

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مقدس مُورِتی

حصہ دوم

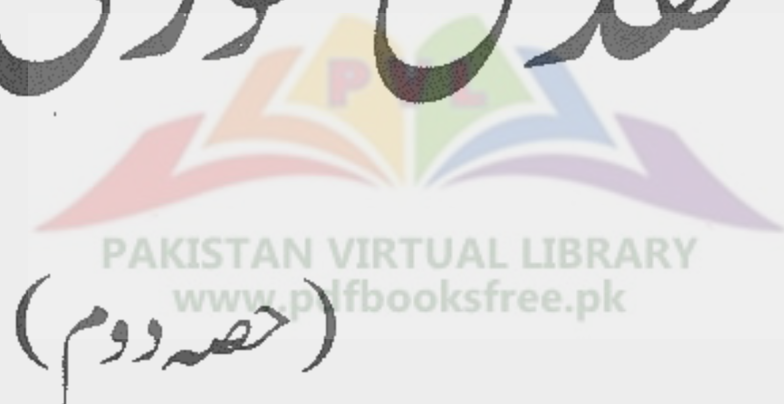
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PDFBOOKSFREE.PK

قبر اچھا لوی



مقدس مورتی



قمر اجنالی

(22)

کایا پنتھا کی کہانی

ہوش آیا تو میں کال کوٹھڑی کے اندھیرے میں کایا پنتھا کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ میری بے ہوشی کے بعد تھاپا کے آدمی مجھے کوٹھڑی میں پھینک گئے تھے۔ کایا پنتھا نے سنبھالا، پھٹی ہوئی قمیض کی دھجیوں سے زخموں کا خون پونچھا اور میرا زخمی سر جسے کسی نرم تکیے کی ضرورت تھی، اپنی گود میں لے کر بیٹھ گیا۔

آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اسی کا سیاہ ہیولا نظر آیا اور میں اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

جسم زخموں سے گھائل اور ضربوں سے چورتھا، کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر چوٹ لگی یا گھاؤ نہ آیا تھا، کہیں ورم تھے کہیں زخم، سوجن کی وجہ سے جگہ جگہ گومڑا بھرا آئے تھے، زخموں سے خون بہنا بند ہو گیا مگر ان میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ شریٹھنڈا ہوتے ہی اکڑ گیا اور پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، کروٹ بدلنا چاہی تو نس نس میں درد کی لہر دوڑ گئی میں کراہ کے رہ گیا، کایا پنتھا فوراً بولا۔

”کیشپ بیٹے! ہلو گے تو گھاؤ دکھ جائیں گے۔“

اس کی آواز میں باپ کی سی شفقت اور ایک دکھی دل کی ٹپ تھی، اس آواز کے ساتھ ایک دو گرم گرم قطرے بھی میرے چہرے پر گرے۔ وہ رو رہا تھا، میں نے آہ بھر کے پوچھا۔

”کیوں روتے ہو کایا۔۔۔! جو آدمی مشکل سے حوصلہ چھوڑ دے وہ ہلکا ہوتا ہے۔“

وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

”میں تمہارے زخموں پر مرہم تو نہیں لگا سکتا، صرف آنسو بہا سکتا ہوں۔“

”مگر یہ بھی جانتے ہو آنسوؤں میں نمک ہوتا ہے اور زخموں کے لئے اچھا نہیں۔“

”پھر میں کیا کروں۔ ان درندوں نے تمہیں بری طرح گھائل کر دیا ہے، اور میں جانتا ہوں

یہ سارا ظلم کس لئے ہوا۔ تم نے جل پنا کے پریم سے انکار کیوں نہ کر دیا؟“

”کیا تم اپنے سر پر موت کو منڈلاتے دیکھ کر اس بات سے انکار کر دو گے کہ اس کے باپ

نہیں ہو؟“

”نہیں، میں اس کا باپ ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔“

”پھر میں کیسے انکار کر دیتا کہ اس کا پریمی نہیں، جو بات سچ ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔“

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : عبدالحفیظ قریشی

مطبع : نیراسد پرنٹرز لاہور

سن اشاعت : 2009ء

تعداد : 600

کمپوزنگ : کلائمکس کمپیوٹرز

قیمت : 500/- روپے

فون: 7231595-7352835

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور۔

ISBN 969-38-0033-8

جل پنا تمہاری بیٹی ہے تو میری بھی کچھ لگتی ہے، میں اپنے من میں پریم بھاؤ رکھتا اور اس کے دکھ بانٹنا چاہتا ہوں۔“

وہ پھوٹ پڑا۔ ”اسی بات کا تو رونا ہے کہ جل پنا کو چھڑاتے چھڑاتے خود اس بندی گھر میں پھنس گئے ہو جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ میری حالت دیکھتے تو اپنے آپ پر خود رونے لگتے، میں پانچ برس سے یہاں ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور اب میرے برے لیکھوں کے کارن تم بھی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہو۔“

میں اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ”قدرت کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا، میں جل پنا کی تلاش میں یہاں نہ آتا تو کیسے پتہ چلتا کہ تم زندہ ہو اور تمہاری موت کا نائک اس لئے رچایا گیا تھا کہ کوئی تمہیں ڈھونڈنے کی چٹنا نہ کرے۔“

”اگر تمہیں پتہ چل گیا کہ میں زندہ ہوں تو کیا فائدہ۔ اب تو تم بھی اسی کال کوٹھڑی کے بنوتی ہو۔“

”تمہاری طرح گنجال بھی یہی سمجھتا ہے کہ میں یہاں سے نکل نہ سکوں گا مگر یہ اس کی بھول ہے۔ ساؤ گاری سے چلتے سے میں شاستر کو بول آیا تھا کہ جل پنا کو چھڑانے پہاڑی خانقاہ میں جا رہا ہوں اگر دو تین دن کے اندر لوٹ کے نہ گیا تو وہ سمجھ جائے گا کہ میں بندی گھر میں پھنس گیا ہوں، پھر سروپ جی کو بتا دے گا اور وہ ضرور میرے پیچھے آئیں گے۔“

کایا پنتھا کے لئے یہ انکشاف حیرت انگیز بھی تھا اور امید افزا بھی۔ ”کیا سروپ جی تمہیں چھڑانے کی کوشش کریں گے۔“

”کیوں نہیں کریں گے، میرا ان کا نانا ہی ایسا ہے۔“

کایا پنتھا خاموش ہو گیا، شاید سوچ رہا تھا کیا واقعی سروپ جی مجھے چھڑانے آئیں گے لیکن مجھے وشواس تھا، شاستر وانہیں لے کر ضرور اس خانقاہ تک پہنچ جائے گا اور گنجال کی بازی الٹ دے گا، اب میں نے کایا کو اپنے اور جل پنا کے بارے میں کچھ بتانا ضروری سمجھا۔

”میں نے جل پنا کو اپنی دنیا میں واپس لے جانے کی سوگند کھائی ہے کیونکہ جب تمہاری جیبی کو پتہ چلا کہ تمہارا سایہ اس کے سر سے اٹھ چکا ہے، اس کے من پر قیامت بیت گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی، جل پنا اس کی بہن کی نشانی اور ایک بچھڑی آتما ہے۔ وہ اپنی بچھڑی آتما سے ملنے کو ترپنے لگی۔ چاہتی تھی اسے رنگا متی لے آئے اور اپنی بہو بنا لے، تب میں نے اسے وچن دیا اور سوگند کھائی کہ جل پنا کو ساؤ گاری سے نکال لاؤں گا اور اسے چاچی کی بہو بھی بناؤں گا۔ میں اپنی ماں کا سپنا پورا کرنے نکلا ہوں اور یہ سپنا ضرور پورا ہوگا کیونکہ میں اور جل پنا ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں۔“

کایا پنتھا کی آنکھوں میں شکر گزاری کے آنسو بھی تھے، پیار کی چمک بھی۔ ”بھگوان کرے تمہارا سپنا پورا ہو، چندر بالا بھی یہی چاہتی تھی کہ اس کے لڑکی ہوئی تو اسے تم سے بیاہ دے گی، جل پنا پیدا ہونے سے پہلے ہی تمہارے نام کر دی گئی تھی۔“

اچانک مجھے ایک نیا خیال آیا۔ ”وہ میرے پریم کے دوش میں ساؤ گاری سے نکال دی گئی اور چار دن پہلے اسی خانقاہ میں لائی گئی ہے کیا تمہاری ملاقات نہیں کرائی گئی اس سے؟“ وہ بے چین ہو گیا۔ ”نہیں تمہارے سوا مجھے کسی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ یہیں ہے، اسی خانقاہ میں، یہ کیسا اندھیر ہے، ہم باپ بیٹی ایک دوسرے کے پاس رہ کر بھی ایک دوسرے سے نہیں مل پائے۔“

”اس کا مطلب ہے اسے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا کہ تم زندہ اور خانقاہ کے تہہ خانے میں بند ہو۔“

”جل پنا کو میری موت کا وشواس تو ہوگا کیونکہ میرے نام کی اترھی اس کی آنکھوں کے سامنے جلی تھی، پر گنجال نے اسے میرے جینے کی خبر نہیں دی ہوگی، شاید دے گا بھی نہیں، وہ مجھے ترپا ترپا کے مارنا چاہتا ہے۔“

اور میں حیران تھا اگر پروہت گنجال جل پنا کو یہ نہیں بتانا چاہتا کہ اس کا باپ زندہ ہے تو اسے خانقاہ میں لانے کا مقصد کیا ہے، حالانکہ کایا پنتھا کو بالکل غیر متوقع طور پر زندہ دیکھ کر مجھے خیال گزرا تھا وہ خانقاہ میں اس لئے لائی گئی ہے کہ اگر مجھ سے پریم کا نانا توڑ لے اور سدا کنواری رہنے کا وچن دے، جیسا گنجال چاہتا تھا تو اسے باپ سے ملا دیا جائے گا، بہر حال یہ ایک ایسی الجھن تھی جس کا کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔ ناگہاں مجھے کچھ اور بھی یاد آیا اور پوچھا۔

”کیا جل پنا کے بدن پر چاند گرہن کا کوئی نشان ہے۔“

کایا پنتھا اس سوال پر بری طرح چونکا۔

”ہاں۔۔۔۔ وہ ماں کے پیٹ میں تھی کہ چاند گرہن ہوا تھا، جب پیدا ہوئی دائیں چھاتی کے نیچے روپیہ کے برابر گول سرخ نشان تھا جس میں چھوٹے چھوٹے باریک دائرے سے ابھرے ہوئے تھے مگر تم نے کیوں پوچھا؟“

”یونہی۔۔۔“ میں اسے بتانا نہ چاہتا تھا کہ چاند گرہن کا وہی نشان اس کی بد نصیبی کی علامت بن گیا ہے اور ایک بار پھر کروٹ بدلنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اکڑے ہوئے جسم میں سر سے پاؤں تک درد کی ٹیسیں اٹھیں اور نہ چاہنے کے باوجود میرے ہونٹوں پر ایک دردناک سی کراہ ترپ گئی۔

کایا پنتھا بھی ساتھ ترپا۔ وہ میرے لئے بڑا بے چین تھا مگر کچھ کر بھی نہ سکتا تھا، بس میرا سر

وہ میرے پاس سے نہیں اٹھا درد میں کچھ افاقہ ہوا تو اس نے جنگلے کے قریب بیٹھ کے چند لقمے زہر مار کئے۔

میں تھا پا بہادر اور اس کے قبائلی پہرے داروں سے پٹ کر زخمی ہو کر خود اپنی نظروں میں گر گیا تھا، ذلت اور توہین کا احساس ہر اس پڑھے لکھے آدمی کو ہوتا ہے جو ایسے حالات سے گزرتا ہے، شاید میں نے ابھی تک ان واقعات کی سنگینی کا صحیح احساس نہیں کیا تھا جو پے در پے پیش آئے تھے مگر اب سوچ رہا تھا کہ مجھے ابھی زمین کے پیٹ میں اپنا بستر نہیں بچھانا بلکہ یہاں سے نکلنا اور ایک ایسے دشمن سے نمٹنا ہے جو سمجھتا ہے کہ مجھے مات دے چکا، تو اب میں اپنے آپ کو پڑھا لکھا آدمی ظاہر نہیں ہونے دوں گا اور علم اور گیان کے ریشم کے غلاف اتار کر ایک نیا لباس پہن لوں گا مگر اپنے دشمن تک پہنچنے سے پہلے مجھے اس کے بارے میں وہ سب باتیں معلوم کرنا ہوں گی جو ماضی کا قصہ بن کر گزر جاتی اور مستقبل میں کسی مقام پر اس کا رستہ روک کے کھڑی ہو جاتی ہیں، تب مجھے خیال آیا کہ کایا پنتھا کی کہانی کیوں نہ سنوں، اس کے آئینے میں گنجال کی صورت نظر آ جائے گی۔

وہ بھوجن کر کے میرے پاس آ بیٹھا تھا، میں نے پوچھا۔ ”میں جاننا چاہتا ہوں پروہت گنجال کو تم سے کیا بیر ہے اور تم نے اس کی کون سی بات نہیں مانی تھی جس کی پاداش میں پانچ برس سے اس بھیانک مقبرے میں دفن ہو؟“

میں نے محسوس کیا یہ سوال سن کر وہ کانپ گیا ہے، بولا۔

”میرا اس کا لیکھا کچھ اور ہے۔“

”وہی تو پوچھا ہے۔“

”کیا کرو گے سن کر!“

”اس نے مجھ سے بھی لیکھا ڈالا اور مجھے حساب چکانا ہے۔“

وہ بات سن کے حیران رہ گیا کیونکہ میری موجودہ حالت کے مقابلے میں یہ بات بہت بڑی تھی، کہاں پر اسرار طاقتوں کا مالک پروہت گنجال جس کا حکم و اختیار اس پہاڑی خانقاہ پر بھی چلتا تھا، کہاں مجھ جیسا مضروب اور زخمی جو اسی کے اشارے پر گرفتار ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچنے لگا، میں نے کہا۔

”تم اپنی کہانی سناؤ گے تو میرا دھیان تمہاری باتوں میں لگا رہے گا اور کچھ دیر کے لیے اپنی تکلیف بھول جاؤں گا۔“

وہ مجھے اپنی کہانی سنانے پر تیار ہو گیا۔

اور یہ ہے کایا پنتھا کی کہانی جسے میں اپنے الفاظ میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

اپنی گود میں لئے بیٹھا رہا۔ ہم ایک بھیانک قبائلی جیل کے بندی تھے اور یہ بلند کوہستانوں کا دور افتادہ علاقہ تھا جس کے آس پاس کوسوں تک قانون کی حکمرانی نہ تھی۔

ہلنے جلنے سے پورے شریر میں درد جاگ اٹھتا، زخموں کی جلن، سوجن اور اینٹھن ہونے ہوئے بڑھنے لگی۔ میں نے ابھی تک کچھ کھایا پیانا تھا، میرے ساتھ کایا پنتھا بھی بھوکا تھا۔ تھوہر کی سی کڑوی کیلی روٹیوں کے ساتھ پتلی دال کا گنداپیالہ جوں کا توں، ایک طرف پڑا تھا، مسلمانوں کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ دوزخیوں کو کھانے کے عوض تھوہر دیا جائے گا، سوچا یہ بندی گھر بھی تو دھرتی کا ایک دوزخ، ایک نرگ ہی ہے، جہاں حالات نے مجھے لا پھینکا ہے۔

کوٹھڑی کے اندر اندھیرے سے میں نے اندازہ لگایا کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا کیونکہ رات کو اس تہہ خانے میں گھپ اندھیرا ہو جاتا اور قریب بیٹھا آدمی بھی دکھائی نہ دیتا تھا مگر ”دن کے اندھیرے“ میں ہم ایک دوسرے کے سائے ضرور دیکھ لیتے تھے، کایا پنتھا پانچ برس سے انہی اندھیروں میں رہنے اور یہی کھانا کھانے کا عادی تھا، میں نے پوچھا۔

”تم نے بھوجن کیوں نہیں کیا؟“

”بس جی نہیں چاہا، آج یہی سوچتا رہا ہوں کہ تمہارے گھاؤ کیسے بھریں گے؟“

”سے ہر گھاؤ بھر دیتا ہے، میرے گھاؤ بھی بھر جائیں گے، تم چٹنا نہ کرو اور بھوجن کر لو۔“

”آج اس بھوجن سے جی اچاٹ ہو گیا ہے۔“

”پھر بھی اپنے شریر کی شکتی قائم رکھنے کے لئے تمہیں تھوڑا بہت کھالینا چاہیے۔“

”کیا لینا ہے مجھے شریر کی شکتی سے؟“

”تم کمزور ہو گئے تو میری دیکھ بھال کیسے کر سکو گے۔ نہ جانے گھاؤ بھرنے میں کتنے دن

لگ جائیں۔“

یہ بات اس کے من کو لگی۔ بولا ”ہاں تمہاری دیکھ بھال کے لئے مجھے شکتی چاہیے، میں

بھوجن کروں گا مگر میرے اٹھنے سے تمہیں تکلیف ہوگی۔“

”میرا اور کوٹ بستر کی طرح بچھا دو، میں اس پر لیٹ جاؤں گا۔“

اس نے میرا زخمی سر اٹھایا اور بڑی احتیاط سے فرش پر رکھا۔ سر کا تو جو حال تھا سوچا تھا مگر

بایاں کندھا اور گردن دونوں گھائل تھے۔ تھا پا بہادر نے اپنی ساری بہادری یہیں آزمائی تھی اور

اس کے بوٹ کی کھری نے کھال ادھیڑ دی تھی، کایا نے میرا سر فرش پر رکھا تو یوں لگا جیسے گردن

پر چھری چل گئی پھر بھی میں نے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس نے میرا اور کوٹ فرش

پر بچھایا مگر اس ”بستر“ پر منتقل ہوتے وقت ضبط کے باوجود میری چیخ نکل گئی۔ ورم اور سوجن سے

جسم اکڑ گیا تھا۔ رگ پٹھے کھینچ گئے تھے، جب ہلا تو جیسے جان ہی نکل گئی میں جب تک کراہتا رہا

ہدایت کے خلاف کچھ نہیں کیا۔

میرا باپ بودھ دھرم پر بڑا اعتقاد رکھتا تھا لیکن جب دھرم کے رکھوالے ہی اتیا چار کرنے لگیں اور اپنے انند منگل اور عیش کے لئے چھل فریب پر اتر آئیں تو ایسے سادھوؤں پر کون وشواس کرے گا۔ پنتھا گرام کا دل بھی ان کی طرف سے میلہ ہو گیا اور آٹھوں پہرے چین رہنے لگا۔ تنہا گت بدھ نے کہا تھا۔ ”آدمی صرف موت سے ملنے کے لئے جیتا ہے اور دنیا کا عیش اسے نرگ میں لے جاتا ہے“ مگر بودھ سادھو جیون کے چند روزہ آرام کے لئے سانپ بن کر مایا کے گرد گھومتے اور دان کی مٹی چاٹ کر پھنکارتے تھے، پنتھا نے ان کی طرف سے بڑے دکھ اٹھائے اور کئی برس جھوٹے مقدموں میں پھنسا رہا۔ سادھوؤں نے اسے دھرم کا باغی، ناشتک اور نہ جانے کیا کیا خطاب دیئے۔ وہ چاہتا تھا ان زمینوں کو چھوڑ دے تاکہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو مگر کاؤ کے پرانے کاشتکاروں نے اسے اس ارادے سے باز رکھا اور بتایا کہ اس طرح مرنے والے کی آتما کو دکھ پہنچے گا۔

پنتھا گرام من کی شانتی ڈھونڈنے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا دنیا کے سارے بدھ مندروں میں سادھوؤں کا یہی حال ہے یا تری بن کر دیس دیس گھومنے لگا۔ ہندوستان میں بدھ کی یا ترا سے لوٹا تو سیام کے شہر بنکاک کے مندروں کی زیارت کرنے چلا گیا پھر اس نے ملایا کے شہر کوآن تان کے بہت بڑے بودھ مندر کا چرچا سنا، جہاں تنہا گت بدھ کی ہزاروں مورتیاں رکھی گئی تھیں۔ ان کے درشنوں کیلئے بودھ یا تری دور دور سے پہنچتے اور من کی شکتی لے کر لوٹتے تھے، یوں تو ہندوستان، چین، جاپان، برما اور سیام میں بھی بڑے بڑے عالی شان اور پر شکوہ مندر ہیں، جہاں بدھ کے پرانے تجسس، مورتیاں اور تاریخی نوادرموجود ہیں مگر ملایا کے کوآن تان مندر کی شہرت ہی صرف بدھ کی مورتیوں کے کارن تھی، پنتھا گرام کے دن رات پریشانی میں گزرتے تھے، من کی شانتی کے لئے وہ کچھ برمی یا تریوں کے ساتھ رنگون کی بندرگاہ سے جہاز پر بیٹھا اور ملایا روانہ ہو گیا۔

بحری جہاز نے اسے سنگاپور کی بندرگاہ پر اتار دیا جو ملایا کے جنوبی ساحل پر واقع ہے، وہاں سے کوآن تان کے لئے جو ملایا کے پوربی گھاٹ پر ہے جہاز، لانیچیں اور دخانی اسٹیر چلتے تھے کیونکہ ریل نہیں جاتی، غیر ملکی یا تری پہلے سنگاپور پہنچتے اور وہاں سے شمال کی طرف بحری سفر کر کے کوآن تان جاتے تھے۔

پنتھا گرام یہ منت مان کر چلا تھا کہ تمام پجاریوں کو کھانا کھلائے گا اور اگر اس نے دیکھا کہ وہ تنہا گت کے اصولوں پر سچے دل سے کار بند ہیں اور روپے پیسے کالا لچ نہیں رکھتے تو انہیں دان بھی دے گا مگر کوآن تان پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جتنا بڑا وہ مندر تھا اتنے ہی سادھو

”میرا باپ پنتھا گرام سنگ کالنگ حکامتی میں ایک معمولی کسان تھا۔ یہ شہر کا چین اسٹیٹ کے پچھتم میں دریائے چین ون (Chinowin) کے کنارے آباد ہے۔

پنتھا گرام بدھ دھرم میں گہرا وشواس رکھتا اور سادھوؤں، بھکشوؤں کی بڑھ چڑھ کے سیوا کرتا تھا مگر انہی برہم چاریوں کے کارن اسے بڑا کشت اٹھانا پڑا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ اسی شہر میں کاؤ ایک بڑا زمیندار تھا جس کا دھان خریدنے دور دور سے بیوپاری آتے تھے۔ کاؤ کی کوئی اولاد نہ تھی، دور نزدیک کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا۔ اسے پنتھا گرام سے بڑا لگاؤ تھا۔ اسی لگاؤ کے باعث وہ بھی دھرم کے کاموں میں حصہ لیتا اور بودھ مندروں اور پگوڈوں کی یا ترا کرنے جاتا تھا، اس نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کی ساری زمین دھرم کے نام پر مندروں کو دان کر دی جائے مگر انہی دنوں ایک ایسا شرم ناک واقعہ ہوا کہ سادھوؤں پر سے کاؤ کا وشواس اٹھ گیا۔

اسے پتہ چلا کہ بعض سادھو مندروں کی کمائی ویشیا عورتوں پر لٹا دیتے اور چوری چھپے اپنی راتوں کو رنگین بناتے ہیں۔ ان میں حکامتی کا پروہت بھی تھا، ایک بدکار عورت سے اس کے خفیہ تعلقات کی تصدیق ہو گئی جو رات کو مندر میں آتی اور منہ اندھیرے چلی جاتی تھی، یہ شرم ناک کہانیاں سن کر کاؤ نے اپنی وصیت منسوخ کر دی اور مرنے سے پہلے ساری زمین میرے باپ پنتھا گرام کو سونپ گیا، اس نے انگریزی قانون کے مطابق اپنی زندگی ہی میں زمینوں کی رجسٹری پنتھا گرام کے نام کر دی اور اسے ہدایت کی تھی کہ سادھوؤں کو دان بند کر دیا جائے۔

کاؤ کے مرتے ہی جب اس کی زمینوں کا قبضہ میرے باپ نے لیا اور مرنے والے کی ہدایت کے مطابق سادھوؤں کو دیا جانے والا دان بند کر دیا تو سنگ کالنگ حکامتی اور آس پاس کے بودھ مندروں میں بڑا چرچا ہوا، حکامتی کے پروہت اور سادھوؤں نے تو کاؤ کی رسوم میت میں بھی شرکت نہیں کی۔ اس کی چتا کو آگ میرے باپ نے لگائی تھی، اسی کارن سادھو اس کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے کاؤ کی پرانی وصیت کی بناء پر مانڈلے کی بودھ کونسل تک عرضیاں بھیجیں کہ کاؤ کی زمینیں مندروں کو دی جائیں یا پھر دھرم کے نام پر علیحدہ کی گئی زمینوں اور جائیدادوں کی رکھشا کرنے والا ڈیپارٹمنٹ (محکمہ اوقاف) ان پر قبضہ کر لے مگر برما کے انگریزی قانون کے مطابق ان زمینوں کی رجسٹری پنتھا گرام کے نام ہو چکی تھی، اس لئے سادھوؤں کی یہ ساری چالیں ناکام ہو گئیں مگر انہوں نے میرے باپ کا پیچھا نہیں چھوڑا اور کاؤ کے نقلی، رشتے دار پیدا کر کے حق رشتہ داری، حق آسائش، حق شفعہ اور حق دخل یابی کے کتنے ہی جھوٹے مقدمے کھڑے کر دیئے اور آئے دن کچھریوں میں پیشیاں ہونے لگیں، حکامتی اور ارد گرد کے سادھوؤں نے وہ طوفان اٹھایا کہ پنتھا کے من کا سکون اجڑ گیا مگر مرنے والے کی

اور پجاری آسودہ حال تھے، اسے یہ معلوم کر لینے میں دیر نہ لگی کہ بودہ دیسوں کے ان گنت یاتری یہاں آکر دان پن کرتے ہیں جس سے مندر کے پروہت، پجاری، سادھو، بھکشو مال دار ہو گئے ہیں۔ مندر بہت بڑے رقبے میں واقع اور کئی حلقوں میں بنا ہوا تھا، جہاں مختلف دھاتوں، چوب، پتھر، ہاتھی دانت، چاندی اور سونے کی مورتیوں کے انبار تھے اور پجاری پاتریوں کو ان مورتیوں، نیز بے شمار بودہ نوادرات کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی فیس لیتے تھے جس طرح مندر میں ہزار ہا مورتیاں اور ہزار ہا نوادر تھے اسی طرح ”گائیڈ“ کا کام کرنے والے پجاریوں کی تعداد بھی درجنوں نہیں بیسیوں کے حساب سے تھی اور وہ خوب کھاتے تھے۔

پنتھانے بھی ایک پجاری گائیڈ کی خدمات معاوضے پر حاصل کر لیں اور یاتریوں کے ہجوم میں تنہا گت کی مورتیوں کے درشن کرتا رہا۔ اس نے وہاں بہت ہی تاریخی اور قدیم الایام مورتیاں دیکھیں۔ پتھر اور دھات کی کئی مورتیاں ہندوستان سے لائی گئی تھیں، جو کنشک اور کش خاندانوں کی یاد دلاتی تھیں۔ ان مورتیوں کے درشن کر کے پنتھا گرام کے من میں بدھ کا پریم بھاؤ کچھ اور بڑھ گیا مگر یہ بات اس کے لئے بڑی تکلیف دہ تھی کہ کوآن تان کا بودہ مندر ایک دھارمک منڈی بن گیا تھا، جہاں پروہت، پجاری، سادھو، بھکشو سب دھرم کا بیوپار کرتے تھے۔ وہ مندر کے مہا پروہت تنگا سو سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا جو ملایا کے ایک قدیم بودہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس نے مہا پروہت کو بتایا کہ وہ من کی شانتی کے لئے یہاں آیا اور تمام بھکشوؤں کو کھانا کھلانا چاہتا ہے مگر یہ دیکھ کر اس کا دل بجھ گیا ہے کہ یہاں بدھ کے بھگت دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں، مہا پروہت تنگا سو کہنے لگا۔

”تم نے کھانا کھلانے کی جو منت مانی ہے وہ پوری کرو اور اس بات پر نہ جاؤ کہ پجاری دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ وہ یاتریوں سے جو کچھ کماتے ہیں، رات کو مندر کے خزانے میں جمع کر دیتے ہیں۔“

اور یہ بات غلط نہ تھی، پنتھانے اپنی آنکھوں سے پجاریوں کو یاتریوں سے محصول ہونے والی فیس مندر کے دفتر میں جمع کراتے دیکھا، جس سے اس کا من صاف ہو گیا پھر اس نے ایک شاندار ضیافت کا بندوبست کیا جس سے اس کے دل کو بڑا سکون ملا۔

میں بتا چکا ہوں کوآن تان کا مندر بہت وسیع و عالی شان اور کئی حلقوں میں پھیلا تھا۔ ”گولڈن سیکشن“ میں صرف سونے کی مورتیاں رکھی گئی تھیں جن کی مالیت لاکھوں روپے تھی، اس لئے کئی پہرے دار دن رات دیکھ بھال کرتے تھے، تیسرے دن پنتھا گرام نے گولڈن سیکشن کا رخ کیا۔ اس نے تھوڑی سی ملائی زبان سیکھ لی تھی اور کھانا کھلانے کی وجہ سے بہت سے لوگ اسے

جاننے لگے تھے، اس لئے جب وہ وقت سے پہلے ہی کیونکہ مندر میں زیارت کے اوقات مقرر تھے۔ گولڈن سیکشن میں داخل ہوا تو چوکیداروں نے اسے نہیں روکا۔ وہ اس سیکشن کے نگران سے جو مہا پروہت کا نائب خاص تھا، کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، مندر میں سب لوگ کیا سادھو، بھکشو کیا گائیڈ اور یاتری ننگے پاؤں پھرتے اور اپنی جوتیاں باہر ہی اتارتے تھے، جب پنتھا بے آواز چلتا نائب خاص کے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اندر سے کھسر پھسر کی آواز سنی اور ملائی زبان کے جو چند الفاظ کانوں میں پڑے وہ چونکا دینے والے تھے کیونکہ اندر سونے کی قیمتی مورتیوں کو ایک خفیہ رستے سے اڑا لے جانے کی سازش ہو رہی تھی اور مندر کے نائب خاص نے جو خفیہ راستہ جانتا تھا اس کام کے لئے رات کے ایک بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔“

وہ دنگ رہ گیا اور نائب خاص سے ملنے کی بجائے وہیں سے دبے پاؤں لوٹ آیا مگر پریشان تھا کہ ان لوگوں کی شکلیں تو دیکھی نہیں کہ کون تھے دوبارہ اندر جانا مناسب نہ تھا، وہیں چوکیداروں سے باتیں کرنے لگا، مندر میں زیارت کا سہ شروع ہونے والا تھا اور گائیڈ یاتریوں کے ہمراہ آرہے تھے۔ اسی اثناء میں دو یاتری جو شکل و شبہات سے جاپانی معلوم ہوتے تھے، نائب خاص کے کمرے سے باہر آئے اور مندر کے بیرونی گیٹ کی طرف چلے گئے، ان کے کھر درے چہروں پر سمندری ہواؤں نے کچھ ایسے اثرات چھوڑے تھے جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ پیشہ ور ملاح ہیں جن کی زندگی سمندروں میں گزرتی ہے۔

پنتھا گرام کسی ہچکچاہٹ کے بغیر مہا پروہت تنگا سو تک پہنچا اور جب اسے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت مل گئی مورتیوں کی چوری کے بارے میں جو کچھ سنا تھا مہا پروہت کو سنا دیا وہ اس سنسنی خیز اطلاع پر حیران رہ گیا کیونکہ نائب خاص بڑے بھروسے کا آدمی تھا پھر بھی اس نے احتیاط کے طور پر پولیس کو خبر دے دی اور درخواست کی کہ مندر کی خفیہ نگرانی کی جائے، اس کے ساتھ ہی ایک پجاری کو نائب خاص کی نگرانی پر مقرر کر دیا۔

نائب خاص اور جاپانی ملاحوں کی ملاقات رات کو ایک بجے ”گولڈن سیکشن“ کے پیچھے مندر کی ایک سنسان گلی میں طے پائی تھی جہاں انہیں پہرے داروں کی نظروں سے بچ کر پہنچنا تھا، رات کے ایک بجے بھی وہ گلی سنسان تھی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کی ملاقات اسی گلی میں ہوئی، نائب خاص نے رات کی تاریکی میں جاپانی ملاحوں کو ساتھ لیا اور ایک عقبی دروازے کا تالا کھول کر طلائی مورتیوں کے سیکشن میں داخل ہوا مگر جب وہ بڑی الماری کا تالا کھول رہا تھا جس کے شیشوں کے پیچھے سب سے قیمتی مورتیاں رکھی تھیں کہ ناگہاں ہال نما کمرے میں روشنی ہو گئی اور کئی مسلح سپاہیوں نے الماریوں کے پیچھے سے نکل کر انہیں گھیر لیا۔ نائب خاص اور جاپانی ملاح رینگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ کوآن تان کے پولیس انسپکٹر کے ہمراہ مہا پروہت تنگا سو اور پنتھا

”پنتھا گرام! تم امی تابھ بدھ کے سچے پریمی ہو اور من کی شانتی کے لئے اتنی دور سے اس کی مورتیوں کے درشن کرنے آئے ہو اس لئے جانے سے پہلے میں تمہیں ایک ایسی چیز دینا چاہتا ہوں جو زیادہ قیمتی تو نہیں مگر بدھ اتھاس میں بڑی نادر اور پوتر سمجھی جاتی ہے، تم نے انعام لینے سے انکار کر دیا اور کہا تھا کہ میں تمہیں کوئی ایسی روحانی سوغات دوں جس سے تمہارے من کو شانتی ملے تو میں ایک روحانی سوغات ہی دے رہا ہوں جس کی برکت سے تمہاری ہر کلپنا دور ہو جائے گی۔“

یہ کہہ کر مہا پرودھت تنگا سونے، سونے کی ایک ڈبیا نکالی جو چاروں طرف سے اس طرح بند تھی کہ کھولی نہ جاسکتی تھی اور جو کچھ تھا اس ڈبیا کے اندر ہی بند تھا، وہ اسے پنتھا کے حوالے کرنے سے پہلے بتانے لگا۔

”اس ڈبیا کے ساتھ بودھ اتھاس کی ایک کہانی وابستہ ہے جو دو ہزار برس سے زیادہ پرانی ہے، صدیوں پہلے ملایا کے کچھ بیوپاری ہندوستان گئے اور وہاں سے کچھ بودھ سوغاتیں اپنے ساتھ لائے تھے، اس طرح یہ ڈبیا بھی یہاں پہنچی، ملایا کے جو بیوپاری اسے لائے تھے انہیں ہدایت کی گئی کہ ڈبیا کھولنے یا توڑنے کی کوشش نہ کریں مگر عجیب بات یہ ہے کہ ڈبیا جہاں بھی رکھی گئی وہاں شانتی ہی شانتی رہی، بہت سے لوگ ان باتوں کو نہیں مانتے مگر بعض چیزوں پر بھگوان کا سایہ ہوتا ہے اور ان کی برکت اپنا اثر دکھاتی ہے، تبھی میں یہ پرانی اور روحانی سوغات تمہیں دے رہا اور نصیحت کرتا ہوں کہ کبھی اسے کھولنے یا توڑنے کی کوشش نہ کرنا اور اپنے گھر کی کسی محفوظ جگہ رکھنا، مجھے پورا وشواس ہے کہ اس کی برکت سے تمہاری ساری مشکلیں دور ہو جائیں گے۔“

یہ کہہ کر تنگا سونے وہ ڈبیا پنتھا گرام کے سپرد کر دی۔

پنتھا کو روپے، پیسے یا چاندی سونے کا لالچ نہیں تھا، ویسے بھی ڈبیا کا وزن پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا اور اس کے سونے کی قیمت چند سو روپے ہوگی مگر پرودھت نے اس کی جس تاریخی حیثیت کا ذکر کیا، وہ پنتھا کی گہری دلچسپی کا باعث بن گئی اور پوچھنے لگا۔

”آپ نے بودھ اتھاس کے بارے میں کہا ہے، کیا میں وہ کہانی جان سکتا ہوں تاکہ اس کی تاریخی اہمیت سے آگاہ ہو سکوں۔“

”کیوں نہیں، جو کچھ مجھے معلوم ہے تمہیں بتا دیتا ہوں۔“

پھر تنگا سو، ڈبیا کی تاریخی حیثیت بیان کرنے لگا۔

”جیسا کہ میں نے کہا یہ ڈبیا دو ہزار سال سے زیادہ پرانی اور ہندوستان کے بودھ مہاراجہ اشوکا کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس زمانے میں مشہور بودھ ارہت، سارگلیان نے ایتا بھ

گرام خود موجود تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جاپانی ملاح سمندری قزاقوں کی ایک تنظیم سے تعلق رکھتے تھے، جو شانت مہا ساگر (بحرالکابل) کے جزیروں کے آس پاس بھولے بھٹکے جہازوں کو لوٹ لیتی تھی۔ بحری قزاقوں کا ایک انتہائی تیز رفتار اسٹیمر کو آن تان کے ساحل پر لنگر انداز تھا جس میں ان کا سردار کیپٹن کے روپ میں موجود تھا، جب ملایا کی سمندری پولیس نے اسے گھیرنے کی کوشش کی تو رات کے اندھیرے میں سمندر کا سینہ چیرتا ہوا سائیگون کی طرف فرار ہو گیا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ پنتھا گرام کو چوری کی سازش کا پتہ چل گیا اور اس نے مہا پرودھت تنگا سو کو خبردار کر دیا، اس طرح بدھا کی وہ مورتیاں چوری نہ ہو سکیں جو اس مندر کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ کوآن تان کی یا ترا سے پنتھا پر جہاں یہ بھید کھلا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں اور دھرم استھانوں میں بھی برے لوگ ہوتے ہیں۔ وہاں ایک روحانی سکون بھی ملا کہ محض اس کے کاربن تھاگت بدھ کی قیمتی مورتیاں چوری اور خواری سے بچ گئیں، مہا پرودھت تنگا سو اس سے بڑا متاثر ہوا اور سمجھا پنتھا گرام کو بھگوان ہی برما سے کوآن تان لے آیا تھا تاکہ وہ مورتیوں کی حفاظت کا ذریعہ بنے۔ اس سیوا کے بدلے مہا پرودھت نے پنتھا کو انعام دینے کا فیصلہ کیا مگر اس نے انعام لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔

”اگر مہا پرودھت مجھے کچھ دینا چاہتے ہیں تو کوئی ایسی روحانی سوغات دیں جو میرے بے چین من کو شانتی دے سکے کیونکہ میں بودھ مندروں میں مندر کی شانتی ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔“

تنگا سونے پوچھا۔ ”تمہارے من کو کیا چتا ہے؟“

پنتھا گرام نے سنگ کالنگ حکامتی کے زمیندار کاؤ کی زمینوں اور علاقے کے بودھ سادھوؤں کی دشمنی کا قصہ سنایا جنہوں نے جھوٹی نالشیں دائر کر کے اس کا سکھ چین چھین لیا اور جینا حرام کر دیا تھا، مہا پرودھت نے سوچ بچار کے بعد صلاح دی۔

”کاؤ کی زمینوں کا ساتواں حصہ حکامتی کے بودھ مندر کو دان کر دو۔“

پنتھا سوچ میں پڑ گیا کیونکہ کاؤ نے منع کیا تھا کہ وہ سادھوؤں کو دان نہ دے۔ مہا پرودھت

نے بڑی باریک بات نکالی اور سمجھایا۔

”کاؤ نے سادھوؤں کو دان دینے سے منع کیا تھا، مندروں کو نہیں۔“

یہ بات پنتھا کی سمجھ میں آ گئی، اس کے ساتھ ہی تنگا سونے مانڈلے کی بودھ کونسل کے نام ایک چٹھی لکھ دی کہ وہ سنگ کالنگ حکامتی کے سادھوؤں کو سمجھائے وہ اپادھی نہ بنیں، پنتھا گرام مطمئن نظر آنے لگا مگر رخصت ہونے سے پہلے مہا پرودھت نے اسے اپنے کمرہ خاص میں بلایا

کا انتہائی دلچسپ مرحلہ تو اب شروع ہوا تھا، کایا کہنے لگا۔
 ”ایسی نادر اور نایاب ڈیبا واقعی ایک تاریخی اور روحانی سوغات تھی جو دو ہزار سال سے
 زیادہ پرانی اور سارگلیان جیسے مہاراجہ نے چھوڑی تھی اور جس کی برکت اتنی صدیاں بیت جانے
 پر بھی ختم یا کم نہ ہو سکی تھی جیسی پنتھا گرام نے اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں اور
 سب سے اہم بات یہ پوچھی۔۔۔ ”اس ڈیبا میں کیا ہے اور یہ پوتر کیوں ہے۔۔۔؟“
 غالباً کوآن تان کا مہاراجہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ ڈیبا میں کوئی انوکھی شے بند کر دی گئی
 ہے جو برکت کا کارن ہے، اس نے جواب دیا۔

”پنتھا گرام! تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ اس میں کیا ہے، اسے کھولنے اور توڑنے
 کی مناسبت بھی اسی لئے کر دی گئی ہے کہ کوئی اس کے اندر کے گن اور جوہر کو نہ جان سکے، شاید مہاراجہ
 سارگلیان نے اس میں کوئی ایسا بھید بند کر دیا ہے جس کا نام مہاراجہ ایتنا بھ بدھ سے ہے
 کیونکہ سونے کی اس ڈیبا پر سارگلیان نے پالی زبان میں کچھ پوتر شبد اور کچھ پوتر نام کندہ کرائے
 تھے جن کی وجہ سے یہ ڈیبا پوتر ہے۔“

پھر مہاراجہ ہت کے کہنے پر پنتھا نے ڈیبا پر کندہ حروف دیکھے اور تنگا سو کہنے لگا۔
 ”تم انہیں پڑھ نہیں سکو گے کیونکہ یہ شبد اور نام پالی زبان میں ہیں، جواب دنیا میں کہیں اور
 بولی اور سمجھی نہیں جاتی، ہندوستان میں بودھ راج کے ساتھ پالی زبان کا بھی انت ہو گیا تھا مگر
 میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ پوتر شبد اور پوتر نام یہ ہیں۔“

”جیون بھید۔۔۔ چارانا۔۔۔“

”تھا گت، شاکیہ منی، امی تابھ، آتما روپی۔“

اور کایا پنتھا کی زبان سے یہ شبد اور نام سن کر مجھ پر حیرت کا ایسا زبردست دورہ پڑا کہ کچھ
 ہوش نہ رہا اور میں جوش حیرت میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا، جھٹکے کے ساتھ اٹھنے سے زخموں میں
 شدید ٹیمپیں اٹھیں اور شریر کی نس نس میں چنگاریاں سلت اٹھیں مگر کایا نے جو عجیب و غریب اور
 سنسنی خیز انکشاف کیا تھا۔ اس کے سامنے میں اپنی جسمانی تکلیف بھول گیا۔

وہ بھی میرے اس طرح ایک اکی اٹھنے پر حیران رہ گیا اور گھبرا کے پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا کشپ! تمہارا من تو ٹھیک ہے؟“

میں تڑپ کے بولا۔ ”یہ بتاؤ پھر کیا ہوا، کیا پنتھا گرام کوآن تان سے وہ ڈیبا لے آیا تھا؟“

اب حیران ہونے کی باری کایا پنتھا کی تھی، پراسرار ڈیبا کے بارے میں میری یہ بے چینی اور
 دلچسپی دیکھ کر وہ حیرت کا سایہ بن گیا اور عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں
 بھی نہیں تھا کہ جو کچھ وہ بتا رہا ہے میرے لئے اتنا تحیر خیز ہوگا۔

بودھ کی ایک مقدس مورتی مہاراجہ اشوکا کو بھینٹ کی اور اسے مرگ داؤ کے بڑے مٹھ میں رکھنے
 کی خواہش کی تھی جو بنارس سے تین میل شمال کی جانب تعمیر ہوا تھا، کہتے ہیں اس مورتی میں کوئی
 جیون بھید تھا جس کی خاطر مورتی سرکاری مٹھ کی حفاظت میں دے دی گئی۔ بعد میں سارگلیان
 نے سونے کی یہ ڈیبا بنوائی اور شاید اس میں بھی کوئی بھید کی بات محفوظ کر دی۔ مرنے سے پہلے
 وہ ڈیبا بودھ گیا کے ایک پروہت کو سونپ گیا جو نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی آخر ملایا
 پنچنی اور اب میں یہ ڈیبا تمہیں سونپ رہا ہوں۔“

کایا پنتھا کی اس کہانی میں سارگلیان کا نام اور مقدس مورتی کا ذکر سن کر میری جو کیفیت
 ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ مارے حیرت کے گھائل جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی کیونکہ مقدس
 مورتی کے ساتھ اب ایک ”پوتر ڈیبا“ کا انکشاف میرے لئے بڑا ہی حیران کن تھا اور میں یہ
 جاننے کے لئے بے چین تھا کہ اس ڈیبا میں کیا ہے؟ اس بے چینی میں اٹھنے کی کوشش کی مگر سارا
 شریر درد کی شدت سے تھرا اٹھا اور میرے ہونٹوں سے ”ہائے۔۔۔“ کی آواز نکلی۔ کایا پنتھا سمجھا
 شاید میں لیٹے لیٹے تھک گیا اور اٹھنا چاہتا ہوں، میرا ہاتھ پکڑ کے بولا۔

”لیٹے رہو کشپ بیٹے! تم گھائل ہو، ملنے جلنے سے تکلیف ہوگی۔“

میں نے اپنی بے چینی کو الفاظ کے پردے میں لپیٹنے کی کوشش کی ”میں تمہاری دلچسپ کہانی
 میں اتنا کھو گیا تھا کہ اپنے گھاؤ بھول گیا۔“

حالانکہ سچ بات یہ ہے کہ کایا نے اپنے باپ پنتھا گرام کی جو کہانی سنائی وہ تو ایک بودھ
 تری کی سرگزشت سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی جس سے کسی کو دلچسپی ہو سکتی ہے کسی کو نہیں
 میں بھی محض کوآن تان کے مندر میں بدھ کی ہزار ہا مورتیوں کی وجہ سے وہ سرگزشت سننا رہا
 مہاراجہ اشوکا، سارگلیان، مقدس مورتی اور پوتر ڈیبا کے ذکر پر چونکا تھا۔ نہ صرف چونکا بلکہ
 حیرت میں اٹھنے کی بھول کر بیٹھا جس نے احساس دلایا کہ میں تو ملنے جلنے کے بھی قابل
 ہوں۔ بہر حال کایا پنتھا کی کہانی میں میری دلچسپی شروع ہو چکی تھی اور میں اس ”روحانی
 سوغات“ کے بارے میں جو کوآن تان کے مہاراجہ نے پنتھا گرام کے حوالے کی۔ مزید کچھ
 بنانا کچھ سننا چاہتا تھا اور لیٹے لیٹے بولا۔

”تو پنتھا گرام نے سارگلیان کی وہ ڈیبا تنگا سو سے لے لی؟“

”ہاں۔۔۔ کیونکہ وہ ایک پوتر ڈیبا تھی اور اس کی برکت سے من کو شانتی ملتی تھی۔“

”مگر پنتھا گرام نے یہ نہیں پوچھا کہ ڈیبا پوتر کیوں ہے؟“

”پوچھا تھا اور وہی اب تمہیں بتانے والا ہوں۔“

میں اپنے شریر کی سو جن اور زخموں کی تکلیف کو نظر انداز کر کے ہمہ تن گوش ہو گیا کیونکہ کہانی

”اب کہاں ہے وہ ڈبیا؟“

وہ حیرت زدہ سا بولا۔ ”تم ڈبیا کے لئے اتنے بے چین کیوں ہو گئے؟“

مجھے خیال آیا کہ میں تو کچھ زیادہ ہی بے کل ہوں اور میری بے کلی میرے راز دل کو افشا کئے دیتی ہے پھر اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

”کوئی بھی بدھ گیانی جب سنے گا کہ وہ ڈبیا سارگلیان جیسے مہاپرش کی یادگار ہے اور اس پر بھگوان بدھ کے چار پوتر نام لکھے ہیں تو کیا اس کے لئے بے چین نہیں ہوگا؟“

میرا یہ عذر کا یا پتھا کو معقول معلوم ہوا۔ ”پروہت گنجال نے بھی یہی کہا تھا کہ تم ایک بودھ گیانی ہو اور اس ناتے بودھ اتھاس کی کہانی سے تمہاری دلچسپی ضروری ہے مگر آرام سے لیٹ جاؤ، میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے خود ہی مجھے کندھوں سے پکڑ کے لٹانے کی کوشش کی اور ایک بار پھر میرے دکھتے جسم کو درد کی لہروں سے گزرنا پڑا اور میں چند لمحے شدید کرب سے دو چار رہا، کا یا بھی پریشان تھا۔

”تمہارے سر پر گرم ہے کہیں بخار تو نہیں؟“

”شاید زخموں کی جلن ہے۔“

”کچھ دیر آرام کر لو۔ اٹھنے بیٹھنے سے زخم اور بگڑ جائیں گے۔“

”کایا موسا۔۔۔ تم اپنی کہانی کہتے رہو۔“

”اب میں کہانی نہیں کہوں گا۔“

”کیوں نہیں کہو گے؟“

تم بے کل ہوتے اور اٹھ کر بیٹھ جاتے ہو۔ پہلے اچھے تو ہو لو پھر سن لینا میری کہانی۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور خاموشی اور اندھیرے میں سارگلیان کی چھوڑی ہوئی طلائی ڈبیا میرے تصور میں تپکی کی طرح گھومنے اور ناچنے لگی۔

○

کئی منٹ تک نہ اس نے بات کی نہ میں بولا اور اس خاموشی میں ہر لمحہ بڑا طویل اور بوجھل محسوس ہونے لگا، میرا ذہن اس پر اسرار ڈبیا کے تعاقب میں تھا اور اس کے بارے میں بڑھتی ہوئی دلچسپی مجبور کر رہی تھی کہ میں کچھ پوچھوں، کچھ بولوں، آخر میرے ہونٹ بول پڑے۔

”کایا موسا۔۔۔ اس طرح سے کیسے کئے گا؟“

”سے تو ہر حال میں کٹ جاتا ہے، میں نے پانچ برس کاٹے ہیں، اس تاریکی، تنہائی اور خاموشی میں۔“

اس کی طرح اب میں بھی کوٹھڑی کے اندھیرے سے مانوس ہو گیا اور نہ صرف اس کا ہیولا دیکھ سکتا بلکہ ہونٹوں کی حرکت اور آنکھوں کی چمک سے جذبات کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں حیرت کی بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ غالباً اس بات پر حیران تھا کہ سارگلیان کی ڈبیا پر کندہ پالی زبان کے چار شبد اور چار نام میرے لئے ایسا اچنبھا کیوں بن گئے کہ میں اپنے زخموں کی پروا کئے بغیر اٹھ گیا۔

میری آپ بیتی پڑھنے والے ان شبدوں اور ناموں کی اہمیت جانتے اور سمجھ گئے ہوں گے کہ کا یا پتھا کے انکشاف پر میرا حیران و بے چین ہو جانا بے سبب نہ تھا کیونکہ انہی شبدوں اور ناموں میں جو آنند بھکشو والی مورتی پر بھی کندہ تھے جیون کا کوئی گہرا راز لپیٹ دیا گیا تھا۔ کا یا میری بے چینی کو چشم حیرت سے دیکھتا رہا، اس نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہ دیا تھا، میں نے اسے توجہ دلائی۔

”کایا موسا۔۔۔! میں نے کچھ پوچھا تھا؟“

”اور میں سوچ رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر تم ڈبیا پر لکھے شبد اور نام سن کر اتنے بے چین اور پریشان ہو گئے تو جو کچھ میں آگے بیان کرنے والا ہوں اسے سن کر تمہاری حالت کیا ہوگی؟“

کا یا پتھا کی کہانی اب میری حیرت و دلچسپی کا محور بنتی جا رہی تھی، میں نے کہا۔

”میری چٹان نہ کرو اور جو کچھ بتانا چاہتے ہو بتاتے رہو۔“

”جو کچھ تم نے پوچھا تھا، اس کا جواب ”ہاں“ ہے کیونکہ میرا باپ وہ ڈبیا کو آن تان سے لے آیا تھا اور مہاپروہت تنگا سونے آخری بات یہ بتائی کہ سارگلیان نے ڈبیا پر ایک ہدایت بھی کندہ کرائی تھی اور یہ ہے اس کا ارتھ کہ۔۔۔ اس بھید کو کھولنے کا ادھیکار صرف اس آدمی کو ہے جو بھگوان شاکیہ منی کی وہ مقدس مورتی حاصل کر لے، جو ان کے پیارے شش آنند بھکشو نے بنوائی تھی۔“

یہ ایک اور عجیب انکشاف تھا جو کایا نے کیا اور مجھ پر حیرت کا ایک اور عالم گزر گیا کیونکہ سار گلیان کی ڈبیا اور مقدس مورتی باہم لازم و ملزوم کر دی گئی تھیں یا ان کی مثال دو تن اور ایک جان کی سی تھی گویا سارگلیان نے مقدس مورتی کی روح نکال کر ڈبیا میں بند کر دی، اسے کھولے بغیر مورتی کے جوہر کو سمجھنا مشکل تھا اور ڈبیا کھولنے سے پہلے مورتی کو حاصل کرنے کی شرط رکھی گئی تھی، میں جانتا تھا آنند بھکشو نے اس مورتی میں بھگوان بدھ کی سر کی راکھ محفوظ کر دی تھی مگر اس کا راز یا جوہر ڈبیا میں بند تھا، یعنی وہ مورتی کی ”جان“ تھی اور میرے لئے مورتی کے ساتھ ڈبیا حاصل کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا، میں نے بالکل صاف اور واضح سوال کیا۔

دریائے چین ون میں بہا دیں مگر میں نہیں جانتا تھا وہ مقدس امانت جس کی حفاظت مجھے اپنی جان سے بڑھ کے کرنا تھی، میری تباہی و بربادی کا کارن بن جائے گی اور دنیا مجھ پر اتنی تنگ اور تاریک ہو جائے گی، جیسے زمین کے پیٹ میں اتری ہوئی یہ کال کوٹھڑی ہے جہاں نہ تازہ ہوا آتی ہے نہ روشنی۔

جب میں نے اپنے باپ کو وچن دیا تو بڑا خوش تھا کہ بودھ اتہاس کی ایک پوتر اور نادر یادگار میرے سپرد کی جا رہی ہے مگر آج میرے پاس غموں اور آنسوؤں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا کیونکہ مجھ پر ہر تباہی سارگلیان کی اسی ڈبیا کی وجہ سے آئی جس کی حفاظت کا وچن دے چکا تھا، اس تباہی کا آغاز تب ہوا، جب میں اپنی بیٹی کے پیار میں تمہاری موسیٰ چندر بالا کی موت کا غم بھول چکا تھا۔ چندر بالا کے سؤرگ باش ہو جانے پر دنیا سے میرا من اچاٹ ہو گیا تھا لوگوں نے دوسرا بیہ کرنے کے مشورے دیے مگر میں نے جل پنا کی خاطر دوسرا بیہ کیا نہ دنیا چھوڑی۔ میرے جیون کا ایک ہی آدرش تھا کہ اپنی بیٹی کی پرورش کروں، اسے سکھی رکھوں۔ میں نے اسے باپ کی شفقت کے ساتھ ماں کی متا بھی دی اور اس کے سب چاؤ پورے کئے، وہ بچپن ہی سے ناچ سے لگاؤ رکھتی تھی، یہ شوق پورا کرنے کے لئے ایک ماسٹر نو کر رکھ لیا، جو اسے ناچ سکھایا کرتا تھا۔ میں علاقے کا ایک خوشحال زمیندار اور اپنی بیٹی کی ہر تمنا پوری کرنا چاہتا تھا، ہم دونوں باپ بیٹی بڑے خوش تھے مگر جل پنا کی عمر کا تیرھواں برس ہم دونوں کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا۔

”یہ 1925ء کے سن اور ستمبر کے مہینے کی بات ہے۔ تبت کا ایک لاما بھگوان بدھ کی کوئی گم شدہ مورتی ڈھونڈتا ہوا برما میں آیا اور قدیم شہر آوا اور مانڈلے سے ہوتا سنگ کالنگ حکامتی سے گزرا۔“

کایا پنتھا کی زبانی تبتی لاما کا ذکر سن کر جو بھگوان کی گم شدہ مورتی ڈھونڈتا پھرتا تھا میرا ماتھا ٹھنکا اور پوچھا۔

”کیا نام تھا اس لاما کا؟“

”بدری ساکھا۔“

اور بدری ساکھا کا نام سن کر میرے ذہن میں جیسے موت کی گھنٹی بجی۔ یہی بدری ساکھا انا تھ بند و دالی مورتی کا سراغ لگاتا ساؤ گاری پہنچا اور منگل ساؤ سے ملا تھا۔ چکرورتی چاچا سے اس کی پہلی ملاقات 1920ء کو ڈھاکہ میں اور دو برس بعد دوسری ملاقات چٹاگانگ کی بندرگاہ پر ہوئی تھی، پھر اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ وہ چکرورتی چاچا کی مصیبت کا باعث بنا اور اب کایا پنتھا کی کہانی میں بھی موجود تھا، یہ انکشاف بڑا حیران کن تھا کہ وہ آسام اور پوربی بنگال سے ہوتا برما میں جا نکلا تھا اور مورتی کی تلاش ختم نہ ہوئی تھی۔ کایا نے بتایا۔

”بدری ساکھا نے مانڈلے میں کسی برمی یا تری سے سنا تھا کہ سنگ کالنگ حکامتی کا زمیندار

”مگر مجھے تو یہ خاموشی ڈ سے جا رہی ہے، کچھ بولو، کچھ کہو۔“

”کیا بولوں، کیا کہوں؟“

”اپنی کہانی کہو نا۔۔۔“ میں دل کی خواہش دبانہ سکا۔ ”میرا دھیان بٹا رہے گا، خاموشی میں تو گھاؤ اور بھی دکھنے لگتے ہیں۔“

”اگر تمہیں خاموشی اچھی نہیں لگتی تو اپنی رام کہانی سناتا ہوں۔“ پھر وہ کہنے لگا۔ ”میرے باپ پنتھا گرام پر سادھوؤں کے کارن جو کچھ بتی وہ تم سن چکے ہو، اس کا بہت تھوڑا سا حال باقی ہے کوآن تان کی یا ترا کر کے وہ حکامتی میں لوٹا تو معلوم نہیں پروہت تنگا سو کی چٹھی کا اثر تھا جو اس نے مانڈلے کی بودھ کونسل کو لکھی تھی یا سارگلیان کی پوتر ڈبیا کی کرامت، کہ کچھ ہی دنوں میں کاؤ کی زمینوں کے سارے جھوٹے مقدسے واپس لے لئے یا خارج کر دیئے گئے، پنتھا نے تنگا سو کی ہدایت کے مطابق زمینوں کا ساتواں حصہ بودھ مندر کے نام دان کر دیا اور وہی سادھو جو اس کی آبرو اور جان کے دشمن ہو رہے تھے اور اسے دھرم کا بیری اور ناسٹک کہتے تھے، اس کے دھرم پیار کے گن گانے لگے۔ کاؤ کے وہ جھوٹے رشتے دار بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے کہ پھر کسی کی صورت بھی دکھائی نہ دی اور وہ کروڑھ اور جھوٹ مکر و فریت کا طوفان دیکھتے ہی دیکھتے اتر گیا اور پنتھا کو وہ شانتی مل گئی جس کا وہ مدت سے متلاشی تھا۔

میرے باپ کا خیال تھا یہ سب کچھ پوتر ڈبیا کی برکت کا نتیجہ ہے جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، مرنے سے پہلے اس نے وہ ڈبیا میرے حوالے کی اور کہا۔

”میں نے اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا اور دنیا کی نظروں سے چھپا کے رکھا ہے، اسی کی برکت سے مجھے شانتی ملی اور میرے سارے بگڑے کاج سدھر گئے تم بھی اس پوتر سوغات کی اپنی جان سے بڑھ کے حفاظت کرنا، نہ اسے کھولنا، نہ توڑنا، نہ کسی کو دینا، نہ بیچنا، مجھے وچن دو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہی کرو گے۔“

بھلا مجھے ایک ایسی تاریخی شے کی حفاظت سے کیا انکار ہو سکتا تھا جو میرے باپ کی شانتی اور اس کی خوش حالی کا سبب بنی۔ پنتھا گرام نے جیسا چاہا تھا، میں نے ویسا وچن دے دیا اس کے آخری الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں، اس نے مرنے سے پہلے کہا تھا۔

”کایا بیٹے! جب تم اس سنسار کا جیون بھوگ کر دوسرے سنسار میں آؤ گے تو میں تم سے پوچھوں گا کیا اپنا وچن پورا کر کے آئے ہو اور اس دنیا میں مجھے تمہارا انکار نہیں، اقرار چاہیے۔“

یہ کہہ کہ پنتھا گرام پر لوک سدھار گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک کہانی ختم ہو گئی، یہاں سے دوسری کہانی شروع ہوتی ہے دوسرا دوار کھلتا ہے اور اب میں وہ روداد سناؤں گا جو مجھ پر گزری، میرا باپ ایک امانت میرے سپرد کر کے رخصت ہو گیا اور میں نے اس کی چٹا کی راکھ اور ہڈیاں

”ڈبیا ایک نظر دکھا دو۔“

مجھے اس کی نیت اچھی نہ لگی، صاف جواب دیدیا۔ ”دکھا بھی نہیں سکتا۔ اب چلے جاؤ۔“
یہ سنتے ہی وہ بڑے جلال میں کھڑا ہوا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہنے لگا۔
”کایا پنتھا۔۔۔! وہ ڈبیا تم مجھے دو گے۔ یہ میں کہتا ہوں۔“

نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا، میں ایک پل کے لئے ہل گیا مگر فوراً سنبھلا مجھے اس کی بات پر غصہ آیا اور کہا۔

”اس کے آگے تمہیں کچھ کہنے اور مجھے کچھ سننے کی ضرورت نہیں، میرے گھر سے نکل جاؤ، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔۔۔ سمجھے۔۔۔!“

مجھے بعد میں پتہ چلا اس کا نام پروہت گنجال تھا، وہ مجھے کروڑوں کی نظروں سے گھورتا ہوا میرے گھر سے تو چلا گیا مگر حکامتی سے نہیں گیا کیونکہ دوسرے دن اس کا چیلہ شکر ایک سندیس لے کر آیا۔

”اگر تمہیں اپنا اور اپنی بیٹی کا جیون پیارا ہے تو ڈبیا سے دست بردار ہو جاؤ اور اسے میرے حوالے کر دو۔“

میں اس دھمکی کو صرف ایک گیدڑ بھلی سمجھا اور اس کے چیلے کو بھی گھر سے نکل جانے اور کبھی ادھر نہ آنے کا حکم دیا۔

دوسرے دن کی بات ہے میں شام کے چھپٹے میں اپنی زمینوں سے لوٹ رہا تھا کہ پروہت گنجال شمشان کے کسی بھوت کی طرح اچانک دریا کے گھاٹ سے نمودار ہوا اور میری طرف بڑھا۔ میری زمینوں کا بڑا رقبہ دریائے چن ون کے ساتھ چلا گیا ہے اور میں انہی کو دیکھنے گیا تھا وہ آتے ہی کہنے لگا۔

”کایا پنتھا۔۔۔! تم نے میری کوئی بات نہیں مانی اور میں یہ بتانے آیا ہوں۔۔۔ اگر آج بھی تم نہیں مانے اور میں نراش لوٹا تو ایک ایسا کھیل شروع ہو جائے گا جس کا انت نہ جانے کہاں ہو۔“
یہ اس کی تیسری دھمکی تھی، میں نے غصے میں پوچھا۔ ”تم ڈبیا کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو، جس پر تمہارا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔“

”ادھیکار تمہارا بھی نہیں کیونکہ وہ بودھ اتہاس کی امانت ہے اور وہ امانت میں تم سے لینے آیا ہوں۔“

اب بات میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی، میں بھڑک کے بولا۔ ”تم ہو کون، دھرم کے ٹھیکیدار، اتیا چاری، لٹیرے؟ پھر جو کچھ تم چاہتے ہو کرو میں منٹ لوں گا۔“

”تم جھگڑا مول لینا چاہتے ہو، میں صرف سمجھا رہا ہوں اور آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ انکار کا

پنتھا گرام کو آن تان کے مندر سے کوئی تاریخی سوغات لے کر آیا تھا جو سارگلیان جیسے مہاراش کی یادگار ہے، جب مجھ سے ملا تو اسی سوغات کو دیکھنے کی فرمائش کی، میں نے کوئی مضائقہ نہ سمجھا اور پوتر ڈبیا اسے دکھائی اور کہا۔

”اس بند ڈبیا کو کھولنے کا حکم نہیں۔“

وہ بڑا حیران ہوا اور اس پر کندہ عبارت دیکھنے لگا۔ میں نے بتایا۔

”یہ پالی زبان میں چار شبد اور بدھ کے چار نام لکھے ہیں۔۔۔ جیون بھید چار انائے۔۔۔“

تھا گت، شاکیہ منی، امی تابھ آتما روپی۔۔۔“

بدری سا کھانے یہ شبد اور نام سنے تو اسی طرح چونکا جس طرح آج تم چونکے اور بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے، وہ کچھ دیر ڈبیا کو دیکھتا رہا پھر اسے آنکھوں سے لگایا، بوسیدہ دیا، پر نام کیا اور چلا گیا۔

اسے گئے صرف تین مہینے ہوئے تھے کہ میرے گھر ایک پراسرار مہمان آچکا، وہ آسامی قبائل کا ایک سادھو اور اپنے آپ کو بھگوان بدھ کا بھگت کہتا تھا، اس نے بھی مجھ سے سارگلیان کی ڈبیا کے بارے میں پوچھا اور مجھے کچھ عجیب سا لگا کہ یہ دوسرا آدمی بھی اسی سوغات سے دلچسپی رکھتا ہے جو میرا باپ کئی برس پہلے کو آن تان سے لایا تھا، آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ کچھ باتیں کرنے کے بعد وہ مطلب پر آگیا اور بولا۔

”میں وہ ڈبیا خریدنا چاہتا ہوں۔ اس کی اصلی قیمت سے دو تین گنا زیادہ دام دوں گا۔“
میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور جواب دیا۔۔۔ ”تاریخی یادگاریں بیچی نہیں جاتیں اور پھر وہ تو میرے باپ کی نشانی ہے۔“

”بیچنا نہیں چاہتے تو دھرم کے نام پر دان کر دو۔“

یہ بات سن کر مجھے اور تعجب ہوا۔ ”دان بھی نہیں کر سکتا۔“

میں اس کے سوال پر اور وہ میرے جواب پر حیران تھا، ہم دونوں ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے رہے کچھ دیر چپ رہ کر وہ اچانک بولا۔

”سادھوؤں پر کرپا کرنے سے بھگوان خوش ہوتا ہے، سادھو بگڑ جائیں تو بھگوان بگڑ جاتا ہے۔“
گویا وہ مجھے اپنی بھگتی، بزرگی اور سادھن کی چٹکار بھی دکھا رہا تھا اور اس آڑ میں دھمکی بھی دے رہا تھا مگر مجھ سے سادھوؤں کے کون سے گن چھپے تھے، میں ان کی کئی پہلو دار باتوں کو جانتا تھا، اس لئے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”شما کر دو سادھو مہاراج! میں وہ ڈبیا کسی کو نہیں دے سکتا۔“

میرا انکار سن کر بھی اس کا اصرار جاری تھا۔

نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔“

”میں اپنا اچھا برا سب سمجھتا ہوں تمہیں سمجھانے کی ضرورت نہیں۔“

ایک لخت اس نے بات کا رخ بدل دیا اور بڑی شوخی اور گستاخی سے بولا۔ ”کایا پنتھا۔“
سارگلیان کی ڈبیا کے ساتھ اب میں تمہاری بیٹی جل پنا میں بھی دلچسپی رکھتا ہوں۔“
میرے غصے کا پارا اور چڑھ گیا۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا اس گستاخی کا کیا جواب دوں کہ اس نے ایک عجیب بات کہہ کر مجھے لرزادیا۔

”جل پنا کی دائیں چھاتی کے نیچے چاند گرہن کا نشان ہے نا؟“

میں دم بخود رہ گیا۔ ”تمہیں کیا معلوم؟“

یہ بات میں نے تمہاری ایک پڑوسن سے آج ہی سنی ہے اور میں اس مندر کا پروہت ہوں جہاں چاند گرہن کے نشان والی لڑکی بھگوان کی نرتکی بنتی اور سدا کنواری رہتی ہے، تو اب جل پنا بھگوان کی نرتکی بنے گی۔“

جی چاہتا تھا اگر میرے پاس بندوق ہو تو اس کا بھیجا اڑا دوں۔ ”پروہت گنجال! کل کا سورج چڑھنے سے پہلے اگر تم حکامتی سے چلے نہ گئے تو کل تمہاری حوالات کا پہلا دن ہوگا۔“
وہ تمسخر کے لہجے میں بولا۔ ”پولیس کی حوالات کا، یا تم نے اپنی کوئی حوالات بنا رکھی ہے؟“
”اس کا جواب تمہیں کل مل جائے گا۔“

میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر وہ شرارت سے باز نہ آیا تو اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا کیونکہ پولیس والوں سے میرے اچھے مراسم تھے جیسے ہر بڑے زمیندار کے ہوتے ہیں مگر اس شام کے بعد پروہت گنجال پھر حکامتی میں نظر نہیں آیا۔ وہ چلا گیا اور اپنی منخوس یاد میرے ذہن میں چھوڑ گیا تھا کیونکہ کبھی کبھی جل پنا کو دیکھ کر یہ خیال مجھے پریشان کرنے لگتا تھا کہ اس کی چھاتی کے نیچے چاند گرہن کا نشان ہے اور گنجال یہ چیتا ونی دے گیا تھا کہ وہ ”بھگوان کی نرتکی“ بنے گی۔

اس واقعے کو چار مہینے بیت گئے اور میں نے گنجال کو ذہن سے اتار پھینکا تھا کہ ایک دن ہمارے محل کے چھیرے بھولا کا خط ملا اس نے لکھا تھا۔

”مچھلی کے شکار کا موسم آگیا۔“

سنگ کا لنگ حکامتی سے دھن کی جانب ہمارے شہر دریائے چن ون کے کنارے آباد ہے۔ وہاں دریا کے کنارے سے ایک جھیل بن گئی تھی جہاں مچھلی کا شکار کھیلا جاتا تھا، بھولا کا جھونپڑا گھاٹ پر تھا، میں شکار کے لئے کبھی کبھار وہاں جاتا اور بھولا کا مہمان بنتا تھا، اس کا خط ملا تو طبیعت شکار کے لئے مچلی اور دوسرے دن ہمارے پہنچ گیا، اسی رات بھولا کے جھونپڑے سے

مجھے پراسرار طریقے سے اغوا کر کے آسام کے سرحدی قبیلے سنھالی میں پہنچا دیا گیا جہاں پروہت گنجال ایک بار پھر میرے سامنے کھڑا تھا، اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا، وہ بولا۔

”کایا پنتھا۔۔۔! میں تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں، اگر سارگلیان کی امانت مجھے دے دو تو رہا کر دیئے جاؤ گے اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ تم اپنی بیٹی کے نام ایک چٹھی لکھو گے جس میں بتاؤ گے وہ ڈبیا کہاں رکھی ہے اور اسے ہدایت کرو گے وہ میرے آدمی کو دے دی جائے، اگر میرا آدمی ڈبیا لے لیا تو تمہاری خلاصی ہو جائے گی مگر اب تمہیں اس کے دام نہیں دیئے جائیں گے کیونکہ تم یہ حق کھو بیٹھے ہو، بس میں نے کہہ دیا، تمہاری رہائی اور واپسی کا یہی ایک راستہ ہے ورنہ یہاں سے دوسرا راستہ کہاں جاتا ہے؟ وہ تم خود دیکھ لو گے۔“

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، اپنے باپ کو دیئے ہوئے آخری وچن کے مطابق میں وہ امانت نہ بیچ سکتا نہ کسی کو دے سکتا تھا، میں نے جواب دیا۔

”ڈبیا تمہیں کسی قیمت پر نہیں مل سکتی خواہ اس کا سودا میری جان کے عوض ہی کیوں نہ کیا جائے۔“

”تم بھی ضدی ہو اور میں بھی اپنی بات کا دھنی ہوں۔ اب دہائی یا اسیری تمہاری اپنی مرضی پر ہے۔“

میں نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔ ”یہ نہ سمجھو کہ تم قانون سے بچ جاؤ گے، بھولا میرے اغوا کی خبر پولیس کو دے دے گا اور وہ تمہیں کھوج لے گی۔“

”میں پولیس کا سوا گت کروں گا مگر بھولا اس تک پہنچ سکے تب نا۔“

وہ مجھے ایسی نظروں سے گھورتا کہ میرا وجود برف کی طرح پگھلتا محسوس ہوتا مگر باپ کی وصیت اور اپنا وچن یاد کر کے خود کو پتھر بنا لیتا، اس نے یہ جاننے کی بڑی کوشش کی کہ وہ ڈبیا کہاں چھپا رکھی ہے مگر میں نے اپنے ہونٹ سی لئے اور اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا، پھر اس نے میرے پاؤں سے جوتی، جیب سے گھڑی، ہاتھ سے انگلی اور جسم سے کپڑے اتروا لئے اور دوسرے کپڑے پہنے کو دیئے۔ میں نہیں جانتا تھا وہ کیا کرنا چاہتا ہے، وہیں سے سنھالی قبیلے کے کچھ لوگ مجھے لے کر اتر کی طرف چل پڑے اور ندیاں پار کرتے، پہاڑوں کے حاشیوں پر چلتے اور کٹھن راستوں سے گزرتے اس پہاڑی خانقاہ میں پہنچے اور مجھے تھاپا بہادر کے حوالے کر کے لوٹ گئے، میں ایک کمرے میں بند کر دیا گیا، ساتویں دن پروہت گنجال بندی گھر کے اس کمرے میں آیا اور اس نے عجیب اور مضحکہ خیز کہانی سنا کر مجھے مہبوت کر دیا، کہنے لگا۔

”کایا پنتھا۔۔۔! سنساں میں آدمی ایک ہی بار جنم لیتا ہے اور ایک ہی بار مرتا ہے مگر تم دوبار

سکھ کی سانس ختم ہو گئی، کیونکہ اب تو اس قبر میں اتارا جائے گا جہاں چپ کے سناٹے، کاٹتی تنہائی اور گھپ اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں، جہاں تیرے شریر کی ہڈیاں گل جائیں گی، چمڑا سوکھ جائے گا مگر تو مرے گا نہیں۔ تو نے مجھے حوالات میں ڈال دینے کی دھمکی دی تھی مگر میں تجھے ایک ایسی حوالات میں اتاروں گا جس کے اندر جانے کا دروازہ تو ہے پر باہر نکلنے کا کوئی دروازہ نہیں، کیونکہ جب مردہ قبر میں اتار دیا جاتا ہے تو اس کے سارے دروازے اور سوراخ بند کر دئے جاتے ہیں تو ایسی ہے وہ حوالات، جہاں تجھے اپنا جیون بھوگنا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے تھاپا بہادر کو طلب کیا اور حکم دیا۔ ”اسے زمین کے پیٹ میں ڈال دو۔“ پھر وہ غصے میں بھرا باہر نکل گیا اور تھاپا بہادر کے قبائلی پہرے دار مجھے اس کمرے سے نکال کر، جس کی آہنی سلاخوں سے تازہ ہوا اور دھوپ اندر آتی تھی ایک تاریک زینہ اترنے لگے جیسے کسی اندھے کنویں میں اتر رہے ہوں اور مجھے لا کر اس کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جس کی دیواروں کے پتھر بھی میرے لیکھوں کی طرح کالے ہیں۔ تب سے میں اس کوٹھڑی میں بند ہوں اور نیلا آکاش اور چمکتا سورج اور دن کی روشنی دیکھنے کو ترس گیا ہوں اور آہستہ آہستہ دھرم اور قدرت اور بھگوان پر سے میرا وشواس ٹوٹا جا رہا ہے، میں نے گنجال کی جس دھمکی کو مذاق سمجھا وہ ایک خوفناک حقیقت تھی اور مجھے جس بھگوان پر بھروسہ تھا وہ پتھروں کی طرح گونگا، بھرا اور اندھا نکلا، وہ نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے، نہ بولتا ہے، سب کچھ وہم ہی وہم ہے، گمان ہی گمان ہے۔

تو یہ ہے میری قید اور اسیری کی کہانی، مگر بات یہیں ختم نہیں ہو گئی، پروہت گنجال نے مجھ سے بدترین انتقام لیا اور جو کچھ کہا تھا پورا کر دکھایا، وہ کبھی کبھی اس کوٹھڑی میں مجھے دیکھنے آتا ہے اور ہر بار ایک نئی خبر سنا کر میری روح گھائل کر دیتا ہے۔

قید کے پہلے برس اس نے یہ خبر دی کہ جل پنا کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں رہا اور وہ بھرے سنسار میں اکیلی رہ گئی ہے، اس لئے اسے حکامتی سے ماند لے کے ایک ناچ آشرم میں پہنچا دیا گیا ہے تاکہ آشرم کی لڑکیوں میں اس کا جی لگا رہے اور وہ ناچ کلا سیکھ لے کیونکہ ایک دن اسے بھگوان کی نرنگی بننا ہے۔

کچھ دن پہلے اس نے اپنے چیلے شکر کو میرے پاس بھیجا اور اس نے بتایا کہ پروہت گنجال اور ساؤ گاری کے وارث سروپ جی جل پنا سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اس کا کارن یہ ہوا کہ جل پنا ایک نوجوان سے پریم کرنے لگی ہے اور اسی دوش میں اسے بندی گھر میں ڈالا جا رہا ہے کیونکہ بھگوان کی نرنگی کسی سے پریم نہیں کر سکتی، اسے سدا کنواری اور چیرہ بند رہنا پڑتا ہے۔ شکر نے یہ بھی کہا۔ ”اگر اب جل پنا تمہیں دیکھ لے تو تم پروشواش نہیں کرے گی کیوں کہ تم اس کے لئے مر چکے اور شمشان کے اندھیروں میں گم ہو چکے شمشانوں کے اندھیروں سے۔ ف بھوت

مرو گے اور میں تمہیں یہ خبر دینے آیا ہوں کہ اپنی بیٹی اور دنیا کے لئے تم مر گئے کیونکہ لوگوں کو دریائے چن ون کے کنارے تمہاری لاش مل گئی تھی، وہ تمہاری نہیں کسی اور کی لاش تھی مگر اس کی جیب سے جو کاغذ نکلے جو چٹھیاں ملیں ان پر کایا پتھا کا پتہ لکھا تھا۔ جل پنا نے تمہاری جوتی، گھڑی، انگٹھی اور کپڑوں سے تمہاری لاش شناخت کر لی اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ تمہارے کسانوں نے پولیس کی آگیا سے تمہاری اڑھی چتا کے حوالے کر دی۔ تمہاری بیٹی نے اسے آگ لگائی اور تم جل کر راکھ ہو گئے۔ تمہارا کریم بھی ہو چکا اور ہڈیاں دریائے چن ون میں بہائی جا چکی ہیں تو یہ ہے تمہارے ایک جیون کا انت جو ہو چکا، مگر اب بھی میری بات مان لو اور سارگلیان کی ڈیپا کا پتہ دید کیونکہ میرے آدمی تمہارے گھر کا کونہ کونہ چھان چکے اور انہیں وہ ڈیپا نہیں ملی، تو میں تمہیں دوسرا جیون دے دوں گا، اب بھی آخری فیصلہ تمہی کو کرنا ہے۔“

میں حیران تو ہوا مگر اس کہانی کو ایک ہولناک مذاق سمجھا کہ ڈیپا ہتھیانے کے لئے نالک کرتا ہے، سوچا اس نے میری جوتی، گھڑی، انگٹھی اور کپڑے اسی لئے اتر والے تھے کہ میرے مرنے کا تماشا کر کے اور میرا من دہلا کر ڈیپا کا پتہ پوچھ لے۔ میں نے اس کی کہانی پر وشواش نہیں کیا مگر اصل میں سب کچھ ویسے ہی ہو چکا تھا، جیسے اس نے بیان کیا اور میری بیٹی اور کسان مجھے رو بیٹھے تھے اور میرے نام کی اڑھی حکامتی کے شمشان میں جلائی جا چکی تھی، پر میں اپنے ہوش و حواس کے ساتھ جیتا جاگتا تھا، جی پروہت گنجال کی باتیں جھوٹ سمجھتا رہا۔

میں نے جان لیا تھا کہ گنجال زبردست طاقت رکھتا ہے آسام کا سنھتالی قبیلہ اور اس پہاڑی بستی کے قبائلی لوگ اس کے اشاروں پر جان دیتے اور اسے بھگوان کا کوئی بڑا بھگت سمجھتے تھے۔ مجھے اس سے خوف بھی آنے لگا تھا مگر نہ تو میں اپنا وچن توڑ سکتا تھا، نہ مرنے والے باپ کی وصیت سے چشم پوشی کی ہمت تھی۔ یہ وشواس بھی تھا کہ اس پوتر ڈیپا کی برکت سے جو میرے باپ کے من کی شانتی کا کارن بنی تھی، میری مشکلیں جلد ختم ہو جائیں گی، اس لئے میں نے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور ایک بار پھر کہا۔

”میرے ساتھ جو انیائے کر سکتے ہو کر کے دیکھ لو مگر جو چیز مانگتے ہو وہ تمہیں نہیں ملے گی، نہیں ملے گی، نہیں ملے گی۔“

میں نے تین بار کہا اور وہ کڑک کے بولا۔

”مورکھ! تو نے اپنے جیون کا ناش کر لیا۔“

اس کی آنکھوں میں نفرت، کرودھ اور قہر کی بجلیاں کوند رہی تھیں اور چہرہ غصے کی آگ میں سرخ ہو گیا تھا، پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ یوں لہرایا جیسے مجھے تلوار سے کاٹ دیا ہو اور کہا۔

”بس آج سے تجھ پر ہوا اور اجالے کے دوار بند ہوئے، دنیا سے تیرا ناتا ٹوٹ گیا، تیرے

نکل کر آیا کرتے ہیں۔“

”علوم نہیں اس نے یہ کیوں کہا پر میں نے سنا اور چپ رہا کیوں کہ اگر میں اور جل پنا مل سکتے تو پچھڑتے ہی کیوں اور گنجال میری موت کا نائک کیوں کھیلتا؟ وہ اس وقت تک جل پنا کو مجھ سے اور مجھے جل پنا سے ملنے نہیں دے گا جب تک میں اس کا کہا پورا نہیں کر دیتا۔

بچھ دن پہلے شکر نے جل پنا کو بندی گھر میں ڈالنے کی خبر سنائی تھی۔ کل رات تم اسے چھڑانے کی کوشش میں یہاں پہنچ گئے اور اس کال کوٹھڑی میں ڈال دیئے گئے جہاں صرف وہی آتا ہے جس سے قسمت، دنیا، بھگوان سب روٹھ گئے ہوں۔ اب اپنے ساتھ تمہارا دکھ بھی میری چھاتی کا بوجھ بن گیا ہے۔ اے کاش۔۔۔! تم میری قبر میں نہ اترتے۔

تو یہ ہے میری کہانی اور یہ ہیں میرے غم۔ پانچ برس سے لگا تار میں اس کوٹھڑی میں، جو قبر کی طرح تاریک ہے کیونکہ زمین کے پیٹ میں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے، تنہائی، چپ اور بیٹی۔ جدائی کا عذاب بھوگ رہا ہوں۔

میرے جیتے جی میری ارٹھی جلائی گئی۔ میرا ہرا بھرا سنسار اجڑ گیا، بیٹی پچھڑ گئی، گھر برباد اور زمینیں تاراج ہو گئیں، میرے ساتھ ایسی سختی اور بے انصافی ہوئی کہ شاید ہی کسی کے ساتھ ہوئی ہو۔ کسی کچھری میں میرا مقدمہ پیش نہیں ہوا، کسی عدالت میں حاضری نہیں ہوئی۔ مجھے پکڑنے والا اور میری پنچایت کرنے والا اور مجھے سزا دینے والا ایک ہی ہے، میں نے سوچا تھا بھگوان میری عدالت کرے گا، اس قید اور ظلم سے چھڑائے گا مگر اس کی عدالت سے بھی میرا نیا و نہیں ہوا۔

میں نے دھرتی سے انصاف مانگا اس نے کہا میرے پاس نہیں ہے۔ آکاش سے فریاد کی، اس نے کان بند کر لئے میں نے اس کوٹھڑی کی دیواروں سے کہا۔۔۔ ”میں بے قصور ہوں۔“ لوہے کی سلاخوں کو بتایا۔ ”میرا کوئی دوش نہیں۔“ فرش کے پتھروں سے سرگوشی کی۔ ”میں نے کوئی پاپ نہیں کیا۔“ چھت کی کڑیوں سے فریاد کی۔ ”میرا کوئی جرم نہیں۔۔۔“ اندھیرے میں چلایا۔ ”میں نردوش ہوں۔۔۔ میں نردوش ہوں۔“

مگر کسی نے مجھے جواب نہیں دیا۔ یہ چھت، یہ فرش، یہ سلاخیں، یہ دیواریں، یہ اندھیرے، سب چپ رہے، دھرتی چپ رہی، آکاش چپ رہا، بھگوان چپ رہا۔

پتہ نہیں آکاش پر کوئی بھگوان ہے بھی یا نہیں۔۔۔ اگر ہوتا تو پانچ برس کے اندر کبھی تو مجھ پر دھیان دیتا، پانچ برسوں کے ایک ہزار آٹھ سو پچیس دنوں اور ایک ہزار آٹھ سو پچیس راتوں میں سے کسی ایک دن، کسی ایک رات تو میری فریاد سنتا، مجھے تسلی دیتا اور کہتا۔

”کایا پنتھا۔۔۔! کیوں گھبراتا اور بے کل ہوتا ہے، میں آپ تیرا نیا نہ کروں گا اور اس پتھر سے دل آدمی کو خود سزاؤں گا، جس نے تجھ پر اتنے ظلم ڈھائے اور تیرا جینا جانوروں سے بدتر کر دیا۔“

مگر ایک ایک کر کے پانچ برس بیت گئے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔

میرا اور گنجال کا جھگڑا اتنا الجھا ہوا اور مشکل نہیں، میں جانتا ہوں ہم دونوں میں کون سچا، کون جھوٹا، کون بے چارہ، کون ہتھیارا ہے۔۔۔ مگر کیا بھگوان کچھ نہیں جانتا، جو سب سے بڑا پانچ، منصف، پالنہ بار اور آدمی کے جیون کا ضامن ہے۔۔۔؟

میں نے کسی کی جان نہیں لی، کسی کو دکھ نہیں دیا، کسی کا حق نہیں چھینا، میں مندروں میں اس کے نام کا چڑھاؤ چڑھاتا، سادھوؤں، بھکشوؤں کو دان دیتا اور بھوکوں کو کھانا کھلاتا تھا پھر اسے ایسی کوئی بھول ہو گئی جس کا بدلہ اتنا کڑا اور بھیانک ہے؟

اگر کوئی بھگوان ہے اور جواب دے سکتا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ میں نے کونسا پاپ جرم کیا تھا جس کی سزا میں وہ مجھے یہ سزا گھسیٹ لایا؟

کیا میرا دوش، میری خطا صرف یہ ہے کہ میں نے اپنے باپ کی وصیت کو پورا نہیں کیا اور سارگلیان کی چھوڑی ہوئی ڈبیا جس کی مالیت چند سو روپے سے زائد نہیں، ایک ایسے آدمی کو دی جس کا اس پر کوئی ادھیکار نہ تھا۔۔۔؟ اور مجھے اس پاؤ بھر سونے کے ٹکڑے سے لینا بھی کیا ہے۔ نہ جانے اس میں کیا ہے، کچھ ہے بھی یا نہیں اور اگر کوئی ”جیون بھید“ ہے جیسا کوآن تان کے مہا پروہت نے پتھرا گرام سے کہا تھا تو کیا میرے اپنے جیون کی کوئی قیمت، کوئی اہمیت نہیں کہ میں اس ڈبیا کی خاطر اس کال کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑتا رہوں۔۔۔؟

بھگوان کے نیاؤ سے نراش ہو کر میں نے کئی بار سوچا کہ وہ منحوس ڈبیا جس کے کارن سکھ شانتی کے بدلے مجھ کو دکھ اور عذاب ملا۔ پروہت گنجال کو سونپ کر اپنی جان چھڑاؤں اور اس گہرے کنویں سے نکلوں، پھر خیال آیا، اگر میں نے ایسا کیا تو مرنے والے باپ کے سامنے بے وفا ٹھہروں گا مگر کون جانتا ہے کہ میں ہی وہ آدمی ہوں جس نے باپ کی وصیت پر اپنا جیون اور اس کے سارے سکھ بھینٹ کر دیئے، اگر ایسا ظلم کسی پر بت پر ٹوٹتا تو اس کا سینہ پھٹ جاتا اور وہ لاوا اگلتا ہوا ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ میں بھی دکھوں سے چور چور ہو چکا اور ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں مگر اپنی بات، اپنے قول سے نہیں پھرا، جو کچھ گنجال سے پہلے دن کہا تھا، وہ آج بھی کہتا ہوں کہ۔۔۔

”جس چیز کی طلب رکھتے ہو وہ تمہیں نہیں مل سکتی۔“

اب وہ اس سے زیادہ ستم مجھ پر کیا ڈھائے گا؟ مجھے تو دکھ، تکلیف کا احساس ہی نہیں رہا۔ میرے نصیب میں اندھیرے ہی اندھیرے ہیں۔ اس گہری قبر میں میری ہڈیاں گل رہی ہیں، چھڑا سوکھ رہا ہے۔ آنکھوں کی جوت کم ہو رہی ہے۔ رہائی کی کوئی آس اور جینے کی کوئی امنگ باقی نہیں رہی، پھر بھی میں نے اپنا قول نہیں ہارا۔ گنجال سے ہار نہیں مانی۔

میں نہیں جانتا کوئی دوسرا سنسار ہے یا نہیں اور میں مرنے کے بعد اس سنسار میں اپنے باپ سے مل سکوں گا یا نہیں، لیکن مرنے والے اگر سن سکتے یا دیکھ سکتے ہیں تو پھر پنتھا گرام بھی سن لے اور دیکھ لے کہ اس کے بیٹے نے ہر ظلم اپنی جان پر جھیلایا ہے، مگر اپنا وچن نہیں توڑا۔ وہ خود برباد ہو گیا لیکن اس کی وصیت پر قائم رہا، چلو میرے ساتھ تو، جو بیتی سو بیتی، پر گنجال اب میری بیٹی کا جیون بھی نشٹ کر رہا ہے اور یہ دکھ میری روح میں شگاٹ ڈال رہا ہے، مجھے اندر سے کاٹ رہا ہے۔“

یہ کہہ کر کایا پنتھا بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا اور اسے روتے دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس کے دکھ بڑے اور صدمے گہرے تھے پھر بھی میں اسے تسلی دینے اور چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔

”اپنے آنسو روک لو کایا پنتھا۔۔۔! رونے سے کچھ نہیں ملتا۔“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آنکھوں کے ساتھ آنسوؤں کا نانا ہے، مجھے رو لینے دو۔ اس لعنتی بندی گھر میں میرے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے، میں یہاں اپنے آپ پر، اپنی قسمت پر، اپنے باپ پر اور کبھی کبھی سارگلیان کی سوغات پر، جو میرے لئے نحوست اور بربادی کا ذریعہ بن گئی من ہی من میں کڑھتا رہا، دکھ سہتا اور ضبط کرتا رہا، کبھی رویا نہیں مگر جب سے تم میرے انجام میں شریک ہوئے ہو میرے ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے ہیں۔“

اور اس کی آنسوؤں سے بھیگی آواز میرے دل میں اترتی چلی گئی، میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

”کایا موسا۔۔۔! اگر دکھ زمین سے پیدا ہوتے تو سکھ بھی اسی دھرتی سے جنم لیتے ہیں۔ مجھے اپنے انجام میں شریک سمجھتے ہو تو یہ بھی سن لو کہ ساتھی مل جائے تو خوشیاں دگنی ہو جاتی اور غم آدھے رہ جاتے ہیں۔ میں تمہارے دکھوں میں نہیں خوشیوں میں شریک رہوں گا اور یہ دشواں دلاتا ہوں کہ تمہارے دکھوں کا موسم بیت گیا، اب سکھ کے دن آنے والے ہیں۔“

”مجھے اب کسی بات پر دشواں نہیں رہا۔“ اس کا لہجہ بھاری تھا۔ ”کبھی میں بھی یہی سپنے دیکھا کرتا تھا کہ کوئی آئے گا اور میں اس کو ٹھٹھی سے رہائی پاؤں گا کوئی نہیں آیا۔“

”آدمی کو اتنا تراش نہیں ہونا چاہیے۔ سانس ہے تو آس ہے۔“

”مگر اس اندھیری قبر میں ہر آس ٹوٹ جاتی، ہر امید چکنا چور ہو جاتی ہے، میری طرح ایک دن تمہیں بھی اس بے رحم کوٹھڑی سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔“

اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ سیاہ لگ رہا تھا کیونکہ باہر سورج کبھی کا غروب ہو چکا اور اس کا ل کوٹھڑی کے اندھیرے بھی کالے ہو گئے تھے۔ وہ سسک سسک کر خود ہی چپ ہو گیا اور میں

محسوس کر رہا تھا کہ میرا شریر پہلے سے زیادہ گرم ہو گیا ہے۔ یہ حرارت بخار کی خبر دے رہی تھی، میں نے کایا کو نہیں بتایا۔ وہ بے چارہ تو پہلے ہی دکھوں کی آگ میں جل رہا تھا مگر اس کی کہانی سن کر جہاں پروہت گنجال کا اصل روپ سامنے آ گیا وہاں ایک نئی الجھن بھی پیدا ہو گئی اور وہ تھی سارگلیان کی چھوڑی ہوئی ڈبیا، آخر اس میں کیا ہے جس کے لئے گنجال نے کایا پنتھا کو جیتے جی قبر میں اتار دیا؟

○○○

(23)

شعبہ

رات کا کھانا پہنچانے کے لئے زینے والی کوٹھڑی کا بھاری چوبی دروازہ کھلا، اس کے ساتھ ہی مشعل کی روشنی لوہے کے جنگلہ سے لپکتی اندر آئی اور سیدھی میری آنکھوں پر پڑی میں اپنی کوٹھڑی میں آہنی جنگلے کی طرف منہ کئے لیٹا تھا، پہرے دار نے آگے بڑھ کے اور سلاخوں سے ہاتھ بڑھا کے رات کا کھانا اندر رکھا اور دن کے کھانے کا برتن اٹھالیا۔

کھانا لانے والا پہرے دار وہی قبائلی تھا جس کا ہاتھ میں نے پکڑ لیا اور گنجال کو سندیس بھیجا تھا، میری موجودہ حالت اسی سندیس کا نتیجہ تھی، اس نے حیرت سے بچے ہوئے کھانے کو دیکھا، کایا نے صرف آدمی روٹی کھائی اور میرے حصے کی روٹی جوں کی توں پڑی تھی سمجھ گیا کہ میں نے کھانے کو چھوا بھی نہیں، مجھ سے بولا۔

جب تک نہاؤ گے نہیں بھوجن بھی نہیں کرو گے؟

میں نے کوئی جواب نہ دیا، چپ چاپ لیٹا رہا، وہ کہنے لگا ”پر وہت جی تو ساؤ گاری لوٹ گئے اگر سردار تھا پا بہادر کو کچھ کہنا ہو تو بول دو۔“

میں نے پھر جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، کایا پنتھا بھی چپ رہا، پہرے دار گندا برتن اٹھایا، دروازہ بند کیا اور چلا گیا کوٹھڑی میں پھر گھور اندھیرا چھا گیا اس اندھیرے میں کایا کی آواز سنائی دی۔

”کیشپ بیٹے! تم نے دن بھر کچھ نہیں کھایا، رات کو یہ لوگ بھات اور پیچ کی کڑی بھیجتے ہیں،، اٹھ کے دو چار نوالے کھا لو۔“

دن بھر فاقہ کیا اور صرف پانی کے چند گھونٹ پیے تھے مگر اب سو جن، زخموں کے کھرند اور اٹھٹھن سے جسم دکھ بھی رہا تھا، تپ بھی رہا تھا اور کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا اس لئے کہہ دیا۔

”تم کھا لو مجھے بھوک نہیں۔“

”کب تک نہیں کھاؤ گے؟“

”میرا من نہیں چاہتا۔“

”اس نرگ میں من مارنا پڑے گا، میں تمہیں سہارا دے کر بٹھاتا ہوں تھوڑا سا بھات کھا لو۔“ میں انکار کرتا رہا مگر اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے تو وہیں ”سن“ ہو کے رہ گیا۔

”ارے تمہیں تو بخار ہے۔ جی تو کچھ کھانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

اس کے لہجے میں ایک نئی پریشانی تھی۔ ”اس بندی گھر میں دوا کہاں سے آئے گی؟“

”تم چننا نہ کرو، میں دوا کے بغیر اچھا ہو جاؤں گا۔“

میرے ہاتھ چھوڑ کے اس نے بھات کی تھالی اور پیچ کا کٹورا پرے کھسکا دیا۔ ”اب تو میرا جی نہیں چاہتا کھانے کو۔“

”کیا دو پہر والی بات بھول گئے؟ کچھ کھاؤ گے نہیں تو میری دیکھ بھال نہیں کر سکو گے۔“

میرے اصرار پر وہ بھوجن کرنے لگا، اس نے بتایا۔ ”چاول بہت موٹے ہیں جیسے گھیوں اہال دیئے گئے ہوں۔ پانچ برس پہلے کئی دن تک انہیں کھانے کو جی نہ چاہا پھر ہولے ہولے یہی موٹے چاول پیٹ میں اترنے لگے۔“

رات کے باعث کوٹھڑی میں اتنا گہرا اندھیرا ہو گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کالے کالے دھبے بھی مشکل سے دیکھ سکتے تھے۔ کایا نے میرے کہنے پر پیٹ بھر کے بھوجن کیا اور برتن جنگلے کی طرف کھسکا دیئے، وہ میری حالت پر اس لئے بھی پریشان تھا کہ میں نیا بندی اور ان حالات سے نہیں گزرا تھا جن سے وہ گزر چکا تھا، پانچ سال کا سہ بہت ہوتا ہے۔ ان پانچ برسوں میں وہ ضرور بیمار پڑا ہو گا اور اسے بھی دوا نہیں ملی ہوگی مگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہاں کچھ نہیں مل سکتا، وہ میری دوا دارو کی سوچ رہا تھا۔

”سویرے تھا پا بہادر سے منت سماجت کروں گا کہ تمہارے لئے کوئی دوا بھجوادے۔ یہ لوگ جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔“

”میرے لئے تھا پا سے کچھ نہ مانگنا، دوا کے بدلے زہر ملے گا۔“

یہ سن کر وہ کانپ گیا۔ ”پھر میں کیا کروں؟“

وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، میں نے کہا۔ ”بھگوان سے پرارٹھنا کرو، وہ مجھے اچھا کر دے۔“

”کس بھگوان کی بات کرتے ہو۔ جو ہتھیاروں اور ظالموں کا ساتھی اور نردوشوں کا

بیری ہے۔“

میں بھول گیا تھا کہ دکھ بھوگتے اور ظلم سہتے سہتے بھگوان پر سے اس کاوش اس ڈمگ گیا اور وہ

بہت کچھ کہہ چکا ہے مگر ضروری تھا کہ اب میں بھی کچھ کہوں۔“

”کایا پنتھا۔۔۔! بھگوان کو دوش کیوں دیتے ہو، وہ تو زنجن (بے عیب) ہے اور آدمی کی

خطا کے مقابلے میں بہت تھوڑی سزا دیتا ہے، کرو دھ میں دھیمہ اور دیا میں تیز ہے، ظالموں کو

ڈھیل دیتا اور ان پر جنت پوری کرتا ہے مگر جب کسی اتیا چاری کو پکڑتا ہے تو اسے بھاگنے کی

مہلت نہیں دیتا۔ اس کے نیاؤ میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ تمہارا، میرا، سب کا نیاؤ کرے گا

اور اسے روکنے والا کوئی نہیں، کیونکہ جہاں آدمی کے اختیار کی حد ختم ہو جاتی ہے، وہاں سے اس کے اختیار کی حد شروع ہوتی ہے، وہ اپادھیوں کے کروتوت دیکھتا اور چپ رہتا ہے، ظالموں کی باتیں سنتا اور بولتا نہیں مگر جب ان کے خلاف اپنے کردہ اور جلال میں آکر کڑکتا ہے تو پھر دھرتی کا حمل گر جاتا ہے۔“

کایا پنتھا نے چیخ ماری اور اپنے بستر پر ڈھے گیا، میرے اور اس کے درمیان بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور کچھ دیر کوٹھڑی میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی رہی جس میں صرف سانس چلتی تھیں، دل دھڑکتے تھے، ذہن سوچتے تھے، شاید کایا بھی کچھ سوچ رہا تھا مگر میرے بخار کی آنچ تیز ہو رہی تھی اور حلق میں کانٹے سے چھپنے لگے تھے، آخر خاموشی کو میں نے ہی توڑا۔

”کایا موسا۔۔۔ دو گھنٹ پانی پلا دو۔“

وہ جلدی سے اٹھا، مجھے سہارا دے کر بٹھایا اور گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا، میں نے صرف دو گھنٹ بھرے اور لیٹ گیا مگر اتنی سی حرکت سے دکھتے شریر میں ٹیسیں اٹھیں تو یوں لگا جگہ جگہ بچھوٹنے ڈنگ مار دیا ہے، میں سسکار کے رہ گیا، وہ پاس ہی بیٹھ گیا۔

”تمہارا بخار تیز ہو رہا ہے۔“ وہ فکر مند تھا۔

”نیند آگئی تو ہلکا ہو جائے گا تم بھی سو جاؤ۔“

وہ اپنے بستر پر جالیٹا پھر اس کی آواز نہیں آئی اور میں ان حالات پر غور کرنے لگا جو مجھے اس کال کوٹھڑی تک لے آئے تھے، آج اس قبر میں دوسری رات تھی اور میں حیران تھا کہ نہ جانے ان دنوں میرے ذہن کو کیا ہو گیا ہے، نہ تو میرے اندر کا آدمی بولا تھا نہ شاسترو نے ذہنی رابطہ قائم کر کے پوچھا حالانکہ وہ جانتا تھا میرا سفر خطرناک ہے اور اس سفر میں کوئی بھیا نک واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔

شاسترو ہی اس اندھیرے میں آس کا جگنو تھا، صرف وہی میرے سفر اور منزل کے بارے میں جانتا تھا اور مجھے تسلی تھی وہ سروپ جی کو لے کر پہاڑی خانقاہ تک پہنچ جائے گا، اب خیال آیا اگر سب کچھ ویسے ہی ہو گیا جیسے میں سوچ رہا ہوں اور سروپ جی سچ میری تلاش میں خانقاہ تک آ بھی گئے تو کیا ضروری ہے وہ اس زیر زمین کوٹھڑی تک بھی پہنچ سکیں؟ گنجال جیسا چالاک آدمی انہیں جل پنا سے ملو ادے گا جو خانقاہ کے کسی کمرے میں ”ناچ بھگتی کا چلہ“ کاٹ رہی ہو گی مگر یہ کہہ کر انہیں نراش کر دے گا کہ تھارو کیشپ تو خانقاہ تک پہنچا ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے گونگے مدایا کو ختم کر دیا یا میری طرح کسی دوسرے کنویں میں ڈال دیا ہو جس کا حال تھا پاپا بہادر اور اس کے چند پیروں سے دار ہی جانتے ہوں۔ وہ سب میری آمد سے انکار کر دیں گے، سروپ جی کو پتہ ہی نہ چل سکے گا کہ میں اسی خانقاہ کے ایک گہرے تہہ خانے میں قید ہوں اور

اوپر ہی کے چند کمرے دیکھ کر لوٹ جائیں گے، ضرور گنجال یہی چال کھیلے گا، اس نے کہا تھا کہ سال دو سال میں کبھی کبھی آکر دیکھتا رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کو میری کوٹھڑی تک پہنچنے نہیں دے گا اور کایا پنتھا کی طرح میں بھی اسی مقبرے میں دفن رہوں گا۔

یہ سوچ کر میرے جسم کا رواں رواں کانپ اٹھا اور میں اس خوفناک صورت حال کو سمجھا جس سے دو چار تھا۔ کایا ٹھیک کہتا تھا کہ میں نے اپنی مصیبت کو سمجھا ہی نہیں اور رہائی کے جھوٹے سپنے دیکھتا ہوں، اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دے رہا ہوں، اب جو غور کیا تو پتہ چلا کہ باہر کی دنیا سے میرا ناتا ٹوٹ چکا ہے اور میں پوری طرح گنجال کی گرفت میں ہوں۔ معاملے کی صورت پر توجہ دی اور دھیان سے سوچا تو ہر راستہ مسدود اور ہر دروازہ بند پایا۔ میں سچ مچ موت کی دہلیز پر پہنچ چکا تھا اور میرے چاروں طرف اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ اس بھیا نک ادراک سے میرا دماغ سنسنانے اور شریر تھرانے لگا۔

یہ سب کچھ میری پریشانی کا نتیجہ یا بخار کا ہڈیاں نہ تھا بلکہ وہ لرزہ غیر حقیقت تھی جسے میں نے پہلی بار سمجھا پورے شعور کے ساتھ اور بخار کی آگ میں پھنکنے کے باوجود میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک سرد لہر سرسرا رہی چلی گئی۔

میرے ارد گرد پتھر کی اوچی، مضبوط دیواروں کا حصار تھا اور میں خود 38-40 فٹ گہرے کنویں کی ایک کوٹھڑی میں قید تھا۔ ایک ناقابل بیان وحشت اور ہڈیوں میں اترتی ہوئی دہشت نے مجھے گھیر لیا، خوف و ہراس کی اس حالت میں ایک مایوس کن جھنجھلاہٹ بھی ذہن کو جھٹکے دے رہی تھی کہ شاسترو کیوں نہیں بولتا؟

میں اپنے جیون میں کبھی اتنا نراش، اتنا دکھی، اتنا خوف زدہ نہ ہوا تھا کیونکہ اس اندھے کنویں اور اونچے حصار سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا، کیا یہی کوٹھڑی میری اس کوشش کا صلہ تھا جو میں نے جل پنا کو گنجال کی قید سے چھڑانے کے لئے کی؟ کیا میں بھی کایا پنتھا کی طرح انہی اندھیروں میں سسک سسک کر جیوں گا اور ایک دن اسی قبر میں موت سے جالموں گا؟ اس خیال ہی سے دل ڈوبنے لگا اور مایوسی میرے حواس منتشر کرنے لگی۔ اچانک اس مصیبت میں مجھے صوفی عبد الجبار کی یاد آئی اور ان کے الفاظ میرے ذہن کے ڈر بے میں کبوتروں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔

”مشکل حالات میں ”یا خئی یا قیوم“ کا ورد کر لیا کرو کیونکہ خدا کی ذات ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والی اور مشکلات میں پکارنے والے کی دست گیری کرتی ہے۔“

مجھ پر اس سے کڑی مشکل اور کیا آ سکتی تھی۔ اپنی حالت پر سوچتا تو رقت طاری ہو جاتی کہ دنیا سے ناتا ٹوٹ گیا اب تو بھگوان ہی میری سنے تو سنے اسی بے چینی میں بے اختیار زبان پر

طرف بڑھتا ہے۔ میرا شریر چونکہ بخار کی آنچ میں پھنک رہا ہے، اس لئے میں اس لکڑی ابر کی ٹھنڈی چھاؤں محسوس کرتا اور جب وہ میرے قریب پہنچ جاتا ہے تو یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہوں کہ وہ کالی گھٹا کا کوئی ٹکڑا نہیں بلکہ لہراتے، بل کھاتے، بکھرے بالوں کا ایک سیاہ جال ہے جو ہولے سے مجھے ڈھانپ لیتا ہے اور اس سیاہ جال کی چلمن ہٹا کر دیکھتا ہوں تو منجوری مجھ پر اپنے گھنے ریشمی بالوں کا سایہ کئے بیٹھی ہے، میں حیران ہوں کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گئی۔ منجوری میرے دل کی بات سمجھ لیتی ہے اور کہتی ہے۔

”سوامی! جب تم رنگامتی سے چلے میں سمجھ گئی تھی کہ میرے باپو کے بیری سے لڑنے جا رہے ہو جس نے روپ تارا کو مار دیا تھا اور اب کسی اور کی جان لینا چاہتا ہے، مجھے تمہاری بڑی چننا تھی کیونکہ تم سوچتے زیادہ اور عمل کم کرتے ہو جبھی اس بندی گھر میں آ پھنسے اور یہاں زخموں سے چور چور پڑے ہو میں تمہارے لئے دوا لے کر آئی ہوں۔“

یہ کہہ اس نے کوئی سفید سفوف نکالا اور میرے زخموں اور چوٹوں پر ملنے لگی جس سے ان کی چیخیں اور انٹھن جاتی رہی پھر بولی۔

”تم کیسے مرد ہو ان دیواروں کو توڑ کر نکل نہیں سکتے؟“

میں اپنی مجبوری بیان کرتا ہوں۔ ”میرے پاس کوئی بسولا، کوئی کدال نہیں کہ دیواروں کو توڑ

سکوں، کوئی کمند نہیں کہ نیچے اتر سکوں۔“

”تمہیں یہ چیزیں مل جائیں گی۔“

”پھر میں سیندھ لگا کے باہر آ جاؤں گا۔“

”مگر سیندھ لگاؤ گے کہاں؟“

”دیوار میں۔“

”دیوار توڑو گے تو چھت تمہارے اوپر آ گرے گی۔“

”پھر سیندھ کہاں لگاؤں؟“

”آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑ کے چلی تو میں حیران تھا کہ بخوبی چل پھر سکتا ہوں، مجھے ساتھ لے کر ایک تنگ سے حجرے میں داخل ہوئی اور کیا دیکھتا ہوں یہ تنگ سا حجرہ تو ہماری کال کوٹھڑی کا بیت الخلاء ہے، وہ اس کے سوراخ کی طرف جس سے بول و براز کہیں نیچے گرتا تھا، اشارہ کر کے بولی۔

”یہاں سیندھ لگاؤ اور کال کوٹھڑی سے نکل جاؤ۔“

ہم حجرے سے نکلے تو پھر اونچی دیواروں کے اسی حصار میں تھے، منجوری نے لمبے، گھنے بال لہرائے اور کہا۔

”یا حی یا قیوم“ کے شہد آ گئے۔ میں بار بار انہیں دہرانے لگا اور مسلمانوں کی طرح کبھی کبھی ان الفاظ میں پرارتھنا بھی کرتا۔

”اے قادر مطلق خدا! میری مدد کر کیونکہ تو بے سہاروں کا سہارا ہے۔“

مگر زبان پر ”یا حی یا قیوم“ ہی کا وظیفہ تھا۔ نجانے کب تک گزر گزرتا اور اس کا نام جپتا رہا۔ ہولے ہولے میرے بے کل من کو چین سا آنے لگا پھر ایک نامعلوم سی آواز جو شاید پتھر کی دیواروں سے ناگہاں پھوٹ پڑی یا کہیں چھت سے نکلی تھی، مجھے سنائی دی اور یہ تھی وہ آواز۔

”کیا خدا اپنے بند کے لئے کافی نہیں؟“

یہ آواز سن کر میں ڈر گیا اور آپ سے آپ پکارا اٹھا۔

”کیوں نہیں مالک! تو میرے لئے بہت ہے۔“

”پھر تمہارا کیا ہے؟“

اور اس آواز کے ساتھ ہی میری ساری گھبراہٹ، بے چینی، بے کلی یک لخت جاتی رہی اور من کو ایک عجیب سی تسکین ملی میں نہیں جانتا وہ آواز کہاں سے آئی مگر میں نے سنی ضرور اور سوچنے لگا، اگلے وقتوں میں رشیوں، منیوں، صوفیوں اور پیغمبروں کو اسی طرح گیان ہوتا ہوگا۔

میرا بدن تاتا تیز ہو گیا کہ جسم جلا جاتا تھا، زخم ترخ رہے تھے اور درد کے مارے کروٹ بدانا

دور بھر ہو گیا تھا مگر دل مطمئن تھا اور ذہن پر ایک عجیب سا کبر چھا رہا تھا یوں لگا کہ اس کبرے

میں کہیں آ جا رہا ہوں اور ایسے تھا وہ کبرا جیسے زمین کی چھاتی سے دھند نکلتی یا ابلتے پانی سے

بھاپ اڑتی ہے اور اس کے سفید سفید آنچلوں میں لپٹا میں اوپر اٹھ رہا تھا جیسے کوئی گہرے کنویں

کی اٹھاہ سے ہولے ہولے بلند ہوتا اور اوپر آتا ہے پھر اوپر ہی اوپر میں اڑتا چلا گیا۔ بڑی

طویل تھی وہ پرواز اور میں انجانے فاصلوں سے گزر رہا تھا مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس پرواز

کے دوران مجھے اپنے بخار کی حدت اور شریر کی تپش کا احساس تھا، میں کبھی کبھی درد سے کراہ بھی

اٹھتا کیونکہ جسم میں درد کی لہر بھی ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی، بخار کی آگ سے میرا حلق سوکھنے اور

جلنے لگتا۔ نہ جانے یہ کبر کی چادر مجھے اپنے آنچلوں میں لپیٹ کر کہاں لئے جا رہی تھی پھر یک

لخت میں بلندی سے نیچے اترنے لگا اور کبر کا بادل میرے زخمی شریر کو اونچی اور مہیب دیواروں

کے ایک حصار میں اتار کے غائب ہو گیا۔

میں سوچتا ہوں اس حصار تک پہنچنے میں مجھے پورا ایک دن لگ گیا ہے اور حیران ہوتا ہوں،

شاید یہ بھی کوئی بندی گھر ہے مگر اس کی اونچی اونچی فلک بوس دیواروں پر کوئی چھت نہیں اور

اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ گھنے گھور بادل کا ایک ٹکڑا جو بالکل اکیلا ہے یعنی اس کے آگے پیچھے کوئی

دوسرا بادل نہیں بگولے کی مانند گھومتا، بل کھاتا نیچے جھپٹتا اور اونچی دیواروں کے حصار میں میری

یہاں اندھیرا، اجالا ایک ساتھ۔ آنکھ کھلنے کا مطلب تھا سویرا مگر کایا نے بتایا۔
”رات کا آخری پہر ہے۔“

”ارے۔۔۔ ابھی رات بھی نہیں بتی اور میں سمجھ رہا تھا بہت سولیا۔“
”ہاں سو تو بہت لئے۔۔۔ پوری دو راتیں اور ایک دن سوئے رہے اور اب جاگے ہو۔“
”دو راتیں، ایک دن سو یا رہا؟“

میں سمجھا شاید کایا پتہ انداز کر رہا ہے مگر وہ بتانے لگا

”میری کل کی رات جاگتے کئی کیونکہ تیز بخار سے تم پر غشی طاری تھی، کل کا سارا دن بھی بے چینی میں گزرا۔ اس بے ہوشی کی حالت میں جسے نیند کہتے ہو تم کبھی کبھی پانی مانگتے تھے کیونکہ بخار کی آگ سے تمہارا شریر پھنک رہا اور حلق بار بار سوکھتا تھا۔ میں بار بار تمہارے منہ میں پانی کے چند قطرے ڈال دیتا کیونکہ میں نے اپنے حصے کا پانی بھی تمہارے لئے بچا لیا تھا اور بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگتا کہ وہ مجھے شفا کرے اور تمہیں اچھا کر دے۔ کل دو پہر کو جب پہرے دار بھوجن لے کر آیا تم بخار سے بے ہوش پڑے تھے اور سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی، وہ بھی دیکھتا ہی رہ گیا، میں نے سوچا اسے کہہ کے تھا پابہادر سے کوئی دوا منگواؤں جس سے بے ہوشی دور ہو مگر تم نے منع کر دیا تھا پھر پہرے دار رات کا کھانا لے کر آیا اور پوچھنے لگا۔

”نئے بندی کو سزات آئی کہ نہیں؟“

”نہیں۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کل سے بے سدھ پڑا ہے، تھپا کو بول دینا۔“
وہ پھر چلا گیا اور میں تمہاری دیکھ بھال میں لگ گیا مگر آج رات ذرا اپنی کمر سیدھی کرنے لیٹ گیا کہ تم چیخ مار کے ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھے۔“

اپنی بے ہوشی اور بیماری کا یہ حال سن کر میری حیرانی کی حد نہ رہی، میں تو سمجھا تھا کہ سویرا ہا اور نہ جانے کہاں کہاں اڑتا رہا مگر میری نیند اصل میں غشی اور طویل پرواز ایک طویل بے ہوشی تھی، بخار کی تیز آنچ سے اٹھنے والے جسمانی بخارات نے سفید کمرے کی شکل اختیار کر لی جو میرے ذہن کو اڑائے پھرتے رہے مگر وہ سپنا کتنا عجیب تھا۔ منجوری گھٹا کے ہیولے کی طرح لہراتی اور زلفوں کے گولے کی مانند گھومتی، چکراتی آئی اور میرے زخمی جسم پر دوا مل کے چلی گئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے گردن کے گھاؤ پھر سر کے گوڑ پر ہاتھ پھیرا جن میں شدید اینٹھن اور چھین تھی مگر اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسرے زخموں کو ہاتھ لگا کے دیکھا تو سب معجزانہ طور پر ٹھیک ہو چکے تھے اور اس انکشاف نے مجھ پر ایک نئی سنسنی طاری کر دیکھ سپنے میں منجوری نے جو سفوف میرے جسم پر مل دیا تھا اس سے بھلا چنگا ہو گیا اور اب آرام سے بیٹھا ہوں، نہ گھاؤ رہے نہ درد۔

”جسے لینے آئے ہو اسے چھوڑ کہ نہ جانا۔“

میں اس کے عجیب فقرے پر سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بال لہراتی ایک طرف لپکی جیسے دھویں کا ایک مرغولہ لہراتا یا کالی بدلی کا ٹکڑا اڑتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ”سیاہ گولے میں تبدیل ہو کر اسی طرح غائب ہو گئی جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی، میں کچھ دیر کھڑا اوپر دیکھتا رہا پھر ایک طرف چلنے لگا ابھی تھوڑی دور چلا تھا کہ اندھیرے میں ایک کھٹکا سن کر چونک گیا اور مجھ پر ایک خوف سا طاری ہونے لگا میں اونچے حصار کی گہری تاریکی میں ہڈیوں کے کڑکڑانے کی آواز سن رہا تھا، جیسے کئی مردے چل رہے ہوں، دہشت اور خوف سے میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے کہ ناگہاں کہیں روشنی کا جھماکا ہوا، جیسے بجلی چمک جاتی ہے، اس کا وقفہ پلک جھپکنے سے زیادہ نہ تھا مگر اس ذرا سی اڑتی اور گرم ہوتی ساعت میں، میں نے چا چا چکارو رنی کا بھوت دیکھا جو ایک ہاتھ میں بسولا پکڑے، دوسرے ہاتھ میں کدال اٹھائے اور کندھے پر ایک بھاری کمند لٹکائے عجیب دیوانگی اور وحشت کے ساتھ ہماری کال کوٹھڑی کے بیت الخلاء میں داخل ہو رہا تھا گویا کسی کا خون کرنے جا رہا ہو۔ حیرت انگیز اور ہیبت ناک منظر دیکھ کر بے اختیار میری چیخ نکل گئی اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جو روشنی کا ذرا سا جھماکا ہونے کے بعد کچھ اور گہرا ہو گیا تھا، کسی نے فوراً ہی مجھے چپکے سے کندھوں سے پکڑ لیا۔

یہ سمجھ کر شاید چا چا کا بھوت ہی مجھے چمٹ رہا ہے، میں گھبرا کے ایک دم اچھلا اور چلایا
”چھوڑ دو مجھے۔“

اس گہرے اندھیرے میں آواز آئی۔ ”کیا ہوا کیشپ بیٹے! تم ڈر کیوں گئے؟“ اور یہ آواز چا چا چکارو رنی کی نہیں بلکہ کایا پتہ تھا کی تھی۔

میں نے سر کو ایک دو بار جھٹکا، آنکھیں جھپکیں پھر دیکھا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا اور یہ اندھیرا ہماری کال کوٹھڑی کا تھا جس میں کایا پتہ تھا کا سایہ قریب ہی بیٹھا دکھائی دیا یعنی میں سپنے میں ڈر کر نیند سے جاگا اور ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھا تھا۔

تو کتنی راتوں کے بعد آج میں نے پھر سپنا دیکھا تھا۔

کایا پتہ ابھی تک حیرت کا بت سا بنا مجھے کندھوں سے پکڑے بیٹھا تھا اور میرا شریر ہلکا ہلکا لگ رہا تھا کیونکہ میں گہری نیند سو یا تھا اور سپنے گہری نیند ہی میں آتے ہیں جب روح جسم سے الگ ہو کر عجیب عجیب منظر دیکھتی ہے، صوفی عبد الجبار نے خوابوں کا یہی فلسفہ بیان کیا تھا۔

”بھگوان کا شکر ہے تمہارا بخار اتر گیا۔“ کایا اب میرے ہاتھ دیکھ رہا تھا، مجھے نہ بخار اترنے کا ہوش تھا نہ اپنے زخموں کا دھیان، ذہن ابھی تک حیرت انگیز سپنے میں الجھا تھا۔

”کیا سویرا ہو گیا؟“

کوئی ہم درد اور سہمی ہی لایا ہوگا۔“

”اس خانقاہ اور بستی میں ہمارا کوئی ہمدرد نہیں۔“

”ہے ایک۔۔۔“ اچانک مجھے بات سوچھی۔ ”تھا پابہادر کی بیٹی بانگی مجھے جانتی ہے۔“

بانگی کے ساتھ ہی خیال آیا پرسوں سویرے جب وہ بے کواڑ کے اس گھر وندے میں آئی ہو گی جہاں اس نے مجھے اور گونگے مدایا کو چھپایا تھا اپنا کمبل دیکھ کر سمجھی ہوگی کہ ہم منہ اندھیرے ہی کہیں نکل گئے ہیں اور شاید کچھ اداس بھی ہوئی ہو، میں نے اسی کا سہارا لیا تھا مگر کایا نے میری بات پر جرح کی۔

”وہ اس کوٹھڑی میں کیسے آئی؟ تالے کی کنجی تو پہرے دار کے پاس رہتی ہے۔“

”بانگی نے کنجی اس سے لے لی ہوگی۔“

”پھر بھی اس کا آنا میری سمجھ میں نہیں آتا، میں رات کو بے خبر نہیں سوتا کوئی چوہا بھی داخل ہو تو میری آنکھ کھل جاتی ہے۔“

”چھوڑو کایا موسا۔۔۔! تم کس بات کے پیچھے پڑ گئے۔ یہ چیزیں اس لئے پہنچائی گئی ہیں

کہ ہم سیندھ لگا کر یہاں سے نکل جائیں۔“

وہ بری طرح چونکا۔ ”سیندھ لگائیں گے کہاں؟“

”یہاں۔۔۔“ میں نے غلاظت گرنے والے سوراخ کی طرح اشارہ کیا۔ ”ہم اس سوراخ

کو اتنا چوڑا اور بڑا کر لیں گے کہ نیچے اتر سکیں۔۔۔ یہ دیکھو کمند بڑی مضبوط ہے۔“

اور جب میں اسے کمند کھارہا تھا وہ ٹارچ کی روشنی میں میرے چہرے، گردن اور جسم کے

دوسرے اعضا کو جہاں گھاؤ، کھرند، گوڑ اور چوٹوں کے نشان تھے، چشم حیرت سے دیکھ رہا تھا

کیونکہ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا، اس اچنبھے پر وہ بدحواس نظر آنے لگا، اس نے اپنی پھٹی پھٹی

میلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”کیشپ! یہ کمند، کدال اور بسولا تو بانگی چھوڑ گئی ہوگی، جیسا تم کہتے ہو مگر تمہارے

گھاؤ کیا ہوئے؟“

”مار پیٹ کے نشان تھے، مٹ گئے۔“

”کل تک ان سے خون رستا تھا، جگہ جگہ سوجن تھی، ہاتھ لگانے یا بلنے سے تم کراہ اٹھتے تھے،

ایسے گھاؤ کبھی ایک رات میں اچھے ہوتے نہیں دیکھے۔“

”ابھی تمہیں اور بھی بہت کچھ دیکھنا ہے کایا موسا۔۔۔!“

اس کی حیرت بدستور قائم تھی۔ ”مگر کچھ مجھے بھی بتاؤ۔“

”کیا بتاؤں؟“

یہ ایک ناقابل یقین بات ہوئی تھی۔

اس سنسنی خیز انکشاف کے ساتھ میرے گھاؤ، تپ، غشی، درد سب کچھ جاتا رہا، مجھے اپنے سنے کا آخری حصہ یاد آیا جس میں چکرورتی چاچا کے بھوت کو دیکھ کر میں ڈر گیا اور چیخ مار کے اٹھ بیٹھا تھا۔۔۔ تو یہ خواب، رویا، کشف نہ جانے کیا تھا۔ اچانک ایک نیا خیال آیا اور کایا پنتھا سے کہا۔

”ذرا ٹٹی میں جا کے دیکھو وہاں کوئی بسولا، کوئی کدال، کوئی کمند ہے کہ نہیں؟“

وہ حیران سا مجھے دیکھنے لگا۔ ”کہیں بخار کی گرمی سے دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا؟ بھلا

بسولا، کدال اور کمند کون لائے گا یہاں؟“

”تم جا کے دیکھو تو سہی۔“ میں نے اصرار کیا۔

اگر وہ مجھے پاگل نہیں سمجھ رہا تھا تو میں بھی اس وہم میں ضرور مبتلا تھا کہ میرے دماغ میں بیماری کی وجہ سے کوئی خلل آ گیا مگر میرے اصرار پر مجبوراً ہاتھوں کے بل بیت الخلاء کے پست کواڑ میں گھس گیا اور چند منٹ کے بعد لوٹ کے آیا تو خود پاگل ہو رہا تھا اور اس کی زبان غوطے کھا رہی تھی۔

”کیشپ! وہاں۔۔۔ ایک بسولا بھی ہے۔۔۔ ایک کدال بھی۔۔۔ ایک رسہ بھی۔“

میں اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ ”تو اب ہمیں ٹارچ کی ضرورت ہے، چلو پتھر کی وہ سل اکھاڑیں

جس کے نیچے میں نے اپنی چیزیں چھپائی تھیں۔“

ہم دونوں آگے پیچھے بیت الخلاء کے ڈرے میں گھس گئے پھر سل اکھاڑ نے میں دیر نہیں

لگائی اور جب ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو میں بھی نقش حیرت بن گیا، بیت الخلاء کے ایک کونے

میں بسولا، کدال، کمند تینوں چیزیں پڑی تھیں اور مزید حیرت اس بات پر ہوئی کہ کمند وہی تھی

جو مدایا بھکشو ساتھ لے کر آیا تھا اور جس کے ذریعے کھائی عبور کر کے ہم خانقاہ میں اترے تھے۔

کایا پنتھا کو جیسے سکتہ ہو گیا، ٹٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا پھر ایک دم گھبرا کے بولا۔

”یہ چیزیں کہاں سے آگئیں؟“

میں نے اسے نہیں بتایا کہ رات وصال رائے کی بیٹی منجوری میرے سنے میں آئی اور کچھ

باتیں کر کے چلی گئی تو چکرورتی چاچا کا بھوت یہ چیزیں اٹھائے یہاں داخل ہوا تھا اور اسی کو

دیکھ کر میری چیخ نکلی اور آنکھ کھلی تھی۔ کشف و کرامت والی بات ابھی میری اپنی سمجھ میں نہیں آ

رہی تھی، پھر کایا کی سمجھ میں کہاں سے آتی، اس لئے چپ رہا مگر وہ صورت سوال کھڑا تھا۔

”بولو نا کون لایا یہ چیزیں اور تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہاں پڑی ہیں؟“

”میں نے“ کیسے“ کا جواب تو نظر انداز کر دیا اور ”کون“ کے بارے میں کہا۔۔۔۔۔ ”ہمارا

خانقاہ تک آئے ہوں اور گنجال انہیں اوپر کے کمرے دکھا کر واپس لے گیا ہو مگر کھانا لانے والے پہرے دار نے کسی کے آنے جانے کا ذکر نہیں کیا۔

دن کو پٹیاں باندھے لیٹا رہتا اور جب پہرے دار بھوجن لے کر آتا اور بیرونی کوٹھڑی کا دروازہ کھولتا کایا میری خبر گیری میں لگ جاتا، کبھی کبھی اس کے سامنے میری حالت پر آنسو بھی بہا دیتا، بیماری کے اس نالک کا مقصد یہی تھا کہ وہ ہماری طرف سے مطمئن رہے یہ نالک کئی دن چلتا رہا، ہم دو پہر کا بھوجن کرنے کے بعد شام کے سات ساڑھے سات بجے تک سو لیتے اور آدھی رات کو سرنگ کھودنے لگ جاتے، کام کی رفتار بھی کچھ بڑھا دی تھی مگر جوں جوں سرنگ گہری ہو رہی تھی اسے کھودنے میں مشکل پیش آتی گئی کیونکہ سوراخ میں ایک آدمی گھس کر کھدائی کر سکتا تھا، پھر بھی نوے رات نالی کے قوس نما خم تک کھدائی ہو گئی اور ٹارچ کی روشنی میں وہ خم دو فٹ مزید گہرا تھا دو فٹ کے نیچے گہری کھائی کا خلا تھا۔ وہاں سے کھائی کی گہرائی کا اندازہ تیس چالیس فٹ سے زیادہ نہ تھا ہم کند کے ذریعے اس کی تہہ میں اتر سکتے تھے اور پورب کی طرف چونکہ کھائی کی گہرائی بتدریج کم ہوتی چلی گئی تھی اس لئے کسی مقام سے باہر بھی نکل سکتے تھے۔

اب ہمارے فرار میں صرف دو فٹ کا فاصلہ حائل تھا، یہ کام آنے والی رات پر چھوڑ دیا گیا اور ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ کوٹھڑی میں آکر لیٹ گئے، دو پہر کو پہرے دار معمول کے مطابق کھانا لے کر آیا تو اس کی باتوں میں درد کی جھلک دکھائی دی، مجھ سے کہنے لگا۔

”بڑا کشت بھوگا ہے تم نے بابو! بھلے آدمی لگتے ہو۔ پروہت جی کا کہنا مان کیوں نہیں لیتے؟“

”مگر پروہت جی تو چلے گئے۔“

”چلے گئے تو کیا ہوا، تم سردار تھا پا کو بول دو وہ سندیس بھیج کر انہیں بلا لے گا۔“

میں چپ ہو گیا، کیا یہ کوئی نئی چال ہے؟

”کیا سوچنے لگے؟“ اس نے پوچھا۔

کایا کا دھیان کسی اور طرف تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”سوچتا ہوں کہ پروہت گنجال کا کہا

مان لینا چاہیے مگر میرا ساٹھی مان جائے تب ہے نا۔“

”اسے سمجھاؤ، آپ بھی سوچ لو۔“

پہرے دار خالی برتن لے کر لوٹ گیا۔ میں جانتا تھا وہ آپ سے آپ نہیں بولا، اس سے یہ بات کہلوانی گئی ہے کہ ہمیں گنجال کا کہا مان لینا چاہیے۔ زبان اسی کی تھی، الفاظ کسی اور کے تھے، اگر یہ کوئی نئی چال تھی تو بھی میں نے نیم رضا مندی کا اظہار کر کے اس میں دلچسپی پیدا کر دی تھی، اب پہرے دار تھا پا کو جا کر بتائے گا کہ اگر کایا پنتھا نہیں تو میں ضرور اپنی ”نہ“ کو ”ہاں“ میں بدلنے کی سوچ رہا ہوں۔ ادھر میرا مقصد یہ تھا کہ انہیں اس دلچسپی میں الجھائے رکھوں تاکہ

آجائے اور بڑی بے چینی کے ساتھ وقت کا انتظار کرنے لگے، سیندھ لگانے کے لئے آدھی رات کا سسے طے پایا تھا۔

○

ٹھیک آدھی رات کو جب میری ویسٹرن کی گھڑی بارہ بج رہی تھی اور ہمارے اندازے کے مطابق خانقاہ کی دیکھ بھال کرنے والے محافظ بندی گھر کے دروازوں پر بھاری تالے ڈال کر سو گئے تھے، ہم چو پاؤں کی طرح آگے پیچھے بیت الخلاء میں داخل ہوئے اور سیندھ لگانے کی ابتداء کی۔

کایا نے بسوا سنجالا، میں نے کدال اٹھائی اور اس سوراخ کے پتھر اکھاڑنے لگے جس سے بول و بزار نیچے گرتا تھا، نالی سے بدبودار ہوا آتی تھی مگر اب بویا گندگی کی پروا کس کو تھی، ہم ریت، چونا اور پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ سوراخ سے نیچے گراتے رہے تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ یہ کام بڑا مشکل اور تھکا دینے والا تھا مگر ہماری رہائی بلکہ زندگی کا انحصار بھی اسی پر تھا۔ صبح کے چار بجے ہم نے کام بند کر دیا اور چار گھنٹوں کی محنت مشقت کے بعد سوراخ کافی چوڑا اور دو فٹ کے قریب گہرا کر لیا۔

اندازے کے مطابق وہ نالی کوئی بیس بائیس فٹ گہری تھی، پہلے دن کا کام دیکھ کر سیندھ کو اس کے آخری کنارے تک کھودنے کے لئے نو دس دن اور درکار تھے مگر خطرہ یہ تھا کہ کھائی میں گرنے اور جمع ہونے والا ملبہ دیکھ لیا گیا تو ہمارا بھید کھل جائے گا اس صورت میں تھا پا بہادر کے بدترین تشدد کا بھی ڈر تھا پھر بھی زندگی کے لئے موت سے کھیلنا ہی پڑتا ہے۔

کام ختم کر کے ہم کوٹھڑی میں آئے تو سردی کے باوجود بدن پسینے سے بھیگے ہوئے اور دل دھڑک رہے تھے مگر آس کی جوت روشن ہو چکی تھی اور کایا کو یہ سوچ پریشان کرنے لگی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو اس نرگ میں چھوڑ کر فرار کیسے ہو سکے گا، میں نے اسے سمجھایا۔

”ہم ایک بار یہاں سے نکل گئے تو جل پنا کو بھی رہا کرالیں گے۔“

”کیسے رہا کرالیں گے؟“

”کیا گنجال کا حساب نہیں چکاؤ گے؟“

میری اس بات نے اس کے من میں فرار اور انتقام کے الاؤ دہکا دیے۔ اب وہ ایک بدلا ہوا آدمی نظر آتا تھا اور کوٹھڑی کے اندھیرے میں بھی اس کی آنکھیں سندربن کے ٹائیگر کی طرح چمکنے لگتی تھیں۔

دو دن اور گزر گئے اور دو دنوں میں سوراخ پانچ فٹ اور گہرا کر لیا مگر اس عرصے میں شاسترو اور سروپ جی کے آنے کی خبر نہیں ملی۔ ہم نے پوچھا بھی نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ میری تلاش میں

وہ ہماری طرف سے کچھ غافل ہو جائیں اور ہمیں فرار کا موقع مل جائے۔
شام تک ہم مزے سے سوتے رہے، پہرے دار رات کا بھوجن لے کر آیا تو پوچھنے لگا۔
”کچھ سوچ لیا تم نے؟“

”میں نے تو سوچ لیا مگر میرا ساتھی نہیں مانتا۔“

اب پتہ چلا مجھے کایا پنتھا کے ساتھ بند کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ میں تشدد اور قید کی سختیوں سے تنگ آ کر اسے گنجال کی بات مان لینے کی ترغیب دے سکوں یہ کایا سے سارگلیان کی امانت حاصل کرنے کی آخری ترکیب تھی، میں نے پہرے دار سے سرگوشی کی۔
”کایا پنتھا بھی اس کوٹھڑی سے تنگ آ چکا ہے، میں ایک دو راتوں میں اسے منالوں گا۔۔۔“

مگر ایک بات کا ڈر ہے۔“

”کس بات سے ڈرتے ہو؟“

”ہم نے گنجال کا کہا پورا کر دیا تو بھی شاید ہمیں رہانہ کیا جائے۔“

وہ چونکا۔۔۔ میں نے کہا۔ ”اگر تھاپا بہادر رہائی کی ضمانت دے دے تو میرا ساتھی مان جائے گا ہم صرف تھاپا پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔“

پہرے دار سر بلاتا لوٹ گیا۔ میں نے تھاپا کے اعتماد کا جال بچھا کر انہیں کچھ اور غافل کر دیا تھا۔ رات کا بھوجن کر کے ہم صلاح مشورہ کرتے رہے، صرف دو فٹ کی کھدائی کے بعد ہمارے فرار کا راستہ کھلا تھا اور پروگرام کے مطابق ہمیں رات کے تین بجے تک سرنگ مکمل کر کے کھائی میں اتر جانا تھا، مقررہ وقت پر ہم بیت الخلاء میں گھس گئے اور کام شروع کر دیا، مگر چار بجے تک بڑی مشکل سے ایک فٹ کھدائی ہو سکی کیونکہ کھائی کے کنارے کا پتھر جو بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا، بڑی مضبوطی اور سختی سے قائم تھا، وہ ساڑھے چار بجے تک بھی نہیں ٹوٹا اور ہم فرار نہ ہو سکے، تھوڑی دیر میں سویرا ہونے والا تھا، ہم نے کام بند کیا اور تھکے ہارے کال کوٹھڑی میں لوٹ آئے۔

آخری مرحلے پر کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہ تھا، ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانے کی ضرورت تھی، ہم یہی سمجھے قدرت ایک دن اور ہمیں اس کوٹھڑی کا مہمان بنائے رکھنا چاہتی ہے مگر یہ ایک دن کا ثنا مشکل ہو گیا۔ دھیان اسی بات پر لگا تھا کہ کب رات آئے اور کب ہم سرنگ کا آخری پتھر کاٹ کر اس جہنم سے نکلیں، دو پہر کا کھانا آیا تو پہرے دار یہ سرگوشی کر کے چلا گیا۔

”میں نے سردار تھاپا کو ضمانت کے لئے بول دیا ہے۔“

ہمیں تھاپا کی ضمانت کی بجائے یہاں سے بھاگ نکلنے کی فکر تھی، زمین کے پیٹ میں اتری ہوئی اس گہری اور تاریک قبر میں یہ ہمارا آخری دن تھا۔ دو پہر کا بھوجن کر کے لیٹے تو نیند نہ آ سکی، ایک عجیب سی بے چینی اور بے کلی تھی، کچھ سوچتے، کچھ جاگتے دن کاٹنے کی کوشش کی مگر

سے گزرتا ہی نہیں تھا، ہر پل صدیوں پر بھاری ہو رہا تھا۔ کھڑی کی رفتار بھی جیسے سست ہو گئی تھی، اسی اضطراب میں کوٹھڑی کا اندھیرا کچھ اور گہرا اور کالا ہو گیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ باہر سورج ڈوب گیا ہے۔ اب رات کے بھوجن کا انتظار تھا جو آٹھ بجے ملتا تھا اور اس کے بعد ہمیں یہ کال کوٹھڑی چھوڑنے کی تیاری کرنا تھی مگر ابھی سات ہی بجے تھے کہ اچانک بیرونی کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے کا کھٹکا ہوا اور ہم بری طرح چونک گئے کیونکہ یہ بات بالکل خلاف معمول ہونی تھی۔ دروازہ کھلا اور مشعل کی روشنی میں پہرے دار کے ساتھ تھاپا بہادر خود نمودار ہوا مگر اس کے پیچھے ایک اور ہستی بھی تھی۔۔۔ وہ ہستی جو مجھے اور کایا پنتھا کو اس سنسار میں سب سے زیادہ عزیز تھی بھگوان کی زنتی جل پنا تھی وہ۔۔۔ بے حد اداس، پریشان، غمگین جو زینہ اتر کے کوٹھڑی میں یوں داخل ہوئی تھی جیسے کوئی لاش قبر میں اترتی ہے۔

مشعل کی روشنی میں اس نے مجھے، میں نے اسے دیکھا اور ہم دونوں پل بھر کے لئے سکتے میں آ گئے۔ کایا پنتھا نے بھی بیٹی کو پہچان لیا اور اپنی جنگلے کی سلاخیں پکڑے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اسے دیکھنے لگے جیسے اسے بیٹی کے وجود پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب جل پنا نے مجھ سے نظریں ہٹا کر باپ کو دیکھا، اس کی صورت دیکھی جو پانچ برس کی اس بھیا نک قید کی سختیاں جھیل جھیل کر بگڑ گئی تھی، اس کے غلیظ جسم پر وہ کوٹ دیکھا جسے کبھی میرے بدن پر دیکھ چکی تھی اور یہ سب دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ گئی، ناگہاں تھاپا بہادر کہنے لگا۔

”جل پنا۔۔۔! یہ تمہارا باپ۔۔۔ یہ ہے کایا پنتھا جو مرا نہیں مگر زندہ ہی قبر میں دفن ہے۔ اسے اچھی طرح دیکھ لو، پہچان لو اور اگر اپنی آنکھوں پر شک ہے تو تھارو کیشپ سے پوچھ لو یہ تمہیں بتائے گا کہ یہی حکامتی کا وہ زمیندار ہے جو پروہت سے جھگڑا مول لے کر اس حال کو پہنچا۔“
شاید جل پنا نے باپ کو پہچان لیا تھا، اس کے ہونٹ کپکپائے۔ ”پتا جی۔۔۔!“ اس کے ساتھ ہی کایا پنتھا کی جگر خراش چیخ بلند ہوئی۔

”بیٹی۔۔۔!“

”یوں لگا جیسے کسی نے لوہے کی گرم، تپتی، دھکتی سلاخ سے اس کا جسم داغ دیا ہو اور وہ درد سے بلبل کر چیخ اٹھا، اور ایسی لرزہ خیز، ایسی جگر گداز تھی وہ چیخ جو اس زیر زمین کوٹھڑی کے پتھروں کا کلیجا بھی چیر گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے پوری خانقاہ اس کی دبشت سے کانپ اٹھی ہو کیونکہ وہ درد بھری چیخ اس کنویں کی گہرائی سے نکلتی اور بوسیدہ زینے کی سیڑھیاں پھلانگتی اوپر چڑھتی محسوس ہوئی۔“

جل پنا نے باپ کی یہ دیوانگی دیکھی۔ معاملے کی سنگین صورت سمجھی اور شدت غم سے غش کھا کر دھڑام سے فرش پر گری، کایا پنتھا پھر چیخا۔ میرے دل پر قیامت بیت گئی۔ تھاپا نے پہرے

(24)

دیوتاؤں کی باتیں

تھاپا بہادر جل پنا کو لے کر جس طرح اچانک ہماری کوٹھڑی میں آدھمکا اور جس غیر متوقع انداز میں ناگہاں باپ بیٹی کی ملاقات کرائی گئی، اس کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور تھا، اس نے ہم تینوں کو آنا فانا یوں آنے سامنے کر دیا تھا کہ کوئی بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔

جل پنا باپ کی بگڑی صورت، خراب خستہ حالت اور تباہ حال زندگی دیکھ کر مارے صدمے کے غش کھا کے گری۔

کایا پنتھا کے ہوش و حواس پر دھمکی بجلی بن کر ٹوٹی کہ پروہت گنجال کی بات پوری نہ کی گئی یا صاف لفظوں میں اس نے سارگلیان کی نشانی کا پتہ نہ بتایا تو بیٹی اس کی آنکھوں کے سامنے ختم کر دی جائے گی۔ پانچ برس کی اذیت ناک جدائی کے بعد وہ جل پنا کو سامنے دیکھ کر یہ دھمکی برداشت نہ کر سکا اور آہنی جنگلے پر جھولتا ہوا کوٹھڑی کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

میری اپنی حالت یہ تھی جیسے زمین پاؤں سے نکل گئی ہو، جل پنا کی غیر متوقع آمد اور تھاپا بہادر کی دھمکی سے میں بھی کچھ بدحواس ہو گیا تھا معاملے نے ایک ایسی رخ اختیار کر لیا تھا جس نے ہمارے فرار کا نقشہ ہی بدل کے رکھ دیا، جل پنا کو اس حالت میں چھوڑ کر جب موت نے اس کے سر پر اپنا بے رحم سایہ ڈال دیا تھا کایا پنتھا تو کیا میں بھی فرار کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، اب ہمارے سامنے یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر ہم قید سے بھاگ نکلے تو کہیں ہمارے فرار کی سزا بھی غریب جل پنا کو نہ دی جائے۔

کایا پنتھا اندر کی کوٹھڑی میں ڈھیر تھا، جل پنا باہر کی کوٹھڑی میں بے ہوش پڑی تھی۔ خود میں کچھ کہنے سننے اور تھاپا کے سوال کا جواب دینے کے قابل نہ رہ گیا تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ تو مجھے کہنا ہی تھا اور میں نے کہا۔

”سردار تھاپا! میں نے سندیس بھیج دیا تھا کہ کایا کو منالوں گا اور صرف تمہاری ضمانت پر ہم گنجال کی ضد پوری کر دیں گے پھر تم اس لڑکی کو لے کر یہاں کیوں آئے؟“

”یہ سب کچھ پروہت گنجال کی آگیا سے کیا گیا ہے۔“ تھاپا بتانے لگا۔ ”ان کا سندیس آیا تھا، نرنکی کو بتا دیا جائے کہ کایا پنتھا زندہ ہے، اگر وہ اس نہ کرے تو تہہ خانے میں دونوں کی ملاقات کرا دی جائے، اس آگیا کے مطابق جب میں نے جل پنا کو یہ خبر سنائی کہ تمہارے باپ

دار کو اشارہ کیا وہ مشعل دیوار کے ساتھ لٹکا کر سیڑھیوں پر بھاگتا چلا گیا اور تھاپا بہادر کہنے لگا۔

”کایا پنتھا.....! تم اس لڑکی کے باپ ہو اور تھارو کیشپ! تم اس کے پریمی ہو۔ میں اسے یہاں اس لئے لایا ہوں کہ یہ دیکھ لے اس کا باپ زندہ ہے۔ پریمی بے بس ہے، تم بھی دونوں اس کی صورت آخری بار دیکھ لو کیوں کہ اگر پروہت گنجال کی بات سے انکار کیا گیا تو تمہارے سامنے اس لڑکی کا جیون چھین لیا جائے گا۔“

اور ایسے خوفناک تھے یہ الفاظ جن کی دہشت سے کایا پنتھا لڑکھڑا کر کوٹھڑی میں گرا اور میرے ذہن پر بجلیاں سی کوندتی چلی گئیں کیونکہ فیصلے کی گھڑی بہت قریب آگئی اور سرنگ قریب ہونے کے باوجود ہم سے دور ہو گئی تھی۔

○○○

اس تاریخی ڈبیا کا پتہ پوچھنا چاہتا تھا، جسے کایا کا باپ کو آن تان کے بودھ مندر سے لایا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا اور میں فوراً کایا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میرے زخم تو اچھے ہو چکے تھے مگر ان پر ابھی تک خون سے رنگی سرخ میلی پٹیاں بندھی تھیں۔ ان پٹیوں کی وجہ سے میں کسی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتا تھا ورنہ یہ شک پیدا ہوتا کہ گھائل یا بیمار ہونے کا ڈھونگ رچا رہا ہوں، جبکہ میں چاہتا تھا تھا پا اور اس کے آدمی اسی بھول میں رہیں کہ میرے گھاؤ ابھی اچھے نہیں ہوئے اور میں آسانی سے حرکت نہیں کر سکتا، پھر بھی کایا کی بے ہوشی نے مجھے فکر مند کر دیا تھا، میں نے تھوڑی سی جستی ضرور دکھائی اور اس کا سراپنی گود میں رکھ کر ہتھیلیاں ملنے لگا۔ اس کی نبض مدھم ضرور تھی مگر چل رہی تھی اسے جھنجھوڑنے لگا۔

”کایا پتھا! ہوش میں آؤ۔“

اسی لمحے تہہ خانے کی چکر دار سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ابھری پہرے دار ایک قبائلی لڑکی کو ساتھ لے کر کوٹھڑی میں داخل ہوا، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ تھا پا بہادر کی بیٹی بانکی تھی، اس نے مجھے دیکھا نہیں اگر دیکھا تو توجہ نہ دے سکی کیونکہ بانکی کی نظر سب سے پہلے جل پنا پر پڑی جو زینے کے پاس ہی بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے آتے ہی تھا پا بولا۔

”بانکی ذرا زنگی کو ہوش میں لا۔ یہ اپنی سدھ کھو چکی ہے۔“

سردار تھا پا نے اپنی بیٹی کو صرف اس لئے بلایا تھا کہ وہ جل پنا کو سنبھال سکے اور یہ دوسرا ثبوت تھا اس بات کا کہ اس کا جیون تھا پا کی دھمکی سے زیادہ ضروری تھا۔ بانکی نے ایک نظر باپ کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ ”یہ تہہ خانے میں کیوں لائی گئی، بے ہوش کیسے ہو گئی؟“ مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں پوچھا اور جل پنا کے پاس بیٹھ گئی پھر بڑی مہارت سے اس کی دائیں پنڈلی پکڑی۔ پیتل کا کڑا جس میں چنے کے دانوں کی سی چھوٹی چھوٹی گھنگریاں پروئی تھیں۔ اوپر چڑھا کر ٹخنے کی کوئی رگ دبائے لگی۔ اس کی انگلیاں ٹخنے اور پنڈلی کے درمیان حرکت کرتی رہیں، اس کے ساتھ ہی جل پنا کے وجود میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی، وہ ٹخنہ چھوڑ کر کن پٹیاں سہلانے لگی۔ چند ہی ساعتوں میں جل پنا نے آنکھیں کھول دیں اور حیرت زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

بانکی کا عمل مختصر لیکن بڑا نتیجہ خیز تھا، اس کی دیکھا دیکھی میں بھی کایا کی کن پٹیاں سہلانے اور تھپتھپانے لگا مگر وہ جوں کا توں پڑا رہا تو اس کی سماعت بیدار کرنے لگا۔

”کایا پتھا۔۔۔! ہوش میں آ جاؤ، دیکھو جل پنا تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔“

کایا پتھا پر تو کچھ اثر نہ ہوا البتہ میری آواز سن کر بانکی چونکی اور اپنی سلاخوں کے اندر پہلی بار

کا ابھی دیبانت نہیں ہوا اور وہ اسی خانقاہ کی ایک کوٹھڑی میں قید ہے تو اس نے میری بات پر دوشواس نہیں کیا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ پانچ برس پہلے چن ون ندی کے کنارے جس آدمی کی لوتھلی وہ کایا پتھا نہیں تھا، صرف اسے کایا کا لباس پہنا دیا گیا تھا اور صورت اس لئے بگاڑ دی گئی تھی کہ پہچان نہ ہو سکے اور اسے حکامتی کا زمیندار کایا پتھا ہی سمجھ کر جلا دیا جائے۔۔۔ یہ بات سن کر بھی جل پنا نہیں مانی اور یہی سمجھتی رہی کہ میں اس کے ساتھ کوئی چھل کھیل رہا ہوں، تب میں اسے یہاں لے آیا کہ باپ کے ساتھ اپنے پریمی کو بھی دیکھ لے۔

تھا پا کے آخری فقرے میں طنز کا زہر گھلا ہوا تھا مگر میں اس بات پر حیران تھا کہ آخر پروہت گنجال نے باپ بیٹی کی ملاقات کا یہ طریقہ کیوں اختیار کیا۔ اس وقت وہ دونوں اچانک ملاقات اور صدمے کی شدت سے بے ہوش پڑے تھے اور ایسی صورتحال کبھی کبھی جان لیوا بھی ثابت ہوتی ہے اچانک مجھے ایک بات سوچ گئی اور میں تھا پا سے بولا۔

”تم نے یہ بھی سوچا ہے اس حالت میں اگر کوئی مر گیا، لڑکی یا اس کا باپ؟“ پروہت گنجال تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا؟“

”جب یہ پروہت جی کا حکم ہے تو مجھے کس بات کی چنتا؟“

”تھا پا بہادر! تمہیں چنتا ہونی چاہیے کیونکہ باپ بیٹی پروہت گنجال کے لئے سنہرے پنچھی ہیں اگر کوئی پنچھی پنجرے میں مر گیا تو اسے سارگلیان کی نشانی کبھی نہ مل سکے گی پھر وہ تمہیں دوشی ٹھہرائے گا اور اس کا سارا غصہ تم پر ٹوٹے گا۔“

میں نے دیکھا تھا پا کے چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا، اب مجھے بات بڑھانے کا موقع مل گیا۔

”اگر تم گنجال کو اب تک نہیں سمجھے تو مجھ سے سنو، وہ کسی کو شما کرنا جانتا ہی نہیں تمہیں بھی معاف نہیں کرے گا، ان دونوں کا جیون اس کے لئے بڑا قیمتی ہے۔“

وہ کچھ پریشان اور بدحواس نظر آنے لگا اور گھبرا کے بولا۔ ”جل پنا کی چنتا نہ کرو، تم کایا پتھا کو ہوش میں لاؤ۔“

اور اسی لمحے میرے اندر کا آدمی بول پڑا۔ ”تھا رو کیشپ! تم نے دکھتی رگ پکڑ لی۔ یہ لوگ کایا پتھا اور اس کی بیٹی کو اس سے تک ہلاک نہیں کر سکتے جب تک سارگلیان کی امانت ہاتھ نہ آ جائے۔“

تھا پا کی بدحواسی ظاہر کر رہی تھی کہ باپ بیٹی کا وجود کتنا اہم اور ضروری ہے۔۔۔ تو معلوم ہوا سردار تھا پا کی یہ دھمکی کہ اگر آج اور اسی سے گنجال کا کہا پورا نہ کیا گیا تو جل پنا کو ہماری آنکھوں کے سامنے ختم کر دیا جائے گا محض ایک دکھاوا، ایک ڈراوا تھا۔ وہ ہمیں خوفزدہ کر کے سونے کی

”ٹھیک کہتی ہوں اس کا کوئی دوش نہیں۔“ بانکی نے ذرا جرات دکھائی اور بتی کرنے لگی۔
 ”پردیسی کو چھوڑ دو باپو۔“

تھاپا بہادر نے بیٹی کو قہر آلود نظروں سے گھورا اور کڑک کے بولا۔ ”بانکی۔۔۔! تجھے رنگی کا انت بھول گیا کیا؟“

یہ سنتے ہی بانکی پہاڑی ہرنی کی طرح قلاںچ بھر کے زینے پر ہولی اور ناگوار سے لہجے میں ذراتن کے بولی، ”میں رنگی نہیں ہوں باپو! یہ بھی یاد رکھنا۔“

سردار تھاپا پل دوپل سکتے میں آگیا اور اس اثناء میں بانکی دھڑ دھڑ سیڑھیاں بھلا گئی اوپر چلی گئی چند ساعتیں اس کے پیروں کی آہٹ سنائی دیتی رہی پھر خاموشی چھا گئی اور اس خاموشی میں تھاپا نے ناگہاں اپنی بندوق کی نال میرے سینے پر تان دی۔

”تھارو کیشپ! تمہارا کیا سمبندھ ہے بانکی سے۔۔۔ کب ملے تھے تم دونوں؟“
 بانکی اپنے باپ کے من میں کئی شکوک پیدا کر کے جا چکی اور اب مجھی کو اپنی صفائی پیش کرنا تھی۔ جل پنا، کایا پتھا، پھرے دار سب اس عجیب و غریب صورت حال پر حیران تھے اور کایا کو اس بات کا ثبوت مل گیا تھا کہ تھاپا بہادر کی لڑکی مجھے جانتی ہے، تاہم ہماری جان پہچان کا بھید جس حال میں کھلا وہ کوئی اچھا نہ تھا اور تھاپا کی بندوق مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ بانکی سے میرا کیا سمبندھ ہے، میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”سردار تھاپا! تمہیں خود سوچنا چاہیے بھلا اس بے چاری سے میرا کیا سمبندھ ہو سکتا ہے، تم ایک اچھے جیلر ضرور ہو مگر ایک باپ ہر گز نہیں ورنہ تمہارے دل میں اولاد کے لئے نفرت نہیں پیار ہوتا اور تم اپنی بیٹی کی بات شانتی سے سنتے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔“

”جواب ہی چاہتے ہو تو سنو، جس دن بستی میں آیا وہ چراگاہ میں بھیڑیں چرا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کمان اٹھائی اور چلہ کھینچ دیا۔ میں نے ہاتھ اٹھائے اور بتایا۔“ پردیسی ہوں نام تھارو کیشپ ہے۔“ وہ کچھ شانت ہوئی اور کہنے لگی۔ ”میں بستی کے سردار تھاپا بہادر کی بیٹی بانکی ہوں۔ اگر تم راستہ بھول کے ادھر آ گئے ہو تو بھی چلے جاؤ۔“ اور میں آگے بڑھ گیا، بس یہ ہے اصل بات، اس دن کے بعد میں نے بانکی کو، بانکی نے مجھے آج دیکھا ہے۔“

”میں بانکی سے پوچھ لوں گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو تمہاری کھال کھینچ لی جائے گی۔“

”بے کار باتوں میں الجھنے سے کیا فائدہ تم اچھی طرح جانتے ہو جس لڑکی کے لئے یہاں آیا ہوں، وہ میرے سامنے کھڑی ہے اور تم خود اسے میرے پاس لے کر آئے ہو۔ اس کا بد نصیب باپ بھی تمہارا بندہ ہے پھر معاملے کی بات کیوں نہیں کرتے۔“

دیکھتی ہوئی حیرت سے بولی۔

”کوئی اور بھی بے سدھ ہے کیا؟“

”ہاں۔۔ ایک بندی اپنے ہوش کھو بیٹھا ہے۔“ تھاپا نے جواب دیا۔

بانکی نے جل پنا کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔ اب وہ اداس نظروں سے مجھے اور اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی، معاملے کی صورت اس کی سمجھ میں آ گئی تھی، اچانک بانکی اسے چھوڑ کر جنگل کے پاس آ گئی اور مجھ سے کہنے لگی۔

”اے۔۔۔ اس کے ٹخنے کی رگ پر انگلی مارو۔“

اس نے مجھے دیکھا اور پہچان نہ سکی، بارہ تیرہ دن میں میری داڑھی کے بال بڑھ آئے تھے، سر، گردن اور ہاتھوں پر خون آلود پٹیاں بندھی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی میں اس بھیانک بندی گھر میں اسیر ہو سکتا ہوں مگر جب میں کایا کے دائیں ٹخنے کی رگیں دبا رہا تھا وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی، اس کی نظر بار بار میرے نیلے اور کوٹ پر ٹک جاتی۔

میں اسی کوٹ میں اسے ملا تھا، اس کے بتائے ہوئے نسخے پر عمل کرنے کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ کایا کا بدن ہلاتو میں اس کی کن پٹیاں سہلانے اور ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگا جلد ہی وہ ہوش میں آ گیا، ٹھیک اسی لمحے میری اور بانکی کی نظریں ملیں اور مجھے یوں لگا جیسے وہ حیرت سے غش کھا کے گر پڑے گی، اس نے مجھے پہچان لیا اور بھونچکا سی رہ گئی، پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔

”پردیسی تھارو۔۔۔! تم۔۔۔ یہاں۔۔۔“

”ہاں بانکی!“ میں اٹھ کر جنگل کے پاس آ گیا۔ ”تیرے باپ کا بندی ہوں۔“
 میں نے تھاپا بہادر پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھا کہ اس کی بیٹی کو نام سے جانتا ہوں، میرا جواب سنتے ہی بانکی بجلی ایسی تیزی سے اس کی طرف پلٹی اور پوچھنے لگی۔

”باپو! تم نے پردیسی کو کیوں بندی بنا لیا؟“

معاملہ تھاپا بہادر کی سمجھ میں نہ آ سکا، حیران و ششدر سا دیدے پھاڑے بانکی کو دیکھتا اور حیرت کے بھنور میں غوطے کھاتا رہا اچانک اس نے سر اٹھایا اور گرج کے بولا۔

”تو اسے کب سے جانتی ہے، کیسے جانتی ہے؟“

”میں۔۔۔ میں تو کچھ نہیں جانتی۔“ بانکی گھبرا گئی۔

”کچھ نہیں جانتی تو تجھے اس کا اور اسے تیرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”نام۔۔۔ نام۔۔۔“ اس نے بڑی مشکل سے تھوک حلق سے اتارا۔ ”ہاں اس کا نام

پردیسی تھارو ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ زدوش ہے۔“

”کیا بکتی ہے۔“

وہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ بندوق کی نال بھی جھکا دی اور مجھے گھور کے دیکھنے لگا۔ ”معا ملے کی بات میں نے بول دی ہے، اگر پروہت جی کا کہا پورا نہ کیا گیا تو آج نرتکی کے جیون کی آخری رات ہوگی اور اس کے بعد تم دونوں۔۔۔“

غالباً وہ سمجھتا تھا، ڈرا دھمکا کر کایا کی زبان کھلوا لے گا اور میں پہلے ہی بتا چکا ہوں، اس کی دھمکی میں کوئی وزن نہ تھا۔ اس نے دوبارہ وہی بات کی تو میں نے اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔

”ذرا شانت ہو جاؤ سردار تھاپا! اتنا کرودھ اچھا نہیں۔ میں نے تمہیں کہلوا بھیجا تھا کہ تمہاری خاطر اور صرف تمہاری ضمانت پر میں کایا پنتھا کو منالوں گا پھر مجھ پر وشواس کیوں نہیں کرتے؟“

اس نے کایا کی طرف ہاتھ لہرایا۔ ”اس سے کہونا جو کچھ بتانا ہے بتا دے۔“

”پانچ برس کے بعد کھلنے والی زبان کو پانچ منٹ کی مہلت تو ملنی چاہئے۔“

وہ خفگی سے بولا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہی میں تین چار دن سے کایا پنتھا کو سمجھا رہا ہوں کہ پروہت گنجال کی بات مان لو، کایا کچھ سمجھا ہے کچھ نہیں سمجھا مگر تم میری ایک بات مان لو تو میں کل اس کی زبان کھلوا دینے کا ذمہ لیتا ہوں۔“

کایا پنتھا، جل پنا اور سردار تھاپا نے چونک کر میری طرف دیکھا، پہرے دار بھی حیران تھا، تھاپا نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”کوئی بات مان لو؟“

میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ”صرف آج رات نرتکی کو ہماری کوٹھڑی میں رہنے کی آگیا دے دو۔“

”وہ کس لئے؟“ تھاپا کا چہرہ سوالیہ بن گیا۔

”کایا پنتھا چتا میں نہیں جلا، بیٹی کی جدائی میں جلتا رہا ہے اور آج بھی جل رہا ہے، باپ بیٹی ملیں گے اور اپنے دکھ بانٹیں گے تو ان کے دل پیچ جائیں گے اور میں انہیں مجبور کر دوں گا کہ جو چیز مانگی جا رہی ہے دے دی جائے۔ مجھے وشواس ہے اگر آج رات جل پنا کوٹھڑی میں رہے تو کل کایا کی زبان کھل جائے گی۔“

تھاپا کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔ یوں لگتا تھا وہ دو حصوں میں بٹ گیا ہے، میری بات کی اہمیت بھی سمجھتا ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے ہچکچا بھی رہا ہے، شاید ڈرتا تھا کہ میں ایک ہی رات میں جل پنا کو کوئی الٹی پیٹی نہ پڑھا دوں، اس کا یہ وہم دور کرنا ضروری تھا۔

”تھاپا بہادر! تم پانچ برس تک من مانی کرتے رہے ہو اور کایا کی زبان نہ کھلوا سکے۔ میں پانچ برس کی نہیں صرف ایک رات کی بات کرتا ہوں جس کا نتیجہ تم صبح دیکھ لو گے اگر کل تک کایا نہ مانا تب بھی ہم اور حالات پوری طرح تمہارے قابو میں ہیں تم جو چاہو کر سکتے ہو مگر جو مشورہ میں دے

رہا ہوں اس پر اگر عمل کرو تو پروہت گنجال کے جیون کی سب سے بڑی آشا پوری ہو جائے گی۔“

ایک لخت وہ پیچھے ہٹا اور سرگوشیوں کا سلسلہ ختم کر کے اونچی آواز میں بولا۔ ”پروہت جی کا حکم ہے سارگلیان کی ڈبیا کا پتہ آج ہی ملنا چاہیے نہیں تو نرتکی ختم۔۔۔“

زندگی ایک عورت کے روپ میں میرے سامنے کھڑی تھی، میں نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔ ”تم نرتکی کو ختم نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے گا اور تمہیں کچھ نہ مل سکے گا، میری بات مان لو گے تو کل کا سورج تمہارے جیون کا سب سے اہم سندیس لے کر طلوع ہوگا۔ ایسا سندیس جو پروہت گنجال کو حیران کر دے گا۔“

میری اس بات نے اس کا سارا تذبذب دور کر دیا۔ ”بہت اچھا تھا روکیشپ! تمہارے کہنے پر میں نرتکی کو آج رات یہاں چھوڑ جاتا ہوں مگر کل کے بعد کوئی مہلت نہیں ملے گی۔“

چوسر کی گوٹ میرے حق میں پڑی تھی، میں نے ایک اور چال چلی۔ ”سردار تھاپا۔۔۔! تمہیں بھی قول دینا ہوگا کہ ڈبیا کا پتہ مل جانے بلکہ ڈبیا حاصل کر لینے کے بعد تم ہم تینوں کی رکھشا اور رہائی کے ضامن بنو گے کیونکہ سب کچھ تمہارے بھروسے پر ہوگا۔“

وہ ایک دوپل چپ رہنے کے بعد بولا۔ ”میں تمہاری رہائی اور رکھشا کا ذمہ لیتا ہوں۔“

”پھر یہ جنگل کھول دو جل پنا کو اندر آنے دو۔“

اس نے پہرے دار کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا، پہلے قفل پھر دروازہ کھلا تو میں نے جل پنا کو اشارہ کیا۔

”اندر آ جاؤ جل پنا۔۔۔! سردار تھاپا نے آج رات تمہیں اپنے باپ کے پاس رہنے کی آگیا دے دی ہے اور کایا پنتھا۔۔۔! بیٹی سے تمہارا ملاپ اس شرط پر ہو رہا ہے کہ تم بھی میری ایک بات مانو گے۔“

معلوم نہیں کایا نے میری بات سنی یا نہیں کیونکہ دروازہ کھلتے ہی جب جل پنا کوٹھڑی میں داخل ہوئی، وہ دیوانوں کی طرح لپکا اور دھاڑیں مار کر بیٹی سے لپٹ گیا۔ جل پنا نے اپنی چیخ تو روک لی لیکن آنسو نہ روک سکی۔ ملاپ کی اس گھڑی میں دونوں کے دل موم کی طرح پگھل گئے، آنکھوں کے سوتے پھوٹ نکلے اور درد کی چادر نے انہیں اپنے آنچل میں لپیٹ لیا۔ یہ منظر کچھ ایسا ہی دل گداز تھا کہ بڑے بڑے پتھر دل بھی کانپ اٹھتے، معلوم نہیں تھاپا بہادر کے دل پر بھی کچھ اثر ہوا یا نہیں مگر میں نے اس منظر سے پگھل کر اسے توجہ دلائی۔

”سردار تھاپا۔۔۔! تم بھی ایک جوان بیٹی کے باپ ہو اور بیٹی کا دل بڑا نازک ہوتا ہے۔ بانکی سے کچھ نہ کہنا، میری اس سے ملاقات بے سان و گمان اور اتفاقیہ ہو گئی تھی۔ وہ تمہاری بیٹی ہے اور میں اس کی عزت کرتا ہوں۔“

جل پنا پریشان سے لہجے میں بولی۔ ”کیشپ بابو کہاں چلے گئے؟“
”تمہارے پاس تو بیٹھا ہوں۔“

میں نے موجودگی کا احساس دلایا اور اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی، اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”کیشپ! میرے قریب آ جاؤ۔“ پھر باپ سے مخاطب ہوئی۔ ”پتا جی! میں کیشپ جی سے پریم کرتی اور انہیں اپنا بھگوان سمجھتی ہوں۔“

”میں سن چکا ہوں بیٹی! یہ بھی جانتا ہوں گنجال نے اس دوش میں تمہیں اس بندی گھر میں ڈال دیا اور کیشپ تمہیں رہا کرانے آیا تھا مگر خود بندی بن گیا۔ ظالموں نے بڑا دکھ دیا، اسے مارا پیٹا، ہنسر بھوسائے اور میں تڑپتا رہا اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔“

پنا تڑپی اور باپ کی موجودگی کو نظر انداز کر کے مجھ سے لپٹ گئی۔ ”ہائے کیشپ میں مریوں نہ گئی۔“

”ایسا نہیں بولو پنا۔“ میں نے اسے بھینچ لیا اور من میں جوالا بھڑک اٹھی۔ ”نہ میں تمہارے بغیر جی سکتا ہوں نہ تم میرے بغیر مر سکتی ہو۔“

اب وہ میرے سینے کے ساتھ لگ کر بلک بلک کے رونے لگی۔ باپ کی طویل قید کے ساتھ اسے میری اسیری کا غم بھی کھائے جا رہا تھا۔

”میں کتنی ابھا گن ہوں۔ میرے کارن تم اس کال کوٹھڑی تک پہنچے۔“ اس کی آواز آنسوؤں کے بھنور میں ڈوب گئی اور یہ آنسو میرے دل میں بھی جوار بھاٹا سا پیدا کرنے لگے۔

”کیوں روتی ہو بچی! بھگوان جو کچھ کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔“
”مگر یہ اچھا نہیں ہوا۔“

”اگر میں قید نہ ہوتا تو اس بندی گھر کے پرانے قیدی سے کیسے ملتا اور یہ بھید کس طرح کھلتا کہ تمہارے پتا جی زندہ ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہوا پر اب میں پتا جی کو پالنے کے بعد کھونا نہیں چاہتی، تمہیں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔“
”ہم دونوں کو تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

”مگر تمہارا کہتا ہے کل تک پروہت گنجال کا کہا پورا نہ ہوا تو ہم سب کو مار ڈالے گا۔“

اچانک اندھیرے میں کایا پنتھا کی آواز سنائی دی۔ ”گھبراؤ نہیں بیٹی! میں تمہاری خاطر تمہارے کیشپ کی خاطر گنجال کی بات مان لوں گا، اپنے باپ سے کیا ہوا وچن توڑ دوں گا اور تمہارا

بہادر کو بتا دوں گا کہ میں نے سارے گلیان کی امانت کہاں چھپا رکھی ہے، اب مجھے وہ منحوس ڈبیا عزیز نہیں، تم دونوں کا جیون عزیز ہے۔“

اس کے چہرے پر گزرنے والی لہر سے معلوم ہوتا تھا کہ میری بات اس کے دل میں اتر گئی ہے۔ ”جو کچھ تم نے کہہ دیا مجھے اس پر دوشواں ہے، بس اب کل ملیں گے۔“

یہ کہہ کر اس نے پہرے دار کو اشارہ کیا جو آہنی جنگلے کا دروازہ بند کر کے تالہ لگا چکا تھا اور کوٹھڑی سے نکلا، پہرے دار نے مشعل اٹھائی اور بیرونی کوٹھڑی کے چوٹی کوڑ بند کر دیئے جس کے ساتھ ہم روشنی سے محروم ہو گئے پھر بھاری قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور فوراً ہی پتھر کے زینے پر ان کے قدموں کی چاپ اوپر اٹھتی اور ہمارے سروں پر سے گزرتی ہوئی ہولے ہولے خاموشیوں میں ڈوب گئی۔



ان کے جاتے ہی زیر زمین کوٹھڑی میں قبر سا اندھیرا چھا گیا۔ میں اس اندھیرے میں کایا پنتھا اور جل پنا کی ہلکی ہلکی سسکیاں سن رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے لگے اپنی قسمت پر آنسو بہا رہے تھے اور غالباً یہ احساس نہ کر پائے تھے کہ کوٹھڑی کا موسم بدل گیا ہے، میں باپ بیٹی کے ملاپ میں مغل نہیں ہوا اور چپ چاپ بیت الخلاء میں رینگ گیا۔

قطب جنوبی اور قطب شمالی میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے، مگر 38-40 فٹ گہرے اس مقبرے کا اندھیرا زمین کی گردش سے متاثر نہ ہوتا تھا، یہاں کی تاریکی سالوں اور صدیوں سے طویل اور موسموں کے تغیر سے بے نیاز تھی۔ اس کال کوٹھڑی میں چند لمحوں کے لئے روشنی اس وقت ہوتی جب پہرے دار کھانا لے کر آتا اور بیرونی دروازہ کھولتا تھا ورنہ یہاں دن رات میں کوئی تمیز نہ تھی۔ میرا خیال تھا جل پنا اس گھنے گھور اندھیرے سے گھبرا جائے گی اس لئے بیت الخلاء سے خارج نکال لایا۔ غالباً تنگ کواڑ کا کھٹکا ہی تھا جس نے باپ بیٹی کی محویت کا سحر توڑ دیا اور جل پنا چونک کے بولی۔

”یہاں تو بڑا اندھیرا ہے پتا جی! کوئی دیا نہیں جلائے کو؟“

”میری قسمت کا دیا پانچ برس پہلے بجھ گیا تھا پھر نہیں جلاتا اب سے انہی اندھیروں میں جی رہا ہوں۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔“

دونوں دیوار کے ساتھ لگ کے بیٹھ گئے، میں جل پنا کے چہرے پر گزرنے والی کیفیت تو نہیں دیکھ سکا مگر اس کی کپکپائی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ اس حجرہ اجل کی سیاہی سے خوف زدہ ہو گئی ہے۔

”مجھے تو ڈر لگتا ہے اس اندھیرے سے۔“

”تمہارے ڈر کا کارن یہ ہے کہ کوٹھڑی کے اندھیرے میں ہمارے لیکھوں کی سیاہی بھی گھل مل گئی ہے۔“

میں نے جل پنا کو پرے ہٹایا۔ ”کایا موسا۔۔۔! بیٹی سے ملنے کی خوشی میں کہیں تم اپنے ہوش تو نہیں کھو بیٹھے؟“

”ہوش تو اب آیا ہے پہلے میں جان بوجھ کر انجان بنا رہا اور ایسی بھول کر بیٹھا جس کے کارن میں، جل پنا اور تم اس بھیا نک بندی گھر میں پہنچ گئے اور اس دھرتی کے پیٹ میں بیٹھے اپنے انجام پر سوچ رہے ہیں، اگر پانچ برس پہلے میں نے گجالی کی بات مان لی ہوتی تو مجھے اور جل پنا کو اتنا طویل اور کڑا عذاب نہ بھوگنا پڑتا۔ آج میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سونے کی وہ ڈبیا جو اس سارے فساد کی جڑ ہے اپنے پاس نہیں رکھوں گا بلکہ اسے تھا پنا بہادر کے حوالے کر کے یہاں سے نجات حاصل کروں گا۔“

میں چیخ اٹھا۔۔۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

کایا حیران و دم بخود رہ گیا اور خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ”کیا تم سردار تھا پنا کی بات بھول گئے کہ وہ ہمیں مزید مہلت نہیں دے گا اگر کل تک اسے ڈبیا کا پتہ نہ دیا گیا تو ہم تینوں کو ختم کر دے گا۔“

”اور میں کہتا ہوں تمہارا، جل پنا اور شاید میرا جیون بھی صرف اسی لمحے تک سلامت ہے جب تک ڈبیا کا پتہ نہیں دیا جاتا۔ ڈبیا حاصل کر لینے کے بعد ہمارے وجود ان کے لئے بے کار بلکہ خطرناک ہوں گے، اس لئے وہ ہمیں بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔“

”مگر تھا پنا نے ہماری رکھشا اور رہائی کا ذمہ لیا ہے۔“

”اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ ضمانت دھوکے کا ایک جال ہے تاکہ ہم اس میں پھنس جائیں اور تم اس کے بھروسے پر اپنی زبان کھول دو مگر ہماری جانیں اسی لمحے تک محفوظ ہیں، جب تک تمہاری زبان نہیں کھلتی۔“

”پھر تم نے تھا پنا بہادر کو یہ وشواس کیوں دلایا تھا کہ کل تک میری زبان کھلوا دو گے۔“

”ہم دونوں لفظوں کی چوسر کھیل رہے تھے کایا موسا!“ میں اسے سمجھانے لگا۔ ”تھا پنا نے جل پنا کے قتل کی دھمکی اس لئے دی تھی کہ تم گھبرا کے ڈبیا کا حال کھول دو اور میں نے اسے تمہاری زبان کھلوانے کا لالچ اس لئے دیا تھا کہ وہ جل پنا کو ہماری کوٹھڑی میں چھوڑ جائے اور میں نے بازی جیت لی۔“

”مگر یہ ایک رات کی جیت ہے، کل اسے کیا جواب دو گے؟“

”کل اس کے آنے سے پہلے ہم یہاں سے جا چکے ہوں گے۔ ہمارے فرار کا راستہ تیار ہے۔“

”ارے۔۔۔ وہ اندھیرے میں اچھلا۔“ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

”اب سمجھ گئے نا میں نے جل پنا کو اپنے پاس ٹھہرانے کی ضد کیوں کی تھی۔“

”سمجھ گیا کیشپ! بالکل سمجھ گیا مگر تھا پنا کی دھمکی نے مجھے اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ میں کچھ اور سوچنے لگا۔“

حالات کی رفتار ہمارے حق میں تھی، اب میں کایا کو بتانے لگا۔ ”تم بھگوان سے نراش اور بیٹی کے لئے پریشان تھے مگر دیکھ لو بھگوان نے کس طرح ہماری مدد کی اور تھا پنا آپ سے آپ جل پنا کو ہمارے پاس لے آیا۔ اگر ہم کل یہاں سے نکل گئے ہوتے تو جل پنا یہیں رہ جاتی مگر آج یہ ہمارے ساتھ جائے گی۔“

”بھگوان کی لیلانیاری ہے، اس کا نام ست ہے۔“

کایا تو سچ سچ بھگوان کی اس نیاری حکمت پر بے حد خوش تھا کیونکہ ہم نے یہی طے کیا تھا خانقاہ سے فرار ہونے کے بعد جل پنا کی رہائی کی کوئی تدبیر کریں گے لیکن تقدیر اس کا ہاتھ پکڑ کے ہمارے پاس لے آئی تھی۔ وہ میرے پہلو میں گم صم بیٹھی یہ ساری بات چیت سنتی اور حیران ہوتی رہی۔ 38-40 فٹ تک زمین کے پیٹ میں اتری ہوئی اس کال کوٹھڑی سے فرار کی کوشش ناقابل یقین تھی لیکن وہ ہمیں پاگل نہیں سمجھتی تھی، جب ہم چپ ہو گئے تو پریشان سے لہجے میں بولی۔

”تم یہاں سے نکلو کے کس طرح؟ خانقاہ میں دن رات پہرہ رہتا ہے۔“

کایا بیٹی کو بتانے لگا۔ ”ہم نے سرنگ کھودی ہے اور دس راتوں سے کام کر رہے ہیں۔“

میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”کایا موسا۔۔۔! ذرا دھیرے بولو۔۔۔ دیواروں کے بھی کان

ہوتے ہیں، اگر تمہاری آواز کسی نے سن لی تو قیامت ٹوٹ پڑے گی ہم پر۔۔۔“

”یک لخت اس نے اپنے ہونٹ بھیج لئے۔“ میں نہیں بولتا۔ تم بتا دو اسے۔“

”بتانے کی کیا ضرورت ہے کایا موسا۔۔۔! اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی۔“

وہ میری طرف پلٹی اور ایک بار پھر میرے ساتھ آگئی۔ ”جب تم بتا جی کو موسا کہتے ہو تو

میرے من کو بڑا چین ملتا ہے۔“

”ارے۔۔۔ یہ سچ مچ میرے موسا ہیں۔“

”کیا۔۔۔؟ جل پنا کو جیسے میری بات پر یقین نہ آیا۔۔۔“

”اپنے پتا جی سے پوچھ لو۔“

”ہاں بیٹی! کیشپ ٹھیک کہتا ہے۔“ کایا خود اسے بتانے لگا۔ ”تم جانتی ہو تمہاری ماں پوربی

بنگال کے شہر رنگامتی کی رہنے والی تھی اور تمہیں یہ بھی یاد ہوگا، ایک بار میں نے بتایا تھا کہ اس کا

ایک بھتیجا ہے جسے وہ اپنی بہن کسم بالا کے پاس چھوڑ آئی اور اکثر اسے یاد کیا کرتی تھی۔“

”ہاں مجھے یاد ہے ماں کی ایک بہن بھی تھی۔ ایک بھتیجا بھی تھا۔“

”وہ بھتیجا یہی تھا رو کیشپ ہے۔ کسم بالا اور چندر بالا لگی بہنیں تھیں اس رشتے سے جب

میں بند کیا تو میری تلاشی لینا بھول گئے۔ اس تاریک کوٹھڑی میں یہ ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، اس لئے ہم ٹارچ بہت کم جلاتے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ بند کر دی۔ کوٹھڑی میں پھر گھنا گھورا اندھیرا چھا گیا اور اس اندھیرے میں جل پنا آہستہ سے میرے قریب کھسک آئی۔ ”تم نے کہا تھا مجھے وہ سرنگ دکھاؤ گے جو فرار کے لئے کھودی ہے۔“

”اسے دیکھنے کے لئے تمہیں اس کوٹھڑی کے بیت الخلاء میں چلنا ہوگا۔ مگر بیت الخلاء میں داخل ہونے کا دروازہ بہت چھوٹا اور تنگ ہے۔ دروازہ کہاں اسے ایک موکھا سمجھو اور تمہیں گھٹنوں کے بل گزرنا پڑے گا۔“

”جس موکھے سے تم گزرتے ہو میں بھی گزر جاؤں گی۔“

میں کایا سے مخاطب ہوا۔ ”کایا موسا۔۔۔“ پہرے دار رات کا بھوجن لے کر آنے والا ہوگا تم ذرا باہر دھیان رکھو میں جل پنا کو سرنگ دکھالاؤں۔“

میں نے ٹارچ پھر روشن کر لی اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے گھٹنوں کے بل بیت الخلاء کی طرف بڑھا۔ جل پنا بھی ہاتھوں اور گھٹنوں پر چلتی میرے پیچھے پیچھے اس ڈربے میں داخل ہوئی اور جب اس نے کھڑے ہو کر بیس اکیس فٹ گہری سرنگ دیکھی جس سے ایک آدمی بخوبی نیچے اتر سکتا تھا تو دنگ رہ گئی کیونکہ مضبوط پتھر کاٹ کاٹ کر نیچے کھائی میں گرانا کڑی محنت اور بڑے صبر کا کام تھا، اسے اصل حیرت تو کمند، کدال اور بسولا دیکھ کر ہوئی اور دم بخود سی ہو کر پوچھنے لگی۔

”یہ سامان کہاں سے آیا ہے؟“

”بھگوان نے بھیجا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”بھگوان نے یہ سامان کسی کے ذریعے بھجوا دیا ہوگا۔ اس خانقاہ میں بھگوان کا وہ بھگت کون ہے؟“

”جل پنا۔۔۔! کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب آدمی دینا بھی چاہے تو نہیں دے سکتا۔ تم نے جس بھگت کا پوچھا ہے اب وہ اس دنیا میں نہیں رہتا۔“

اس کی آنکھوں میں حیرت بجلی کی طرح کوند نے لگی۔

”تم حیران کیوں ہوتی ہو۔ اس دنیا اور اس دنیا میں جسے ہم دیکھ نہیں سکتے، صرف ایک پردہ حائل ہے جو ہمارے ذہن پر پڑا رہتا رہا ہے اور جب کسی سپنے اور کشف میں آدمی کی روح اس کے جسم سے الگ ہو جاتی ہے وہ پردہ درمیان سے اٹھ جاتا ہے اور آدمی انہونی باتیں سنتا۔“

تمہاری ماں کیشپ کی موسی ہوئی تو میں اس کا موسا ہی لگا۔“

جل پنا حیرت اور مسرت کے عالم میں پکاڑ اٹھی۔ ”کیا یہ سچ ہے کیشپ!“

”ہاں سچ ہے اور میں تمہیں اس کا ثبوت بھی دکھاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اپنے اوور کوٹ کی جیب سے وہ تصویر نکالی جو پہلے کایا پنتھا کو دکھا چکا تھا اور ٹارچ روشن کر کے تصویر جل پنا کے ہاتھ میں دے دی۔ ”دیکھو۔۔۔۔۔ یہ ہے دونوں بہنوں کی تصویر۔“

یہ موسی چندر بالا اور یہ میری چاچی ماں کسم بالا ہیں۔۔۔“

تصویر دیکھتے ہی جل پنا بولی۔ ”پتا جی! ایسی ہی ایک تصویر ہمارے گھر میں بھی تھی۔۔۔“

”ہاں، وہ تیری ماں کی نشانی ہے جسے میں نے سنبھال لیا تھا۔“

جل پنا اس بات پر دیوانی ہوئی جا رہی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان سچ مچ کا ناتہ نکل آیا ہے اور یہ سن کر تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کہ ماں کو اس کے ملانے کا وجہ دے چکا ہوں۔“

”میں یہ تو جانتی تھی تم ساؤ گاری میں لوٹو گے تو مجھے نہ پا کر تڑپ اٹھو گے اور میرا کھوج لگانے ضرور نکلوں گے مگر یہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی تم اور میں ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔“

ہمارا ماضی بھی ایک اور پر یوار بھی ایک ہے اور جب تم دوبارہ ملو گے تو میرا اور اپنا شجرہ ساتھ لے کر آؤ گے۔“

جل پنا کی زبان سے وہ عورت بول رہی تھی جسے اپنی گم شدہ جنت مل گئی ہو۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی نظریں اب میرے چہرے پر ٹکی تھیں اور وہ کہہ رہی تھی۔

”میں نے سنا ہے ماں تمہیں بہت چاہتی تھی اور مرتے سے بھی تمہارا نام لیتی رہی۔ اگر میں تمہاری چاچی ماں کی بچھڑی آتما ہوں تو تم بھی میرے سؤرگ باشی ماں کا سپنا ہو، شاید اسی لئے جب میں نے پہلی بار تمہیں ساؤ گاری میں دیکھا تو بے اختیار تمہاری طرف کھنچی آئی اور یہی سمجھی بھگوان نے تمہیں صرف میرے لئے ساؤ گاری میں بھیجا ہے۔“

”میرا اپنا وچار بھی یہی ہے کہ کوئی ان دیکھی طاقت مجھے تمہارے پاس کھینچ لائی تھی، کہتے ہیں جن روحوں کا آپس میں کوئی سمبندھ ہوتا ہے، وہ کسی نہ کسی رنگ میں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔“

کایا پنتھا بڑی دلچسپی سے ہماری باتیں سن رہا تھا کہنے لگا۔ ”یہ بھی بھگوان کا ایک نیا را کھیل ہے ورنہ کون جانتا تھا کہ چندر بالا کا سپنا اس طرح پورا ہوگا۔“

اچانک جل پنا کو روشنی دیکھ کر ٹارچ کا خیال آیا۔ حیران سی ہو کر بولی۔ ”یہ ٹارچ تمہارے پاس کہاں سے آگئی؟“

”اپنے ساتھ لے کر آیا تھا مگر جب تھا پا اور پروہت گنجال نے مجھے اس زیر زمین مقبرے

ہو گیا اور پھر نہیں بولا۔ ”غالباً سمجھ گیا تھا کہ یہی رات ہماری زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے، اگر ہم فرار نہ ہو سکتے تو کل تھا پابہادر کی بندوق ایک ایسا سوال کرے گی جس کا جواب کوئی نہ دے سکے گا اور اگر فرار ہوتے ہوئے پکڑے گئے تو سزا موت سے زیادہ بھیانک ہوگی، اس لئے ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا اور ”رات کا اندھیرا“ بن کے اس بندی گھر سے نکل جانا تھا۔

کھدائی شروع کرنے کے لئے ابھی ہمارے پاس تین ساڑھے تین گھنٹے اور تھے۔ یہ سے کاٹنے کے لئے میں نے سوچا کیوں نہ جل پنا کی رام کہانی سنوں۔ وہ میرے قریب ہی دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ میرا بازو اس کی کمر کے گرد حائل ہو گیا۔

”گنجال نے ایک دفعہ کہا تھا تم ناچ بھگتی کا چلہ کاٹو گی مگر یہاں تو آنگن ٹیڑھا ہونے کے کارن تم ناچنا بھول ہی گئی ہو گی۔“

”اس نے غلط نہیں کہا تھا کیشپ! میں یہاں بھی ناچ کا ریاض کرتی رہی ہوں۔“

میں اس جواب سے پریشان سا ہو گیا۔ ”بندی گھر میں ناچ کا ریاض؟“

”اوپر خانقاہ کے ایک کمرے میں بھگوان بدھ اور اندر دیوتا کی مورتیاں ہیں اور شکر اسی کمرے میں مجھے ناچ بھگتی کا ریاض کراتا رہا ہے۔“ جل پنا بتانے لگی۔ ”خانقاہ میں ایک بوڑھا پجاری پٹاما بھی کبھی میرا ناچ دیکھنے آتا تھا ایک دن اس نے یہ کہہ کر مجھے بھونچکا سا کر دیا کہ میں پچھلے جنم میں بھی نرتی تھی۔ وہ بدھستو امتیریا اور بدھستو ادا کوکستوار کا نام لے کر پوجا کرتا اور ہمیشہ تین کپڑے پہنتا ہے۔۔۔ دھوتی، کرتا، چادر اور سرمنڈوا کے رکھتا ہے۔“

میں یہ باتیں سن کر حیرت زدہ رہ گیا اور میری دلچسپی بڑھ گئی۔ ”پھر وہ ہنایان فرقے کا بودھ ہوگا، یہ لوگ ہندوؤں کی طرح دیوتاؤں اور پتر جنم کو بھی مانتے اور سمجھتے ہیں کہ آتما کئی چولے اور کئی شریر بدلتی ہے صرف نروان کے بعد ہی مکمل موت ہے اور آدمی مکتی گھر میں پہنچ کر آواگون سے نجات حاصل کرتا ہے۔“

”مجھے بودھوں کے عقیدوں اور وچاروں کے بارے میں علم نہیں مگر میں نے پٹاما پجاری کو پروہت گنجال کے پیروں پر سر رکھ کر پرنام کرتے ضرور دیکھا ہے۔“

میں چونک اٹھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ پروہت گنجال بھی ہنایان فرقے سے سمبندھ رکھتا ہے۔ میری آپ بیتی پڑھنے والوں کو شاید بودھ فرقوں اور ان کی ”استری کایا“ سے کوئی دلچسپی نہ ہو پھر بھی میں اپنی آپ بیتی کے حوالے سے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح علم یا بدھی یعنی ”استری کایا“ کے تین روپ یا تین درجے ہیں دھرم کایا۔۔۔ نروان کایا۔۔۔ اور سمجھوک کایا، اسی طرح بودھوں کے بڑے فرقے بھی دو ہیں۔ پہلا ہنایان جسے ”چھوٹی گاڑی“ کہا جاتا ہے، دوسرا مہایان جسے مہاراجہ کنشک کے دور میں جب بودھوں کی چوتھی کونسل منعقد ہوئی تھی۔

انہوں نے واقعات دیکھتا ہے تو یہاں بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہو گزرا ہے مگر ہم یہ چند قیمتی گھڑیاں ایسی باتوں میں کیوں ضائع کریں جنہیں میرا اپنا ذہن ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔“

وہ تصویر حیرت بنی کھڑی تھی، میں نے ٹارچ بجھائی اور اسے بانہوں سے پکڑ کر سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی اسرار و حیرت کے غلافوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آگئی اور اپنی بانہیں میرے گلے میں پرو دیں۔ ہم آغوشی اور پیار کا وہ لمحہ زیادہ طویل نہیں تھا مگر بطن زمین میں اترے ہوئے اس ڈربے کے اندر ملاپ کا وہ لمحہ آج بھی میرے جیون کا انمول سرمایہ ہے۔ سروپ ساؤجی نے جل پنا کو ساؤ گاری سے اس لئے نکال دیا تھا کہ وہ مجھ سے نہ مل سکے اور پروہت گنجال نے مجھے اس کال کوٹھڑی میں اس لئے دھکیل دیا تھا کہ میرے ہاتھ اس کی زلفوں تک نہ پہنچ سکیں اور ہمارے درمیان ایک گہرا تہہ خانہ اور لوہے کی سلاخیں دیوار بنی رہیں مگر قدرت کے ان دیکھے ہاتھ اسے ایک بار پھر میری بانہوں میں لے آئے تھے اور یہ ملاپ تقدیر کا فیصلہ تھا۔



ہم دوبارہ کوٹھڑی میں آ کے بیٹھے ہی تھے اور ابھی ٹارچ اپنے اوپر کوٹ کی جیب میں سنبھال رہا تھا کہ بیرونی کواڑ کھلنے کی آواز سنائی دی اور فوراً ہی مشعل کی روشنی کوٹھڑی میں در آئی پہرے دار رات کا بھوجن لے آیا تھا۔ آج بیچ کی کڑھی کے بدلے بھات کے ساتھ مسور کی دال آئی تھی اور اس کوٹھڑی میں یہ ”من و سلوی“ پہلی بار اتر اٹھا، پہرے دار نے خالی برتن سنبھال لے اور کہا۔

”سردار نے بولا ہے فیصلہ کل تک ہو جانا چاہیے۔“

”جا کر بول دوسرے چٹانہ کرے۔ جس بات کا فیصلہ پانچ برسوں میں نہیں ہو سکا کل ہو جائے گا۔“

اس نے بیرونی کوٹھڑی کے پٹ بند کئے، تالا لگایا اور چلا گیا، ہم پھر اندھیرے میں تھے۔ اسی اندھیرے میں بھوجن کیا اور فرار کے بارے میں سوچنے لگے۔ معمول کے مطابق ہمیں بارہ بجے بقیہ کھدائی شروع کرنا بھی مگر بیٹی کا ساتھ ہو جانے سے کایا کچھ زیادہ ہی بے چین ہو رہا تھا، کہنے لگا۔

”آج ہم دس بجے کام شروع کر دیں گے تاکہ بھاگنے اور بستی سے دور نکل جانے کے لئے زیادہ سے مل جائے۔“

”نہیں کایا موسا۔۔۔!“ میں نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ ”آج کی رات تو ہمیں زیادہ احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ اگر ذرا سی بھول بھی ہو گئی تو پکڑے جائیں گے اور جانتے ہوا انجام کیا ہوگا؟“

مجھے یا کایا کو اس انجام کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ میری بات سن کر وہ چپ

”بڑی گاڑی“ کا نام دیا گیا تھا۔ باقی سب شاخیں انہی فرقوں سے نکلی ہیں۔

ہنایان بودھ قدامت پرست ہیں۔ اس فرقے کو لنگا، برما، سیام اور ہندو چین میں مقبولیت رہی جبکہ مہایان اصلاح یافتہ فرقہ کہلاتا ہے اور اس کے ماننے والے نیپال، پوربی بنگال، آسام، تبت، چین، منچوریا، کوریا، جاپان اور فلپائن تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بودھوں کا سب سے بڑا فرقہ مہایان ہے جس کا چین میں تاؤ مت اور کنفیوٹس ازم سے اشتراک ہوا اور جاپان میں یہ فرقہ ایک طرف شنٹو مت سے متاثر ہوا اور دوسری جانب اس سے ایک نئے فرقے زین بدھی نے جنم لیا۔ اسی طرح تبت میں جہاں بدھ لوگ کئی ہندو دیوتاؤں کو بھی پوجتے ہیں وہاں یہ وشواس بھی رکھتے ہیں کہ شاکیہ منی گوتم سدھارتھ کی آتما دلائی لاما میں حلول کر جاتی ہے اور بدھ ان لاماؤں کے روپ میں بار بار جنم لیتے ہیں۔

ہندو برہمن اور مغرب کے کئی مصنف بدھ کو یہ دوش بھی دیتے ہیں کہ ان کے ہاں بھگوان، ایشور اور خدا کا کوئی تصور نہیں اور بودھ دھرم میں ایشور کا خیال مہاراجہ اشوک اعظم کے عہد میں 273 تا 233 ق م میں اس سے پیدا کیا گیا جب تیسری بودھ کونسل بلانی گئی اور مہایان فرقے نے ایشور، آخرت، پرلوک، نرگ اور سزا و جزا کے عقیدوں کا اضافہ کر دیا مگر یہ الزام غلط ہے کیونکہ بدھ اپنے جیون ہی میں ان ساری باتوں پر وشواس رکھتے اور سنگھ کے سادھوؤں، بھکشوؤں کو ان برہمنوں کے دیوی دیوتاؤں کے بجائے اودیت مت (وحدت الہی) کا یقین دلاتے اور ایشور کو میوا دوتیم (وحدہ لاشریک) مانتے تھے وہ ایشور کے سچے بھگت، اوتار اور ملہم تھے جن کو خدا کا گیان ہوتا تھا، جیہی برہمن ان سے کرو دھ رکھتے اور ان کے بارے میں جھوٹی باتیں پھیلاتے رہتے تھے۔

میرے پڑھنے والے کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میں چونکہ پوربی بنگال کا رہنے والا ہوں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لئے اسلامی عقیدوں سے متاثر ہو کر خدا، واحدانیت، آخرت، جنت، دوزخ اور جزا سزا کی باتیں کرتا ہوں بلکہ مہایان فرقے کی بہت بڑی تعداد یہ باتیں کسی نہ کسی رنگ میں اڑھائی ہزار سال سے مانتی چلی آرہی ہے۔ قدیم بدھ گرنتھوں اور شاستروں میں یہ سب باتیں لکھی ہیں جو لوگ ان باتوں سے لگاؤ رکھتے ہیں، ان کی دلچسپی کے لئے عرض کرتا چلوں کہ بدھ کے شاگردوں میں سے کسیا پ، اوپالی اور انند بھکشو نے تنھا گت کے اپدیشوں کو بیان کیا جو سنگھ میں دہرائے جاتے رہے اور جنہیں 242 قبل مسیح اشوک اعظم کے حکم پر لکھا گیا۔ بدھ کے یہ فلسفیانہ اقوال اور پر حکمت باتیں تین حصوں پر مشتمل ہیں جو ”ویان پٹاک“، ”ست پٹاک“ اور ”ابی دھرم پٹاک“ کہلاتے ہیں اور ان تینوں حصوں کو ملا کر جو کتاب تیار ہوئی اس کا نام ”تری پٹاک“ رکھا گیا، بعد میں ”دھم پداس“ کے نام سے بھی بدھ کی تعلیمات قلمبند کی گئیں

مگر یہ کتاب اصل میں ”ست پٹاک“ ہی کا خلاصہ ہے۔

اگر میرے پڑھنے والے دھرم اور عقیدے کے اس مختصر بیان سے اکتا گئے ہوں تو میں ان سے معذرت اور شام چاہتا ہوں مگر ان باتوں کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ جل پنا نے خانقاہ کے بوڑھے پجاری پٹاما اور اس کے بدھستوا عقیدے اور اندر دیوتا اور پتر جنم کی بات چھیڑ کر مجھے چونکا دیا تھا۔ یہ باتیں چونکہ ہنایان فرقے کے بودھ ہی مانتے اور مہایان بودھوں سے الجھتے اور ان سے بیر بھی رکھتے ہیں اس لئے میں سوچنے لگا تھا کہ اگر پٹاما پجاری اور پروہت ہنایان بودھ ہیں تو ضرور ساؤ خاندان کا دھرم بھی یہی ہوگا جیہی سروپ جی نے ساؤ گاری کے مندر میں گنجال کے سامنے مجھ سے اس بات پر تکرار کی تھی کہ شاکیہ منی بدھ برہما اندر اور کئی دیوتاؤں کو مانتے تھے اور اب اندر دیوتا کی طرح سندر کنواریوں کا ناچ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اسی لئے ”بھگوان کی زنتی“ کے لئے کنوار پن کی شرط رکھی گئی ہے۔

میں پہلے بھی قارئین کو بتا چکا ہوں کہ بعض بدھ عقیدوں کا میری کہانی سے گہرانا ہے، اس لئے پٹاما پجاری کا عقیدہ جان لینے کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ تنھا گت بدھ کے بارے میں ہنایان اور مہایان فرقوں کے دھرموں کا فرق بیان کرنا چلوں تاکہ پڑھنے والے میری اس عجیب اور پرسرار سرگزشت کے تانے بانے آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں۔

اس وضاحت کے بعد میں پھر کہانی کے اسرار کی طرف لوٹا اور زمین کے تاریک پیٹ میں اتری ہوئی اس کال کوٹھڑی میں واپس آتا ہوں جہاں جل پنا نے خانقاہ میں ناچ بھگتی کے ریاض کی بات سنا کر مجھے حیران کر دیا تھا۔

میرے لئے یہ انکشاف بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا کہ پٹاما پجاری پروہت گنجال کے پیروں پر سر رکھ کر پر نام کرتا ہے۔ یہ شو بھا اور عزت تو صرف اور صرف مہان پروہتوں کو دی جاتی ہے جو گنتی کے چند ایک ہی ہوتے ہیں، اس سے گنجال کی دھار مک حیثیت اور مہا سنگھ (اعلیٰ درجے) کا پتہ چلتا اور یہ معما سمجھ میں آتا تھا کہ آسام کا سنھتالی قبیلہ اور کانگٹو کے نواح میں اس پہاڑی خانقاہ کے قبائلی پہرے دار سردار تنھا پاسیت اس کے اشاروں پر کیوں ناپتے ہیں۔ یہ بات مزید حیرت کا باعث تھی کہ تنھا پابہادر اپنے نام سے نیپالی تھا اور نیپال کے بودھ مہایان فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، پھر اس کا پروہت گنجال سے کیا سمبندھ جو ہنایان سنگھ کے طریق پر چلتا ہے، اچانک مجھے ایک نئی بات سوچھی اور میں نے پوچھا ”پروہت گنجال کب آیا تھا یہاں؟“

”تیرہ چودہ دنوں کے اندر دو بار آچکا ہے۔“ جل پنا نے بتایا۔

میں پھر چونکا۔ مجھے اس خانقاہ میں قید ہوئے تیرہ ہی دن ہوئے تھے، اس کے مطلب ہے پہلی بار وہ اس رات تنھا پابہادر کا مہمان بن کر آیا تھا جس رات میں اور مدایا بھکشو خانقاہ میں

ترے اور پکڑے گئے تھے۔ تھاپا کے ساتھ ہمارا سواگت کرنے کے لئے پروہت گنجال خود موجود تھا مگر میری گرفتاری کے دوسرے دن وہ ساؤ گاری لوٹ گیا تھا اور جل پنا انہی ایام میں اس کی دوبارہ آمد کا ذکر کر رہی تھی۔

”دوسری بار کب آیا تھا؟“

”چھ سات دن پہلے کی بات ہے، میں شکر کے ساتھ ریاض کر رہی تھی اور پٹاما پجاری مجھے ناچ بھگتی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور میں گنجال کو اندر آتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔“

”اکیلا تھا کیا؟“

”نہیں سروپ جی ساتھ تھے اور میں انہی کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔“

مارے حیرت کے میں اچھلا۔ ”اور کون تھا؟“

”شاسترو اور پیگو بھی تھے، میں سمجھی شاید وہ لوگ مجھے لینے آئے ہیں۔“

”پھر کیا ہوا؟“ میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔

”میں نے سروپ جی کو پرنام کیا۔ پٹاما نے چوٹی تخت سے اٹھ کر انہیں دھن داد کہا اور بتانے لگا کہ میں بڑی لگن سے ناچ بھگتی کا ریاض کرتی ہوں مگر میں نے دیکھا سروپ جی کچھ کھوئے کھوئے پریشان سے تھے۔“

”انہوں نے کچھ بتایا تھا کہ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

”صرف یہ بتایا تھا کہ ایک ضروری کام سے آیا ہوں مگر لگتا تھا کچھ کھو گیا ہے، کچھ ڈھونڈ رہے ہیں، وہ میرے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرے اور پریشان سے لہجے میں کہنے لگے۔ ”جل پنا! تجھے ایک بھول کا پرائیوٹ کر بھنڈو کو یہاں بھیجا گیا ہے، ناچ بھگتی کا چلہ پورا کر اور اپنے من سے موہ مایا کا خیال نکال دے جی تو ساؤ گاری واپسی جاسکتی ہے۔“ پھر جانے لگے تو پوچھا تجھے یہاں کوئی دکھ تکلیف تو نہیں؟“ میں نے جواب دیا۔ ”نہیں“ اور یہ غلط نہ تھا کیونکہ خانقاہ میں میری ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا تھا پھر وہ لوٹ گئے۔“

میں اس کی زبان سے یہ روداد سن کر دنگ رہ گیا۔ ”کیا سروپ جی یہی سمجھانے آئے تھے تمہیں کہ موہ مایا کے جال سے نکلو۔۔۔؟“

میں خود حیران تھی کہ یہ بات تو وہ ساؤ گاری میں بھی کہہ چکے تھے پھر خانقاہ میں آکر سمجھانے کی کیا ضرورت تھی۔ ”جل پنا ایک پل کے لئے رکی پھر بولی۔“ میں نے بتایا ہے نا وہ جیسے کچھ ڈھونڈتے پھرتے اور جلدی میں تھے، جب کمرے سے باہر جانے لگے تو پٹاما پجاری بھی ان کے ساتھ نکل گیا مگر شاسترو میرے قریب آیا غالباً کچھ کہنا، کچھ بتانا چاہتا تھا کہ پروہت گنجال

نے فوراً اسے کمرے سے باہر دھکیل دیا اور شکر نے دروازہ بند کر لیا۔ ”یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ تو میں نے جو کچھ سوچا تھا وہ بالکل ٹھیک نکلا۔ سروپ جی مجھے ساؤ گاری سے غائب پا کر پریشان ہو گئے اور شاسترو نے بھی انہیں بتا دیا تھا کہ میں جل پنا کے پیچھے پہاڑی خانقاہ کی طرف چلا گیا اور غالباً کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں وہ گنجال شاسترو اور پیگو کو لے کر خود میری تلاش میں نکلے اور خانقاہ میں آ پہنچے مگر گنجال کو یہ دھڑکا تو پہلے ہی سے ہو گا کہ مجھے تلاش کیا جائے گا اور تلاش کرنے والے یہاں تک بھی آ جائیں گے لہذا اس نے سردار تھاپا اور اس کے قبائلی پہرے داروں کو پہلے ہی تاکید کر دی ہو گی کہ میرے بارے میں کسی کو کچھ بتایا نہ جائے۔ سروپ جی نے خانقاہ اور اس کے ساتھ بندی گھر کے سارے کمرے ایک ایک کر کے دیکھ لئے ہوں گے۔ سردار تھاپا اور پہرے داروں سے پوچھ گچھ کی ہو گی اور جواب یہی ملا ہو گا۔ تھارو کیشپ نام کا کوئی آدمی خانقاہ تو کیا ان کی بستی میں بھی نہیں آیا۔“

سب سے معتبر گواہی پٹاما پجاری کی ہو گی جس نے مجھے دیکھا تک نہیں تھا۔ اس نے بھگوان کی سوگند کھا کر کہا ہو گا کہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس طرح گنجال نے سروپ جی کو وشواس دلایا ہو گا کہ میں خانقاہ تک پہنچ ہی نہیں سکا۔ شاید رستہ بھول کر کسی دوسری جانب نکل گیا ہوں۔ سروپ جی، شاسترو اور پیگو میں سے کسی کو خیال بھی نہیں آیا ہو گا کہ اس خانقاہ کے پیٹ میں ناف زمین تک اترا ہوا کوئی ہولناک تہہ خانہ بھی ہو سکتا ہے، جہاں دن کی روشنی اور تازہ ہوا کا گزر نہیں اور میں ایک بدنصیب بندی کے ساتھ اسی بھیا نک تہہ خانے کی کال کوٹھڑی میں بند ہوں۔

اپنے نائک میں کامیابی کا رنگ بھرنے کے لئے گنجال نے گونگے بھکشو دایا کو یا تو ختم کر دیا یا پھر خانقاہ سے باہر کسی دوسری جگہ بھجوا دیا ہو گا تا کہ میرے ساتھ اس کا بھی کوئی کھوج نہ مل سکے گویا گنجال نے زندہ آدمیوں کی کتاب سے میرا نام بھی خارج کر دیا تھا، جب چھان بین کے بعد بھی میرا کوئی سراغ نہ ملا ہو گا ان تینوں کی چننا بڑھ گئی ہو گی اور خانقاہ سے نراش لوٹ کر نہ جانے وہ مجھے کہاں کہاں ڈھونڈ رہے ہوں گے، ہو سکتا ہے سروپ جی نے پیگو کو چپکے چپکے میری تلاش کے لئے بائی پارہ کی طرف بھی دوڑا دیا ہو اور جب سندرمتی نے میری گمشدگی کی خبر سنی ہو گی، اس کے دل پر قیامت بیت گئی ہو گی۔

تو یہ تھا اس جیشو کا انت، اس دوڑ دھوپ کا انجام جو سروپ جی نے، شاسترو نے، پیگو نے میرے لئے کی تھی اور اس کال کوٹھڑی کے اندھیرے میں مجھے جس اندیشے کا گیان ہوا تھا وہ بالکل اسی طرح ظہور میں آیا تھا جیسے میں نے سوچا تھا، سانپ راستہ دیتا نہیں، راستہ روک لیتا ہے اور گنجال نے بھی میری تلاش کا راستہ روک لیا اور کسی کوزیر زمین تہہ خانے میں اترنے ہی

”ہاں میں نے کہا اور اس لئے کہا کہ کبھی دو الگ الگ راہیں بھی ایک ہی منزل پر پہنچتی ہیں۔“
جل پنا کے اس جواب میں اس کے پریم کی منطق بھی تھی اور پیار کی وہ وارنٹی بھی جو ہر شے، ہر اس ہستی کو عورت کا محبوب بنا دیتی ہے جس سے اس کا برہمادچسپی رکھتا ہے۔ مجھے یوں لگا وہ سچ مچ مہیشوری ہے اور اس کے وجود کے سوا سنسار میں اور کچھ نہیں اور اسی احساس کی شدت میں سرشار ہو کر میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ کاپانتھا ہمارے پاس ہی بیٹھا بڑی محویت سے ہماری باتیں سن رہا ہے جل پنا کو اپنے بزوؤں میں کھینچ لیا، اسے پیار کیا اور کہا۔

”جل پنا۔۔۔! آکاش کی نیلی کتاب پر جو کچھ لکھا ہے میں اسے پڑھ تو لیتا ہوں مگر اس کی تحریر بدل نہیں سکتا اور اس کتاب میں میرے اور تمہارے سوا کچھ اور نام بھی ساتھ ساتھ لکھے ہیں۔“

یہ بات سن کر اس پر پیار اور سرور کی ایک سنسنی طاری ہو گئی اور میں نے اس کے جسم کی اس سنسنی کو اپنے بازوؤں میں محسوس کیا پھر وہ میری گرفت سے نکل کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی اور میں نے پوچھا۔ ”جب تم نے داسی بن کر رہنے کے لئے کہا تو سروپ جی نے کیا جواب دیا؟“

”وہ تو مجھ سے اسی بات پر ناراض تھے کہ میں تم سے پریم کرتی ہوں، کہنے لگے تو صرف بھگوان کی داسی ہے، کسی اور کی نہیں۔ یہاں رہنے کے لئے تجھے اپنے پریم کا بلیدان دینا اور سدا کنواری رہنا ہوگا پھر وہ چلے گئے کیونکہ میں نے ترک محبت سے انکار کر دیا تھا۔“

میں سنتا رہا، جل پنا کہتی رہی۔ ”اسی رات پروہت گنجال نے مجھے بتایا کہ تو نے سروپ جی کو ناراض کر کے اچھا نہیں کیا، پریم تجھے راس نہیں آئے گا کیونکہ تیرے بھاگ میں چیرہ بند کنواری رہنا لکھا ہے اور تو کسی مرد کے بستر پر نہیں جائے گی۔“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آخر میرے بھاگ میں ایسا کیوں لکھا ہے، کس نے لکھا ہے؟“
”بھگوان نے۔“ گنجال کہنے لگا۔ ”ہر کنواری اور مہر زدہ زندگی کا جیون ایک بند کتاب کی طرح ہوتا ہے۔ وہ بند کتاب صرف بھگوان ہی کھولتا ہے اور تجھ پر بھگوان نے اپنی مہر لگائی ہے۔“

میں حیران رہ گئی۔ ”مگر کون کہتا ہے کہ بھگوان نے مجھ پر مہر لگائی ہے؟“
”یہ میں کہتا ہوں کیونکہ تو ایک گرہن زدہ کنواری ہے اور تیری دائیں چھاتی کے نیچے بھگوان نے چاند گرہن کا نشان داغا ہے۔ یہی بھگوان کی وہ مہر ہے جو تجھ پر اسی سے لگائی گئی جب تو اپنی ماں کے گربھ میں تھی۔“

میں اس انکشاف پر بھونچکا سی رہ گئی۔ گنجال نے بتایا۔ ”جس لڑکی پر بھگوان چاند گرہن کا نشان لگاتا ہے اسے اپنے لئے چن لیتا ہے، وہ سدا کنواری رہتی اور اس کا کنواری پن بھگوان کی امانت ہوتا ہے، اگر وہ کسی مرد کے بستر پر جائے تو اس سے جیون چھین لیا جاتا ہے کیا تو روپ تارا کا انت نہیں جانتی، وہ بھی گرہن زدہ زندگی تھی، اس نے ساؤ گاری کے ایک بھکشو سے پریم کیا

نہیں دیا تھا، جہاں اس نے مجھے تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر مرنے کے لئے بند کر رکھا تھا، میرا ذہن ابھی انہی باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک جل پنا کہنے لگی۔

”کیشپ! میں نے تمہیں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مجھ پر ساری مصیبت سروپ جی کے کارن ٹوٹی اور میں انہی کی آگیا پر اس خانقاہ میں بھیج دی گئی، میں نے سوچا تھا یہاں سے لوٹنے سے جب وہ مجھے ملنے آئیں گے، ان سے پوچھوں گی اگر میں ان کی بیٹی ہوتی تب بھی وہ مجھے تم سے پیار کرنے سے روک دیتے مگر واپسی پر وہ مجھ سے ملے ہی نہیں، جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح اچانک لوٹ گئے، تمہارے رنگامتی چلے جانے کے بعد پروہت گنجال نے ان پر یہ بات کھول دی تھی کہ میں تم سے پریم کرتی ہوں، سوچتی تھی وہ بھلے آدمی ہیں انہیں سب کچھ بتا دوں گی اور بنتی کروں گی کہ مجھے کیشپ بابو سے بیاہ کی آگیا دے دیں تو مان جائیں گے مگر وہ میرے پریم کی بات سنتے ہی سوکھی لکڑی کی طرح جل اٹھے اور بڑے کرودھ میں بولے۔

”بھگوان کی زندگی کسی سے پریم نہیں کر سکتی۔ کسی مرد کا تصور بھی اس کے لئے پاپ ہے۔“

”پریم پاپ کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پریم پاپ نہیں۔“ وہ بولے۔ ”مگر تیرے لئے پاپ سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ بھگوان نے

تجھے اپنے لئے پسند کر لیا ہے۔“

”میں تو کیشپ بابو کو اپنا بھگوان مانتی ہوں۔“

”کیشپ کا خیال دل سے نکال دے۔“

”اگر میں ایسا نہ کر سکوں؟“

”پھر تجھے ساؤ گاری سے نکلنا ہوگا۔“

مجھے شک ہوا کہیں ان کے اس برتاؤ کا کارن سندرمتی نہ ہو کیونکہ ساؤ گاری آتے ہی اس نے تمہارا رہائشی کمرہ بدل دیا اور تمہیں اوپر لے گئی تھی، اس لئے میں نے سوال کیا۔

”کیا آپ نے کیشپ بابو کو سندرمتی کے لئے پسند کر لیا ہے؟“

یہ سنتے ہی وہ تڑپ اٹھے۔ ”تجھے یہ پوچھنے کا ادھیکار نہیں کہ میں سندرمتی کے لئے کس کو پسند اور کس کو نا پسند کرتا ہوں۔“

میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا۔ ”یہ بات میں نے اس لئے پوچھی ہے کہ اگر آپ کیشپ جی کو سندرمتی کے لئے پسند کر چکے ہیں تو بھی مجھے ان سے دور نہ کریں، میں ان دونوں کی داسی بن کے رہ لوں گی۔۔۔۔۔“

جل پنا کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں جی اٹھا، میری آتما میں روشنی کا ایک نیا درکھل گیا اور میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”تم نے کہا یہ؟“

اور چھپ چھپ کے اس سے ملتی تھی مگر جس رات وہ بھکشو سے آلودہ ہوئی دوسرے ہی دن بھگوان نے اسے بھسم کر دیا۔“

میں نے سنا تھا کہ مجھ سے پہلے جوزنکی بھگوان کے مندر میں ناچتی تھی اس کا نام روپ تارا تھا اور وہ ایک رات اچانک مردہ پائی گئی مگر اب یہ سن کر کانپ اٹھی کہ میری طرح وہ بھی گرہن زدہ تھی اور اسے کسی بھکشو سے پریم کرنے کی سزا دی گئی۔ انجانے میں پوچھ لیا۔
”کون تھا وہ بھکشو؟“

”ان سات گونگے بھکشوؤں میں سے ایک جنہیں تو نے ساؤ گاری میں دیکھا ہوگا اور مدایا ہے اس کا نام۔“

مدایا بھکشو کا نام سن کر میں فرط حیرت سے ایک دم کھڑا ہو گیا اور جل پنا سے کہا۔ ”کیا تم نے یہ نہیں پوچھا گنجال سے کہ مدایا کیوں نہیں مرا؟“

”پوچھا تھا۔“ جل پنا بتانے لگی۔ ”اور گنجال نے جواب دیا کہ وہ بھگوان کے قہر اور کرودھ سے ڈر گیا، اس نے پرارتھنا کی، معافی مانگی اور پاپ کے پرائیچت میں اپنی زبان کٹوا دی ورنہ پہلے وہ گونگا نہیں تھا۔“

یہ ایک اور حیرت انگیز اور سنسنی خیز انکشاف ہوا تھا جس پر میں حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ مدایا بھکشو مجھے بتا چکا تھا اس نے اپنی زبان اس لئے کٹوائی تھی کہ اس کے ہاتھ سے برہمن زمیندار (کایا پنتھا) کا ”خون“ ہو گیا تھا اور اسی پاپ کا پرائیچت کرنے کے لئے اسے زبان کا بلیڈان دینا پڑا۔ خود گنجال نے مجھے بتایا تھا کہ مدایا اپنے آپ کو کایا پنتھا کا قاتل سمجھتا ہے مگر اس نے زبان کس پاپ کے پرائیچت میں کٹوائی؟

”خیر مدایا بھکشو نے کوئی پاپ کیا تھا یا نہیں مگر میں تمہیں یہ ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ جب گنجال نے تمہیں ساؤ گاری سے نکالنے اور اس خانقاہ میں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تو گونگے مدایا ہی نے اسے روکا تھا جس پر گنجال اس کا بھی دشمن بن گیا اور مدایا بھکشو نے ساؤ گاری کو چھوڑ دیا، جب میں ساؤ گاری لوٹا، اسی نے چھپ کر مجھ سے انا تھ بندو کی سادھی پر ملاقات کی اور اس پہاڑی خانقاہ کا پتہ بتایا تھا جہاں تم قید کر دی گئی تھیں پھر وہی مجھے ساتھ لے کر یہاں آیا کیونکہ وہ تمہیں گنجال کی قید سے چھڑانا چاہتا تھا مگر بے چارہ میرے ساتھ ہی پکڑا گیا اور میں نہیں جانتا وہ مار دیا گیا یا میری طرح کسی کال کوٹھڑی میں قید ہے۔“

جل پنا کے لئے یہ ایک نئی کہانی تھی مگر میں نے یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ مدایا بھکشو ہی پانچ برس پہلے کا پانتھا کو دریاے چن ون کے ایک جھونپڑے سے اٹھالایا تھا اس وقت جو کچھ ہوا اس میں مدایا کی مرضی کا دخل نہ تھا پھر بھی وہ اپنے فعل پر شرمندہ اور اسی بھول کا بدلہ چکانے کے لئے

جل پنا کی رہائی چاہتا تھا۔ وہ مدایا بھکشو کی ہمدردی اور گرفتاری کا سن کر پریشان ہو گئی اور میں دوبارہ اس کے پاس بیٹھ گیا تو بولی۔

”کیشپ! تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ میں یہاں قید نہیں تھی اور تمہاری جدائی کے سوا مجھے اس خانقاہ میں آنے کا کوئی غم نہ تھا۔ دراصل پروہت گنجال نے روپ تارا کے انت کا انکشاف کر کے مجھے ڈرا دیا اور نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے تم پر کوئی کشت آئے، جیسی کچھ سے کے لئے یہاں آنا قبول کر لیا۔ نجانے وہ کون سی پراسرار طاقت تھی جس نے مجھے ساؤ گاری سے نکلنے پر مجبور کر دیا کئی دن تک میرے دماغ پر ایک دھند سی چھائی رہی اور بار بار ایک آواز سنائی دیتی تھی کہ میں ناچ بھکتی کے سوا سب کچھ بھول جاؤں، اپنے آپ کو بھول جاؤں، تمہیں بھول جاؤں، کیونکہ میں بھگوان کی نرتکی ہوں، گرہن زدہ ہوں، کنواری ہوں اور سدا کنواری رہی رہوں گی اور میں ایک بند کتاب ہوں اور یہ بند کتاب صرف بھگوان ہی کھولیں گے مگر یہاں آکر بھی میں نہ تمہیں بھول سکی نہ اپنے آپ کو اور کبھی کبھی خود بخود پکارا اٹھتی تھی۔
”میں صرف کیشپ کی ہوں۔“

ایک دن جب میرے پاس صرف پٹاما پجاری تھا میں نے اس سے سوال کیا کہ بھگوان کسی لڑکی کے شریر پر چاند گرہن کا نشان کیوں لگاتا ہے؟“
پٹاما پجاری نے بتایا۔ ”گرنھوں اور پورانوں میں لکھا ہے، جب دھرتی پر کوئی خاص واقعہ ہونے والا ہو تب چندرما کو گرہن لگتا ہے اور گرہن اس لئے لگتا ہے کہ سور یہ دیوتا اور برہما دیوتا ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو کر جنگ لڑتے اور چاند پر اندھیرے کی چادر ڈال دیتے ہیں، اس اندھیرے میں چندرما (سوم دیوتا) دھرتی پر نیا جنم لینے والی روحوں کو دیکھتا اور جسے اپنے لئے پسند کر لیتا ہے، اس پر گرہن کا نشان لگاتا ہے۔“

اچانک اس نے پوچھا۔ ”تیری ماں کا نام کیا تھا؟“
”چندر بالا۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ بولا۔ ”پھر تو تیری ماں کا چندرما یعنی سوم دیوتا سے گہرا سمبندھ تھا اور آکاش کا یا میں چندرکلا چاند کے سولہویں حصے کو کہتے ہیں اسی لئے جب تو اپنی ماں کے گربھ میں تھی چاند گرہن کی رات سوم دیوتا نے تیرے شریر کے سولہویں درجے پر نشان لگایا اور سوم دیوتا سندر لڑکیوں اور ناریوں سے پریم کرتا ہے اور شاستروں میں لکھا ہے اگلے وقتوں میں سوم دیوتا (چندرما) نے اپنے گورو برہسپت کی سندر عورت تارا پر عاشق ہو کر اسے بہکایا اور اپنے گھر میں ڈال لیا تھا۔ برہسپت گورو اس لئے کہلاتا ہے کہ وہ دیوتاؤں کا استاد بھی ہے اور پروہت بھی۔ اگر دیوتا کرودھ، غصے اور جلال میں ہوں تو وہ انسانوں کی سفارش کر کے ان کے جوش کو دھیمما کرتا ہے،

ڈال دیا گیا، آج ہی تھا پابہادر نے مجھے بتایا۔

”اگر تو پروہت جی کی بات مان لے تو تیرے باپ کا جیون لوٹا دیا جائے گا۔“

بات میری سمجھ میں نہ آسکی۔ ”بھلا مرنے والے لوٹ کے کب آتے ہیں؟“

وہ کہنے لگا تیرا باپ مرا نہیں تھا، وہ لاش کسی اور کی تھی جو جلائی گئی وہ اسی خانقاہ کے تہہ خانے

میں قید ہے اور تیرا پریمی کیشپ بھی تیرے باپ کی کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اگر تو ان دونوں کا

جیون چاہتی ہے تو تجھے میرے کہے پر چلنا ہوگا۔ اپنے پتا سے سارگلیان کی ڈبیا کا پتہ پوچھنا ہوگا۔“

مجھے تھا پا کی بات پر یقین نہیں آیا تو میرا ہاتھ کھینچ کر بولا۔ ”آ میں تجھے کایا پتا تھا اور تھارو

کیشپ سے ملاؤں۔ ان دونوں کے جیون کی ڈور اب تیرے ہاتھ میں ہے اگر تجھے دیکھ کر

انہوں نے پروہت جی کا کہا پورا کر دیا تو زندہ رہیں گے، نہیں تو دھرتی کے گہرے اور اندھیرے

پیٹ میں سسک سسک کے مرجائیں گے۔“

”پھر وہ مجھے لے کر یہاں آ گیا اور اس نے جو کچھ کہا تھا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ

لیا۔“ یہ کہہ کر جل پنا خاموش ہو گئی۔



اس کی کہانی سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پروہت گنجال اور پٹاما پجاری نہ صرف بودھوں

کے ہنایان فرقے سے تعلق رکھتے بلکہ ہندو دھرم اور پنر جنم کو مانتے اور ان تمام باتوں پر وشواس

رکھتے ہیں جو دیوتاؤں کے بارے میں مشہور ہیں، میں بتا چکا ہوں بودھ دھرم مختلف دیسوں میں

مختلف دھرموں سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ ہندوستان میں چونکہ برہمنوں کو پھر غلبہ حاصل ہو گیا تھا،

اس لئے ان کی دھارمک کتابوں اور کہانیوں کو دوبارہ شہرت ملی جبکہ بودھوں کی چھوٹی گاڑی

ہنایان پہلے ہی سے ہندو دیوتاؤں کو مانتی رہی ہے۔ پوربی بنگال، آسام، تبت اور نیپال کے

بودھ زیادہ تر بڑی گاڑی مہایان سے وابستہ ہیں، پھر بھی ان فرقوں کی کئی شاخیں اور عقیدے

الگ الگ ہیں۔

ساؤ گاری سے لے کر پہاڑی خانقاہ تک جہاں ہم قید تھے، میں نے ایک ہی تکرار سنی اور یہ

تھی وہ تکرار کہ جل پنا بھگوان کی نرتکی اور اسے کنواری رہنا ہے۔ سروپ جی بھی اسی بات پر زور

دیتے تھے کہ بھگوان کی نشان زدہ نرتکی کا کسی مرد سے پریم کرنا مہاپاپ ہے، پروہت گنجال نے

کہا تھا اگر وہ کسی مرد سے پریم کرے گی تو دونوں کا جیون بھسم ہو جائے گا۔ اس نے روپ تارا

کی پراسرار موت کا قصہ سنا اسے ڈرا بھی دیا تھا اور اب پٹاما پجاری نے ایک اور کہانی سنائی تھی

جس نے جل پنا کو مزید پریشان کر دیا تھا۔

سوم دیوتا اور برہسپت کی بیوی تارا کے پریم اور اغوا کی کتھا دیوتاؤں کی جنگ اور تارا کے

جب سوم دیوتا تارا کو بھگا کر لے گیا تو برہسپت نے اپنے حامی دیوتاؤں کو بلایا جن میں اندر

دیوتا سب سے آگے تھا مگر سوم یعنی چندرماں نے تارا کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے

بھی حامی دیوتا اُش نس رُودر۔ وانو اور کئی دوسرے جمع ہو گئے اور تارا کے لئے دیوتاؤں میں

بڑی خوفناک جنگ ہوئی جسے ”تارکانے“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ سے دھرتی

کانپ اٹھی، آخر برہما دیوتا نے التجا کر کے لڑائی بند کرائی اور سوم دیوتا سے کہا وہ تارا کو اس کے

پتی برہسپت کے حوالے کر دے۔ سوم نے بادل خواستہ برہسپت کی سند عورت اسے لوٹا دی مگر

اس اثناء میں تارا حاملہ ہو چکی تھی، اس نے بڑا ہی خوبصورت بچہ جنا جس کی کالی آنکھیں دیکھنے

والوں کا دل کھینچتی تھیں، برہسپت اور سوم دونوں بچے کا باپ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے یہ جھگڑا

ختم کرنے کے لئے برہما جی تارا کے پاس گئے اور کہا۔

”صرف تو جانتی ہے کہ بچے کا باپ کون ہے اس لئے سچ بول دے۔“

”میں سوم دیوتا سے حاملہ ہوئی تھی۔“ تارا نے بتایا۔

تب وہ بچہ سوم (چندرماں) کا بیٹا کہلایا اور اس کا نام بدھ رکھا گیا۔ اسے ”شیاما نگ“ یعنی

سیاہ چشم بھی کہتے ہیں، چونکہ تارا سوم دیوتا سے واپس لے لی گئی تھی جس کا اسے بڑا دکھ تھا اس

لئے جب سوریا دیوتا اور برہما دیوتا (جو تمام مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے) آپس میں لڑتے اور

چندرماں پر اپنا سایہ ڈال کر اسے سیاہ کر دیتے ہیں تو اس اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر سوم دھرتی

پر نظر ڈالتا اور جس عورت کے گربھ میں سندر لڑکی پل رہی ہو اس پر اپنی مہر لگا دیتا ہے، سوم دیوتا

سندر تا کالو بھی ہے۔ اس نے دُکش کی ستائیں لڑکیوں کے ساتھ بیاہ کیا تھا جو سب کی سب

حسین اور خوبصورت تھیں مگر اس کی راتیں زیادہ تر اونی کے ساتھ بسر ہوتی تھیں جو ان میں

سب سے زیادہ سندر تھی چنانچہ اپنی دوسری لڑکیوں کی شکایت پر دُکش نے سوم (چندرماں) کو

شراب دیا کہ وہ زوال پذیر رہے، تب سے چاند گھٹتا بڑھتا رہا ہے اور اسے گربھن بھی لگتا ہے مگر

گربھن زدہ لڑکی بھگوان کی نرتکی بن کر اس کی شرمن میں آجائے تو سوم دیوتا کی دست درازی سے

بچ جاتی ہے جیسا کہ اسے بھگوان کے لئے کنواری رہنا پڑتا ہے اور وہ اٹھارہ اور بیس برس کی عمر کے

درمیان کسی رات سپنے میں بھگوان سے پھل ہو جاتی ہے۔“

میں یہ باتیں سن کر دنگ رہ گئی پھر کبھی اس سے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ پٹاما پورانوں اور

شاستروں کے حوالے سے بات کرتا تھا۔ میں ڈرتی بھی تھی، نہ جانے آگے چل کر کیا واقعات

پیش آئیں، پٹاما پجاری اور شکر کے علاوہ سردار تھا پا اور خانقاہ کے چوکیدار بھی میرے ساتھ اچھا

برتاؤ کرتے تھے مگر پانچ چہرہ دن سے یعنی سب سروپ جی مجھے دیکھ کر چلے گئے ان کا برتاؤ یک

نخت بدل گیا، یوں لگتا تھا جیسے میری حیثیت قیدی کی سی ہو گئی ہے کیوں میرے کمرے پر تالا

اس لئے وہی جانتا ہے کہ ماں کے گربھ میں بعض بچوں پر گرہن کا نشان کیوں لگ جاتا ہے مگر یہ نشان سورہ اور سوم آپ سے آپ نہیں لگاتے۔ زمین کی گردش سے رتیں بدلتی اور موسم تبدیل ہوتے ہیں، ممکن ہے دھرتی پر بھی چاند ستاروں کی گردشوں کا کوئی اچھا برا اثر ہو جیسے نجومی اور جوتشی کہتے ہیں لیکن کوئی دیوتا گرہن لگانے کی شکتی نہیں رکھتا۔ یہ اصل میں برہمنوں کی باتیں ہیں جنہیں چھوٹی گاڑی والے بودھ مانتے ہیں، تمہیں یہ سارے وہم اپنے من سے نکال دینے چاہئیں۔“

○○○

وطن سے چند ماں کے بیٹے بدھ کی پیدائش کا قصہ اصل میں چندر بنی خاندان کی وجہ تسمیہ کے ارد گرد گھومتا ہے کیونکہ یہی سیاہ چشم بدھ جس نے رگ وید کی رچنائیں لکھیں اور منو منی کی لڑکی الا سے بیاہ کیا چندر بنی خاندان کا مورث اعلیٰ قرار دیا جاتا ہے سوم کی ستائیں بیویوں کی حکایت بھی جو سب کی سب دش کی بٹیاں تھیں۔ ہندو شاستروں میں بیان کی گئی ہے مگر اس بات پر کہ سوم ان لڑکیوں میں سے سندراؤنی کو سب سے زیادہ پیار کرتا تھا دش کا اسے شراب دینا اور اس شراب کے کارن چاند کا گھٹنا بڑھنا اور اسے گرہن لگنا بھی ایک عجیب افسانہ تھا تارا کے پریم کی کتھا اور اوہنی کو چاہنے کی داستان اس لئے بیان کی گئی کہ جل پنا جو پہلے ہی گرہن زدہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھی، اب سوم دیوتا کی حسن پرستی میں کھوئی رہے اور چونکہ چندر ماں نے اس کی چھاتی کے نیچے اپنی پسند کا نشان لگایا تھا جس کے سبب وہ تارا کی طرح اسے بھی اپنی عورت بنانے کا جتن کر رہا تھا اس لئے وہ کنواری رہنے کا فیصلہ کر لے۔

میں نے محسوس کیا کہ پروہت گنجال کے بعد پٹا مپجاری کی باتیں سن کر وہ کافی پریشان اور خوفزدہ نظر آتی تھی اور اس پر ایک نفسیاتی عمل کیا جا رہا تھا اس لئے ضروری تھا اس کے ذہن سے کہانیوں کا اثر زائل کر دیا جائے، میں اسے سمجھانے لگا۔

”سنو جل پنا۔۔۔! یہ پروہت پجاری لوگ دیوتاؤں کی کہانیاں سنا کر جو انسانوں نے لکھی ہیں۔ لوگوں کو خوفزدہ کرتے ہیں، ایک ہی آدم یا برہما کی اولاد ہونے کے ناتے ہم انسان بھی ایک ہی رشتے میں بندھے ہیں کیونکہ میں برہما جی کو آدمی مانتا ہوں، دیوتا نہیں اور ہر آدمی کے اندر ایک دوسرا آدمی چھپا رہتا ہے جو دیوتا ہوتا ہے یا شیطان۔ اگلے وقتوں میں دھرتی پر دیوتا رہتے تھے یا جنات یا پھر وہ آدمی ہی کی کوئی نسل تھی مگر کسی لڑکی کے شریر پر چاند گرہن کا نشان لگنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ نہ یہ کسی دیوتا کا چٹکار ہے، ہم ایک ایسے زمانے سے گزر رہے ہیں جب انسان نے اپنی دھرتی اور ستاروں کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کر لی ہیں۔

ہماری زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے، دونوں سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں جسے دھرم ”سورہ دیوتا“ کے نام سے یاد کرتا ہے، جب چاند آسمانوں پر گردش کرتا ہوا زمین اور سورج کے درمیان حائل ہو جاتا ہے تو سورج گرہن لگتا ہے اور جب زمین گھومتی ہوئی چاند اور سورج کے بیچ آ جاتی ہے تو چاند گرہن ہوتا ہے۔ یہ زمین اور چندر ماں کی اپنی اپنی رفتار اور گردش کا ایک طبعی عمل ہے جو کبھی کبھی گرہن کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ نیلے آکاش کے اوپر لامحدود اور بے کنار خلا میں لاکھوں، کروڑوں ستارے اپنے اپنے راستوں پر بھاگے جا رہے ہیں، ان کے راستے ان کی منزلیں اور گردشیں کسی دیوتا نے نہیں بلکہ اس ایشور نے مقرر کی ہیں جو آکاش اور دھرتی اور ستاروں کا پیدا کرنے والا اور قادر مطلق ہے،

(25)

فرار

جب جل پنا کو یہ بھاشن یا گیان دے رہا تھا تو اس کا نرم اور کوئل ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا جس پر ایک پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ کایا پنتھا چپ بیٹھا ہماری باتیں سن رہا تھا، اچانک بولا۔

”پنا بیٹی۔۔۔! دھرم کیا کہتا ہے؟ میں نہیں جانتا مگر جب تو کیشپ کو اپنا پتی مان بیٹھی تو یہی تیرا سوم، تیرا چندر ماں، تیرا برہما اور تیرا بھگوان ہے۔ مجھ سے پوچھتی ہے تو میں نے بھی اس کال کوٹھڑی میں کیشپ کے ذریعے بھگوان کا گیان حاصل کر لیا ہے، اگر تجھے کیشپ مل گیا تو بھگوان مل گیا۔ تیری ماں چندر بالا بھی یہی چاہتی تھی۔“

ابھی آخری الفاظ اس کی زبان پر ہی تھے کہ میں نے زیر زمین تہہ خانے کے زینے پر ایک مدہم سی نامعلوم سی چاپ سنی، پہلے تو اسے واہمہ سمجھا مگر جب دوسری بار ویسی ہی نرم آہٹ پیدا ہوئی جسے ”آہٹ“ کہنا بھی شاید درست نہ تھا کیونکہ وہ تو ایسی کیفیت تھی جیسے سانپ بے آواز چلتا ہے تو میں سمجھ گیا کوئی ننگے پاؤں ہو لے ہو لے سیڑھیاں اتر رہا تھا اور قدم دبا دبا کے رکھتا ہے تاکہ ہلکی سی دھمک بھی پیدا نہ ہو سکے میں نے فوراً باپ بیٹی سے سرگوشی کی۔ ”ہوشیار، شاید آج رات ہماری خفیہ نگرانی ہو رہی ہے۔“

دونوں بری طرح چونک اٹھے اور کان زینے کی طرف لگا دیے، پھر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بے آواز، بے چاپ چلتا ہوں بیرونی کواڑ سے آگاہ ہو، اس کی آمد کسی سانپ کی مانند ناگہاں اور پرسرار تھی، اس نے سانس تک روک رکھی تھی تاکہ اس کی آمد و شد کا ارتعاش بھی ہمیں سنائی نہ دے سکے۔ وہ جو کوئی بھی تھا یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ آج رات جب جل پنا ہمارے پاس چھوڑ دی گئی ہے ہم آپس میں کیا باتیں کرتے اور کس نتیجے پر پہنچتے ہیں، سردار تھا پا کی دھمکی کے مطابق ہمارے پاس صرف آج کی رات تھی اور اسی رات کایا پنتھا کو یہ فیصلہ کرنا تھا، آیا سارگلیان کی امانت پر وہت گنجال کو سوئپ دی جائے یا خاموشی اختیار کر کے موت کو گلے لگا لیا جائے۔

مجھے اور جل پنا کو بھی صرف رات بھر کی مہلت دی گئی تھی کہ ہمیں ایک دوسرے سے کنارہ کرنا اور پریم کا بندھن توڑ دینا ہو گا یا قید کی سختیاں برداشت کرنا اور مرنا ہے۔

کن سوئپاں لینے والا بھیدی اسی کوٹھڑی کا پہرے دار تھا یا کوئی اور۔۔۔ بہر حال وہ ہماری بات چیت سننے کے لئے بھیجا گیا تھا میں نے اسے تراش نہیں کیا اور اندھیرے میں کایا موسا کا

ہاتھ دبا کر ذرا اونچی آواز میں تاکہ باہر والا بھی سن سکے کہنے لگا۔

”کایا پنتھا۔۔۔! جیون کا ہر سفر کسی شمشان یا قبرستان پر ختم ہوتا ہے اور آدمی کے اپنے فیصلے ہی اسے خوش بختی یا بد بختی کی طرف دھکیل دیتے ہیں تم نے پانچ برس پہلے پروہت گنجال کی بات ماننے سے انکار کر کے جو بھول کی تھی، اس کا نتیجہ بھگت لیا اور جیتے جی شمشان میں جلے اور اس اندھیری قبر میں بھی اتار دیئے گئے، اب اپنے حال پر ترس کھاؤ اور اپنی بیٹی کا جیون بھی بچاؤ، آخر تمہیں کیا لینا ہے سارگلیان کی ڈبیا سے؟ تم وہ منحوس ڈبیا پروہت گنجال کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے تاکہ اس بندی گھر سے رہائی پاؤ جل پنا۔! تم سمجھاؤ نا اپنے پتا جی کو۔۔۔“

ساتھ ہی میں نے جل پنا کا ہاتھ دبا دیا اور وہ بولی۔ ”پتا جی! آج میں آپ کے، اپنے اور کیشپ کے جیون کی بھیک مانگتی ہوں، بھگوان کے لئے ضد چھوڑ دیجئے اور جو کچھ پروہت گنجال نے کہا ہے، مان جائیے۔“

کایا پنتھا بھی صورتحال کی نزاکت اور ہماری باتوں کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گیا تھا، کہنے لگا۔

”اب میں بھی سوچتا ہوں مجھے پانچ برس پہلے ہی گنجال سے معاملہ طے کر لینا چاہیے تھا۔“

”تو کیا تم سردار تھا پا کو ڈبیا کا پتہ بتانے پر تیار ہو؟“ میں نے خوشی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

”اگر میں ڈبیا کا پتہ بتا دوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور وہ لوگ میرے بتائے ہوئے پتے سے اسے حاصل کر لیں تو بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ ہمیں چھوڑ دیں گے؟“

”اس بات کی پروا نہ کرو کایا پنتھا۔۔۔! سردار تھا پا ہمیں شرن میں لینے کا قول دے چکا اور وہ قول کا پکا ہے، مجھے اس پر پورا رشواں ہے اور میں نے بھی یہ سوچ کر جل پنا سے پریم کا ناتا توڑ لینے کا فیصلہ کیا ہے کہ جب یہ بھگوان کی نرتکی بن چکی ہے تو اسے موہ مایا کی دنیا میں کھینچ لے جانے سے بھگوان ناراض ہو گا۔ جل پنا بھی میری بات سمجھ گئی اور بھگوان کی ہو کر رہنا چاہتی ہے، اب تم مان جاؤ تو ہمارے سب کشت دورہ جائیں گے، ہم نے گنجال سے دشمنی کر کے دیکھ لیا، اب ذرا دوستی کر کے بھی دیکھیں۔“

”اچھا کیشپ!“ وہ بھی ذرا اونچی آواز میں بولا۔ ”جو تم کہتے ہو مانے لیتا ہوں، اگر تمہیں تھا پا بہادر پر بھروسہ ہے تو اسی بھروسے پر کل میں اسے ڈبیا کا پتہ بتا دوں گا۔“

”اور میں کل تمہارے سامنے تھا پا سے وچن لوں گا کہ وہ ہماری رکھشا اور رہائی کا ذمے دار ہو گا۔“ پھر میں نے جھوٹ موٹ کی ایک جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ”رات بہت بیت گئی ہے آرام

کرتا چاہیے۔ آج تو مجھے بہت نیند آرہی ہے، کئی راتوں کے بعد چین سے سو سکوں گا۔“

پھر ہم نے بات چیت بند کر دی اور یہ ظاہر کیا کہ سونے کے لئے لیٹ گئے ہیں، کال کوٹھڑی

پر ایک گھمبیر چپ چھاگئی اور اس چپ اور گھور اندھیرے میں کان چونکے کسی اور طرف لگے تھے، اس لئے ہم نے فوراً ہی بیرونی کوٹھڑی کے کواڑ سے لگ کر کن سوئیاں لینے والے ”گھر کے بھیدی“ کی حرکت سنی۔ وہ دبے پاؤں، بے آہٹ، بے چاپ، بے آواز پلٹا اور بڑی آہستگی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا مگر کچھ سیڑھیاں عبور کر لینے کے بعد اپنی احتیاط قائم نہ رکھ سکا اور ہم تینوں نے اس کے قدموں کی ہلکی ہلکی دھمک صاف طور سے سنی۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب لوٹا تھا، ہم اپنے نائک میں کامیاب رہے تھے، تھاپا ہم سے اور ہم تھاپا سے چال کھیل رہے تھے۔

بھیدی جا کر اسے بتائے گا کہ ہم نے اس پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، یہ ایک ایسی خوش خبری ہوگی کہ آج رات تھاپا اور اس کے پہرے داروں کو ہماری طرف سے غافل کر دے گی، وہ سب کے سب اپنی کامیابی کے سنے دیکھتے ہوئے آج رات مزے سے سوئیں گے مگر جس طرح سورج کی پہلی کرن ستاروں کے چراغ گل کر دیتی ہے اسی طرح کل کا سورج ان سارے سپنوں کو چکنا چور کر دے گا۔۔۔ کل جب تھاپا سارگلیان کی امانت کا پتہ پوچھنے آئے گا اور پہرے دار ہماری کال کوٹھڑی کا دروازہ کھولے گا تو ہم تینوں میں سے کسی کو بھی نہ پا کر ان کے پاؤں تلے سے دھرتی نکل جائے گی۔

گنجال کے کردہ اور قہر سے بچنے کے لئے تھاپا اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر شکاری کتوں کی طرح ہمارا پیچھا کرے گا۔ اس خیال سے میں چونک اٹھا کیونکہ ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور ہمیں اس بندی گھر سے جلد از جلد نکل جانا اور کل کا سورج چڑھنے سے پہلے اس بستی سے دور کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا تھا، اچانک جل پنا نے جو میرے قریب ہی بیٹھی تھی سرگوشی کی۔

”کیشپ کیا سچ سچ سو گئے۔“

”آج سونے کی نہیں جاگنے کی رات ہے پنا!“ میں نے اس ہاتھ پکڑ کے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ”میں نے ابھی ابھی تم سے پریم کا نانا تا توڑ لینے کی جو بات کی ہے، اس کے لئے شام چاہتا ہوں۔“

”اور میں تب شام کروں گی جب ہم اس بندی گھر سے نکل جائیں گے۔“

کایا پنتھا بھی ہماری سرگوشیوں میں شریک ہو گیا۔ ”کیشپ! ہم نے جو نائک کھیلا ہے وہ لوگ اسے سچ سمجھ گئے اور آج رات بے فکر ہو کر جلد سو جائیں گے کیوں نہ ہم بھی اپنا کام جلد شروع کر دیں؟“

”نہیں کایا موسا۔۔۔! ہم ایسی کوئی بھول نہیں کریں گے، ذرا انہیں سو لینے دو۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی صرف دس بجے ہیں۔“ پھر میں اسے بتانے لگا۔ ”بے شک ہمارا

نائک کامیاب رہا ہے اور اس سے مطمئن بھی ہوں گے مگر کبھی کبھی نائک کے منظر بدل جاتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ بھی ہمارے ساتھ کوئی کھیل ہی کھیل رہے ہوں۔ رات کا بھوجن دینے کے بعد کوئی اس تہہ خانے میں نہیں اترتا مگر آج ایک آدمی چوروں کی طرح دبے پیروں سیڑھیاں اتر کے کواڑ سے آگیا اور ہماری سن گن لیتا رہا، اگر ہم نے سرنگ کھودنے کا کام شروع کر دیا ہوتا تو خود سوچ لو اس سے تک کیا کچھ تبدیل ہو گیا ہوتا، یہاں سے نکل جانے کے لئے میں تم سے زیادہ بے چین ہوں کیونکہ ہمیں جو کچھ کرنا ہے، آج ہی رات کرنا ہے مگر آج کی رات نہ صرف ہمارے لئے بلکہ تھاپا بہادر کے لئے بھی غیر معمولی اور فیصلے کی رات ہے اس لئے جلدی میں کوئی غلط قدم اٹھانا بہت مہلک ہوگا، میں جانتا ہوں ہمارا ایک ایک پل بڑا مہنگا، بڑا کٹھن ہے اور کالے نہیں کٹے گا پھر بھی ہمیں اپنی بے کلی پر قابو پانا ہوگا، اگر چاہو تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اپنی کمر سیدھی کر لو، آج ہمیں لمبا سفر کرنا ہے۔“

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے الفاظ بیان کرتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں مہینے ڈیڑھ مہینے کی بات کر رہا ہوں اور اتنا طویل سے ہمیں کوٹھڑی ہی میں گزارنا ہے مگر ہر لمحہ اپنی رفتار سے گزرتا ہے اور اس میں کوئی کمی پیشی نہیں ہوتی۔ ہمیں شبہ سے کا انتظار کرنا تھا۔

میری بات سن کر کایا پنتھا سچ سچ لیٹ گیا اور اس نے کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا میں نے جل پنا سے کہا۔ ”تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔“

”نہیں۔۔۔ میں تم سے باتیں کروں گی۔“

”آج رات دیواروں کے بھی کان ہوں گے۔“

”مگر وہ میری باتیں نہیں سن سکیں گی۔“

یہ کہہ کر وہ ہولے سے میری گود میں کھسک آئی اور میں نے کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا، اس کال کوٹھڑی کا گھور اندھیرا بڑا وحشت ناک تھا مگر یہی اندھیرا ہمارے اور کایا پنتھا کے درمیان کالی چادر بن کر حائل ہو گیا، جل پنا کے جسم پر ایک کچی سی طاری تھی، سانس درست کر کے بولی۔

”تم نے میرے لئے کتنا کشت اٹھایا ہے کیشپ!“

”اگر یہ کشت نہ اٹھاتا تو اپنے کایا موسا کو کیسے ڈھونڈتا؟“

اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں پرو دیں۔ ”تم مہان ہو کیشپ! پہلے مجھے ڈھونڈا پھر پتا جی کو حالانکہ ہمیں ڈھونڈنا بہت مشکل تھا۔ گنجال نے پتاجی کو موت کے اندھیروں میں چھپا دیا اور میری ذات کو بھیدوں کی گھڑی میں باندھ کر ایک ایسے ویرانے میں لا رکھا جہاں کوئی اسے کھولنے نہیں آ سکتا تھا مگر تم آ گئے اور آتے ہی میرے من میں اتر گئے۔“

لیکن وہ خالی پڑا تھا، اسی اثناء میں کایا پنتھا بھی میرے قریب پہنچ گیا۔

”کیا بات ہے کیشپ! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟“

اسے اپنی پریشانی کا کارن کیا بتاتا، میں استخوانی ہاتھ، سرگوشی، کواڑ کھلنے اور بند ہونے کی آواز کو اشارہ غیبی سمجھا اور بولا۔ ”کچھ نہیں، کام شروع کرنے کا سہ ہو گیا ہے۔“

گھڑی دیکھی تو ٹھیک بارہ بجے تھے۔ اب ہم سرنگ مکمل کرنے کے لئے بیت الخلاء میں جانے والے تھے میں نے جل پنا سے کہا۔

”تم یہیں بیٹھو اگر سیڑھیوں پر کوئی دھک یا چاپ سنو تو فوراً ہمیں خبر کر دینا۔“

”مگر کیشپ! وہ۔۔۔۔۔ وہ سخت ہاتھ کیا تمہارا تھا؟“

میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی تو چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ”کیسا ہاتھ؟“

”اس نے میری کلائی جھٹک دی تھی۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”کوئی ہاتھ داتھ نہیں تھا۔“

”اور کواڑ کی آواز؟“

”بس ایک وہم تھا۔“ پھر میں نے اسے تسلی دی۔ ”گھبراؤ نہیں آدمی پریشان ہو تو اندھیرے

میں دیواریں بھی بھوت نظر آتی ہیں مگر آج رات تمہیں ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہے۔“

اس کی گھبراہٹ تو بے شک دور ہو گئی مگر حیرت دور نہ ہو سکی پھر بھی میرے اشارے پر اپنی جنگل کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور کان بیرونی کوٹھڑی کے کواڑ اور زینے کی طرف لگا دیئے۔ اسے وہیں چھوڑ کر میں اور کایا پنتھا گھٹنوں کے بل آگے پیچھے بیت الخلاء میں داخل ہوئے پھر میں بسولا اٹھا کر اور کمرے سے کمند باندھ کر گہری سرنگ میں اتر ا۔

آج رات ہمیں صرف ایک فٹ کھدائی کرنا اور بنیاد کا وہ پتھر توڑ کے گرانا تھا جو کھائی کے کنارے بڑی مضبوطی سے قائم تھا اور جسے ہم کل رات نہیں توڑ سکے تھے، میرا خیال تھا اس پتھر کو توڑنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جائیں گے سرنگ میں اتر کے میں نے بھگوان کو یاد کیا اور بڑی احتیاط سے بسولا چلانے لگا۔ پندرہ بیس منٹ میں اس کا ایک کنارہ ٹوٹ کے گرا جس سے مجھے بسولا چلانے میں کچھ آسانی ہو گئی مگر جونہی میں نے بنیاد کے پتھر پر ضرب لگائی پورے کا پورا پتھر میرے پیروں کے نیچے بڑی تیزی سے کھسکا اور بنیاد سے نکل کر کھائی میں لڑکتا چلا گیا پھر ایک خوفناک دھماکے سے اس کی تہہ میں جا گرا، اگر میری کمر میں کمند نہ بندھی ہوئی ہوتی یا میں نے جلدی سے ایک پتھر کے کونے کو نہ پکڑ لیا ہوتا جسے سہارا لینے کی خاطر پوری طرح کاٹا نہ گیا تھا تو بنیادی پتھر کے ساتھ میں بھی لڑکتا ہوا گہری کھائی میں جا گرتا۔

بنیاد کا پتھر لڑھکنے اور کھائی میں گرنے کا دھماکہ اس قدر بھیانک اور لرزہ خیز تھا کہ میں خوف

”میرا اور تمہارا ایک پرانا ناتا بھی تھا نا جی میں تمہاری طرف کھنچا آیا۔“

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”میرے ماضی کی کتاب تو اندھیرے میں گم ہو چکی تھی اسے پڑھنے کے لئے تم روشنی کہاں سے لائے؟“

”من میں پیار کا دیار روشن ہو تو سب اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔“

”ہاں پیار سب سے بڑی روشنی ہے۔“

”تم میرا پیار ہو۔“

”تم میری روشنی ہو۔“

”کیشپ! جان بھی مانگو گے تو چہروں میں رکھ دوں گی۔“

”پگلی! پریمی جان دیتے ہیں، لیتے نہیں۔“

ہم ایک دوسرے کے پریم میں ڈوبتے چلے گئے، پیار میں کچھ رسمیں ہوتی ہیں، کچھ قسمیں ہوتی ہیں، ہم نے قسمیں انا تھا بندو کی سادھی پر کھائی تھیں اور پیار کی رسمیں نبھاتے ہوئے دونوں اس بندی گھر تک آپہنچے تھے جہاں گنجال نے گویا ہمارے جیون کے سارے ادھیکار ختم کر دیئے تھے مگر یہی بندی گھر ہماری خوش بختی کی علامت بن گیا اور پچھڑے ہوئے مل گئے، اس وقت ہم تینوں ایک ایسی کوٹھڑی میں بند تھے جس کا دروازہ تو موت کے اندھیروں میں کھلتا مگر موکھا جسے ہم نے خود کھودا، جیون کے اجالے میں اترتا تھا۔

جل پنا سے پیار کی باتیں کرتے یا اس کی لذت آفریں قربت کے باعث سے گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ اچانک اندھیرے میں کسی کا سخت ہاتھ میرے کندھے پر پڑا اور ایسا تھا وہ ہاتھ جیسے کوئی مشت استخوان ہو جس نے مجھے جھنجھوڑ کے رکھ دیا اور ساتھ میں نے مدھم سی سرگوشی سنی۔

”انہواب۔۔۔۔۔“

لہجہ تحکمانہ تھا، میں سمجھا کایا پنتھا اٹھ کر میرے سر پر آکھڑا ہوا اور مجھے احساس دلا رہا ہے کہ کام شروع کرنے کا سہ آگیا، میں جل پنا کو گھبراہٹ میں پرے کر کے یک لخت کھڑا ہوا تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کایا پنتھا اندھیرے میں جہاں لیٹا تھا اب بھی وہیں لیٹا ہے پھر مجھے جھنجھوڑنے والا ہاتھ کس کا تھا؟ مدھم سرگوشی کرنے والا کون تھا؟

ابھی میں اس عجیب واقعے پر حیران ہو رہا تھا کہ ناگہاں بیت الخلاء کے تنگ اور پست دروازے کا چوٹی کواڑ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی، میں نے فوراً ٹارچ نکال کر روشن کی، اس ڈر بے کا چوٹی کواڑ ابھی تک ہل رہا تھا مگر کسی کی صورت دکھائی نہ دی، میں ڈر بے کی طرف لپکا، گھٹنوں کے بل جھک کر کواڑ کھولا اور ٹارچ کی روشنی میں گردن آگے کر کے بیت الخلاء میں جھانکا

سے کانپ اٹھا۔ دھماکہ خیز آواز یقیناً دور دور تک سنی گئی ہوگی میں چند لمحے سرنگ میں لٹکا اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا، سب کچھ آنا فنا ہو گیا تھا۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا جیسے پتھر کسی نے پہلے ہی بنیاد سے کھسکا کر ڈھیلا کر دیا تھا اور جونہی میں نے ضرب لگائی وہ کھائی میں لڑھکتا چلا گیا۔ یہ بالکل ایک شعبہ ہوا تھا مگر اب کھٹکا اس بات کا لگا تھا کہ اگر دھماکہ کی آواز سن کر کوئی پہرے دار کھائی کی طرف نکل آیا تو ہمارا بھید کھل جائے گا اور ہم فرار ہونے سے پہلے ہی کسی بھیانک مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔

میں سرنگ سے باہر آیا تو کایا پتھا بھی بڑا گھبرایا ہوا تھا، ہم دونوں سرنگ کے دہانے پر حیران و ششدر بیٹھے سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہئے؟ ہمارے فرار کا راستہ کھلا تھا مگر خوف کے مارے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے کہ سرنگ سے اترتے ہی پکڑے گئے تو کیا ہوگا؟

اچانک میرے اندر کا تھار و کیشپ بول پڑا۔ ”آدمی موت سے ڈرتا تو جنم ہی نہ لیتا۔“

اچانک میں نے اس کال کو ٹھڑی سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک جھٹکے سے اٹھا اور سامان سنبھالنے لگا پھر جل پنا کو بلایا اور کہا۔

”سرنگ میں اترنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور پاؤں سے کڑے اتار دو۔“

وہ کڑے اتارنے لگی اور کایا پتھا گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ”کیشپ! ہمیں ذرا انتظار کر لینا چاہیے، شاید باہر کوئی خطرہ ہو۔“

”خطرہ باہر ہے تو اندر بھی ہے، ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ میں نے کمند اس کی طرف بڑھائی۔ ”کایا موسا! یہ کمند اپنی کمر سے باندھ لو پہلے تہی نیچے اتر دے۔“

اس نے انکار نہیں کیا، کمند باندھ لی، میں نے ٹارچ جل پنا کو پکڑائی اور کمند کی رسی پکڑ کے بیٹھ گیا روشنی کے دائرے میں کایا سرنگ میں داخل ہوا اور پتھروں کے ابھرے کناروں پر پاؤں لٹکاتا جو اسی مقصد کے لئے چھوڑ دیئے گئے تھے کمند کے سہارے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا، جوں جوں وہ نیچے اترتا، رسی پر دباؤ بڑھتا گیا مگر اس کے جسم کا بوجھ چونکہ پتھروں کے ابھرے کناروں پر پڑتا تھا اس لئے مجھے کمند سنبھالنے اور اسے ہولے ہولے نیچے کھسکانے میں کوئی زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ مگر جب وہ اکیس بائیس فٹ گہری سرنگ سے گزر کر کھائی کی دیوار اترنے لگا اس کا سارا بوجھ کمند پر پڑا اور اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ریشمی ڈور میرے ہاتھوں کے گوشت میں اترتی جا رہی تھی، میں نے اپنے دونوں پاؤں سرنگ کے دہانے میں پھنسا لئے تھے جس سے مجھے جسم کا توازن قائم رکھنے میں مدد ملی۔ میں نے کایا کا سارا بوجھ اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر اٹھالیا اور آہستہ آہستہ رسی بھی چھوڑتا جا رہا تھا، کوئی دس بارہ منٹ کی کشمکش کے بعد کایا کے پیروں نے زمین چھولی پھر اس نے کمند کمر سے کھول کر ہلائی میں نے رسی اوپر

کھینچ لی۔

اس کے بعد انہی ہاتھوں سے جن میں گہری سرخ لکیریں پڑ گئی تھیں۔ کمند جل پنا کی کمر میں باندھی، ٹارچ جلا کر سرنگ کے دہانے پر رکھ دی اور دھیرے دھیرے اسے بھی سرنگ میں اتارنے لگا میرا خیال تھا شاید وہ کمند کے ذریعے اپنا شہریر قابو میں نہ رکھ سکے اور اسے اتارنے میں مشکل پیش آئے مگر وہ اس طرح سنبھل سنبھل کر سرنگ سے گزری اور اس احتیاط سے کھائی کی دیوار سے پاؤں ٹکاتی نیچے اتری جیسے کمند کے ذریعے دیواروں پر چڑھنے اترنے کی مشق کرتی رہی ہو۔ اس کا نازک جسم بھی کایا سے ہلکا تھا لہذا مجھے اس کا بوجھ سہارنے میں کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی اور چند منٹ میں وہ بھی نیچے پہنچ گئی۔

اب میرے اترنے کا سوال تھا، میں نے کمند کا ایک سرا کمر سے باندھا، دوسرے سرے کا آہنی کنڈا فرش کے پتھروں کی ایک درز میں پھنسا یا اور اسے اچھی طرح کھینچ کر اطمینان کر لیا کہ نکلے گا نہیں پھر بسولا اٹھا کر کمر میں اڑس لیا۔ یہ بسولا بطور ہتھیار ساتھ لے آیا تھا کہ نہ جانے بھاگتے سے کیا حالات پیش آئیں۔ ٹارچ کوٹ کی جیب میں رکھی اور کمند کے ذریعے سرنگ کے کانٹے ہوئے پتھر کے کونوں، کھدروں پر پاؤں رکھتا بڑی احتیاط سے نیچے اترنے لگا، گھپ اندھیرے کی وجہ سے پاؤں اچٹ جانے اور ذرا سی بے احتیاتی پر کمند کا کنڈا پتھروں کی درز سے نکل جانے کا ڈر تھا اس لئے بہت سنبھل سنبھل کر اترتا اور آخر پاؤں کھائی کے سر پر آگئے جہاں سے بنیادی پتھر اکھڑ کے گرا تھا

میں نے کنارے پر پیر ٹکا کے ٹارچ نکالی اوپر سرنگ میں روشنی کا دائرہ پھینکا اور رسی کو جھٹکا دے کر کمند کا کنڈا پتھروں کی زد سے نکالنے لگا، کمند ساتھ ہی لے جانا چاہتا تھا اس لئے ضروری تھا کہ اب اس کے کنڈے کو کھائی کے کسی پتھر سے اٹکا کر نیچے اتروں، چوتھی کوشش کامیاب ہوئی اور کمند کا آہنی کنڈا بیت الخلاء کے پتھروں کی درز چھوڑ کر میرے اوپر گرا پھر ٹارچ کی روشنی میں اسے کھائی کے سرے پر ایک پتھر سے اٹکایا۔ ٹارچ جیب میں رکھی اور کھائی کی مہیب دیوار سے پاؤں ٹکاتا نیچے اترنے لگا، یوں لگتا تھا کسی پراسرار اور طاقت ور ہاتھ نے کمند کو اوپر سے تھام رکھا ہے میں دیوار پر پھسلتا، سنبھلتا چند لمحوں کے بعد گہری کھائی میں بلے کے ڈھیر پر کھڑا تھا جہاں کایا پتھا اور جل پنا میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے کمند کو جھٹکا دے کر اس کا کنڈا کھائی کے سرے نکالا جو ہمارے قریب ہی گرا پھر کمند لپیٹتے ہوئے تاروں کی مدد سے روشنی میں کھائی کا جائزہ لیا تو ہم کم و بیش 80-85 فٹ گہری خندق میں کھڑے تھے جو اٹھارہ بیس فٹ چوڑی اور جس کی دونوں قدرتی دیواریں بلند فصیلوں کی طرح اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔

جل پنانے فوراً ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا، باہر پہاڑوں کا مخصوص سناٹا طاری تھا، رات کی سردی بھی تھی اور تاریکی بھی مگر یہ تاریکی زمین کے پیٹ میں اترتی ہوئی اس کال کوٹھری کے بھیانک اندھیرے سے بہت مختلف تھی، جسے ہم چھوڑ آئے تھے، میں نے کمند کا یا پتھا کے حوالے کی، بائیں ہاتھ میں ٹارچ اور دائیں ہاتھ میں بسولا سنبھالا اور پورب کا رخ کیا۔

سرنگ کی بنیاد کا پتھر گرنے سے اگرچہ ہولناک دھماکہ ہوا تھا اور خطرہ تھا، اس کی آواز سن کر خانقاہ کے پہرے دار یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آواز کیسی تھی، باہر نکل آئیں گے لیکن کایا نے بتایا اس نے اندھیرے میں ہر طرف نظریں دوڑائیں اور دور و نزدیک کسی سائے کو بھی حرکت کرتے نہیں دیکھا، کایا کی آنکھیں گہرے اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں اس لئے مجھے اس کے بیان پر پورا وشواس تھا، اس نے پانچ برس کے بعد کھلی فضا میں سانس لی اور تاروں بھرا آکاش دیکھا تھا پھر بھی بے حد خوفزدہ اور سہا سہا نظر آیا، اسے صرف ایک ہی فکر تھی کہ اس لعنتی خانقاہ اور منحوس بستی سے جتنی جلد ہو سکے، دور۔۔۔ دور نکل جائے۔

کھائی کے اندر روڑے، کنکر، پتھر پڑے تھے، ہم کبھی کبھی ٹارچ کی روشنی میں انہیں دیکھ لیتے اور پورب کی طرف بڑھتے رہے، مدایا بھکشو کے ساتھ میں اس خندق نما کھائی کا پہلے ہی دن جائزہ لے چکا اور جانتا تھا کہ وہ پورب کی طرف سوڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر ختم ہو جاتی ہے، کمند احتیاطاً ساتھ لے لی تھی کہ شاید اسی کے سہارے کھائی سے نکلنا پڑے اور واقعی اس کی ضرورت پیش آگئی۔

ناہموار کھائی کے اندر جس کی تہہ بتدریج بلند ہو رہی تھی ٹھوکروں سے بچنا اور آہٹ کے بغیر چلنا بڑا مشکل کام تھا کیونکہ کھائی خانقاہ کے عقب میں تھی اور آہٹ کسی خطرے کا سندیس بن سکتی تھی، اسی لئے جل پنا کے پیروں سے کڑے اتروالے تھے، ہم بڑی احتیاط سے چلتے اس سرے پر پہنچے جہاں کھائی بند ہو گئی تھی، یہاں اس کی چوڑائی دس بارہ فٹ اور اونچائی بیس پچیس فٹ سے زیادہ نہ تھی مگر یہ بیس پچیس فٹ اونچی دیواریں بالکل سپاٹ اور عمودی تھیں جن سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

میں نے پوربی سرے پر کمند پھینکی جہاں نوکیلے پتھروں کی باڑھ تھی۔ کندھا اٹکا اور سب سے پہلے میں باہر نکلا مگر کمند کے ذریعے عمودی دیوار چڑھتے ہوئے مجھے اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کرنا پڑی، جل پنا کے لئے یہ چڑھائی مشکل تھی میرے بعد کایا پتھا باہر نکلا پھر ہم دونوں نے مل کر اسے اوپر کھینچ لیا۔

کھائی سے نکل کر چراگاہ سے گزرتے دھن کی طرف اس راستے پر ہوئے جس سے مدایا بھکشو مجھے لے کر آیا تھا، پہاڑی راستے پر آئے تو رات کے دو بج رہے تھے اور ستاروں کے

جھمکے، تگنوں، چوکٹھے سر پر آگئے تھے، آکاش اونچے پر بتوں کی چوٹیوں اور گھاٹیوں پر کسی جھلملاتے شامیانے کی طرح جھکا ہوا تھا اور پہاڑوں کی سرد ہوا جسم میں اترتی جا رہی تھی۔

اندازے کے مطابق سردار تھا پا کو دن چڑھے سات آٹھ بجے کے درمیان مقبرہ نما تہہ خانے میں اترنا اور کال کوٹھری کا دروازہ کھلوا کر ہم سے فیصلہ کرنا تھا، اسی لمحے ہمارے فرار کا انکشاف ہوتا جس کے بعد قبائلی سوار ہمیں ڈھونڈنے اور ہمارا پیچھا کرنے نکلتے گویا فرار کا بھید کھلنے اور تلاش و تعاقب میں دوڑنے تک ہمارے پاس پانچ چھ گھنٹے تھے اور انہی پانچ چھ گھنٹوں میں ہمیں تیز رفتاری کے ساتھ ان کی گرفت سے دور نکل جانا تھا۔

چلتے چلتے میں نے کایا پتھا کو اس صورتحال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ سورج نکلنے تک اگر ہم رتتا گری کی وادی میں پہنچ جائیں تو خطرے سے نکل سکتے اور یہ فیصلہ چل کر نہیں دوڑ کر طے کیا جا سکتا ہے جل پنا دنگ رہ گئی۔

”رات کے اندھیرے میں پر بتوں کے حاشیوں پر بھاگنا خطرناک ہے۔“

”مگر جہاں تک بھاگ سکتے ہیں ہمیں بھاگنا ہو گا۔“

اور ہم اونچے اونچے پہاڑی راستے پر بھاگنے لگے، میں اور جل پنا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے آگے تھے اور کایا پتھا ہمارے پیچھے پیچھے لیکن ابھی ہم ڈیڑھ دو فرلانگ ہی بھاگے ہوں گے کہ جل پنا رک کر ہانپنے لگی۔ میں نے کہا ”بھاگتی رہو۔“

مگر اسے ناپچنے کا تجربہ تھا، بھاگنے کا نہیں، بولی۔ ”دم پھولنے لگا ہے میرا۔“

میں نے جھپاک سے اسے بازوؤں میں لپیٹ کر اٹھایا۔ وہ تڑپی، مچلی۔ ”ارے کیا کرتے ہو؟“

لیکن یہ سے عذر سننے کا نہیں تھا، میں نے اسے پیٹھ پر لادا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا غالباً وہ نہیں جانتی تھی کہ قبائلی لوگوں کو دھوکہ دے کر فرار ہونا کتنا خطرناک ہوتا ہے، اب جبکہ ہم ان کا مضبوط حصار توڑ کے نکل آئے تھے، رکنا ہماری موت اور بھاگنا اور مسلسل بھاگتے رہنا ہماری زندگی تھی۔

○

تھوڑی دور تک دھن کی سمت بھاگنے کے بعد ہم نے پچھم کی جانب کانٹو کا رخ کیا، گوئٹے مدایا کے ساتھ جب میں پہاڑی خانقاہ کی طرف آیا تو ان راستوں کو اچھی طرح دیکھ لیا اور دھیان میں رکھا تھا کہ اگر واپسی خطرناک حالات میں ہوئی تو کہیں رستہ بھول کر کسی اور سمت نہ نکل جاؤں، وہی احتیاط اب کام آ رہی تھی اور میں جل پنا کو اٹھائے کبھی ٹارچ جلاتا، کبھی بجھاتا اندھیرے میں بھاگا جا رہا تھا۔ کایا پتھا میرے پیچھے پیچھے تھا۔

پہاڑی راستوں کے پیچ و خم اور اتار چڑھاؤ ویسے ہی تھکا دینے والے ہوتے ہیں مگر کانگٹو کے اٹھارہ بیس ہزار فٹ اونچے پر بتوں، فلک بوس چوٹیوں، برف پوش گھاٹیوں کے درمیان یہ مڑاڑا راستہ جو پہاڑیوں کی گوٹ پر پتلی لکیر کی مانند چلا گیا تھا، بڑا ہی دشوار گزار اور خطرناک تھا، جگہ جگہ بھیانک موڑ اور قدم قدم پر پہاڑی کھڈ عفریتوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے تھے، ذرا پاؤں پھسلتا تو موت سینکڑوں فٹ گہرے نشیب میں لڑھکا دیتی گویا تلوار کی دھار پر چلنا تھا، مگر ہم چل ہی نہیں بھاگ رہے تھے جیسے موت ہمارا پیچھا کر رہی ہو۔

اس علاقے میں بہت کم بستیاں ہیں، وہ بھی دور دور۔ اندھیری راتوں میں سفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر کوئی بھولا بھٹکا آدمی ہمیں اس طرح روشنی جلاتے بجھاتے اور دیوانہ وار بھاگتے دیکھ لیتا تو ویران پہاڑوں کی بد روئیں اور بھوت پریت سمجھ کر مارے دہشت کے بے ہوش ہو جاتا۔ بھوتوں کے بارے میں مشہور ہے کہ اندھیری راتوں میں کبھی روشنی جلاتے، کبھی بجھاتے، ناچتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے یا پھر اپنا شکار ڈھونڈتے ہیں۔ پہاڑی راستوں پر ہم بھی بھوتوں ہی کی طرح بھاگے جا رہے تھے۔

تاریکی کے علاوہ اونچے پر بتوں کی برفانی ہوا بھی ہمارا راستہ روک رہی تھی جو ویران پہاڑی وادیوں، گلیوں، کھائیوں اور گھاٹیوں میں بیراگن کی طرح چپتی، چلاتی پھرتی تھی، جوں جوں ہم کانگٹو کی طرف بڑھتے گئے ہوا کی تیزی اور تندگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس بخ بستی اندھیری رات میں کبھی بھاگتے، کبھی چلتے کبھی پل دوپل دم لیتے ہم آگے بڑھتے رہے، مسلسل بھاگ دوڑ میں سردی کا احساس جاتا رہا تھا، ہمارے شریر گرم بلکہ پسینہ میں بھیگ رہے تھے۔

جل پنا کو یہ خیال بار بار پریشان کر رہا تھا کہ میری پیٹھ پر لدی ہے اور میں اپنے ساتھ اس کا بوجھ بھی اٹھائے بھاگ رہا ہوں، اس نے ایک دو بار اصرار کیا کہ اسے اتار دوں مگر ان خطرناک راستوں پر وہ بھاگ تو کیا چل بھی نہیں سکتی تھی اور ہمیں یہ راستے جلد سے جلد عبور کر لینا تھے، ہمارے جیون کی بازی موت سے لگی تھی۔ تھاپا بہادر کے قبائلی سوار دن کا اجالا پھیل جانے کے بعد شکاری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے جھپٹ پڑیں گے اور یہ بے رحم قبائلی جو پر بتوں کی طوفانی ہواؤں کے ساتھ اڑتے اور اپنے شکار پر وحشی درندوں کی طرح جھپٹتے ہیں اگر تعاقب میں نکل آئے تو ہمارا بچ نکلنا مشکل تھا۔ کاپا پنتھا اس بھیانک حقیقت کو اچھی طرح جانتا تھا اور اب جل پنا بھی صورتحال کی سنگینی کو سمجھ رہی تھی، اس لئے چپ ہو گئی۔ اس نے اپنی نازک کلائیوں میری گردن میں پرو دی تھیں اور میں اسے پیٹھ پر لادے بھاگ رہا تھا جیسے صدف اپنے موتی کو اٹھائے ساگر کی لہروں میں سفر کرتا ہے۔

اس سرد، اندھیری، بھیانک رات میں جیون کی لگن ہماری ہر مشکل پر غالب آ رہی تھی اور

جیون اس تاریکی میں بھی ہمیں راستہ دکھا رہا تھا۔

اچانک ماحول میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوئی، آکاش پر چاند ابھرنے لگا اور اس کی زرد روشنی ہولے ہولے کالے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں اور گھاٹیوں پر بکھرتی چلی گئی، ہمارا راستہ روشن اور سفر آسان ہو گیا ہم کانگٹو کے اونچے برفانی پر بتوں کو پیچھے چھوڑ آئے اور دھن کے رخ بڑھ رہے تھے۔

رتنا گری کی وادی سے پہاڑی خانقاہ انیس بیس میل اور کانگٹو چودہ پندرہ میل کی مسافت پر تھا، دو گھنٹوں میں ہم نے تقریباً سات میل کا فاصلہ طے کر لیا اور ابھی مزید بارہ میل کا سفر باقی تھا، یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ہماری پہلی منزل رتنا گری ہی تھی کیونکہ میں اسی راستے سے واقف تھا، اس منزل کی طرف رخ کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے اندازے کے مطابق تھاپا اور اس کے آدمی ہمارا تعاقب کرتے رتنا گری تک نہیں آ سکتے تھے، وہ سروپ جی، شناستر و اور پیگو کے سامنے خانقاہ میں میری آمد و موجودگی سے انکار کر چکے تھے لہذا اس وادی میں ہرگز نہ آتے جہاں انہیں ساؤ گاری کے بایوں سے آمنے سامنے کا دھڑکا تھا۔

کانگٹو سے گزرنے کے بعد سفر کچھ آسان ہو گیا۔ آخری راتوں کا چاند آکاش سے ہماری رہنمائی کر رہا تھا، اب جل پنا میری پیٹھ سے اتر آئی اور ہمارے قدم بقدم بھاگ رہی تھی جہاں تھک جاتی میں اسے پھر اٹھا لیتا اور کبھی بھی اس کا سندر بدن اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتا۔ کاپا پنتھا ننگے پاؤں رہائی اور نئے جیون کی دھن میں مجھ سفر تھا، بھاگ دوڑ کا یہ سلسلہ سویرے تک جاری رہا۔ تیز ہوا کی وجہ سے دھند بھی نہیں پھیلی تھی جب سورج نے پورب کے پہاڑوں سے سر اٹھا کہ دیکھا ہم رتنا گری کے شمالی پر بت کے حاشیوں پر سفر کر رہے تھے اور انا تھ بن صرف اڑھائی میل دور تھا، منزل پر پہنچنے کی دھن میں یہ فاصلہ بڑی آسانی سے طے ہو گیا۔

میں اپنی آپ بیتی کے شروع میں کہیں بتا آیا ہوں کہ شمالی پر بت کی جنوبی ترائی قدرت کی صنای کا عجیب نمونہ تھی، یہاں اڑھائی تین میل کا نشیب ایک قدرتی اسٹیدیم کا نقشہ پیش کرتا تھا کیونکہ پر بت کی ڈھلان چھوٹے چھوٹے طویل قطعوں میں بٹ گئی اور ان قطعوں نے لمبی لمبی سیڑھیوں کی شکل اختیار کر لی تھی جہاں یہ سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں وہاں سے ترائی کا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔

رات بھر کی جاگی اور تھکی ماندی جل پنا میرا ہاتھ تھامے یہ قدرتی سیڑھیاں اترنے لگی۔ کاپا پنتھا قدرت کی اس عجیب کاری گری پر حیران تھا، آخر ہم نشیب میں اتر کر ترائی کے جنگل میں داخل ہوئے، گھنے درختوں کے بیچوں بیچ بہتا چشمہ عبور کر کے انا تھ بندو کی سادھی پر پہنچے اور وہاں اس طرح ڈھے گئے جیسے کوئی تھکار ہارا پیچھی شکاری کی گولی سے بچ کر اپنے گھونسلے میں گرتا

ہے۔ انیس بیس میل کا انتہائی کٹھن اور مشکل سفر ساڑھے پانچ گھنٹوں میں طے ہوا۔ ساری رات ریائی کی کشمکش اور بھاگ دوڑ میں گزری تھی، ہم تینوں کے جیون میں ایسی رات کبھی نہیں آئی تھی، جسم تھک کر چور ہو گئے، بھوک پیاس سے برا حال اور آنکھوں میں نیند کا غلبہ تھا مگر منزل پر پہنچ جانے کا احساس کچھ ایسا راحت افزا تھا کہ کسی بات کا ہوش نہ رہا اور ہم وہیں پڑے بے سدھ ہو گئے۔

میں نہیں جانتا کب نیند کا جھونکا آیا اور کب میں سو گیا، مگر وہ کایا پنتھا کی آواز تھی جس نے مجھے بیدار کر دیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا جل پنا میرے ساتھ لگی اور اپنی بانہیں میری کمر میں لپیٹے بے سدھ پڑی ہے جیسے اس نے نیند کی حالت میں بھی میری پناہ لے رکھی ہو۔ میں نے اپنے بازو سے اس کا سر اٹھایا اور اسے جگا دیا۔ گھڑی دیکھی تو گیارہ بج رہے تھے اور کایا پنتھا اپنے ہاتھوں میں جنگلی بیر لئے کھڑا تھا، قریب ہی بیروں کی چھوٹی سی ڈھیری نظر آئی، اس نے بتایا اس جنگل کے پورب میں ایک جنگلی بیر لگئی تھی اور وہ بیر توڑ لایا۔ اب مجھے یاد آیا کہ ساؤ گاری چھوڑ دینے کے بعد مدایا بھکشورتا گری کے جنگلوں میں اسی غذا سے پیٹ بھرتا ہوگا۔

ہم جنگلی بیروں پر ٹوٹ پڑے مگر اسی اثناء میں کایا پنتھا کے ننگے پیروں کو دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ دونوں پاؤں زخمی ہو رہے تھے اور تلووں میں کئی چھالے ابھر آئے تھے، ابھی ہمیں رپا تک طویل سفر کرنا تھا، بھلا کایا زخمی پیروں سے کیسے چل سکے گا، وہ میری پریشانی بھانپ کر بولا۔
”گھبراؤ نہیں ایک زمیندار اور کسان کا بیٹا ہوں۔“

ہم نے جنگلی بیروں سے پیٹ بھرا۔ چشمے کا پانی پیا، منہ ہاتھ دھوئے اور تازہ دم ہو کر انا تھ بن سے پوربی جنگل کی طرف بڑھے۔ انا تھ بندو کی سادھی سے چلتے سے میں نے بتا دیا تھا کہ ساؤ گاری کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے پہاڑی درے کا رخ کریں گے۔ وہاں سے رپا اور بائی پارہ سے ہوتے ہوئے پوربی جنگل میں رنگامتی جائیں تاکہ میں ماں کو اس کی پکھڑی آتما سے ملا سکوں، اب سفر میں کمند بے کار تھی اس لئے اسے مدایا بھکشو کی امانت سمجھ کر سادھی پر ہی چھوڑ دیا مگر رستے کے بعض خطروں کے باعث بسولا ساتھ ہی لے لیا، سوچا شکر جانتا ہے میں جل پنا اور کایا پنتھا کو لے کر ساؤ گاری میں نہیں جاؤں گا اور رپا کی طرف بڑھوں گا اس لئے ہو سکتا ہے تھاپا کے سوار بھی ساؤ گاری سے پرے پرے ہمارا تعاقب کریں اور رپا کے رستے پر کہیں گھیر لیں گویا گرفتاری کا ڈر ادھر بھی تھا مگر بھگوان کے آسرے پر چل پڑے۔

رتنا گری کے پوربی جنگل سے گزرتے ہوئے ایک بیر لگئی۔ ہم نے جنگلی بیر جیسوں میں بھرے اور دوپہر کے وقت پہاڑی درے میں پہنچ گئے ساؤ گاری کی قدیم الایام بوڑھی

عمارت پیچھے رہ گئی تھی، درے کے کنارے کھڑے ہو کر اس پر نظر دوڑائی تو وہ کسی کیکڑے کی طرح دکھائی دی جو دھرتی کی چھاتی میں پنچے گاڑے بیٹھا ہو۔ جل پنا اپنے باپ کو اس پر اسرار عمارت کے بارے میں وہ سب باتیں بتاتی رہی جنہیں میں اس سے کہیں زیادہ جانتا تھا۔ اسی عمارت کے اسرار اصل میں کایا پنتھا اور اس کی بیٹی کے لئے پھندا بن گئے تھے مگر میں انہیں پھندے سے نکال لایا تھا۔

درہ عبور کر کے ہم اس گہری دراڑ کی طرف بڑھے جس نے اس وادی کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ جب چوٹی پل پار کیا تو میری ویسٹرن کی گھڑی دو بج رہی تھی مگر ابھی تک ہمارے پیچھے نہ کوئی دھول اڑی نہ ٹاپوں کی آواز ابھری تھی۔ نہ جانے تھاپا بہادر کے سواروں نے ہمارا تعاقب کیوں نہیں کیا تھا؟

اچانک چلتے چلتے مجھے خیال آیا، میں زیر زمین کوٹھڑی کے بیت الخلاء میں سردار تھاپا کے لئے ایک ایسا عجوبہ چھوڑ آیا ہوں جسے دیکھ کر وہ خانقاہ کے پہرے داروں کا جینا حرام کر دے گا اور وہ عجوبہ تھا کدال جس سے سرنگ کھودی گئی۔ 38-40 فٹ گہرے تہہ خانے میں کدال دیکھ کر وہ پاگل ہو گیا اور ہنٹر لے کر پہرے داروں پر ٹوٹ پڑا ہوگا کہ کال کوٹھڑی میں کدال کس نے پہنچائی؟ شاید ہمیں کھانا پہنچانے والے پہرے دار کی کھال بھی ادھر لگئی ہو اور اس طرح تھاپا فوری طور پر کسی کو ہمارے تعاقب میں نہ بھیج سکا ہو۔

یہ بھی ہو سکتا ہے تھاپا کے قبائلی سوار فوراً ہی ہمارے کھوج میں دوڑ پڑے ہوں اور اس نے یہ سوچ کر کہ کایا پنتھا برمی زمیندار ہے۔ اپنی بیٹی کو لیکر برما کی طرف جا رہا ہوگا۔ سواروں کو ہدایت کی ہو کہ وہ کانگٹو سے نکل کر ہمیں شمال مشرقی آسام کے پہاڑی راستوں پر تلاش کریں اور سوار اسی طرف نکل گئے ہوں، اگر وہ سچ مچ انہی راستوں پر نکل گئے تھے تو ان کی منزل رپا کی بجائے لاکھم پور ہوگی گویا پر اسرار تقدیر انہیں ہم سے دور پوربی پر بتوں کی سمت لے گئی تھی، صرف شکر ساؤ گاری کی طرف بھاگا ہوگا تاکہ اپنے گورو گنجال کو ہمارے فرار کی خبر دے سکے۔

ہمارا سفر انہی خیالوں میں کٹتا رہا اور سہ پہر کے قریب ہم پانی کی اس لکیر پر پہنچے جو رتنا گری اور رپا کے بیچ واقع ہے، آدھا راستہ ادھر اور درمیان میں پہاڑی چشمہ جس پر ساؤ گاری کے مسافر بڑاؤ کرتے تھے۔

جنگلی بیروں کے سوا ہمارے پاس اور کوئی زادراہ نہ تھا۔ ہم تھکے ہارے چشمے کے کنارے بیٹھ گئے، ایک بار پھر بیروں سے بھوک مٹائی، پانی پیا اور چشمے میں اتر کر اپنے جسموں کا میل کاٹا، مجھے اگر تیرہ چودہ دن سے نہانے کا موقع نہیں ملا تو کایا پنتھا پانچ سال سے نہیں نہایا تھا، جب وہ اشنان کر کے نکلا تو بھگوان کا شکر ادا کرنے لگا جس نے اسے لعنتی بندی گھر سے رہائی

بخشتی تھی۔

نہانے سے جسم کھل گئے، کچھ تھکان بھی اتر گئی اور ہم پھر چل پڑے، سفر ناگزیر تھا تا کہ ہم جلد سے جلد مہذب دنیا کے قریب پہنچ سکیں۔ جل پنا کے لئے اتنا طویل سفر ممکن نہ تھا، وہ تھک کر بیٹھنے لگتی تو میں ابے پہلے کی طرف پیٹھ پر لاد لیتا یا گود میں اٹھا کر چلنے لگتا۔ گہری شام میں بھی سفر جاری رہا، رپا سے آٹھ دس میل ادھر جہاں سے ساگوان کے درختوں اور ربڑ کے جنگلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، ہماری ہمت جواب دے گئی، اندھیرا بھی گہرا ہو گیا تھا اور اب کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں ہم رات بسر کر سکتے۔

راستے سے ہٹ کر پہاڑیوں میں کوئی غار ڈھونڈ رہے تھے کہ پورب کی طرف بہت دور پہاڑی جنگل میں روشنی ٹٹماتی نظر آئی، میں دن کے اجالے میں ادھر سے کئی بار گزرا تھا مگر آس پاس کسی بستی کے آثار دکھائی نہیں دیئے تھے، خیال آیا شاید ربڑ کے جنگلات میں کام کرنے والے مزدوروں کا کوئی جھونپڑا ہو جہاں ہمیں سر چھپانے کو جگہ مل جائے، روشنی میل پون میل دور ٹٹمنا رہی تھی، ہم تن یہ تقدیر گھاٹیوں کے پیچ و خم سے گزرتے تارچ کی روشنی میں پورب کی طرف ایک اور وادی میں اترے۔ تھوڑے فاصلے پر ربڑ کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان کے درمیان چلتے ہوئے روشنی کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی کبھی دکھائی دینے لگتی۔ قریب پہنچے تو دیکھ کر آس بندھی وہ کوئی جھونپڑا نہیں بلکہ ایک چوبی ہٹ تھا جہاں جنگل میں کام کرنے والے بعض مزدور رات بسر کرتے تھے۔

ہٹ کے مزدوروں نے ہمیں اسی وقت دیکھ لیا تھا جب ہم تارچ کی روشنی پھینکتے وادی میں اترے تھے، ایک آدمی لالین اٹھائے ہماری طرف بڑھا اور دور سے بولا۔

”کون ہے؟“

میں نے آسامی زبان میں جواب دیا۔

”مسافر۔۔۔ رات بسر کرنا چاہتے ہیں۔“

آنے والا ایک ادھر عمر آسامی تھا، اس نے لالین کی روشنی میں میرا اور میں نے اس کا جائزہ لیا، میرے اوور کوٹ کا حلیہ اگرچہ گردش سفر سے بگڑ چکا تھا، پھر بھی اس نے میری تہذیب و شائستگی کی گواہی دی۔ آسامی نے پوچھا۔

”کہاں سے آئے ہو بابو!“

”کانگٹو سے۔۔۔ رپا جانا ہے۔“

وہ کانگٹو کا نام سن کر چونکا، میں اس کی وجہ بھی سمجھ گیا۔ ان دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان شاید ہی کسی نے کانگٹو کا سفر کیا ہو۔ ادھر آنے جانے کا راستہ تو اور ہی تھا، ہماری صورتوں سے

ظاہر تھا کہ طویل سفر کر کے آئے اور سخت تھکے ماندے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا ہماری حالت قابل رحم تھی، اس کے چہرے پر ہمدردی کے آثار نظر آئے۔

”لگتا ہے رستہ بھٹک گئے اور بڑے جوکھوں سے گزر رہے ہو۔“

ان الفاظ میں اس نے ہمارا سواگت کیا اور ہمیں ساتھ لے کر ہٹ کی طرف ہولیا۔ ہٹ کافی بڑا اور تین چار کمروں پر مشتمل تھا، پتہ چلا کہ جنگل کے ٹھیکیدار کا دفتر بھی تھا اور رہائش گاہ بھی، ادھیڑ عمر آسامی ٹھیکیدار کا منیم اور اپنی بیوی کے ساتھ وہیں رہتا تھا، اس کے ساتھ دو تین مزدور تھے، کبھی کبھار ٹھیکیدار خود بھی وہاں رات گزار لیتا جو رپا میں رہتا اور مہینے میں صرف دو تین بار ادھر آتا تھا، اس کے لئے الگ کمرہ مخصوص تھا، ہمارے لئے وہی کمرہ کھول دیا گیا، منیم ہمیں کمرے میں بٹھا کر اور لیپ روشن کر کے نکل گیا، پھر چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا تین کمبل اٹھائے داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے منیم بھی آیا، اس نے لڑکے کو ہدایت کی۔

”مہمانوں کے لئے کھانا ذرا جلدی لے آنا۔“

پھر ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا وہ کایا پنتھا کی ہیئت کدائی پر حیران تھا، میں نے مختصر بتایا کہ اسے کانگٹو کے ایک قبیلے نے اپنا بندی بنالیا تھا، میں چھڑا کے لایا ہوں، منیم کایا کی دکھ بھری قید کا ذکر سن کر بڑا متاثر ہوا۔ تھوڑی دیر میں لڑکا کھانا لے آیا، جل پنا اور میں نے کئی دن اور کایا پنتھا نے کئی سال کے بعد سبزی ترکاری اور چپاتی کا مزا چکھا، کھانے کے بعد نیند نے آلیا اور ایسی گہری نیند سوائے کہ دن چڑھے آنکھ کھلی۔

ہٹ کے مزدور سویرے جنگل میں کام کرنے چلے گئے تھے، منیم یہ پوچھنے آیا، ہمیں رات کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی اور ہم ناشتہ کس وقت کریں گے، میں نے اس کی مہمان نوازی کا شکر یہ ادا کیا اور کہا۔

”منیم جی! ناشتہ بھی ہو جائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ یہاں حجامت کا سامان مل جائے گا؟“

وہ میرا بڑھا ہوا شیوہ دیکھ کر مسکرایا پھر اسی کمرے سے ایک چھوٹا سا چوبی ڈبا نکال کر میرے سامنے رکھ دیا، اس ڈبے میں قینچی، استرا، برش، صابن، آئینہ ہر شے موجود تھی، میں سمجھ گیا یہ سامان ٹھیکیدار کا ہوگا کیونکہ کبھی کبھار ہی استعمال میں آتا تھا۔ منیم یہ کہہ کر چلا گیا۔

”تم حجامت بنا لو، میں ناشتہ تیار کرتا ہوں۔“

حجامت کا سامان دراصل کایا پنتھا کے لئے مانگا تھا جس کی داڑھی، مونچھوں اور سر کے بال سادھوؤں کی طرح بڑھ گئے تھے اور شہری دنیا میں داخل ہونے سے پہلے ضروری تھا کہ حلیہ ٹھیک کر لیا جائے۔ کایا پنتھا کا حلیہ درست کرنے میں پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ حجامت کے بعد وہ الگ مار پھر سنگ کانگ کی حکمتی کے زمیندار کایا پنتھا کے روپ میں آ گیا، باپ کو اصل روپ میں

دیکھ کر جل پنا اس سے لپٹ گئی۔ اب وہ پینتالیس سال کا خوش شکل آدمی نظر آ رہا تھا، میں نے اپنا حلیہ بھی ٹھیک کیا اور ہاتھ منہ دھو کر ناشتے کا انتظار کرنے لگا۔

منیم نے ہمارے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا اور کایا کے لئے کرتا پا جامہ اور ایک عدد پرانا جوتا بھی مہیا کر دیا۔ رخصت ہونے لگے تو میں نے بیس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے مگر اس نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ زور لگایا تب بھی نہیں لئے، پہاڑی جنگل سے ایک سیدھا راستہ رپا کو جاتا تھا، اس نے بتایا۔

”اس راستے پر کوئی دو میل دور ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں سے سواری کے گھوڑے مل جائیں گے۔“

اس نے بڑے تپاک سے ہمیں رخصت کیا۔

دو میل کے سفر طے کرنے کے بعد بستی میں داخل ہوئے تو گھوڑے مل گئے اور دو پہر کو ہم رپا پہنچ گئے، وہاں سے لاری پکڑی اور بائی پارہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر میں اگر کوئی خاص بات تھی تو صرف یہ کہ پچھلے دنوں جب میں رنگامتی گیا تو رپا سے بائی پارہ تک سندرمتی میری شریک سفر تھی اور اب اس کی بجائے جل پنا میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

سہ پہر کو ہم بائی پارہ پہنچے، من چاہتا تھا حویلی میں جاؤں اور ایک نظر سندرمتی کو دیکھ لوں مگر لاری اڈے سے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا جل پنا اور کایا پنتھا کی ہمراہی میں سندرمتی سے ملنا مناسب نہ سمجھا، البتہ پوسٹ آفس سے ایک کارڈ اسے پوسٹ کر دیا عبارت مختصر تھی۔

پیاری سندرمتی!

میری چٹنا نہ کرنا، میں گم نہیں ہوا۔ ساؤ گاری سے جو آدرش لے کر نکلا تھا اسے پورا کر کے بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا یہ اطلاع صرف تمہارے لئے ہے کہ میں بالکل خیریت سے ہوں، کسی اور کو بتانے کی ضرورت نہیں، آکر بتاؤں گا، پچھلے دنوں میرے ساتھ کیا ہوتی۔

(تمہارا کیشپ)

یہ کارڈ صرف اس لئے لکھ دیا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ بائی پارے سے شام کی گاڑی مل گئی۔ ریل کا سفر بڑے مزے میں کٹا، رات کچھ سوتے، کچھ اونگھتے کچھ جاگتے گزاری۔ دوسرے دن صبح کے سے گاڑی ”نیندوں کے سبز شہر“ چٹا گانگ میں پہنچ گئی اور ہم اسٹیشن سے نکل کر شہر میں داخل ہوئے۔

پہاڑی خانقاہ سے چٹا گانگ تک سفر کی ایک کہانی ختم ہو گئی اور دوسری شروع ہوئی تھی، پچھلے دنوں ساؤ گاری جاتے ہوئے میں نے چٹا گانگ سے سندرمتی کے لئے جڑاؤ ہار اور جل پنا کے لئے جڑاؤ کڑوں کی جوڑی خریدی تھی۔ سندرمتی کو تو ہار کا تحفہ دے دیا مگر جل پنا کو ابھی

تک کڑے بھیٹ نہیں کر سکا تھا۔ وہ کڑے ساؤ گاری ہی میں رہ گئے تھے۔ اب میں جل پنا کو کوئی نیا تحفہ دینا چاہتا تھا۔ اس لئے پہلے بینک سے روپے نکلا کر سیٹھ لکشمی نارائن کی دکان پر پہنچا اور جل پنا کی پسند کے جڑاؤ جھمکے خریدے۔ یہ پہلا تحفہ تھا جو اسے بھیٹ کیا، اس نے میرے اصرار پر جھمکے پہن لئے۔ اس طرح میں ”بھگوان کی نرتکی“ کو اپنی دنیا میں واپس لے آیا۔ بازار سے ایک نئی ساڑھی بھی لے کر پہنا دی اور یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب وہ کسی مندر کی پجاری اور نرتکی نہیں رہی۔ کایا پنتھا سب کچھ چشم حیرت سے دیکھ رہا تھا، میں نے اس کے لئے، اپنے لئے، ماں کیلئے کچھ کپڑے خریدے اور دریائی بندرگاہ کا رخ کیا۔

اس بندرگاہ سے جل پنا اور کایا پنتھا کے ایک نئے جیون کا آغاز ہو رہا تھا اور جب لانچ دریائے کرناٹکی کی لہروں پر رنگامتی کی طرف روانہ ہوئی، ان دونوں کا ایک جیون ایک المناک ماضی پیچھے رہ گیا۔



کایا پنتھا نے چٹا گانگ اور اس کا ساحلی علاقہ ہی نہیں بنگال کا نیرنگ زمانہ جنگل سندرمتی بھی دیکھا تھا، جسے کتنی ہی ندیوں اور کھاڑیوں نے کٹی قطعوں اور جزیروں میں بانٹ دیا تھا اور یہ گھنے قطعے اور جزیروں پر خلیج بنگال کے پورے ساحل پر شکاریوں کے بھیاٹک سپنوں کی طرح بکھرے تھے مگر جل پنا کے لئے سبز نیندوں کے اس علاقے میں ایک انجانی کشش تھی اور کرناٹکی کے دونوں کناروں پر سرسبز شاداب پہاڑیوں اور جنگلات کا منظر اسے حیران کئے دیتا تھا۔ انہی حسین و دلکش نظاروں کے درمیان سے گزرتی لانچ رنگامتی کے ساحل سے آگئی۔

جب میں کایا پنتھا اور جل پنا کو لے کر گھر کے دروازے پر پہنچا، شام ہو رہی تھی اور سندرسا ملکجا اندھیرا دیواروں اور منڈیروں پر پھیلتا جا رہا تھا۔ دستک دینے کی نوبت نہیں آئی دروازہ کھلا تھا، میں باپ بیٹی کے آگے اندر داخل ہوا اور ماں کو آواز دی جو میری آواز سنتے ہی رسوئی گھر سے نکلی اور آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔

”ارے کیشپ بیٹے! میں نے رات ہی سپنا دیکھا تو میری طرف بھاگا آ رہا ہے میں حیران تھی نجانے یہ کیسا سپنا ہے۔“

”اور دیکھ لے میں آگیا ماں! تیرا سپنا پورا ہو گیا۔“

اس نے ابھی تک توجہ نہ دی تھی کہ میرے ساتھ کون ہے جو نہی نظر جل پنا پر پڑی مجھے چھوڑ کے ایک دم پیچھے ہٹی اور حیرت پاش نظروں سے اسے دیکھتی ہی رہ گئی، جل پنا ہو بہو اپنی ماں چندر بالا کی تصویر تھی۔ اس تصویر کو دیکھا تو تصویر حیرت بن گئی، میں نے کہا۔

”ماں! پہچان تو سہی! کون ہے یہ؟“

ماں نے کایا کو اٹھایا اور اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔
 ”ارے کایا۔۔۔! آج تو میرا من دھل گیا، میری مایا مجھے مل گئی۔
 اس کے ساتھ اس نے جل پنا کو پھر اپنی بانہوں میں بھر لیا اور بولی۔
 ”اب تم بھی برما چھوڑ کر یہیں آ جاؤ۔“

اور میں نے یہ انکشاف کر کے اسے دم بخود کر دیا۔
 ”ماں! تو اپنی آتما کو اپنے پاس رکھ مگر کایا موسا برما نہیں چھوڑ سکتے یہ کل ہی حکامتی کی طرف
 روانہ ہو جائیں گے اور میں بھی ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔“
 یہ پروگرام کایا پنتھا اور جل پنا کو بھی حیران کر دینے والا تھا کیونکہ ان کے ساتھ برما جانے
 کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس ایک ایکی پروگرام پر دونوں حیرت سے مجھے دیکھنے
 لگے، میں نے بتایا۔

”کچھ باتیں ختم ہو گئیں اور کچھ باقی ہیں اور ان کا انت حکامتی میں ہوگا۔ اس لئے ہمارا
 جلد وہاں پہنچنا ضروری ہے۔“

شاید میرے قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ کس چیز کی کشش مجھے سنگ کالنگ حکامتی کی طرف
 کھینچ رہی تھی۔۔۔ سارگلیان کی وہی پراسرار ڈبیا جسے حاصل کرنے کے لئے پروہت گنجال نے
 کایا پنتھا کو زندہ ہی قبر میں اتار دیا اور اس کی بیٹی کی خوشیاں چھین لی تھیں، مقدس مورتی کے
 ساتھ مجھے وہ ڈبیا بھی حاصل کرنا تھی اور میں جلد از جلد اس گنجینہ اسرار تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

○○○

میرے الفاظ نے اس کی محویت توڑ دی اور کپکپاتی آواز میں بولی۔
 ”میں نے پہچان لیا ہے، اپنی پھڑی آتما کو۔۔۔ یہ میری چندر بالا کی نشانی ہے۔۔۔۔۔ یہ
 جل پنا ہے میری۔۔۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ لپک کے آگے بڑھی اپنی پھڑی آتما کو بڑی بے قراری کے ساتھ گلے سے لگایا
 اور سسکیاں بھر کے رونے لگی، جل پنا کو بھی اس کے روپ میں اپنی ماں کی جھلک نظر آئی تھی جو
 اسے جنم دیتے ہی چل بسی، اس نے ماں کی متا دیکھی تھی نہ موسی کا پیار۔ اب جو ایک روتی
 کر لاتی عورت نے اسے گلے سے لگایا تو وہ بھی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور ماں سے چمکتی
 چلی گئی، انہیں روتے بلکتے، تڑپتے سکتے دیکھ کر میری آنکھیں بھی بھیک گئیں، دل بھر آیا۔
 ماں رو بھی رہی تھی بار بار جل پنا کا منہ بھی چوم رہی تھی اور اپنی متا کا اظہار بھی کئے جا رہی تھی۔

”میری بچی۔۔۔ میری آتما۔۔۔ میری گڑیا۔۔۔“
 نجانے اس نے چندر بالا کی اس جیتی جاگتی تصویر کو کتنی بار چوما، کتنی بار گلے لگایا، یوں لگتا
 تھا، وہ اسے اپنے اندر سمو لینا، چھپا لینا چاہتی ہے تاکہ کوئی ان دونوں کو جدا نہ کر سکے۔ جل پنا
 کی سسکیوں کے درمیان صرف ایک ہی لفظ سنائی دے رہا تھا اور وہ یہ لفظ تھا۔ ”ماں۔۔۔۔۔“ جو
 اس کے ہونٹوں پر سسکتا اور آنکھوں سے ٹپکتا رہا اور اس ایک لفظ نے سب کو تڑپا دیا۔ ماں نے
 اسے بھیج لیا۔

”تیرے روپ میں میری چندر بالا مجھے مل گئی۔ وہ مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ مگر تجھے کبھی نہیں
 روٹھنے دوں گی۔ کہیں نہیں جانے دوں گی۔۔۔۔۔“

کایا پنتھا بھی ایک طرف کھڑا رہا تھا، میں نے بھیگی آواز میں کہا۔
 ”ماں! جل پنا اب کہیں نہیں جائے گی مگر کیا تو کایا پنتھا سے نہیں ملے گی؟“

کایا پنتھا کا نام سن کر وہ چونکی اور آنسو پونچھتی حیرت زدہ سی بولی
 ”تو نے کہا تھا کایا۔۔۔۔۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”وہ خبر غلط تھی ماں! کایا موسا مرے نہیں تھے، زندہ ہیں اور جل پنا کے ساتھ میں انہیں بھی

تیرے دوار پر لے آیا ہوں۔۔۔ یہ دیکھ۔۔۔۔۔“

کایا نے فوراً آگے بڑھ کر ماں کے چرن چھو لئے اور گلو گیر آواز میں بولا۔

”کسم جیجی! میں تمہارا دوشی ہوں۔ چندر بالا کو زبردستی تم سے چھین کر رہا لے گیا تھا، مجھے شا

کردو۔ آج کیشپ اس کی آخری نشانی کو تمہارے پاس لے آیا ہے۔ اب جل پنا تمہارے ہی

چرنوں میں رہے گی۔“

سو جھی، اسے کیا معلوم کہ سارگلیان کی جس پراسرار ڈبیا کو اس نے گہرے بھید کی طرح حکامتی میں کہیں چھپا رکھا اور پانچ برس تک موت کا عذاب بھوگا تھا، وہ میرے لئے کتنی اہم تھی اور میں اسے پالنے کے لئے کس قدر بے چین تھا مگر اس پر اپنی بے چینی ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا، البتہ اس کی چٹنا دور کرنے کے لئے سفر برما کی اہمیت بیان کرنے لگا۔

”کایا موسا۔۔۔! شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ قید سے چھوٹے ہی میں برما جانے کی جلدی کیوں کر رہا ہوں۔“

”تم نے میرے من کی بات بوجھ لی، بیچ بیچ یہی سوچ رہا تھا۔“

”کیا پروہت گنجال اور تھا پابہادر یہ جان کر دنگ نہ رہ گئے ہوں گے کہ ہم بندی گھر میں سیندھ لگا کر فرار ہو گئے اور اپنے ساتھ جل پنا کو بھی لے بھاگے؟“

”ان کے سینوں پر تو سانپ لوٹ گیا ہوگا۔“

”بالکل ٹھیک کہاتم نے ہم ایک خطرناک بل سے نکل کر آئے ہیں اور اب اس بل کا سانپ ہمارے بچ نکلنے پر بس گھول رہا ہوگا، مگر اس سے پہلے وہ کسی نئے حملے کے لئے تیار ہو سکے میں اس پر ایک اور چوٹ لگانا چاہتا ہوں، اس لئے ہمارا برما جانا ضروری ہے۔“

وہ میرا مطلب سمجھ کر بولا۔ میں نے انکار کب کیا ہے جب تم نے کہہ دیا جانا ہے، میرے لئے تقدیر کا لکھا ہوگا مگر ایک بات نہیں سمجھ سکا۔“

”کیا نہیں سمجھے؟“

”تھاپا بہادر اپنی پہاڑی خانقاہ میں اور پروہت گنجال ساؤ گاری میں ہوگا، پھر ہم برما کیا لینے جائیں گے؟“

”کیا وہ تمہاری تلاش میں برما کا رخ نہیں کریں گے؟“

”کایا پنتھا کسی سوچ میں ڈوب گیا، میں اسے بتانے لگا۔“

”سنگ کالنگ حکامتی میں تمہیں اپنے گھر کی خبر لینا ہے، اپنی زمینوں کو دیکھنا ہے اور ان لوگوں سے بھی ملنا ہے جو تمہاری مصیبتوں کا کارن بنے۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”وہاں تو میرا کوئی دشمن نہیں، سب دوست ہیں۔“

”حکامتی میں نہ سہی مگر اس کے آس پاس تمہارے بعض دشمن ضرور موجود ہوں گے۔“

”پروہت گنجال اور تھا پابہادر کے سوا میں کسی اور کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا۔“

”یہی تمہاری بھول ہے۔۔۔ میرے خیال میں کچھ اور لوگ بھی ہیں۔“

”کچھ اور لوگ۔۔۔ کون ہیں وہ؟“

”اپنے حافظے پر زور دے کر خود یاد کرو۔“

(26)

رشتے ناتے

برما جانے کا فیصلہ سن کر ماں اور جل پنا دونوں پریشان ہو گئی تھیں۔

جل پنا کی پریشانی کا کارن تو یہ تھا کہ اس نے پانچ برس کی طویل مدت باپ کی جدائی بلکہ اس کے ماتم اور سوگ میں بسر کی۔ خود بھی حادث کے دھاروں پر تنکے کی مانند بہتی، دکھ سکھ سہتی رہی اور اب ڈرتی تھی کہیں برما کا سفر کسی نئی مصیبت کا دروازہ نہ کھول دے۔

ماں شاید اس لئے پریشان تھی کہ پہلے اس کی بہن چندر بالا برما گئی تو لوٹ کے نہ آسکی، اب میں کایا پنتھا کے ساتھ جا رہا تھا تو اس کے من میں کچھ نئے دوسرے سراٹھانے لگے تھے۔

میں نہیں چاہتا تھا ان دونوں کا کوئی جذباتی فیصلہ میرا راستہ روک لے کیونکہ میں سفر کا ارادہ کر چکا اور یہ ارادہ میرا نہیں کسی اور کا تھا۔ میری آپ بیتی پڑھنے والے جان گئے ہوں گے کہ کبھی کبھی میں دو حصوں میں بٹ جاتا ہوں۔ ایک میں ہوتا ہوں اور ایک میرے اندر کوئی اور ہوتا ہے۔ یہ دونوں وجود اگرچہ الگ الگ محسوس ہوتے ہیں، پھر بھی ایک اور ایک جمع کرنے سے جواب دو نہیں آتا۔ ایک ہی رہتا ہے اور عام طور پر میں اندر کے آدمی کا فیصلہ قبول کر لیتا ہوں۔

میرے اندر کا تھارو کیشپ فیصلہ کر چکا تھا کہ میں سارگلیان کی امانت جلد از جلد حاصل کر لوں تا کہ مقدس مورتی کا اصل بھید پالوں۔ اس کے لئے برما کا سفر لازمی تھا مگر ماں صورت سوال کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”کیوں رہے جب برما کی سندر مایا تیرے گھر آگئی پھر تجھے برما جانے کی اتنی چٹنا اور جلدی کیوں ہے؟“

میں نے بات گھمادی۔ ”کیا سب ابھی پوچھ لینا چاہتی ہے؟ پہلے ہمارے بھوجن کی فکر کر، بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے پھر جو کچھ پوچھنا ہوگا پوچھ لینا۔“

وہ یک لخت چونکی۔۔۔ ”ارے۔۔۔ میں جل پنا بیٹی سے ملنے کی خوشی میں کھانے پینے کا تو بھول ہی گئی مگر گھبراؤ نہیں، سب بندوبست ہو جاتا ہے۔“

یہ کہہ کر ماں تو جل پنا کا ہاتھ پکڑے رسوئی میں گھس گئی اور میں کایا پنتھا کو لے کر اپنے کمرے میں آ بیٹھا، وہ بھی میرے فیصلے پر حیران تھا کہ آخر مجھے ایکا ایک برما جانے کی کیوں

مگر کانٹو کے اونچے پرتوں کے پچھم میں ایک قبائلی بستی، خانقاہ کے بندی گھر اور ناف زمین میں اتری ہوئی کال کوٹھڑی کا ذکر سن کر جہاں کا یا پنتھانے پانچ برس تک ہولناک قید کاٹی، ماں کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی، پھر میں نے اسے جل پنا اور اپنی اسیری کا واقعہ سنایا، سرنگ کھودنے اور کال کوٹھڑی سے فرار ہونے کی تفصیل سنائی اور بتایا کہ تعاقب کے خوف سے میں جل پنا کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے کانٹو کے خطرناک پہاڑوں کے حاشیوں پر بھاگتا رہا اور کایا موسا با کی سردی میں ننگے پاؤں، ٹھوکریں کھاتا، ہانپتا کاغتا میرے قدم بقدم بھاگا، ساری رات بھاگنے کے بعد ہم دن کے اجالے میں رتناگری پہنچے اور گھنے جنگل میں انا تھ بندو کی سادھی پر بے سدھ ہو کے گر پڑے تو ماں یہ سب کچھ سننے کے بعد جیسے پتھر کی ہو کے رہ گئی۔ اسے کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کی سدھ، بس چپ چاپ، گم صم سی بیٹھی رہی، میں نے پوچھا۔

”اب تجھے پتہ چلا ماں! کایا موسا، جل پنا اور میں کوئی قید کاٹ کے آرہے ہیں۔“

اسیری اور فرار کی یہ لہر زہ خیز روداد سن کر اس کی آنکھیں بھر آئیں، ہونٹ پھڑپھڑائے اور جذبات کی آنچ سے گھنٹی آواز میں بولی۔

”ارے تم لوگوں نے اتنے کشت اٹھائے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔“
”دیکھ لے ماں! تیری کچھڑی آتما کو کہاں سے نکال کے لایا ہوں۔“

اس نے میرا ہاتھ چوم لیا اور کایا پلٹتھا بولا۔

”چیچی! اگر میرے جسم کے رویں رویں کو زبان مل جائے تو بھی میں کیشپ کا شکر یہ ادا نہیں کر سکتا۔ اس نے مجھے پروہت گنجال کی قید سے رہائی دلائی جو جنگل کے درندوں سے زیادہ بے رحم اور نرک کے عفریتوں سے بڑھ کر ظالم ہے۔“

”ایسے آدمی کو تو کالے یانی کی سزا ہونی چاہئے۔“

مجھے ماں کی سادگی پر حیرت بھی ہوئی، ہنسی بھی آئی۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی۔ ”کالے پانی“ کی سزا پھانسی یا موت کی سزا سے بدتر ہوتی ہے یا پھر اس کے خیال میں ”کالا پانی“ کسی جوالا کھٹی کے دہانے میں ابلتے، کھولتے سیاہ رنگ لاوے کا نام ہے جس میں مجرموں کو جلنے مرنے کے لئے پھینک دیا جاتا ہے، میں نے بتایا۔

”خلیج بنگالہ سے بہت دور سمندروں میں انڈیمان کے جزیرے ہیں جہاں -----
 باغیوں کے لئے بڑی مضبوط جیل بنارکھی ہے، کوئی قیدی اس جیل سے نکل نہیں سکتا اور ساری عمر
 اس کی اونچی دیواروں اور سمندر کے کالے پانیوں میں گھرا رہتا ہے، عام طور پر حکومت کے
 باغیوں کو وہاں بھیجا جاتا ہے مگر پروہت گنجال ہم سب کا مجرم اور ایسے پہاڑی ویرانے میں رہتا
 ہے جہاں قانون کی حکمرانی نہیں۔“

میری بات نے اسے الجھن میں ڈال دیا اور سر پکڑ کے کہنے لگا۔ ”مجھے تو اور کوئی یاد نہیں آ رہا، میں نے پانچ برس اندھیری کال کوٹھڑی میں گزار دیئے، شاید قید نے میرا حافظہ کمزور کر دیا ہے۔“

ٹھیک اسی لمحے ماں دروازے پر نمودار ہوئیں اور وہیں ٹھٹک کر رہ گئی۔

”کیا قید کاٹ کے آرہے ہو کیا۔۔۔؟“

وہ ہکا بکا سا بول نہ سکا، میں ماں کی پریشانی بھانپ گیا مگر اس وقت کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا، سوچا کھانے کے بعد اسے سب کچھ بتا دوں گا۔

”ماں پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں، کھانا تیار ہوا کہ نہیں؟“

”کھانا یروس دیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ پھر کایا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”تم نے بتایا نہیں کایا...!“

”کس جرم میں یا سچ برس قید کاٹی تم نے؟“

”سنسار میں کچھ لوگ جرموں کے بغیر بھی سزا کاٹتے ہیں جیسی!“

مگر کیا پینٹھا کا جواب اسے مطمئن نہ کر سکا۔ ”جرم نہ ہو تو سزا کون دیتا ہے۔؟“

اسے غالباً یہ چتا لگ گئی تھی کہ اس کا بہنوئی سزا یافتہ قیدی ہے اور یہ بات جل چنا کے لئے عمر بھر کا طعنہ بن سکتی ہے، میں نے کہا۔

”کاپا موسا کو سزا کسی عدالت نے نہیں دی تھی ماں!“

”پھر قید کس نے کیا؟“

”یہاں بھوجن کر لینے دے پھر تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“

وہ چپ چاپ پلٹی۔ قید کا ذکر سن کر کچھ بجھ سی گئی اور فکر مند نظر آتی تھی۔ میں اور کایا اس کے پیچھے پیچھے رسولی میں پہنچے۔ جل پنا کھانے پر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ماں نے اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ کچھ چیزیں گھر میں بنالیں، کچھ بازار سے منگوائی تھیں۔ بھات، مچھلی، چپاتی، ترکاری، کھیر، رس گلے، سبھی کچھ تھا اور یہ سب چیزیں ہر بنگالی کے من کو بھاتی ہیں مگر بری کایا پنتھا برسوں کے بعد ایسا لذیذ کھانا کھا رہا تھا اور ماں بڑی عجیب نظروں سے کبھی کبھی اسے دیکھ لیتی تھی، اس کی پریشانی دور کرنے کے لئے میں نے کھانے کے دوران ہی کایا پنتھا کی کہانی چھیڑ دی، جب میں نے اسے بتایا کہ کس طرح گنجال نے گرفتار کر کے اس سے ملتے جلتے ایک آدمی کی لاش کو کایا کی جوتی، گھڑی، انگوٹھی اور کپڑے پہنائے اور چہرہ بگاڑ کر لاش دریائے جنون کے کنارے پھینکوا دی پھر اسے کایا پنتھا کی لاش سمجھ کر جلا دیا گیا اور جل پنا اس بھرے سنسار میں انا تھ ہو کے رہ گئی، تب ماں کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا اور سسک کے بولی۔

”ہائے بھگوان۔۔۔ ایسا اندھیر ہوا؟“

”پھر تو اسے بھگوان ہی سزا دے گا۔“

کھانا ختم ہوا تو اس کے ساتھ میں نے گنجال کا ذکر بھی ختم کر دیا اور دروازے کی طرف

بڑھا۔

”ماں! تھوڑی دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں۔“

”ارے۔۔۔ رات کے سہ کہاں جائے گا؟“

”صوفی چا چا کو سلام کرنے۔“

اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔ ”کچھ دن ہوئے وہ تیرا پوچھنے آئے اور بڑے گھبرائے لگتے تھے، میں تجھے یہ بتانا بھول گئی۔“

صوفی چا چا کے ذکر پر جل پنا اور کایا پنتھا دونوں حیران سے تھے، ہاں انہیں بتانے لگی، صوفی عبد الجبار نام ہے، ہمارے پڑوس ہی میں رہتے اور ایور ویدک حکیم ہیں، میری طرح چندر بالا کو بھی اپنی چھوٹی بہن سمجھتے تھے، بڑے نیک مسلمان اور بھلے آدمی ہیں۔“

میں دروازے سے نکلا اور صوفی چا چا کے مکان کی طرف ہولیا۔ سوچا کل برما کی جانب کوچ ہو گا۔ ان سے بھی مل آؤں، میں نے دستک دی تو خود دروازہ کھولنے آئے اور مجھے دیکھتے ہی بے اختیار گلے سے لپٹا لیا۔

”خدا کا شکر ہے تم خیریت سے لوٹ آئے کیشپ بیٹے!“

ان کا لہجہ دل کی بے چینی کا پتہ دے رہا تھا۔ ”آپ کچھ پریشان لگتے ہیں صوفی چا چا!“

”پریشان تھا مگر تمہیں دیکھ کر ساری پریشانی دور ہو گئی۔“

”تو میرے لئے پریشان تھے آپ؟“

”آدمی اسی کے لئے فکر مند ہوتا ہے جس سے کوئی تعلق ہو۔“

”مگر فکر کیا تھی؟“

”آؤ بیٹھو بتاتا ہوں۔“

مجھے لے کر بیٹھک میں داخل ہوئے اور ہم بیٹھ چکے تو کہنے لگے۔ ”کچھ دن پہلے میں نے تمہارے بارے میں ایک عجیب رویا دیکھی جس نے مجھے پریشان کر دیا، تم نے اپنے دشمنوں کا ذکر کیا تھا نا، میں سمجھا ان کا وار چل گیا ہے کیونکہ رویا میں دیکھا تم کسی بڑی مصیبت میں پھنس گئے اور ایک ایسے قید خانے میں ڈال دیئے گئے ہو جہاں سے نکلنا ممکن نہیں، تمہیں مایوس اداس اور نڈھال دیکھ کر میں بڑا بے چین ہوا اور آواز دی۔“

”یا جی یا قیوم کا ورد کرو، اللہ مدد کرے گا۔“

آنکھ کھلی تو آدھی رات ادھر، آدھی ادھر، سخت پریشان ہوا کہ نہ جانے یہ کیسی رویا ہے۔ اسی

پریشانی میں اٹھ کر وضو کیا پھر اللہ کے حضور سجدے میں گر کر تمہارے لئے دعا کرتا رہا۔ دن چڑھا تو سیدھا تمہارے گھر پہنچا معلوم کروں تمہاری کوئی چٹھی آئی ہے یا نہیں مگر کم بہن نے بتایا ابھی تو کوئی چٹھی نہیں آئی، بس میں اسی دن سے تمہارے لئے فکر مند تھا مگر آج تمہیں دیکھتے ہی میرے سارے وسوسے، اندیشے ختم ہوئے۔ دراصل بعض اوقات آدمی رویا میں جو نظارہ دیکھتا ہے اس کا مخفی مطلب نہیں سمجھ پاتا اور پریشان ہو جاتا ہے میری رویا کی تعبیر بھی شاید کچھ اور ہوگی۔“

میں ایک دو منٹ حیران سا بیٹھا سوچتا رہا کہ صوفی چا چا نے میری قید اور مصیبت کے بارے میں کتنا سچا پند دیکھا جس سے ان کی روحانی شکتی پر میرا وشواس کچھ اور بڑھ گیا پھر جھک کر ان کے پاؤں چھو لئے، وہ تڑپ کے بولے۔

”یہ کیا دیوانگی ہے؟“

”صوفی چا چا۔۔۔ آپ کی رویا بالکل سچی ہے۔“

”رویا سچی ہے یعنی تم۔۔۔“

”میں سچ سچ گرفتار ہوا اور 38-40 فٹ گہرے تہ خانے میں قید کر دیا گیا تھا جہاں سے رہائی کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر ”یا جی یا قیوم“ کا وظیفہ پڑھا تو غیب سے مدد کے سامان پیدا ہو گئے۔“

صوفی چا چا میری بات پر بڑے ششدر تھے۔ میں نے ضروری سمجھا کہ انہیں کایا پنتھا کی اسیری اور اپنی گرفتاری کا حال سناؤں وہ بڑی بے چینی کے عالم میں سب کچھ سنتے رہے، انہیں یہ خبر نہ تھی میری موسیٰ چندر بالا کایا پنتھا کے ساتھ برما چلی گئی تھی اور جل پنا اسی کی بیٹی ہے، ان پر حقیقت کھلی تو بڑے مضطرب ہو کر بولے۔

”اب کایا پنتھا اور جل پنا کہاں ہیں؟“

”انہیں اپنے ساتھ رنگامتی لے آیا ہوں۔“

وہ کچھ سوچتے رہے پھر پوچھنے لگے۔ ”کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟“

”یہ تو آپ نے مجھے عزت بخشی، حکم دیں تو یہیں لے آؤں؟“

”انہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے، میں خود چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔“

”زہے نصیب۔۔۔“

وہ اٹھے اور میں انہیں لے کر اپنے گھر آ گیا۔ ماں بڑے کمرے میں تھی، میں نے آنگن سے آواز دی۔

”ماں، صوفی چا چا آئے ہیں۔“

وہ گھبرا کے پیچھے ہٹے۔۔۔ ”مجھے کیوں گناہگار کرتے ہو کیا۔۔۔ میں تو خدا کا حقیر بندہ اور ذرہ ناچیز ہوں، خدا سے دعا کرتا ہوں اگر مستجاب ہو جائے تو اس کی بندہ پروری ہے۔“

”مگر جو کچھ میں نے دیکھا وہ کسی معجزے سے کم نہ تھا۔“

”اپنے پیدا کرنے والے پر یقین کامل ہو تو معجزے اس دور میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔“

صوفی چا چا نے جو کہا تھا وہی میں کایا پنتھا سے کہنا چاہتا اور خانقاہ کی کال کوٹھڑی میں پیش آنے والے حیرت انگیز اور ناقابل یقین واقعے کا روحانی فلسفہ ان کی زبان سے کہلوانا چاہتا تھا۔ کایا پنتھا پر ان کے ایک مختصر سے فقرے کا گہرا اثر ہوا، دراصل میں بھی انہی کی روحانی تربیت سے خواب کشف، کرامت کے کچھ اسرار سمجھنے لگا ورنہ پہلے اپنی ذہنی صلاحیت کے بارے میں مجھے خود بھی کوئی گیان اور عرفان نہیں تھا، ان کی روحانی شگفتگی اور معجزات کا ذکر چلا تو میں اپنے اصل مقصد کی طرف آیا۔

”صوفی چا چا۔۔۔! آپ کا یا موسا، جل پنا اور میری مصیبتوں کا حال سن چکے ہیں، مجرموں سے بدلہ لینے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میں کون ہوتا ہوں خیال ظاہر کرنے والا، مجرموں کو سزا دینا قانون کا کام ہے۔“

”جہاں قانون کی حکمرانی نہ ہو۔۔۔؟“

”وہاں بھی انسان صرف انسان کے قانون سے بچ سکتا ہے، خدا کے قانون سے نہیں بچ سکتا۔“

”اور خدا کا قانون کیا ہے۔؟“

”قصاص۔۔۔ بدلہ۔۔۔“

یہ میرے سوال کا صحیح لیکن بڑا ہی مختصر سا جواب تھا، میں نے کہا۔

”تھوڑی سی تفصیل اور وضاحت چاہتا ہوں۔“

صوفی عبد الجبار کے چہرے پر یک لخت جلال سے آگیا اور آواز پر رعب ہو گئی۔ ”خدا کے قانون میں قصاص، بدلے کو کہتے ہیں اور بدلہ لینا آدمی پر فرض کر دیا گیا ہے، کیونکہ یہ ایک طبعی جذبہ ہے اور جذبے کی تسکین ضروری ہے جہی جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان کاٹنے کا حکم ہے، یعنی جیسا کسی پر ظلم ہو ویسا ہی اس کا بدلہ ٹھہرایا، اہم اور جبر کا بدلہ نہ ہو اور ظالموں کو ڈھیل دے دی جائے تو ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور وہ دوسرے کمزور لوگوں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنائیں گے، خدا انسان پر انسان کی چیرہ دستیوں اور زیادتیوں کو روکنا چاہتا ہے۔“ صوفی صاحب کی اس وضاحت کے ساتھ ہی میرے من میں روشنی کا ایک نیا کواڑ کھل گیا اور یوں لگا جیسے انہوں نے میری صحیح

وہ فوراً چوٹ پر نمودار ہوئی۔ سر پر دھوتی کا پلہ ٹھیک کرتے ہوئے سواگت کیا، سلام کہا اور انہیں لے کر کمرے میں داخل ہوئی پھر اپنے بہنوئی کایا پنتھا اور جل پنا کا تعارف کرایا، صوفی چا چا نے جل پنا کو دیکھا تو وہیں ٹھٹھک کے رہ گئے۔

”ماشا اللہ۔۔۔ دوسری چندر بالا ہے۔“

جل پنا نے جھک کر ان کے چرن چھو لئے، میری طرح وہ بھی انہیں پتا سان سمجھی اور صوفی چا چا نے سر پر ہاتھ رکھ کر اشیر داد دی۔

”جیتی رہو، سکھی رہو۔“

پھر جیب سے چاندی کا ایک روپیہ نکال کر جس پر ملکہ وکٹوریہ کی مورت ڈھلی ہوئی تھی، اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا، میں نے کہا۔

”جل پنا۔۔۔! یہ ایک روپیہ ایک لاکھ روپے سے زیادہ قیمتی ہے، سنبھال کے رکھنا۔“

”نہیں بیٹی!“ صوفی چا چا بولے۔ ”روپے کی قیمت تو صرف سولہ آنے ہوتی ہے، ہاں تمہیں بیٹی سمجھ کر بھیٹ کیا ہے۔“

”پھر تو ہیروں کے مول بھی مہنگا ہے۔“ جل پنا نے چاندی کا روپیہ عقیدت سے چوم لیا۔

اب صوفی چا چا کایا پنتھا سے مخاطب ہوئے۔

”کیشپ سے تمہاری پتا کا حال سن کر بڑا دکھ ہوا۔ کبھی کبھی خدا بندوں کو امتحان میں ڈال دیتا ہے اور جب وہ امتحان میں پورے اترتے ہیں ان پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے، تم دنیا کے لئے مر گئے تھے مگر اس نے تمہیں پھر زندہ کر دیا۔“

”بے شک میں موت کی دہلیز سے واپس آیا ہوں۔“ پھر کایا موسا نے میری طرف اشارہ کیا۔

”مگر یہ سب کچھ کیشپ کی وجہ سے ہوا، یہی مجھے اس گہری قبر سے نکال لایا جہاں موت کے اندھیروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔“

اب میں نے بھی کایا پنتھا پر ایک انکشاف ضروری سمجھا۔ ”کایا موسا۔۔۔! اس کال کوٹھڑی میں جہاں ہم قید تھے جب ہماری رہائی کا غیبی سامان پیدا ہوا، تم نے حیران ہو کر پوچھا تھا، یہ سامان کہاں سے آگیا میں نے بعض حوالے اور اشارے دے کر تمہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اصل بات اب بتاتا ہوں کہ بندی گھر میں تم نے جو کچھ دیکھا، وہ صوفی چا چا کی دعاؤں اور انہی کے بتائے ہوئے ایک وظیفے کا نتیجہ تھا، یہ میرے گرو ہیں اور ان ہی کی روحانی شگفتگی نے اس حجرہ اجل میں ہماری مدد کی تھی۔“

کایا پنتھا نے حیرت پاش نظروں سے صوفی چا چا کو دیکھا اور ان کے چرنوں میں جھک گیا۔

”آپ بھگوان کے سچے رشی اور صوفی ہیں۔“

راہنمائی کر دی ہے۔

”بس صوفی چا چا۔۔۔! مجھے یہی پوچھنا تھا، اب صرف ایک التجارہ گئی ہے۔“

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے بتایا۔ ”کایا موسا پانچ برس کے بعد اپنے دیس جا رہے ہیں جہاں انہیں اپنے گھر بار اور زمینوں کو دیکھنا ہے، میں بھی ان کے ساتھ برما جا رہا ہوں، جل پنا ماں کے پاس رہے گی ان دونوں کو آپ کی حفاظت میں سوچنا چاہتا ہوں۔“

”کیشپ بیٹے! حفاظت کرنے والا صرف خدا ہے۔“

”مگر وہ کسی کو اپنا وسیلہ بناتا ہے اور آپ سے بہتر وسیلہ کوئی نہیں۔ ہاں کہہ دیں گے تو میری چتا دور ہو جائے گی۔“

انہوں نے ایک پل سوچا پھر بولے۔ ”تم ضد کرتے تو ہوان کا دھیان رکھوں گا۔“ پھر جل پنا کے سر پر اپنی شفقت کا ہاتھ رکھ دیا۔ ”تو نے بڑے دکھ جھیلے ہیں، بیٹی! خدا تجھے اپنی امان میں رکھے۔“

یہ کہہ کر پلٹے۔ ”خدا حافظ“ کہا اور لوٹ گئے۔ کایا پتھا ان کی شخصیت سے بڑا متاثر ہوا تھا، کہنے لگا۔

”بڑے کھرے اور گئی آدمی ہیں صوفی عبد الجبار۔“

”آدمی نہیں دیوتا ہے۔“ میں اپنی منطق بگھارنے لگا۔ ”کیونکہ اگلے وقتوں کے دیوتا بھی آدمی تھے جس طرح بھگوان بدھ نے ماں کی کوکھ سے جنم لیا اسی طرح دیوتا بھی اپنی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوئے، ہم صرف ان کی مورتیاں بناتے اور ان کے گنوں کو پتھر میں ڈھال دیتے ہیں۔“

جل پنا نے بڑی پیاری نظروں سے مجھے دیکھا۔



میں نے اپنے ذہن میں برما کے سفر کا جو نقشہ تیار کیا تھا۔ صوفی چا چا کی ملاقات کے بعد اس نے ایک آدرش کی شکل اختیار کر لی کیونکہ اب ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ سارگلیان کی ڈبیا بے شک میرے سفر کی وجہ تھی مگر اس کے ساتھ جیون کا کچھ لین دین اور اس اپرادھ کا کچھ اولہ بدلہ بھی تھا جو پانچ برس پہلے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کیا گیا تھا۔ میں اسی ادلے بدلے کی روشنی میں اپنے سفر کے پڑاؤ متعین کر رہا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ جل پنا سے تو ان واقعات کے بارے میں کچھ پوچھا ہی نہیں جو کایا پتھا کی گرفتاری اور اسیری کے بعد سنگ کالنگ حکامتی میں پیش آئے تھے، ہم سب بڑے کھرے میں بیٹھے تھے، میں نے جل پنا سے سوال کیا۔

”تم مانڈلے کے ناچ آشرم میں کس طرح پہنچ گئی تھیں؟“

وہ میرے سوال پر کچھ حیران سی ہوئی پھر بتانے لگی۔

”جب لوگوں نے سنا کہ حکامتی کا سب سے بڑا زمیندار چل بسا ہے، اس کے نام کی ارٹھی جلا دی گئی ہے اور میں باپ کی چھوڑی ہوئی زمینوں کی اکیلی وارث ہوں، تب میرے کئی انجانے ہمدرد اور کئی آن دیکھے رشتے دار پیدا ہو گئے۔ پتا جی کی جدائی کے صدمے سے دل چور چور ہو گیا تھا مگر مجھے تسلی دینے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی، بہت لوگ پر سادینے آئے، ایک آدمی چند روز کے بعد میرا چا چا بن کر نمودار اور مجھے پکڑ کے رونے لگا۔ اس نے بتایا۔“

”بیٹی! میں تیرا بد نصیب چا چا مایا پتھا ہوں، چھوٹی عمر میں بھائی سے لڑ کے گھر سے نکلا اور رنگون چلا گیا تھا، وہاں میں نے اپنا جیون آپ بنایا اور کاروبار چلایا مگر ایک اخبار میں اپنے بھائی کایا پتھا کے قتل کی خبر پڑھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جب یہ پتہ چلا کہ باپ کے بعد تم اکیلی رہ گئی ہو من میں ہوک انھی اور اپنا سب کاروبار چھوڑ کر اسی گھر میں لوٹ آیا ہوں جسے چھوڑ کر چلا گیا تھا، میرا کلیجہ اس وقت تک ٹھنڈا نہیں ہو گا جب تک بھائی کے قاتلوں سے بدلہ نہیں لے لوں گا۔“

میں بڑی حیران ہوئی ”مگر پتا جی نے کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا کہ ان کا کوئی بھائی بھی تھا۔“

”وہ کیوں ذکر کرتے، میں نے گھر چھوڑ کر ان کے دل کو تھیس پہنچائی تھی۔ جاتے جاتے کہہ گیا تھا کہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا، جی انہوں نے غصے کے مارے میرا نام بھی نہیں لیا ہو گا۔“

اسی اثناء میں ایک بوڑھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، نہ جانے کہاں سے نکل آیا اور بولا۔

”بیٹی! مایا پتھا ٹھیک کہتا ہے میں جانتا ہوں، یہ چھوٹی عمر میں گھر سے بھاگ گیا تھا مگر بھائی کا صدمہ اسے پھر واپس لے آیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بوڑھا مجھے اور میرے نقلی چا چا کو تسلی دیتا چلا گیا۔ میں اسے دیوان خانے میں چھوڑ کر صحن میں آئی اور اپنی نوکرانی پوئی کو بھیجا کہ وہ بھاگ کے چان بابا کو بلا لائے، چان بابا ہمارا پرانا کسان ہے جس پر پتا جی بڑا بھروسہ کرتے تھے۔ اس نے آتے ہی میرے نقلی چا چا کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا۔

”تم کوئی بھی ہو مگر نہ تو کایا کے بھائی ہو نہ پتھا کے بیٹے کیونکہ میرے مالک پتھا گرام کا ایک ہی بیٹھا تھا۔۔۔ کایا پتھا اور وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“

یہ سنتے ہی جعلی چا چا نے ایک فارم نکالا جس پر اس کا نام مایا پتھا، باپ کا نام پتھا گرام اور سابقہ رہائش سنگ کالنگ حکامتی درج تھا۔ اس پر 10 نومبر 1913ء کی تاریخ اور رنگون کے ایک عدالتی اوتھ کمشنر کی تصدیق تھی گویا یہ تصدیق بارہ سال پہلے کی تھی، اس نے یہ فارم دکھا کر

ہمیں حیران کر دیا اور دھمکی دی۔

”میں پنتھا گرام کا بیٹا، کایا پنتھا کا بھائی اور اپنی بھتیجی جل پناہی کا جائز وارث نہیں بلکہ اپنے باپ کی آدمی زمینوں کا حقدار بھی ہوں۔“

چان نے اسے باہر کا راستہ دکھایا۔ ”یہاں سے چلے جاؤ، تمہارا یہ جعلی کاغذ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔“

وہ بھڑک اٹھا۔۔۔ ”تم ہو کس دھیان میں۔۔۔ میں کورٹ میں نالش کر کے اپنا حق وصول کروں گا۔“

وہ بکتا جھکتا، دھمکیاں دیتا چلا گیا تو تھوڑے دنوں بعد میرے ایک ماما جی آدھمکے۔ اس شخص نے اپنا نام چندر کانت بتایا۔ کہتا تھا۔ ”چٹا گانگ سے آیا ہوں اور سو رگباشی چندر بالا کا بھائی ہوں۔ بہن کے مرنے کا پتہ نہیں چلا مگر اپنے جیجا کایا پنتھا کے مرنے کی خبر پڑھی تو تمہیں دیکھنے کو من ترپا، اگر تم مانو تو تمہاری دیکھ بھال کروں گا نہ مانو تو چلا جاؤں گا مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں صرف ایک نانا ہے جو یہاں کھینچ لایا۔“

مجھے اپنے ننھیال کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا، صرف اتنا جانتی تھی کہ ماں پور بنی بنگال کی رہنے والی اور چٹا گانگ کے اسپتال میں نرس تھی، میری طرح دوسرے لوگ بھی میری ننھیال سے واقف نہ تھے پھر چندر کانت نے نہ تو جائیداد سے کسی دلچسپی کا اظہار کیا نہ کوئی ناپسندیدہ بات کہی، اس کے برتاؤ میں، لہجے میں پیار تھا، میں نے کہا۔

”اگر یہ آپ کی بہن کا گھر ہے تو میں آپ کا سواگت کرتی ہوں۔“

چان بابا نے بھی کہا۔ ”ہو سکتا ہے یہ چندر بالا کا بھائی ہو اور ہو سکتا ہے نہ ہو پھر بھی آدمی بھلا جان پڑتا ہے۔“

اس طرح چندر کانت حویلی میں ٹھہر گیا، انہی دنوں ایک سادھو مہاراج آئے اور کہنے لگے۔

”کایا پنتھا کے پاس سونے کی ایک پرانی ڈبیا تھی جس پر پالی زبان میں کچھ شبہ کندہ ہیں، میں وہ ڈبیا لینے آیا ہوں اگر تم دے دو تو اس سے کایا کی آتما کو شانتی ملے گی۔“

چندر کانت نے جو میرے ماما کا روپ دھار چکا تھا، پوچھا۔

”تمہارا اس ڈبیا پر کیا ادھیکار ہے؟“

”صرف اتنا کہ وہ بودھ اتھاس کی نشانی ہے اور میرے گورو اسے بھگوان بدھ کے مندر میں رکھنا چاہتے ہیں۔“ پھر سادھو نے کہا۔ ”مگر میں ڈبیا تم لوگوں سے مفت نہیں مانگتا۔“

”کیا اس کی قیمت چکاؤ گے؟“

”ہاں۔۔۔ بازار میں جو بھاؤ لگے اس سے دگنا دوں گا۔“

”دگنا۔“ چندر کانت مجھ سے کہنے لگا۔ ”سودا برا نہیں بیٹی! تمہیں پتہ ہے جیجا جی نے وہ ڈبیا کہاں رکھی تھی؟“

”نہیں۔۔۔ نہ میں نے ڈبیا دیکھی نہ پتا جی نے کبھی اس کا ذکر مجھ سے کیا۔“

”تمہیں یہ تو معلوم ہو گا وہ اپنی خاص چیزیں کہاں رکھتے تھے؟“

”مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔“

”خیر۔۔۔ ڈبیا ہو گی تو گھر میں، ڈھونڈ لو۔۔۔ سادھو مہاراج کی اچھا پوری ہو جائے گی۔“

دگنی رقم ملے گی اور سب سے بڑھ کر جیجا جی کی آتما کو شانتی نصیب ہو گی۔“

”اگر پتا جی کی آتما کو شانتی مل سکتی ہے تو میں ڈبیا ضرور ڈھونڈوں گی۔“

سادھو مہاراج نے میری بے چینی دیکھ کر کہا۔ ”تسلی سے ڈھونڈ لینا بیٹی! مجھے جلدی نہیں۔“

میں دو چار دن ٹھہر کے آ جاؤں گا، صرف اتنی ضامنی چاہتا ہوں کہ میرے سوا وہ ڈبیا کسی دوسرے کے پاس نہ بکے۔“

”نہیں مہاراج!“ چندر کانت نے یقین دلایا۔ ”وہ ڈبیا تمہاری ہو گئی۔ تم دو دن بعد آؤ“

یا چار دن بعد۔ ڈبیا مل گئی تو تمہارے ہی ہاتھ بکے گی۔“

سادھو مہاراج چلے گئے اور یہ بھی بتا دوں کہ وہ پروہت گنجال نہیں تھا، میں حیران تھی کہ اگر پتا

جی کے پاس کوئی ایسی ڈبیا تھی تو کہاں ہو سکتی ہے ادھر چندر کانت بڑا پریشان دکھائی دیتا تھا، کہنے

لگا۔ ”مجھے یوں لگتا ہے جیجا کی آتما بے کل ہے، ان کی شانتی کے لئے ہمیں ڈبیا تلاش کرنا ہو گی۔“

اسی دن سے تلاش شروع ہو گئی، ہم نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ صندوق، پیٹیوں،

الٹاریوں میں ہر جگہ ڈھونڈا مجھ سے زیادہ چندر کانت بے چین ہو رہا تھا مگر دو تین دن کی تلاش

کے بعد جب اس کا کوئی کھوج نہ مل سکا میں اس نتیجے پر پہنچی کہ سادھو مہاراج کو کسی نے غلط خبر

دی ہے یا پھر پتا جی وہ ڈبیا اپنے جیون ہی میں کسی کو بھیٹ کر چکے ہیں، ٹھیک چوتھے دن سادھو

مہاراج پھر آدھمکے جب پتہ چلا کہ ڈبیا نہیں ملی تو بڑے نراش ہوئے اور بولے۔

”میری جوتش و دیا کہتی ہے اگر ڈبیا نہ ملی تو اس کنیا کا بیاہ نہیں ہو گا اور یہ لڑکی سدا کنواری

رہے گی۔“

چندر کانت تڑپ اٹھا۔ ”مہاراج! لڑکی کو ایسا شراب نہ دو۔“

”یہ شراب نہیں چندر کانت! آکاش کا یا ہے، اگر اپنی بھانجی کا جیون سکھی دیکھنا چاہتے ہو تو

ڈبیا کا کھوج لگاؤ اور مجھے بڑے مندر میں خبر کر دو، میں ایک ہفتہ اور ٹھہروں گا پھر چلا جاؤں گا۔“

چندر کانت بے حد پریشان تھا کہ اگر ڈبیا نہ ملی تو ضرور کوئی کڑی مصیبت آئے گی، میں نے

چان بابا سے بھی پوچھا مگر اس نے بتایا کہ مالک نے ڈبیا کے بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ ڈبیا

کو بہت کھو جا مگر نہیں ملی۔ آٹھویں دن بڑے مندر سے پتہ کیا تو سادھو مہاراج جا چکے تھے، ان کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

”اگر دیوانہ ملی تو یہ لڑکی سدا کنواری رہے گی۔“

میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھیں، اسی ہفتے جعلی مایا پنتھا، نے میرے خلاف نالاش کر دی، جائیداد کے بٹوارے کا جھگڑا اٹھایا اور مجھے کچہری میں حاضری کا من ملا۔ میں سخت گھبرائی مگر چندر کانت ماما نے تسلی دی کہ میں اس مایا پنتھا سے کورٹ میں نمٹ لوں گا، ایک دن جعلی چاچا نے اپنے غنڈے بھیج کر دھمکایا کہ زمینوں کی رجسٹریاں اس کے حوالے کر دوں ورنہ پچھتاؤں گی۔ یہ سوچ کر نہ جانے آگے چل کر حالات کی صورت کیا ہو میں نے چپکے سے چان بابا کو اپنے گھر بلایا اور زمینوں کے کاغذات اسے دے کر کہا۔

”یہ رجسٹریاں میری امانت ہیں، انہیں اپنے پاس سنبھال کے رکھو، نہ کسی سے ان کا ذکر کرنا نہ میری تحریری اجازت کے بغیر کسی کو دینا۔“

بوڑھا کسان بولا! ”فکر نہ کرو بیٹی! میں نے تمہارے باپ دادا کا نمک کھایا ہے۔ تمہاری امانت کی اپنی جان سے بڑھ کر رکھنا کروں گا۔“

رجسٹریوں کی ہوا چندر کانت کو بھی نہیں لگنے دی مگر انہی دنوں گننام چٹھیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن میں مشورہ دیا جاتا تھا کہ میں اپنے رشتے داروں کا حصہ انہیں دے دوں اور بے کار جھگڑا نہ کروں۔ بعض چٹھیوں میں یہ اشارہ بھی کیا گیا کہ کایا پنتھا نہ رہا، تم بھی نہ رہو گی، ایک چٹھی میں خنجر کا چتر بنا کر بھیجا گیا۔ نیچے لکھا تھا۔

”اپنی موت کے ایٹمی کو پہچان لو جو بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔“

میں یہ چٹھی پڑھ کر کانپ اٹھی، پہلے تو چندر کانت ماما مجھے حوصلہ دیا کرتا تھا کہ میں کسی دھمکی کی پروا نہ کروں مگر خنجر کا چتر دیکھ کر اس کا حوصلہ بھی جاتا رہا، اب وہ کہتا تھا۔

”حالات بگڑتے جا رہے ہیں، شاید میں تمہاری رکھشا نہ کر سکوں، ہو سکے تو اس شہر سے نکلنے کی سوچو۔“

مجھے کچھ سوچتا نہ تھا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں، اسی الجھن میں تھی کہ ایک نئی چٹھی ملی یہ ان چٹھیوں سے جن میں مجھے دھمکیاں دی جاتی تھیں، بالکل الگ تھی اور اس کا مضمون بھی کچھ اور تھا، میرے کسی ان دیکھے ہمدرد نے خبر دی تھی۔

”تیرا جیون سخت خطرے میں ہے، کچھ پیری تیری جان لینا چاہتے ہیں اور انہوں نے تجھے مار دینے کی ٹھانی ہے مگر چنتا نہ کر بھگوان تیری رکھشا کرے گا، اسی کی آگیا پر تجھے گورو آبنی کے ناچ آشرم میں مانڈ لے بھیجے گا فیصلہ کیا گیا ہے جہاں کوئی تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا، کل پو پھٹے

بھگوان کا ایک بھگت تیری حویلی کے کواڑ پر تین بار دستک دے گا بے کھٹکے اس کے ساتھ چلی آنا، وہ تیری رکھشا کرے گا۔

تو حیران ہو گی میں کون ہوں اور مجھے تیری چنتا کیوں ہے، بس اتنا جان لے بھگوان نے تیری رکھشا مجھے سونپی ہے اور یہ گیان دیا ہے کہ تیری دائیں چھاتی کے نیچے چاند گرہن کا نشان ہے، اگر تیرے شریر پر یہ نشان ہے تو تجھے وہی کرنا ہو گا جو میں کہتا ہوں کیونکہ تو بھگوان کی امانت ہے۔“

نیچے کسی کا نام نہیں تھا، بس ایک مہر کا ٹھپا بھگوان بدھ کی مورتی کا تھا، میں یہ چٹھی پڑھ کے دنگ رہ گئی۔ میرے دائیں چھاتی کے نیچے چاند گرہن کا نشان تھا اور حیران تھی کہ میرے پر اسرار رکھوالے کو اس کا پتہ کیسے چلا، میں نے چٹھی چندر کانت ماما کو دکھائی، اس نے پوچھا۔ ”کیا چاند گرہن کے نشان والی بات ٹھیک ہے۔؟“

میں نے ”ہاں“ کہا تو بولا۔ ”پھر تو یہ بھگوان کی لیا ہے۔ اس نے آپ تمہاری رکھشا کا سامان کیا ہے، میری مانو تو تمہیں اس چٹھی کے لکھے کو قسمت کا لکھا سمجھنا چاہیے۔“

چندر کانت پہلے بھی مجھے شہر چھوڑنے کا مشورہ دے چکا تھا، اب چٹھی مانڈ لے کا سندیس لے کر آئی تھی۔ پتاجی کے بعد سنگ کالنگ حکامتی سے مجھے خوف آنے لگا تھا میں دیر تک بیٹھی سوچتی رہی کہ کیا کروں۔۔۔؟ کوئی پر اسرار غیبی آواز مجھے بار بار کہہ رہی تھی۔

”تو وہی کرے گی جو چٹھی میں لکھا ہے۔۔۔ تو وہی کرے گی۔۔۔“

نہ جانے یہ آواز کیسی تھی جو بار بار میرے ذہن سے ٹکرا رہی تھی، میں سمجھی شاید یہ پر ماتما کا، آکاش کا، قسمت کا اشارہ ہے اور مجھے وہی کرنا چاہیے جس کی ہدایت کی گئی ہے۔

دوسرے دن پو پھٹے دروازے پر ٹھیک تین بار دستک ہوئی، کواڑ کھولا تو باہر ایک بھگت کو دیکھا جو منہ ڈھاپنے کھڑا تھا، اس نے کہا۔

”اگر تمہارا نام جل پنا ہے تو میں تمہیں لینے آیا ہوں مگر حکم دیا گیا کہ کسی کو اپنا چہرہ نہ دکھاؤں، مجھ پر وشواس ہو تو میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔“

پھر وہ کسی جادو کے پتلے کی طرح مڑا اور چل دیا، میں اپنا گھر، اپنا شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ایک چرمی بکس اٹھایا جس میں میری ضرورت کی چیزیں تھیں اور چپ چاپ اس کے پیچھے ہوئی۔ چندر کانت ماما اور میری نوکرانی پوئی دروازے میں کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔۔۔

چان بابا کو میرے اس اچانک سفر کی خبر نہ تھی مگر پوئی کو سندیس دے آئی تھی کہ وہ مجھے گورو آبنی کے ناچ آشرم مانڈ لے میں آکر ضرور ملے۔

یوں لگتا تھا کوئی غیبی طاقت مجھے کھینچے لیے جا رہی تھی۔ دریائے جن ون کے گھاٹ پر ایک

اسلام پر اپنے دستخط کر دینا وہی تمہارا مختار نامہ ہوگا۔“
”تم نے کسی کو مختار نامہ تو لکھ کر نہیں دیا تھا؟“

”نہیں۔۔۔ مجھے ایک سرکاری اسلام ضرور دیا گیا کہ اس پر دستخط کروں مگر اس پر میرے مختار کا نام و پتہ درج نہ تھا، میں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ لوگ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ چان بابا مختار نامہ چاہتا ہے اور میں سمجھتی تھی اسے مختار نامے کی ضرورت نہیں۔“
”تم نے ٹھیک کیا، اب یہ بتاؤ جو بھگت تمہیں مانڈ لے کے ناچ آشرم میں چھوڑ گیا کہیں وہ شکر تو نہیں تھا؟“

جل پنا نے حیرت پاش نظروں سے مجھے دیکھا، دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”وہی تھا کیونکہ سنگ کالنگ حکامتی کے گھاٹ سے اسٹیم میں سوار ہوتے وقت میرے ساتھی بھگت نے اپنا گیرا پولہ ذرا اوپر اٹھایا تو میں نے اس کی بائیں پنڈلی پر ترچھے گھاؤ کا ایک لمبا نشان دیکھا تھا، پھر ساؤ گاری میں اتفاق سے ایک دن شکر کی پنڈلی نکلی ہو گئی اور اس پر ترچھے گھاؤ کا وہی مخصوص نشان دیکھ کر میں بری طرح چونکی اور سمجھ گئی مجھے ناچ آشرم تک پہنچانے والا پر اسرار بھگت کون تھا مگر تم کیسے جانتے ہو کہ وہ شکر ہی تھا۔“

”جب شکر تمہیں آشرم میں چھوڑ کے نکلا گورکھا چوکیدار نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔“

جل پنا مزید حیران ہوئی۔ ”کیا تم آشرم کے چوکیدار سے ملے تھے؟“

”میں نہیں شاستر ملا تھا، اس سے۔“

پھر میں نے جل پنا سے ایک تحریر لکھوائی اور یہ تحریر برمی زبان میں تھی کہ اس نے اپنی جائیداد اور زمینوں کے بارے میں نہ کوئی مختار نامہ لکھا نہ کسی کو مختار بنایا، دستور کے مطابق چان بابا ہی جو پنتھ گھرانے کا پرانا ملازم ہے، پیداوار اور لین دین کا ذمے دار تھا اور زمینوں کی جملہ رجسٹریاں اسی کے پاس بطور امانت محفوظ کر دی گئی تھیں۔

اس کام سے فارغ ہو جب میں بستر پر لیٹا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔



ماں، جل پنا، کایا پنتھ سب سو گئے تھے مگر میرا ذہن ایک عجیب گورکھ دھندے میں الجھا ہوا تھا اور میں تصور میں تمام گزرے واقعات کو کسی فلم کی طرح دوبارہ چلتے دیکھ رہا تھا، جس طرح فلم کے مختلف مناظر ایک ہی کہانی کی عکاسی کرتے اور ایک ہی تھیم (Theme) کے ارد گرد گھومتے ہیں اس طرح یہاں بھی تین خاندانوں کی ساری مصیبتیں ساؤ گاری کے مرکز پر گھوم رہی تھیں، ان میں ایک میرا خاندان تھا، دوسرا پنتھ کا تیسرا ویشال رائے کا اور میں نے غور کیا تو اس حقیقت نے مجھے چونکا دیا کہ ہماری مشترکہ مصیبتوں کا محور بھی ایک ہی تھا۔ مختلف حالات و واقعات کے

چھوٹا سادہ خانی اسٹیم ہمارا منتظر تھا، ہم سوار ہوئے تو چل پڑا۔ ہمارے سوا اس میں کوئی تیسرا مسافر نہیں تھا، موٹی داتک اسی اسٹیم میں سفر کیا۔ موٹی داسے ریل میں بیٹھ کر مانڈ لے آئے۔
پر اسرار بھگت مجھے گورو آجی کے ناچ آشرم میں چھوڑ کر چلا گیا۔ نہ میں نے کچھ پوچھا نہ اس نے کوئی جواب دیا، اس طرح ناچ آشرم میں پہنچی، گورو آجی نے میرا سواگت کیا اور اپنی بیٹی کی طرح میری دیکھ بھال کی۔ تین برس کے بعد سروپ جی اور پردھت گنجال اسی ناچ آشرم سے مجھے ساؤ گاری لے گئے۔“

جل پنا کی کہانی نے ہم سب کو حیران کر دیا۔ ماں بولی۔

”وہ موا چندر کانت کون تھا؟ جو تیرا ماما بن بیٹھا، ہمارے سارے پر یوار کو گٹلی کی بیماری کھا کٹی تھی۔ نہ ماں باپ بچے نہ بھائی۔ بھاونج، باری باری سب کی ارتھیاں انھیں صرف میں اور چندر بالا بچی تھیں اور ہمارے کسی بھائی کا نام بھی چندر کانت نہیں تھا۔“

کایا پنتھ اپنی جگہ سچ و تاب کھا رہا تھا۔ ”میں تو اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں، میرا کوئی بھائی ہے نہ بہن پھر یہ مایا پنتھ کہاں سے پیدا ہو گیا، اگر میں ہوتا تو اس حرامی کی ہڈیاں توڑ دیتا۔“

”تم ہوتے تو مایا پنتھ پیدا ہی کیوں ہوتا۔“ میں انہیں سمجھانے لگا۔ یہ کیوں نہیں سوچتے جس طرح پنتھ گرام کو پریشان کرنے کے لئے کاؤ کے جعلی رشتے دار پیدا ہو گئے تھے اور حق رسی کے جھوٹے مقدمے کچھریوں تک پہنچے۔ اسی طرح جل پنا کو تنہا اور بے سہارا سمجھ کر کوئی نقلی ماما بن بیٹھا کوئی جعلی چاچا مگر ان سارے مہروں کو ایک ہی ہاتھ چلا رہا تھا اور وہ ہاتھ پروہت گنجال کا۔ نقلی ماما اس لئے بنایا گیا کہ وہ جل پنا کے ساتھ حویلی میں رہ کر سارگیاں کی دنیا کا کھوج لگائے، جعلی چاچا اس لئے پیدا کیا گیا کہ جائیداد کی تقسیم، زمین کے جھگڑوں اور قتل کی دھمکیوں سے پریشان ہو کر جل پنا کو حکامتی سے نکال کر مانڈ لے کے ناچ آشرم میں پہنچا دیا جائے اور سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا جیسے گنجال چاہتا تھا۔“

میری بات سن کر ماں اور کایا پنتھ جعلی رشتے دار پیدا کرنے کا کارن سمجھ گئے، میں نے جل پنا سے پوچھا۔ ”تم پولی کو سندیس دے آئی تھیں کہ چان بابا تمہیں مانڈ لے کے ناچ آشرم میں آ کر ملے، کیا وہ آیا تھا ملنے؟“

”چان بابا مانڈ لے تو پہنچ گیا تھا مگر اسے آشرم میں داخل نہیں ہونے دیا گیا، نہ مجھے آگیا، ی گئی کہ اس سے مل سکوں۔“

”تمہیں کیوں نہ ملنے دیا گیا؟“

”گورو آجی نے کہا تھا، جب کوئی لڑکی آشرم میں آ جاتی ہے، باہر کی دنیا سے اس کے سارے ناتے ٹوٹ جاتے ہیں، ہاں اگر تم کسی کو اپنی جائیداد کا وارث یا مختار بنانا چاہو تو سرکاری

تو اس کا مقصد کہیں یہ تو نہیں کہ انصاف اور نیائے کا سہ آگیا ہے اور پراسرار قدرت چاہتی ہے کہ ان سب لوگوں کے لئے پکھری لگائی جائے جو قانون اور انصاف کو پامال کرتے رہے۔ کیا کہا تھا صوفی عبد الجبار نے کہ قصاص اور بدلہ آدمی پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جیسا کسی پر ظلم ہو ویسا ہی اس کا بدلہ ٹھہرایا گیا ہے کیونکہ خدا، ایثار یا، بھگوان انسان پر انسان کی چیرہ دستیوں کو روکنا چاہتا ہے، ٹھیک اسی لمحے جب میرا ذہن اس نتیجے پر پہنچا کہ انصاف کا سہ اور فیصلے کا دن آگیا ہے اور ان دیکھی طاقت چاہتی ہے مجرموں کو کٹہرے میں لایا جائے تو ساتھ ہی مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا کہ قدرت یہ نیائے میرے ہی ذریعے چاہتی ہے، جیسا اس نے مجھے بد نصیب کا یا پنتھا سے ملایا جس کی بیٹی بھی اس کی موت پر آنسو بہا چکی تھی اور جیسا پراسرار تقدیر و شال رائے کو میرے پاس کھینچ لائی جو آج بھی اپنی بہن کے غم میں نڈھال اور سینے میں انتقام کی جوالا لئے پھرتا ہے۔

اس حیرت انگیز احساس نے کہ قدرت نے میزان عدل اور ترازو اس کی ڈنڈی میرے ہاتھ میں دے دی اور مجھے اس عجیب و غریب مقدمے کا منصف ٹھہرایا ہے، میں نہ صرف بری طرح چونک اٹھا بلکہ میرے جسم میں سنسنی کی لہر خون کے ساتھ ساتھ گردش کرنے لگی اور میں سوچنے لگا۔

”کیا میں مجرموں کو پکڑ سکوں گا۔۔۔ انصاف کے تقاضے پورے کر سکوں گا؟“

میرے اندر کے تھارو کیشپ نے کہا۔ ”بے شک۔۔۔ تمہیں سب کچھ کرنا ہے۔“

اس اندرونی آواز نے مجھے ایک نئی شکتی بخشی تہیہ کیا کہ ہر مجرم کو پکڑوں گا اور انصاف کی ترازو میں تولوں گا اور جیسا صوفی عبد الجبار نے کہا تھا کہ جہاں عدالت ہے وہاں انسان کے بنائے ہوئے قانون کے ذریعے اور جہاں کوئی عدالت، کوئی پکھری نہیں وہاں خدا کے قانون کے ذریعے بدلے کی حد پوری کروں گا تاکہ دنیا دیکھ لے کہ انصاف اور نیائے کیا ہوتا ہے۔

میں نے سوچا ضرور ہے کہ میں یکسر بدل جاؤں، ایک بدھ گیانی، محقق آثار اور پریما کا لباس اتار دوں کیونکہ یہ لباس رحم، دیا، کمزوری اور نرم دلی کا مظہر ہے اور اس کی بجائے ایک عادل، منصف جج کا چولہ پہن لوں، سر پر انصاف کی وگ لگاؤں اور اپنے دل کو سخت اور ذہن کو مضبوط اور عزم کو پختہ کر لوں تاکہ میرے فیصلے میں کوئی لغزش نہ ہو اور میں انصاف کی ہر شرط پوری کر سکوں۔

یہ سوچ کر میں ایک عجیب کیفیت میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور من ہی من میں کہنے لگا۔

”اب میں اس تھارو کیشپ کو جو بدھ گیانی، محقق آثار اور پریما ہے وقتی طور پر خیر باد کہتا اور اس تھارو کیشپ کا سواگت کرتا ہوں جو ایک عادل، منصف اور جج کا فرض ادا کرنے والا ہے، میں ایک جیون سے رخصت ہوتا اور ایک جیون کا آغاز کرتا ہوں۔ اب ان لوگوں سے میرا رویہ

خط ایک ہی نقطے پر گرتے تھے، اور اس نقطے کا نام تھا پروہت گنجال۔

میں نے تینوں خاندانوں کی مصیبتوں پر غور کیا تو ان کے درمیان ایک عجیب سا ربط اور تسلسل موجود تھا اور حالات نے انہیں زنجیر کی طرح باہم جوڑ دیا تھا، سب سے عجیب بات یہ تھی کہ میں خود پے در پے ایسے حالات سے دوچار ہوا جو مجھے ماضی کے ان واقعات سے قریب کرتے چلے گئے جو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہو گزرے تھے اور جن کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا، اس طرح میں غیر محسوس طور پر اس گہرے اور مہیب راز کی طرف بڑھتا چلا گیا جس نے ان خاندانوں کو اپنے تار عنکبوت میں لپیٹ لیا تھا، پھر سمجھ میں نہ آنے والے اتفاقات کا سلسلہ کچھ ایسا حیرت انگیز تھا کہ اگر میں اسرار کے ایک دروازے میں داخل ہوتا تو دوسرا دروازہ آپ سے آپ کھل جاتا، قدرت میرا ہاتھ پکڑ کے آگے لے جاتی اور تھیر کے نئے گوشوں سے گزرتا، کیا حالات و واقعات کا یہ تسلسل اور عجیب اتفاقات کا یہ سلسلہ بے مقصد اور بے حکمت تھا؟ آخر قدرت کیوں مجھے نئے حالات کی طرف دھکیلتی رہی اور کس لئے گزرے واقعات کے اسرار مجھ پر فاش کرتی چلی گئی؟

اچانک میرے اندر یا کہیں باہر سے آواز آئی یا پھر میں نے محسوس کیا کوئی آواز سن رہا ہوں بہر حال وہ آواز یا احساس کی صدا جو کچھ بھی ہو، کہہ رہی تھی۔

”قدرت کا کوئی کام بے مقصد اور کوئی فعل بے حکمت نہیں ہوتا۔“

اور اس احساس کی روشنی میں جب میں نے اتفاقات کے اس عجیب سلسلے کو دیکھا اور قدرت کی حکمت پر غور کیا کہ آخر یہ سب کچھ کیوں اور کس لئے ہوا تو میرے ذہن کے حاشیے پر ایک ملکٹی لہری پھوٹنے لگی، جیسے اجالا افق سے ہولے ہولے پھوٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے اور جس طرح سورج کی پہلی کرن آکاش اور سنسار کو روشن کر دیتی ہے، بالکل اسی طرح عرفان کی ایک مکمل کرن نے میرے ذہن اور شعور کو جگمگا دیا اور مجھے گیان ہوا۔

ایک لاچار، بے بس اور گرفتار بلا شخص پانچ برس تک ناف زمین میں اتری ہوئی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں تڑپتا، سسکتا رہا کہ اس کے ساتھ اتنا بڑا انیائے ہوا مگر دھرتی چپ اور آکاش خاموش رہا، اس نے کوٹھڑی کی بہری دیواروں، گونگے پتھروں، ٹھنڈی سلاخوں، اندھی کڑیوں، کالی راتوں، تاریک دنوں سب سے باری باری فریاد کی کہ اس سنسار کا پالنے والا، منصفوں کا منصف۔۔۔ عادل کا عادل اس کا انصاف کیوں نہیں کرتا؟ کیا وہ بھی کچھ نہیں دیکھتا، سمجھ نہیں سنتا؟ پھر ایک اور عجیب اتفاق ہوا کہ قدرت میرا ہاتھ پکڑ کر اس بندی گھر میں لے گئی اور مجھے بھی اسی کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا جہاں وہ پانچ برس سے ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور قدرت نے میرے ذریعے اسے قید سے رہائی بخشی۔

مختلف ہوگا جو انسان اور خدا کے قانون کو پامال کرتے ہیں کیونکہ انصاف مجرموں کے چہرے نہیں دیکھتا، ان کے اعمال تو لٹا اور فیصلہ دیتا ہے، آج سے میری نرم دلی اور دیا کے کواڑ بند ہوتے اور میرے اندر عدل اور انصاف کے دروازے کھلتے ہیں کیونکہ جب آدمی مصلحتوں اور کمزوریوں کا لباس اتار کر فرض کا لباس پہن لیتا ہے تو یکسر تبدیل ہو جاتا ہے مگر سچائی کبھی نہیں بدلتی اور ہر زمانے میں اس کا ایک ہی روپ اور ایک ہی آدرش ہوتا ہے اور انصاف کی گھڑی بھی کبھی نہیں ٹلتی، وہ ایک نہ ایک دن آ کے رہتی ہے اور ہر آدمی کو کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی رنگ میں سماج سے لوگوں سے اپنے بیگانوں سے اور اپنے آپ سے انصاف کرنا پڑتا ہے۔“

تو بس فیصلہ ہوا کہ میں انصاف اور نیائے کے لئے قدرت کی مرضی پوری کروں گا اور مقدس مورتی کی تلاش کے ساتھ ساتھ جس کا وعدہ سروپ جی سے، اجل بدوش بوڑھے ساگر ساؤ جی سے اور سندرمی سے کر چکا ہوں، ان لوگوں پر ہونے والے ظلموں کا حساب بھی چکاتا چلوں گا جو اسی مورتی کے اسرار کا شکار ہوئے، یہ فیصلہ کر کے میں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔

صبح بیدار ہوا تو میں ایک بدلا ہوا آدمی تھا، مگر پروگرام کے مطابق اُس دن برما کی طرف کوچ نہ کر سکا، رات میں جن زاویوں سے معاملات پر غور کرتا رہا، قدرت کی جن حکمتوں کے تحت ایک نئے فیصلے پر پہنچا تھا، ان کی روشنی میں صرف کایا پنتھا کو انصاف درکار نہ تھا بلکہ وشال رائے بھی اپنی بہن روپ تارا کا نیا لے چاہتا تھا اور میں وعدہ کر چکا تھا کہ اس کا بدلہ لیا جائے گا، اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔

وشال رائے کا ایک منگل ساؤ تو اسی کے ”داؤ“ سے گھائل ہو کر چل بسا مگر دوسرا دوشی گنجال جس نے روپ تارا کو اغوا کیا، ابھی زندہ تھا اور میرا اندرونی آدمی کہہ رہا تھا، ایک کچہری اس کے لئے بھی لگائی جائے، یہ فیصلہ میں نے رات ہی کر لیا تھا، سویرے آنکھ کھلی تو ماں سے کہا۔

”میرے نہانے تک ناشتہ تیار کر دے، مجھے ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔“

”تجھے اپنے موسا کے ساتھ برما جانا ہے؟“

”نہیں ماں! برما کے سفر سے پہلے ایک اور سفر نکل آیا ہے جو مجھے تنہا کرنا ہے، برما کی طرف کوچ کل ہوگا۔“

ماں نے حیرت سے میری طرف دیکھا، میں نے کہا۔ ”گھبرا نہیں جلد لوٹ آؤں گا۔“

اس نے یہ نہیں پوچھا مجھے کہاں جانا اور کب تک لوٹنا ہے، رسوئی گھر کی طرف ہولی، جل پنا نے میری بات سن لی تھی، قریب آ کر پوچھنے لگی۔

”کہاں جاؤں گے؟“

”برما کے سفر سے پہلے ایک آدمی سے ملنا ضروری ہو گیا ہے، اسی سے ملنے جاؤں گا۔“

”کون آدمی ہے؟“

”ایک ساتھی۔“

ابھی جل پنا کو یہ بتانے کا سہ نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے پہلی نرنگی روپ تارا کا بھائی وشال رائے ہے مگر اس کی تسلی کے لئے کہا۔ ”سفر میں ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں، رات میں نے سوچا اگر تین کا ساتھ ہو جائے تو راہ کی بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔“

ہم جس طرح دشمنوں کی قید سے فرار ہوئے اور جن حالات سے گزرے تھے، انہیں دیکھتے ہوئے جل پنا کو دو کی بجائے تین والی بات پسند آئی۔

”واقعی دو سے تین بھلے ہوتے ہیں۔“

پھر میں نے کایا پنتھا کو بتایا کہ سفر ایک دن کے لئے ملتوی ہو گیا ہے، اس نے یہ بھی نہیں پوچھا۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ سمجھتا تھا التوا میں کوئی مصلحت ہوگی۔۔۔ لغتی بندی گھر سے رہائی کے بعد وہ ہر معاملے میں میری مرضی کو ترجیح دیتا اور جانتا تھا کہ میں جو کچھ کروں گا اسی میں بھلائی ہوگی۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی گھر سے نکلا اور رنگامتی کی بڑی جھیل کو پیچھے چھوڑتا چکمہ بستی کی طرف ہولیا۔

رنگامتی کے شمال اور شرق میں سرسبز پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے چکمہ قبائل کی بعض بستیاں انہی پہاڑیوں کے درمیان پھیلی ہیں مگر پہلی چکمہ بستی جس میں وشال رائے رہتا تھا، صرف پانچ میل کے فاصلے پر تھی، چکمہ عورتیں اور مرد اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے شہر میں آتے جاتے رہتے تھے، صرف دو گھنٹے کا سفر تھا پھر بھی کبھی اس بستی میں نہیں گیا نہ جانتا تھا وشال رائے کا گھر کہاں اور کیسا ہے مجھے گھر تلاش کرنے کی چٹا نہیں تھی، وہ قبیلے کا کھانا پیتا آدمی اور جنگل کے ٹھیکوں کی وجہ سے مشہور تھا۔

میں اپنے خیالوں میں مگن اور سوچتا رہا، میری اچانک آمد سے وہ لوگ کتنے خوش ہوں گے، منجوری کی بڑی خواہش تھی کہ میں اس کے گھر جاؤں مگر کیا اسے جل پنا کے بارے میں کچھ بتانا مناسب ہوگا؟ انہی خیالوں میں سفر کتنے کا احساس نہ ہو سکا پھر رنگامتی کے شمال مشرقی علاقے کا سفر ہو تو اس کے کٹنے کا پتہ ہی نہیں چلتا، آدمی سندر نظاروں میں کھویا چلتا رہتا اور خوش گوار سفر ختم ہو جاتا ہے۔

بستی ایک سرسبز پہاڑی پر واقع تھی، کھیریل کی چھتوں والے مکان اور جھونپڑے دور ہی سے نظر آ گئے، پہاڑی کے دامن میں چکمہ لوگوں کے مویشی اور بھیڑ بکریوں کے چھوٹے

چھوٹے گلے چر رہے تھے، مرد، عورتیں ادھر ادھر کام کاج کر رہے تھے، مسافروں کو راستہ بتانا اور اجنبی لوگوں میں دلچسپی لینا ہمارے علاقے کا پرانا دستور ہے، ابھی بستی میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی سے سامنا ہو گیا، اس نے بڑے شوق سے مجھے پر نام کیا، میں نے پوچھا۔

”وشال رائے کو جانتے ہو؟“

ٹھیکیدار وشال رائے نا؟“

”ہاں، مجھے اسی کے گھر جانا ہے۔“

”کہاں سے آئے ہو بابو جی؟“

رنگامتی سے۔“

اس نے اور کچھ نہیں پوچھا، بولا۔ ”آؤ میں چھوڑ آتا ہوں۔“

پھر وہیں سے پلٹا اور میرے ساتھ ہولیا، چند مڑے مڑے راستے طے کر کے ہم بستی کی پچھلی جانب پہنچے جہاں چند مکان سب سے الگ تھلگ تھے۔ انہی میں ایک مکان وشال رائے کا تھا۔ کافی کھلا اور صاف ستھرا، ہم اس کے دروازے پر پہنچے تو میرے راہبر نے دستک دینے کی بجائے آواز دی۔

”وشال بھیا۔۔۔ کیا گھر میں ہو؟“

کوئی جواب نہ ملا تو زور سے بولا۔

”اے مادھو بہن! تمہارے مہمان آئے ہیں۔“

چند ہی لمحوں میں دروازہ کھلا اور مادھو موسیٰ کی شکل نظر آئی، وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا سی رہ گئی۔

”ارے۔ کیشپ بیٹے!“

دروازے سے نکل کر میری بلائیں لے چکی تو ادھیڑ عمر آدمی کی طرف مڑی۔

”ارے بھیا! منجوری کے باپ ابھی بار کال جانے کو نکلے ہیں، بس گوتم سے بیڑی کا بندل لے رہے ہوں گے ذرا جلدی سے جا کے بول دے گھر لوٹ آئیں، کہنا رنگامتی سے کیشپ بابو آیا ہے۔“

”اچھا بھیج دیتا ہوں وشال بھیا کو۔“

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے لوٹ گیا اور مادھو موسیٰ مجھے لے کر گھر میں داخل ہوئی۔

”کسم بہن تو اچھی ہے نا؟“

”ہاں۔۔۔ اچھی ہے، نمسکار کہتی تھی۔“

حالانکہ میں نے ماں کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ آنگن خالی پڑا تھا، سامنے ساتھ ساتھ دو کمرے، ایک طرف رسوئی گھر، ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا، دوسرے کے

دروازے پر بانس کی تیلیوں کی چلمن لٹک رہی تھی، میری نظریں منجوری کو ڈھونڈنے لگیں، یک لخت مادھو موسیٰ کو اپنی سندر اور نو جوان بیٹی یاد آئی، چلمن والے کمرے کی طرف منہ کر کے بولی۔

”اے منجوری! ذرا باہر تو آ، دیکھ کون آیا ہے؟“

اندر سے آواز آئی۔ ”کون آیا ہے ماں؟“

اس آواز کے ساتھ ہی چلمن ہٹی اور منجوری خود بھی آگئی۔ مجھے دیکھتے ہی خوشی کے مارے گالوں پر گلاب سے کھل گئے، لمبی لمبی غلافی آنکھوں میں ”چشم تاتار“ کام جادو جاگا، جھوم کے بڑھی اور میرے چرن چھو کر کھڑی ہوئی تو نتھنی کا ہیرا جھلمل جھلمل کرنے لگا۔ وہ مجھے پہلے سے کچھ زیادہ سندر لگی، میں اسے دیکھ رہا تھا کہ مسکرا کے پوچھنے لگی۔

”آسام سے کب آئے ہو؟“

”کل شام۔۔۔ آج تمہیں دیکھنے چلا آیا۔“

”اندر آؤ۔۔۔“

اس نے دروازے کی چلمن اٹھادی۔ یہ اسی کا کمرہ تھا، میرے پیچھے پیچھے وہ بھی اندر آئی۔ بانس کی چلمن پھر کمرے اور آنگن کے درمیان حائل ہو گئے اور ساتھ ہی منجوری مجھ سے لپٹ گئی، اس کے بھرے بھرے رسیلے ہونٹ سنگتروں کی قاشوں کی طرح کھل گئی، میں نے یہ دعوت سوئکار کی، ہم پل دو پل بے سدھ ہو گئے، اچانک میں پیچھے ہٹا مگر منجوری پھر آگے بڑھی۔

”کہیں موسیٰ نہ آجائے میں نے سرگوشی کی۔“

”ماں اتنی نا سمجھ نہیں، ہمیں پیار کرنے کا موقع دے گی۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ میرے دل میں جوار بھانا کی سی کیفیت پیدا کر گئی اس کا سندر بدن پھر میرے بازوؤں میں تھا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

”اب تمہارے بغیر میرا جیون کچھ نہیں، میں کچھ نہیں۔“

مجھے یاد آیا کہ عورت کی ساری طاقت اس کی کمزوری میں چھپی ہوتی ہے، منجوری نے اپنی کمزوری کا اظہار کر کے مجھے جیت لیا، اس کے ساتھ گویا میں نے اپنے دل کو بھی تسلی دی۔

”عورت مرد کا جیون اور اس کی آدمی شگتی ہوتی ہے۔“

اس نے پیار سے میری آنکھوں میں جھانکا اور میں اس کے لمبے لمبے مدھرنیوں میں اپنی کمزوری چھپانے لگا، اس کی نتھنی کا چھوٹا سا ہیرا مجھے گھورے جا رہا تھا میں نے اس پر انگلی ماری تو منجوری بولی۔

”اب کے آسام گئے تو مجھے ساتھ لے کے جاؤ گے نا؟“

میں سمجھ گیا کہ اپنے بیاہ کی تاریخ پوچھ رہی ہے، ابھی جواب سوچ ہی رہا تھا کہ مادھو موسیٰ کی

آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

”اری منجوری! کیشپ کے لئے دودھ لے جا۔“

وہ سمندری لہر کی طرح میرے بازوؤں میں تڑپی۔ ”جاؤں؟“

میں نے بازوؤں کا گھیرا کھول دیا تو بھائے کی موج کی طرح چلمن سے گزرتی صحن میں اتر گئی اور لوٹ کے آئی تو دودھ کا گلاس ہاتھ میں تھا، میں ایک کرسی پر بیٹھ کر دودھ پینے لگا، اسی اثناء میں وشال رائے داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ مادھو موسیٰ بھی آئی۔ میں نے اٹھ کر سواگت کیا۔ یہ چھوٹا سا گھرانہ میری اچانک آمد پر اتنا خوش تھا کہ میں ان کی خوشی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وشال رائے بتانے لگا۔

”ارے کیشپ بابو! اگر میرے کو گوتم کی ہنی پر تھوڑی سی دیر نہ ہو جاتی تو میں بستی سے نکل گیا تھا، پر اچھا ہوا اس نے میرے کو باتوں میں لگا لیا۔ اسی بہانے میں رک گیا اور تمہارے آنے کا سندیس ملا، بھگوان جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔“

”اگر تم سے ملاقات نہ ہوتی تو میرا آنا بے کار جاتا۔“

فوراً مادھو موسیٰ کو کچھ اور سوچھی۔ ”اب آئے ہو تو دو چار دن یہیں رہو۔“

”رہنے کے لئے پھر کبھی آؤں گا موسیٰ! مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔“

”لو اتنی جلدی کا ہے کی، کل چلے جانا۔“

”کل تو مجھے برما کی طرف کوچ کرنا ہے، بس وشال جی سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔“

برما کے سفر کا انکشاف بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا، منجوری نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا آسام

سے تمہاری بدلی برما میں ہو گئی ہے؟“

”میری بدلی نہیں ہوئی۔ وہاں میرے ایک رشتے دار کا جھگڑا چل رہا ہے۔“

”کس سے جھگڑا چل رہا ہے؟“

”پروہت گنجال سے۔“

میں نے یہ نام ”کوڈورڈ“ کے طور پر استعمال کیا تھا تا کہ وشال رائے سمجھ جائے۔ میں کیوں آیا ہوں اور میرا جانا کیوں ضروری ہے مگر گنجال کا نام سنتے ہی وہ یوں اچھلا جیسے کمرے میں بم پھٹ گیا ہو، منجوری اور مادھو موسیٰ بھی دم بخود رہ گئیں، ان کی حیرت بتا رہی تھیں وہ گنجال کے نام سے خوفزدہ ہیں۔ یہ نام انہوں نے دس برس پہلے روپ تارا کے پراسرار اغوا کے سلسلے میں سنا ہو گا۔ وشال رائے میرا مطلب سمجھ گیا تھا، بولا۔

”اگر کل تمہارے کو برما جانا ہے تو پھر روکنا ٹھیک نہیں۔“ اور اپنی پتی سے مخاطب ہوا۔

”اری بھگوان! جلدی سے کھانا تیار کر۔ کیشپ آج ہی چلا جائے گا۔“

مادھو موسیٰ اٹھی تو وشال نے منجوری کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ ”جاتو بھی جا کے ماں کا ہاتھ بنا۔“

”ماں کھانا بنا لے گی باپو!“ منجوری نے جواب دیا۔ ”میں کیشپ بابو کے پاس بیٹھوں گی۔“

”اری میرے کو کیشپ بابو سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنا ہیں، اسی واسطے تجھے جانے کو

بولا ہے۔“

”کون سی پرائیویٹ باتیں کروں گے۔ میرے لگن کی یا ان کے دوسرے بیاہ کی؟ تو کرو

میں تمہیں کب روکتی ہوں۔“

”لگن بیاہ کی بات نہیں، جھگڑے کی بات ہے، تیرے کو جھگڑے سے کیا لینا ہے؟“

”جھگڑا گنجال کا ہے تو میں کیشپ کو اکیلا برما نہیں جانے دوں گی۔“

وشال رائے نے بیٹی کو دیکھا، اس کے جذبات کو سمجھا یا نہیں سمجھا مگر مجھ سے کہنے لگا۔

”کیشپ بابو! تمہی بولونا اسے، گھڑی دو گھڑی کوئل جائے۔“

”وشال جی! جب منجوری جھگڑے کا کارن جانتی ہے تو بات اس کے سامنے ہی کیوں نہ ہو

جائے۔“

اس نے میرا کہا مان لیا۔ ”چلو بولو کیا بولتے ہو؟“

اب میں نے بھی کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہ سمجھی، باپ بیٹی کو کایا پنتھا اور جل پنا کی

کہانی سنائی، ان کے ساتھ اپنے ناتے کا ذکر کیا، یہ بھی بتایا کہ روپ تارا کے بعد گنجال جل پنا کو

کس طرح ساؤ گاری لے گیا اور بھگوان کی زندگی بنایا پھر اپنی گرفتاری، اسیری اور رہائی کے

حالات سنائے مگر یہ نہیں بتایا کہ جب میں بندی گھر میں زخموں سے چور پڑا تھا منجوری میرے

سننے یا کشف میں آئی اور اس نے مجھے اچھا کر دیا تھا، آخر میں بتایا کہ میں کایا پنتھا اور جل پنا کو

اپنے گھر لے آیا ہوں۔

وشال رائے کایا پنتھا کی قید کا ذکر سن کر تڑپ اٹھا، منجوری کی آنکھیں بھیگ گئیں، میں نے

بتایا۔ ”کل میں اور کایا موسا برما جا رہے ہیں۔ وہاں گنجال سے مڈ بھیڑ تو نہیں ہوگی مگر سنگ

کالنگ حکامتی میں کچھ کام نمٹانے کے بعد ہم ساؤ گاری جائیں گے۔“

”کیشپ بابو! تم میرے کو کیوں نہیں لے جاتے اپنے ساتھ؟“

”اسی لئے آیا ہوں کیونکہ روپ تارا کے ساتھ جو انیائے ہوا اس کے نیائے کی گھڑی آگئی

ہے، اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ ساؤ گاری جاسکتے ہو مگر ایک شرط ہے۔“

”بولو کیا شرط ہے؟“

”تم سروپ جی سے نہیں جھگڑو گے۔“

وشال رائے سوچ میں پڑ گیا پھر کہنے لگا۔ ”تم نے بول دیا تھا وہ منگل ساؤ کے بیٹے ہیں

جب منگل ساؤ مر گیا تو میرے کو بیٹے سے کیا لینا۔ اپنے کو بس گنجال کا لیکھا چکانا ہے۔“
 ”پھر تم اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو ہمیں آسام کے ریلوے اسٹیشن دیو پور میں ملو۔
 چٹاگانگ سے گاڑی دیو پور جاتی ہے، ہم حکامتی سے فارغ ہو کر سیدھے وہیں پہنچیں گے۔“
 وشال رائے کی آنکھیں کسی چیتے کی طرح چمکنے لگیں۔ وہ بڑبڑایا۔ ”پندرہ تاریخ۔۔۔ دیو پور کا ریلوے اسٹیشن۔“

”ہاں۔۔۔ وہاں سے ساؤ گاری کی طرف سفر ہوگا۔ تاریخ اور اسٹیشن کا نام کسی کاغذ پر لکھ لو۔“
 ”میرے کو کاغذ پر وشواس نہیں، دونوں باتیں اپنے بھیجے پر لکھ لی ہیں، مگر ایک بات اور بول دو۔“
 ”کوئی بات؟“

”میرے کو اکیلا مانگتے ہو یا پھر اپنے بھروسے کے دو آدمی بھی ساتھ لے آؤں؟“
 ”میں چونکا۔“ بھروسے کے دو آدمی کون ہیں؟“
 ”کالی ناتھ اور کریم۔“

یہ نام سنتے ہی مجھے رام گارتھ کے جنگل میں منگل ساؤ اور اس کے ساتھی بھکشو پر ہونے والا حملہ یاد آ گیا۔ اس حملے میں کالی ناتھ اور کریم، وشال رائے کے ہمراہ تھے۔
 ”کیا دونوں ابھی تک تمہارے ساتھ ہیں؟“

”ہاں۔۔۔ کچھ لوگ جیون بھر ساتھ رہتے ہیں“ وہ بتانے لگا۔ ”رام گارتھ والا ٹھیکہ تو تین برس ہوئے ہاتھ سے نکل گیا تھا، آج کل بارکال میں ایک ٹھیکہ اپنے پاس ہے، بارکال چند میل پر ہے۔ کسی دن جاؤں، کسی دن نہ جاؤں، میرے کو کوئی فکر نہیں، کریم اور کالی ناتھ سارا کام چلاتے ہیں، اب لول دو اس کے واسطے کیا بولتے ہو؟“

وشال رائے کی بات سن کر میں سوچنے لگا کہ گنجال کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں اور اس کے پیلے چائے مٹھی کے جال کی مانند آسام کے سنہتال قبیلے سے لے کر کانگٹو کی پہاڑی خانقاہ تک پھیلے ہیں، کیوں نہ اپنے ہاتھ بھی مضبوط ہوں۔

”تم چاہو تو کالی ناتھ اور کریم کو ساتھ لے آنا مگر دشوار گزار پہاڑوں پر جان جوکھوں کا سفر ہوگا۔“

”اپنے آدمی جوکھوں سے نہیں ڈرتے۔ بولو گے تو اندھے کنویں میں کود جائیں گے۔“ وہ پل بھر کور کا پھر ایک عجیب لہجے میں کہنے لگا۔ ”کیشپ بابو! گنجال کے لئے میرے کو آدمیوں کی ضرورت نہیں پر کاپا پتھ کے جھگڑے میں تم نے سنہتالی اور پہاڑی لوگوں کا ذکر کیا ہے تو اپنے کو کالی ناتھ اور کریم کا خیال آ گیا۔“

”اب ایک اور بات بھی سن لو، ہو سکتا ہے ہم دس بارہ دن میں لوٹ آئیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کام میں مہینہ ڈیڑھ لگ جائے۔“

میرے کو دنوں کی کھتی سے مطلب نہیں، اپنے کام سے مطلب ہے۔“
 ”دنوں کا ذکر اس لئے کیا ہے تمہارے پیچھے مادھو موسیٰ اور منجوری کہیں چٹانہ کریں۔“
 ”چٹا کس بات کی۔۔۔ دونوں کو بارکال چھوڑ کے آؤں گا۔“

میں حیران رہ گیا۔ ”ماں بیٹی کو گھر سے نکال کے جنگل کے ٹھیکے پر چھوڑ آؤ گے؟“
 وشال رائے کی گپھے دار مونچھوں کے نیچے ہنسی کی لہر تھرائی۔ ”بارکال میں صرف ٹھیکہ نہیں، وہ میری سسرال بھی ہے، مادھو اور منجوری دونوں وہاں مزے میں رہیں گی۔“
 میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ”پھر تو ٹھیک ہے۔“

سفر کا طے ہو گیا تو وشال رائے منجوری سے مخاطب ہوا جو چپ بیٹھی ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ ”اب بول تیرے کو کچھ بولنا ہے؟“
 ”نہیں بابو۔۔۔!“ منجوری کہنے لگی۔ ”جب تم، کالی ناتھ اور کریم، کیشپ کے ساتھ جاؤ گے تو مجھے کوئی چٹا نہیں ہوگئی۔“

”اب کیشپ کے بھوجن کی چٹا کر۔“
 یہ کہہ کر وشال رائے اٹھا اور چلمن اٹھا کے باہر نکل گیا شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مادھو موسیٰ میرے لئے کیسا کھانا بنا رہی ہے، اس کے جاتے ہی منجوری میرے پاس کھسک آئی اور بولی۔
 ”بابو کو تمہارے بھوجن کی بڑی چٹا ہے۔“
 ”تمہیں چٹا نہیں؟“

اس نے اپنی بائیں میرے گلے میں پرو دیں، ہونٹوں کی قاشیں اوپر اٹھائیں۔ ”تمہارا بھوجن تو میں ہوں۔“

میرے سامنے بڑا لذیذ بھوجن تھا مگر جو کھانا مادھو موسیٰ نے تیار کیا وہ بھی کچھ کم مزے دار نہ تھا، ہم سب نے مل کر کھایا۔ بھوجن ختم ہوا تو میں نے اجازت چاہی مگر منجوری کہنے لگی۔ ”دو گھنٹے کا تو رستہ ہے، دن ڈھلے چلے جانا۔“

وشال رائے اور مادھو موسیٰ نے بھی اس کی تائید کی۔ ”منجوری ٹھیک کہتی ہے، کچھ دیر رک جاؤ۔“
 مجھے دن ڈھلے تک رکنا پڑا اور یہ سب منجوری کے کمرے میں باتیں کرتے، اس کے بالوں کی گھٹاؤں کے درمیان اڑتے، نتھنی کی چمک دمک دیکھتے اور پریم کے جواڑ بھائے میں ابھرتے ڈوبتے بیت گیا، چمک بستی سے نکلا تو پیار کا نشہ انگ انگ میں دوڑ رہا تھا۔

جب رنگامتی پہنچا، مسجد میں عشاء کی اذان ہو رہی تھی، اذان کا ایک فائدہ مسلمانوں کے علاوہ بودھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کو بھی ہے کہ سہے کا پتہ چل جاتا ہے۔ اذان کی آواں سن کر گھڑی دیکھی تو رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔

مجھے چتا اس بات کی تھی کہیں گھر والے پریشان نہ ہوں، بتا کے گیا ہوتا تو بات اور تھی، گھر میں داخل ہوتے ہی پتہ چلا کہ ابھی تک کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ سب میری راہ دیکھ رہے تھے، ماں مجھے رسوئی میں کھینچ لائی، بڑی الجھی الجھی نظر آ رہی تھی۔

”کہاں چلا گیا تھارے؟“

میں نے اس کے کان میں بتایا۔ ”منجوری کے گاؤں۔“

ماں کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں پھر سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ ”اے کہیں

جل پنا کے بارے میں تو نہیں بتا دیا تو نے؟“

”سب کچھ بتا دیا ماں!“

”وہ تصویر حیرت بن گئی۔“ پھر کیا بولی منجوری؟“

”وہ کیا بولتی، میں نے وصال رائے سے پہلے ہی دوسرے بیاہ کی بات کر دی تھی۔“

”مگر وہ تو سندرمی کے بیاہ کی بات تھی۔“

”اب جل پنا کے ناتے کا بھی ذکر کر دیا ہے۔“

”منجوری کچھ تو کہتی ہوگی۔؟“

”اس نے کچھ نہیں کہا بس جل پنا کی چٹان کر رو پڑی۔“

یہ سنتے ہی ماں کی آنکھوں سے بھی پانی چھلک پڑا۔ دھوتی کے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی

بولی۔ ”بڑی اچھی ہے منجوری۔ جس سانچے میں ڈھال دو ڈھل جاتی ہے مگر تو ابھی جل پنا سے

اس کی بات نہ کرنا۔“

ماں کی آواز کچھ اور مدہم ہو گئی تھی، میں نے بھی اسی لہجے میں ”اچھا“ کہہ کر اسے تسلی کر دی

پھر وہ کھانا پروسنے لگی اور مجھ سے بولی۔

”جا کے جل پنا اور کایا سے کہہ دے بھوجن کر لیں، بے چارے کب سے بھوکے بیٹھے ہیں

تیرے لئے۔“

کھانے کے بعد ابھی ہم بڑے کمرے میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ کایا پنتھانے رشتے ناتے

کی بات چھیڑ دی۔

”کسم جیجی! چندر بالا کی بڑی خواہش تھی کہ اس کے ہاں بیٹی نے جنم لیا تو اسے کیشپ سے

بیاہ دے گی۔ بے چاری نے بیٹی کو دودھ پلایا نہ گود کھلایا، جنم دیتے ہی چل بسی، اب سوچتا ہوں۔“

برما جانے سے پہلے اس کی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے ان دونوں کی منگنی کر دوں۔“
ماں تو دل سے یہی چاہتی تھی مگر کایا پنتھانے منگنی کی بات کچھ اس طرح اچانک چلائی کہ کچھ
دل نہ سکی اور بول شاید اس لئے نہ سکی کہ میرے دوسرے ناتوں نے اس کی زبان پکڑ لی۔ اب
سوچ رہی تھی وہ ناگفتنی باتیں کس طرح کرے جنہیں کہتے ہوئے ہچکچاتی اور ڈرتی بھی تھی مگر
جنہیں اس موقع پر بیان کرنا بھی ضروری تھا۔ اسے چپ چاپ دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔
”کیا تمہیں یہ ناتا منظور نہیں جیجی!“

”مجھ سے کیا پوچھتے ہو کایا!“ آخر ماں نے زبان کھولی۔ ”میں تو اسی دن سے جل پنا کو اپنی
بہو مان بیٹھی ہوں جس دن کیشپ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا مگر تم نہیں جانتے کچھ
باتیں اور بھی ہیں۔“

”کیا کیشپ کے لئے کوئی دوسری لڑکی پسند کر چکی ہو؟“

ماں کی پریشان سی نظریں میرے چہرے میں گڑی جا رہی تھیں، میں نے آنکھوں ہی
آنکھوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ جو کچھ اس کے جی میں آتا ہے کہہ دے، کچھ سوچ کر بولی،
میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی کایا۔۔۔! کیشپ کے لئے کچھ اور لڑکیوں کی بات بھی
ہوئی ہے، ایک لگن تو ہو چکا۔۔۔“

یہ سنتے ہی جل پنا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس کی نظریں دوڑ کے مجھ پر ٹک گئیں گویا مجھ
سے لگن کے بارے میں پوچھ رہی تھی مگر ابھی مجھے جواب نہیں دینا تھا۔ کایا پنتھانے ماں کی بات
پر غور کیا اور کہا۔ ”میں ایک لڑکی کے بارے میں کچھ سن چکا ہوں شاید وہ سروپ جی کی بیٹی
سندرمی ہے۔“

اب حیران ہونے کی باری میری اور ماں کی تھی۔ کایا کی زبان سے سندرمی کا نام توقع کے
خلاف سنا تھا مگر اس نے اپنی بات جاری رکھی اور بتایا کہ وہ اس نتیجے پر کیسے پہنچا ہے۔

”جل پنا کو ساؤ گاری سے صرف اس لئے نکالا گیا کہ یہ کیشپ سے پریم کرنی اور سروپ
جی کیشپ پر اپنی بیٹی کا حق سمجھتے تھے۔ وہ ایک بڑے جاگیردار ہیں۔ لاکھوں کی جائیداد ہے۔
سندرمی ان کی اکلوتی بیٹی ہے اور میں نے سنا ہے پڑھی لکھی اور بہت سندرمی ہے، اگر اس سے
کیشپ کا لگن ہو گیا تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں، جل پنا سروپ جی سے التجا کرتی رہی کہ کیشپ
اور سندرمی کی داسی بن کے رہ لے گی مگر انہوں نے بات نہ مانی اور جل پنا کو ساؤ گاری سے
بندی گھر میں بھیج دیا۔“

ماں یہ سن کر ہکا بکا سی رہ گئی، کایا نے جو نتیجہ اخذ کیا، وہ غلط نہ تھا مگر اب ضروری تھا کہ میں
بھی کچھ بولوں کچھ بتاؤں کیونکہ اس نے بات کا صرف ایک پہلو سنا اور سمجھا تھا دوسرے پہلو

گیا۔ وہ عجیب سا تہقہہ میں نے جیون میں پہلی بار اور جل پنانے پانچ برس کے بعد سنا، ذرا ہنسی
 مٹھی تو بولا۔

”میں تو ایک سمجھا تھا، یہاں دو کی بات نکل آئی مگر میں جانتا ہوں یہ دو ہرانا تا کیسے ہوا، ادھر ساؤ گاری میں سروپ جی نے اپنی بیٹی کو کیشپ سے منسوب کر دیا ہوگا، ادھر کسم چینی نے پنپوری کو اپنی بہو بنانے کی بات چلائی ہوگی۔“

”بالکل اسی طرح ہوا کایا!“ ماں چلائی۔۔۔“ ہم دونوں ایک ہی سے ایک ہی گھر میں دو لڑکیوں کی بات کر رہے تھے۔“

”ایک تیسری لڑکی بھی تھی ماں!“ میں نے اسے جل پنا کی طرف توجہ دلائی۔

وہ اپنی دھن میں کہتی رہی۔

[illegible]

یہ کہہ کر ماں پلو سے اپنی آنکھوں کا پانی پونچھنے لگی۔ اس کی باتوں نے عجیب سی کیفیت پیدا کر دی۔ میں مطمئن تھا اس نے کوئی بات چھپائی نہیں جو کچھ ہو گزرا تھا صاف صاف کہہ دیا۔ جل پنا بار بار حیرت سے مجھے دیکھتی۔ اس حیرت میں اس کا پریم، ساگر کے پاگل جوار

کے بارے میں نہ وہ کچھ جانتا تھا نہ جل پنا کو کچھ علم تھا، میں نے دوسرا رخ پیش کیا۔

”کایا موسا۔۔۔! یہ ٹھیک ہے کہ سروپ جی نے میری وجہ سے جل پنا کو ساؤ گاری سے نکال دیا کیونکہ وہ مجھ پر صرف اپنی بیٹی کا حق سمجھتے تھے مگر بات ان کے سمجھنے یا نہ سمجھنے۔۔۔ ماننے یا نہ ماننے کی نہیں بلکہ اس اختیار کی ہے جو ایک شرط پر وہ مجھے لکھ کر دے چکے اور میری ہر بات ماننے کے پابند ہیں، وہ جانتے ہیں جل پنا مجھ سے، میں جل سے پریم کرتا ہوں۔ انہوں نے اسی بات پر ساؤ گاری میں مجھ سے جھگڑا کیا اور مجھے جل پنا کی تلاش سے روکنا چاہا مگر میں ان کی ضد کو ٹھکرا کے پہاڑی خانقاہ میں پہنچ گیا اور گنجال کا بندی بنا۔ اسی بندی گھر میں، میں نے جل پنا کی زبان سے سنا کہ اس نے سندرمی کی داسی بن کر رہنے کی التجا کی، مجھے یہ بات جب بھی بری لگی تھی، اب بھی بری لگی ہے۔ پریم کی کتاب میں ”داسی“ کا کوئی لفظ نہیں۔ پریم میں عورت کا صرف ایک روپ ہوتا ہے اور وہ ہے دیوی کا روپ۔ تم باپ بیٹی داسی اور مالکن کی بات کرتے ہو، اگر سندرمی کو خبر ہوئی کہ اس کے کارن سروپ جی نے جل پنا کو ساؤ گاری سے نکال دیا اور گنجال نے اسے بندی گھر میں ڈال دیا تو خود اس کی تلاش میں نکلتی اور گنجال کا خون کر کے بھی جل پنا کو نکال لاتی۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کے اپنے باپ کی بھول کا پر اُشخت کرتی۔ اسے گلے سے لگاتی کیونکہ وہ جل پنا پر جان دیتی ہے مگر اسے تو کسی بات کا علم ہی نہیں۔“

میں نے جل پنا کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر گزرتی دیکھی۔ اس کی اڑی رنگت لوٹ آئی تھی۔ کایا پنتھانے بھی تصویر کا دوسرا رخ دیکھ لیا اور سمجھ گیا تھا کہ سندرمتی سے لگن کے بعد بھی میں نے جل پنا پر اپنا ادھیہ کار نہیں چھوڑا۔ وہ کہنے لگا۔

”جب سروپ جی تمہیں اختیار دے چکے، تمہاری ہر بات ماننے کے پابند ہیں اور سندر متی جل پناہر جان دیتی ہے تو پھر کہنے کے لئے باقی کیا رہ گیا؟“

”کہنا سننا کبھی ختم نہیں ہوتا کایا موسا! دیے سے دیا جلتا اور بات سے بات چلتی ہے، ابھی تم نے صرف ایک بات سنی ہے، دوسری نہیں۔“

”دوسری بات کیا ہے؟“

”ماں ایک چکمہ گھرانے کی لڑکی کو بھی اپنی بہو مان چکی ہے، بولتی کیوں نہیں ماں؟“

”کیا بولوں..... میں نے خود ہی وشال رائے کی بیٹی منجوری کو کیشپ کے لئے مانگ لیا تھا مگر تب میں جل پنا کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی۔ اب وہ لوگ بھی اپنا ادھیہ کار مانگتے ہیں۔“

جل پنا نے ایک بار پھر چونک کر دیکھا، کایا پتتھا دوسرے ناتے کا ذکر سن کر پل بھر کے لئے حیرت کے کھنور میں ڈوب گیا اور جب ابھرا تو اس کا تہقبہ کانچ کی طرح ٹوٹ کر کمرے میں بکھر

وہ سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تو ماں نے کہا۔ ”لے تیری منگنی کی مٹھائی ہے، کھالے۔“
جل پنا نے مٹھائی کی ایک ڈلی اٹھا کے منہ میں رکھی۔ جھک کر ماں کے چرنوں کو ہاتھ لگایا
پھر دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ ماں نے آ کر کایا کو بدھائی دی، دونوں باتیں کرنے
لگے۔ میں انہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا تو جل پنا جلدی سے اٹھ کر میرے قدموں سے
لیٹ گئی۔

”کیشپ بابو! میں پہلے بھی تمہاری تھی، اب بھی تمہاری ہوں، اگر مجھ سے کبھی بھول چوک
ہو جائے تو شام کر دینا۔“

اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبتی چلی گئی میں نے پکڑ کے اٹھایا تو رو رہی تھی، اس موقع پر
اسے روتا دیکھ کر مجھے عجیب عجیب سے خیال آنے لگے۔

”معلوم ہوتا ہے تمہیں منجوری کی سگائی اور سندرمی کے لگن کا سن کر دکھ ہوا۔“
”نہیں کیشپ بابو۔۔۔!“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی، آنکھوں میں ابھی تک پانی تھا، میں
نے آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔

”پھر ان کٹوروں میں پانی کیوں؟“
”پہلے میں نے ایک سپنا دیکھا تھا، آج اس کی تعبیر دیکھی ہے، اسی خوشی میں یہ کٹورے
چھلک پڑے۔“

”اب ان کٹوروں میں مسکراہٹ کے دیئے جلا دو نا۔“
وہ تڑپ کر میرے سینے سے آگئی اور مسکرانے کی بجائے بلک بلک کر رونے لگی۔ موسم کی
طرح پگھلی جا رہی تھی، عورت کی زندگی میں بعض لمحے ایسے آتے ہیں جب ذرا سی بات پر دل
پگھل پگھل جاتا ہے، آنکھیں چھلک چھلک پڑتی ہیں۔ سسکیوں کے درمیان میں اس کی تڑپتی،
لرزتی آواز بھی سن رہا تھا۔ کہہ رہی تھی۔

”بھلا کون جانتا تھا میرا تمہارا ملاپ اس طرح ہو گا اور تم ایک بلوان کی طرح مجھے بیروں
کی قید سے نکال لاؤ گے۔“

”ارے ارے، مجھے بلوان کہتی ہو۔ میں تو چوروں کی طرح بندی گھر میں سیندھ لگا کر تمہیں
بھگالایا۔ اگر تھاپا کے آدمی پیچھا کر کے پکڑ لیتے تو مار مار کے ساری بلوانی نکال دیتے۔“

جل پنا روتے روتے یک لخت ہنس پڑی۔ نینوں کے کٹوروں میں دیے جل اٹھے۔ پانی
میں آگ لگ گئی اور بھیگی آنکھوں سے پھلجھڑی کی طرح ہنستی، مسکراتی، تڑپتی نظروں کی نرم گرم
پھوار مجھ پر پڑی۔

”مجھ سے کیا نٹ کھٹی کرتے ہو، تم نے تو تھاپا بہادر کا سارا گھمنڈ نکال دیا۔ یہ کام کوئی سورا

کی طرح لہریں لے رہا تھا، یوں لگا دنیا کی ساری رعنائی اس کے چہرے پر سمٹ آئی ہے۔
کایا پنتھا کے من میں بھی کوئی باڑھ چل رہی تھی اور وہ اس طغیانی کو اپنے سینے کی چار دیواری
میں روکے بیٹھا تھا مگر زیادہ دیر تک چڑھتے جذبات کو روک نہ سکا اور یک لخت بولا۔

”کسم جیجی! جو کچھ تم نے کہا، جو کچھ میں نے سنا وہ کچھ ایسا ہے جیسے سورگ کا کوئی سپنا
ہو۔۔۔ تم نے ہر بات اس طرح کھول دی ہے کہ اب مجھے کچھ پوچھنے اور تمہیں کچھ بتانے کی
حاجت نہیں۔ تمہاری باتوں سے مجھے نئی شکلی ملی ہے۔ تم نے، کیشپ نے میری مظلوم بیٹی کو دکھوں
سے نجات دلانے کے لئے سروپ جی سے ناتا جوڑا، اب تم پر میرا مان کچھ اور بڑھ گیا ہے۔
کیشپ کی ذات میری نظروں میں کچھ اور اونچی ہو گئی ہے، مجھے ہاتھ کی ریکھاؤں پر وشواس ہے
اور کیشپ کی تیسری ریکھا بھی اسے سونپتا ہوں، صرف جل پنا سے پوچھنا رہ گیا ہے۔“

یہ کہتے کہتے کایا پنتھا نے جل پنا کی طرف دیکھا۔ ”تم نے میرا فیصلہ سن لیا بیٹی! اب اپنا
فیصلہ بھی دے دو۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد اگر تمہیں کوئی اعتراض، کوئی شکایت ہے تو
تمہاری ہی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

جل پنا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ کہنے لگی۔ ”بتا جی! کیشپ کے بارے
میں آپ کو مجھ سے کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں، یہی میرے دیوتا، یہی
میرے بھگوان ہیں۔ داسی بنا کے رکھیں تو دیوی بنا کے رکھیں تو۔۔۔ میں ان کی چوکھٹ نہیں چھوڑ
سکتی اور اس چوکھٹ پر تو ماں کی مامتا بھی ملی ہے، اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی پھر میری جان
کیشپ نے بچائی، آپ کو نیا جیون کیشپ نے دیا۔ اگر میں ساری عمر ان کی پیروی کی دھول
چاٹتی رہوں پھر بھی بدلہ نہیں چکا سکتی، آپ نے جو کچھ سوچا ہے پورا کریں۔“

یہ کہہ کر اٹھی اور بھاگ کے میرے کمرے میں جا گئی، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بس ہم دیکھتے
رہ گئے اور اس نے دروازہ بھیڑ لیا اس کے چلے جانے کے بعد کچھ لمحے خاموشی میں گزر گئے پھر
کایا پنتھا بولا۔

”کسم جیجی! تم نے میرا اور جل پنا کا فیصلہ سن لیا نا؟“

”سن لیا کایا۔۔۔!“

”اب تم بولو۔۔۔“

ماں اٹھی اور ”ابھی آئی“ کہہ کر سوئی کی طرف چل دی۔ لوٹ کے آئی تو ہاتھ میں مٹھائی کی
تھالی تھی۔ اس نے تھالی کایا کی طرف بڑھائی۔

”او منہ بیٹھا کرو۔ آج سے جل پنا میری ہوئی۔“ پھر اس نے میرا منہ بیٹھا کر لیا اور تھالی
اٹھائے ہوئے میرے کمرے کا دروازہ کھول کے بولی۔ ”جل پنا بیٹی! ذرا میرے پاس آنا۔“

بہادر بھی نہیں کر سکتا۔

”کر سکتا تھا یا نہیں مگر اسی بہانے تم ہنسی تو۔“

میں اچھی بھلی رو رہی تھی تم نے ہنسا دیا۔“

”ارے۔۔۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ رونا کہاں کا اچھا بھلا کام ہے؟“

وہ مسکرا کر ساڑی کے آنچل سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔

”ایک بات پوچھوں؟“

”کیا پوچھو گے؟“

”پہلے قسم کھاؤ سچ بتاؤ گی۔“

”کس کی قسم کھاؤں؟“

”جس کے نام کی پوجا کرتی ہو۔“

”تو تمہارے نام کی قسم کھاتی ہوں سچ بتاؤں گی۔ پوچھو کیا پوچھتے ہو؟“

میں نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں کہیں سندرمی اور منجوری کا جلاپا تو نہیں؟“

”نہیں۔۔۔“ اس کا لہجہ پرسکون تھا۔ ”اور اس لئے نہیں کہ منجوری تمہارا سپنا اور سندرمی

تمہارا نروان ہے مگر میں تمہارا پہلا پریم، تمہاری آن، تمہاری جان ہوں، یہی ایک ناری کی اصل

پونجی ہے، تم نے میرے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی، کسی اور کے لئے تو نہیں لگائی۔“

اس خوبصورت دلیل کے ساتھ اس کی گردن بھی فخر سے تن گئی، میں نے اسے چھیڑنے کیلئے

کہا۔ ”پریم تو سندرمی سے بھی کرتا ہوں۔“

ناگہاں اسے کوئی بات یاد آگئی۔ ”میں نے ساؤ گاری میں سندرمی کے بارے میں پوچھا تو

جب تم نے اس کے پریم کی ہامی کیوں نہیں بھری تھی؟“

”ڈرتا تھا کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔“

”میں تم سے خفا ہونے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی کیشپ!“

میں نے سوچا اب ذرا اسے چڑا کے دیکھوں۔ ”پتہ ہے تمہیں۔۔۔ آج کہاں گیا تھا میں؟“

”کہاں گئے تھے؟“

”منجوری کے گاؤں۔۔۔ اس سے ملنے۔“

”پھر کیا ہوا۔“ اس نے چڑنے کی بجائے خوش طبعی کا مظاہرہ کیا۔ ”تم نے وہ کہاوت نہیں

سنی، ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی، اس کا ناؤں۔۔۔ ہاتھی تو میرے ہی ہو۔“

”تم نے یہ نہیں پوچھا میں نے منجوری کو تمہارے بارے میں کچھ بتایا کہ نہیں۔“

”تو کیا بتایا اسے میرے بارے میں؟“

”ہاں۔۔۔ تمہارے دکھوں کی کہانی سنی تو رونے لگی۔“

جل پنا کے دل میں شاید اس کے لئے ہمدردی اور اپنائیت کا جذبہ ابھرا۔ میرے قریب بیٹھ

کر پوچھنے لگی۔

”کیسی ہے منجوری؟“

”بہت سندر، بہت سیدھی مگر تمہاری طرح ایک دکھا سے بھی ہے۔“

”کیسا دکھ؟“

”ساؤ گاری کی نزکی روپ تارا یاد ہے نا؟“

”ہاں یاد ہے۔۔۔ بے چاری ساؤ گاری میں مر گئی۔“

”وہ منجوری کی پھوپھی تھی، وصال رائے کی بہن۔“

اس انکشاف پر جل پنا مارے حیرت کے اُچھل کر کھڑی ہو گئی اور ہکا بکاسی کہنے لگی۔ ”کتنی

عجیب بات ہے، تمہارے سارے ناتے ساؤ گاری کے گرد گھومتے ہیں۔ میری طرح روپ تارا بھی

وہاں نزکی تھی اور منجوری اس کی بھتیجی ہے۔۔۔ رہی سندرمی تو وہ ساؤ گاری کی وارث ہے۔“

اب میں اسے بتانے لگا۔ ”میں نے ساؤ گاری کے اسرار کو فاش کرنے کی سوگند کھائی ہے

جو تین صدیوں سے نسل در نسل ساؤ خاندان کو چاٹ رہے ہیں جس کا ویرانہ نہ جانے کتنی کنواری

نرتکیوں کا مرگھٹ بنا ہے۔ اب وہ بوڑھی عمارت سندرمی کا ورثہ بننے والی ہے اور گوچی ساؤ کی

وصیت کے مطابق وہ بھی اپنے پرکھوں کی طرح مہذب دنیا سے دور اسی پر اسرار عمارت میں

جینے مرنے کی پابند ہے۔ سروپ جی کے بعد بھگوان کے مندر میں ناچ پوجا کا سلسلہ جاری

رکھنے کے لئے شاید اسے بھی گرہن زدہ لڑکیوں کی تلاش رہے گی جس طرح منگل ساؤ روپ تارا

کو اگر تلہ سے اور سروپ جی تمہیں مانڈ لے کے ناچ آشرم سے ڈھونڈ لائے تھے مگر سندرمی کو یہ

کھیل پسند نہیں۔ وہ اس عمارت کو چھوڑ دینا اور پر اسرار وصیت کی پر ہول چار دیواری سے نکلنا

چاہتی ہے اور میں نے وچن دیا ہے کہ اسے ساؤ گاری سے نکال لاؤں گا۔ ایک نیا جیون دوں گا

اور ساؤ گاری کو گہرے بھیدوں کے جہنم سے نکال کر نروان عطا کروں گا تاکہ اس ویرانے میں

ناچ پوجا کی گھنٹیاں نہ بجیں اور کنواری نرتکیاں آشاؤں کے مرگھٹ پر نہ ناچیں۔“

جل پنا حیرت زدہ، سحر زدہ میزری باتیں سنتی رہی، پھر جھکی اور میرے پاؤں پکڑ کے بیٹھ گئی۔

”مجھے شاکر دو کیشپ!“

”مگر ہوا کیا ہے؟“

”میں تمہیں غلط سمجھی تھی۔“ وہ ابل پڑی۔ ”میں سمجھی تھی میرے پریم کی طرح تمہیں سندرمی

کا کنوارا جو بن بھا گیا، منجوری کی سندر جوانی اچھی لگی کیونکہ بعض سوشیل نو جوان بھونرے کی طرح

”کچھ لوگوں کے ساتھ انیائے ہوا، اب قدرت چاہتی ہے کہ ان کے لئے انصاف کی کچھری لگے۔“

وہ چند لمحے حیران و ششدر سی مجھے دیکھتی رہی۔ ”تو تم اپنا آدرش پورا کرنے جا رہے ہو؟“

”میرا آدرش تم ہو۔“

”تمہیں انسان سمجھوں یا بھگوان؟“

”انسان بھگوان ہی کا ایک روپ ہے۔“

وہ میرے ساتھ آگئی میں نے اسے پیار کیا پھر گھڑی دکھائی۔ ”آدھی رات گزرنے والی ہے اور سویرے مجھے جانا ہے، اب تم بھی آرام کرو۔ میں بھی کچھ سولوں۔“

وہ یک لخت اٹھی، میرے چرنوں کو ہاتھ لگایا اور کمرے سے نکل گئی، اس کے جاتے ہی میں بستر پر لیٹ کے اپنے ذہن میں سوچوں کی کھڑکیاں بند کرنے لگا کہ صبح تک گہری نیند سوسکوں مگر جب مختلف خیالوں اور سوچوں سے رہائی کا جتن کر رہا تھا کہ اچانک دماغ کی کسی گہری کوٹھڑی کے پٹ ہلنے لگے جیسے ہوا سے کواڑ آپ سے آپ کھلتے اور بند ہوتے ہیں، ساتھ ہی میں نے ایک عجیب سی سرسراہٹ سنی۔ میرے ذہن سے ایک عجیب سی رو گزرنے لگی اور گہری کوٹھڑی سے آواز آئی۔

”کہاں ہو پر بھو! بولتے کیوں نہیں، آپ کو کھوجتے کھوجتے برا حال ہو گیا۔“

میرے ہونٹ خود بخود ہلنے لگے۔ ”ارے شاستر دارنگا متی میں ہوں۔“

”میں سروپ جی اور پیلو کو لے کر پیٹری خانقاہ میں پہنچا مگر وہاں تو نہیں تھے۔“

”وہیں تھا، گہرے تہہ خانے میں، گنجال نے تم لوگوں سے چھل کیا۔“

”کل شکر خانقاہ سے آیا، بڑا گھبرایا ہوا بڑا بولکھلایا ہوا تھا، سنتے ہو پر بھو!“

”سن رہا ہوں کیا کہا اس نے۔“

”بولا جل پنا خانقاہ سے بھاگ گئی، یہ سنتے ہی گنجال کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔“

”جل پنا کو میں لے آیا ہوں۔“

”اس سے کہاں ہے؟“

”ابھی ابھی میرے کمرے سے گئی ہے۔“

”چاچی ماں نے اسے سویکار کر لیا نا؟“

”ہاں۔۔۔ تم کہو سروپ جی کیسے ہیں؟“

”بڑے بے گل، بڑے بے چین، لگتا ہے آپ نہیں آؤ گے تو پاگل ہو جائیں گے انہوں نے پیلو کو بھیجا ہے کہ سندرمستی کو ساؤ گاری میں لے آئے۔“

کلی کلی کارس چوستے ہیں مگر اب معلوم ہوا تم نے یہ سب کچھ ایک آدرش کے لئے کیا ہے، کتنے مہمان، کتنے اونچے ہونے اور کتنی چھوٹی تھی میری سوچ۔“

میں نے اسے اٹھا کر اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ ”سنو جل پنا! ساؤ گاری کا نروان بے شک میرا آدرش ہے اور اسی آدرش کو پورا کرنے کے لئے مجھے بھگوان بدھ کی ایک مقدس مورتی کی تلاش ہے مگر تم پر ایک انکشاف اور بھی کرتا ہوں کہ آدمی دنیا میں اپنی مرضی سے نہیں آتا، بھیجا جاتا ہے اور میرے بھیجنے والے نے کہا ہے حسن، سندرتا اور جمال میرا گمشدہ سرمایہ ہے، جہاں سے ملے لوں خواہ وہ ناری کے بدن میں، پھول کی پتھڑی میں، شفق کی لالی میں، جھیل کے کنول میں، چاند کے جھروکے میں چھپ کر بیٹھا ہو اور یہ جو ہندو شاستروں اور پورانوں میں اندرجی کو روپ سندرتا، راگ، رنگ، ناچ اور افسردہوں کے جو بن کارسیا بتایا جاتا ہے تو یہ اصل میں آدمی کے احساس جمال اور سندرتا کے گیان، وجدان اور پہچان کی دیو مالائی صورت ہے ورنہ دیوتا نہ آج ہیں نہ اگلے وقتوں میں تھے۔ آدمی ہی دیوتا ہوتے ہیں، سندرتا کیسا ہی افسرانہ کہلاتی ہیں، تمہیں یاد ہے ساؤ گاری میں ایک شام جب تم ناچ کا لباس پہن کر میرے کمرے میں آئی تھیں میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟“

”وہ بات مجھے کبھی نہیں بھول سکتی، تم نے کہا تھا میں اندر دیوتا کی جینتی ہوں جو آکاش کے نندن باغ میں ناچا کرتی تھی۔“

”حالانکہ تم جینتی نہیں جل پنا ہو مگر جب پریمی سندرتا کی حسن اور جو بن کی تعریف کرتا ہے تو کسی خوبصورت شے یا کسی سندرخیاں سے تشبیہ دیتا ہے، میں سندرتا کا پریمی اور کائنات کے حسن کا پجاری ہوں، اسی لئے سندرتا کو کبھی جل پنا، کبھی سندرمستی، کبھی منجوری کے روپ میں دیکھتا ہوں۔۔۔ تمہیں برا تو نہیں لگا؟“

”نہیں کیشپ! بہت اچھا لگا۔ تم سچ مچ دیوتا ہو۔“

”دیوتا نہیں آدمی ہوں مگر عام آدمیوں سے کچھ مختلف۔“

”تم کچھ بھی ہو مگر تمہارے حوالے سے میں اپنے آپ کو سمجھنے، اپنے آپ پر فخر کرنے لگی ہوں۔“

اس نے پریم کے بھاؤ میں اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میں نے کہا ”اب تمہیں یہ بھی بتا دوں، میں چکمرہ گاؤں میں منجوری سے ملنے نہیں وشال رائے سے ملنے گیا تھا۔“

وہ ایک بار پھر چونکی۔ ”وشال رائے سے کیوں؟“

”اسے گنجال سے اپنا لیکھا چکانا ہے، ہمارے ساتھ ساؤ گاری جائے گا۔“

جل پنا دنگ رہ گئی پھر تڑپ کے بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔“

(27)

برما میں

آنکھ کھلی تو دن نکل آیا اور روپ کا چاند میرے اوپر جھکا ہوا تھا، میرا نیا دن جل پنا کے درشن سے چڑھا، وہی مجھے جگانے آئی تھی، جھکی جھکی بولی۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔“

”نیند آئی رات؟“

”بڑے مزے کی۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”مگر تمہیں صبح ہی صبح میری طبیعت کی چٹنا کیوں ہے؟“

”بس یونہی سوچا رات دیر سے سوئے تھے کہیں طبیعت خراب نہ ہو۔“

”بہت سوچتی ہو میرے بارے میں۔“

میں نے پکڑ کے اپنے پاس بٹھایا تو وہ اچھل کے کھڑی ہو گئی۔ ”جلدی اٹھو، ماں بلا رہی ہے تمہیں۔“

میں اس بلاوے پر حیران تھا۔ جلدی سے اٹھا اور اس کے ساتھ ہی رسوئی میں پہنچا۔ ماں ناشتہ بنا رہی تھی، اس نے اٹھ کر ایک تھالی جس میں ڈھیری مٹھائی تھی، میرے ہاتھ میں تھامادی۔

”یہ کیا ماں؟“

”ابھی بازار سے منگوائی ہے جا کے صوفی عبد الجبار کو دے آ۔ منہ میٹھا کر لیں۔ بول دینا رات جل پنا سے تیری منگنی ہو گئی ہے۔ دعا کریں کہ بہو دودھوں نہائے، پوتوں پھلے۔“

ہر ماں اپنی بہو کے لئے یہی چاہتی ہے مگر وہ کچھ ایسی بے چین ہو رہی تھی کہ میری ہنسی نکل گئی۔ ”ابھی بیاہ کہاں ہوا ہے ماں! صرف منگنی ہوئی ہے۔“

”بیاہ بھی ہو جائے گا رے۔“

”اگر دودھوں نہانے، پوتوں پھلنے کی دعا کرانی ہے تو مٹھائی صوفی چاچا کے پاس خود لے کے جانا اور بہو کو ساتھ لے گئی تو دعا جلد قبول ہوگی۔“

جل پنا شرما کر دروازے کی طرف ہوئی۔ ماں سوچ میں پڑ گئی، پھر بولی۔ ”رہنے دے، میں خود ہی جاؤں گی۔ تو نہادھو کے ناشتہ کر لے۔“

”اے کیوں بلایا ہے؟“

”پریشان ہیں، بہت شاید بیٹی کو دیکھ کر کچھ سنبھلیں۔“

”میں نے کہا تھا انہیں تسلی دیتے رہنا۔“

”پر بھو! جب آپ خانقاہ میں نہیں ملے تو میرے اپنے ہوش اڑ گئے تھے، کیا آپ نہیں آؤ گے۔“

”کچھ دنوں تک آؤں گا مگر بولنا نہیں کسی سے۔“

”آپ کہتے ہو تو نہیں بولوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی ذہن سے گزرنے والی سرسراہٹ ختم ہو گئی۔ شاسترو سے بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور گہری کوٹھڑی کے کواڑ خود بخود بند ہو گئے۔

معلوم نہیں میں نے سچ مچ شاسترو سے باتیں کیں یا وہ میرے اپنے ہی ذہن میں گھس کر بیٹھے ہوئے پریشان سے خیالات تھے جو شاسترو کی آواز بن کر گونجتے رہے ہیں، میں خانقاہ کے بندی گھر میں اس کے ساتھ ذہنی رابطے کا انتظار کرتا رہا تھا مگر اس گہرے کنویں میں تو اس کی آواز سنائی نہ دے سکی، نہ جانے کیوں آج وہ رنگامتی میں ساؤ گاری کی خبریں سنانے پہنچ گیا تھا جن پر مجھے اپنی ہی قیاس آرائی کا گمان ہوا کہ شاید میری سوچ کے مطابق وہاں یہ ساری باتیں اس طرح ہوئی ہوں گی مگر مجھے شاسترو کی بات چیت یا اپنی پریشان خیالی پر توجہ دینے اور سوچنے کا سہ نہیں مل سکا کیونکہ ذہن کی کوٹھڑی بند ہوتے ہی مجھ پر نیند کا غلبہ بڑھتا چلا گیا اور چوہنے سمجھنے کی ساری قوتیں ماند پڑ گئیں۔

○○○

آتے ہیں کہ سفر کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے کہیں کہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ناگن بل کھا رہی ہے۔
میں کایا پنتھا کو اس علاقے کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں سناتا رہا اور لانچ مختلف پڑاؤ
اور گھماؤ کا نئی چندر گونا کے گھاٹ پر آگئی، میں اپنا سامان اٹھانے لگا تو وہ حیران سا ہو کر بولا۔

”ہمیں تو چٹا گانگ جانا ہے۔“

”چٹا گانگ ہی جائیں گے مگر چندر گونا میں ایک بودھ مندر ہے جہاں ہر سال تھان مانا کا
میلہ لگتا ہے میلہ تو گزر گیا سو چتا ہوں مندر ہی دیکھتا چلوں اور اپنے نئے سفر کا شگون لوں۔“
کایا نے شگون لینے کو پسند کیا اور میرے پیچھے ہولیا۔ چندر گونا میں اترنے والے مسافر بہت
تھوڑے تھے، چند عورتیں، چند مرد مگر سوار ہونے والوں کی تعداد کافی تھی، ہم ان کے درمیان
سے گزرتے بندرگاہ سے نکلے اور پہاڑی کی طرف ہولے، میں منجوری کے ساتھ تھان مانا کے
تہوار پر یہاں آچکا اور مندر کا راستہ دیکھا بھالا تھا مگر جب یا تریوں اور میلہ دیکھنے والوں کی بھیڑ
تھی اور اب راستہ سنسناتا پڑا تھا کوئی اکا دکا آدمی بھی دکھائی نہیں دیا، معلوم ہوتا تھا پجاری اور
بھکشو بھی آرام کر رہے ہیں کیونکہ ایک بوڑھے سادھو کے علاوہ جو دیوار کے سائے میں لیٹا تھا
اور کسی کی صورت نظر نہ آئی۔

مندر میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کایا پنتھا نے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ برما میں
بڑے بڑے عالی شان بودھ مندر ہیں، میں اندر داخل ہوا، بڑا کمرہ بھی جس میں بھگوان بدھ کی
بڑی مورتی نصب تھی، خالی تھا، مہار پر وہت کے کمرے میں تین چار سادھوؤں کے درشن ہو گئے
جو اس کے ارد گرد فرش پر بیٹھے تھے۔ ان میں وہ بھکاری سادھو بھی نظر آیا جس نے تھان مانا کے
میلے پر مجھے خنجر کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی، میں اسے، وہ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گیا مگر آج میں
نے اسے کھسکنے یا بھاگنے کی مہلت نہیں دی، ابھی وہ اٹھا ہی تھا کہ میں نے دیوچ لیا اور اسی کا خنجر
نکال کر اس کی گردن پر رکھ دیا، وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

کایا پنتھا حیران و دم بخود کھڑا معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے آواز دی۔ ”کایا!
دروازہ بند کر دو، نہ کسی کو اندر آنے دو نہ باہر جانے دو۔“

وہ فوراً کنڈی چڑھا کر دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا، یہ سب کچھ اتنی جلدی اور اچانک
ہو گیا کہ کسی کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا، سارے سادھو ہکا بکارہ گئے، میں نے خنجر بھکاری
سادھو کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تاکہ اسے اچھی طرح دیکھ لے پھر پوچھا۔

”اس خنجر کو پہچانتے ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے خنجر کی نوک اس کی گردن پر رکھ کر ذرا دباؤ ڈالا تو بولا۔ ”پہچانتا ہوں۔“

سٹن میں آیا تو کایا پنتھا غسل خانے سے نکل رہا تھا، میں نے اسے دیکھتے ہی بتایا۔ ”کایا
موسا ارات خبر آئی ہے کہ ہمارے فرار کا سنتے ہی پروہت گنجال کے پاؤں تلے سے زمین نکل
گئی۔“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”کون لے کر آیا ہے یہ خبر؟“

میں بغلیں جھانکنے لگا، جواب کیا دیتا، اچانک جل پانے ایک اہم اطلاع فراہم کر دی۔ ”پتا
جی! رات جب میں اپنے بستر پر آ کے لیٹی تو یہ کسی سے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے، میں
نے ان کی زبان سے شاستر و گنجال اور سروپ جی کے نام سنے تو حیران ہوئی اور سوچا اٹھ کے
دیکھوں تو سہی کون آیا ہے مگر خیال آیا، ہو گا کون میں انہیں کمرے میں اکیلا چھوڑ کر تو آئی ہوں
پھر بھی ان کی کھسر پھسر سے من کو بے کلی ہو رہی تھی۔ میں دبے پاؤں چلتی دروازے پر پہنچی اور
اندر جھانک کر دیکھا تو اور کوئی بھی نہیں تھا بس یہ بستر پر لیٹے آپ ہی آپ بڑبڑا رہے تھے۔“

کایا پنتھا مسکرانے لگا۔ ”بعض لوگ نیند میں بڑبڑایا کرتے ہیں۔“

”مگر آدمی نیند میں تب بڑبڑاتا ہے جب سپنا دیکھ رہا ہو۔“

سپنے کا سنتے ہی کایا پنتھا کے چہرے پر پہلے حیرت پھر اعتماد اور وشواس کی جھلک نظر آئی۔
”اگر کیپٹ نے رات سپنا دیکھا ہے تو سمجھ لو گنجال کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور جل پنا وہیں کھڑی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی مگر رات
میں نے کوئی سپنا نہیں دیکھا تھا تو معلوم ہوا بات چیت شاستر وہی سے ہوئی تھی، جل پنا نے وہ
باتیں سن لیں اور سمجھی کہ میں سپنے میں بڑبڑا رہا ہوں سوچا کہیں نیند میں بڑبڑانا وہ میری عادت
ہی نہ سمجھ لے مگر میرے پاس سے نہیں تھا کہ اس کی یہ غلط فہمی دور کر سکوں، میں جلدی سے غسل
خانے میں گھس گیا۔



ناشتہ کرتے کرتے آٹھ بج گئے پھر جل پنا کو تسلی دے کر، ماں کے چرنوں کو ہاتھ لگا کر میں
نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور گھر سے نکل کر کایا موسا کے ساتھ دریائی بندرگاہ کی طرف ہولیا،
ہمیں چٹا گانگ سے ریل پر سوار ہو کر دیمو پور پہنچنا تھا۔

بندرگاہ پر پہنچتے ہی لانچ مل گئی اور نیا سفر شروع ہو گیا۔

میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ کرنا فلی کا دریائی سفر بڑا دلچسپ اور رومان خیز ہوتا ہے، ایک تو
اس سفر میں مردوں، عورتوں اور جوان لڑکیوں کے مختلف چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں جن کے رنگ
دار لباس اس علاقے کی سماجی زندگی کا عکس ہوتے ہیں، دوسرے آدمی دریا کے دونوں
ساحلوں پر سرسبز اور سندر مناظر میں کھویا رہتا ہے، تیسرے کرنا فلی ندی میں اتنے گھماؤ اور بچ و خم

”تھان مانا کے دن تم نے اس خنجر سے میری جان لینے کی کوشش کیوں کی؟“

وہ گم صم ہو گیا، میرے بوٹ کی ٹھوکر پنڈلی پر پڑی تو ہلبلا اٹھا۔ ”پروہت جی سے پوچھو۔“

اب میں پروہت سے مخاطب ہوا۔ ”تھان مانا کے دن تم نے حملہ آور کو جانے پہچانے سے انکار کر دیا تھا۔ اب ایک ہی راستہ ہے جو کچھ پوچھوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو نہیں تو اقدام قتل کے دوش میں جیل کی ہوا کھاؤ گے، میں سارا بندوبست کر کے آیا ہوں۔“

مہا پروہت کھے چہرے پر کئی رنگ گزر گئے، تھوک نکل کر بولا، جو پوچھو گے ٹھیک بتاؤں گا۔“

”پہلے بھگوان کی سوگند کھاؤ، تم اس سے بھگوان کے مندر میں ہو جہاں جھوٹ بولنا مہا پاپ ہے۔“

اس نے لرزتی، کانپتی آواز میں سوگند کھائی تو میں نے پوچھا۔

”مجھ پر خنجر تم نے پھنکوا دیا تھا۔“

”جو کچھ ہوا تم بھی سن لو۔“ پھر وہ بتانے لگا۔

”تھان مانا کے میلے سے دو دن پہلے آسام کا ایک بودھ بھگت، مجھے چندر گونا کے گھاٹ پر ملا، اس سے میرے ساتھ صرف بھوال تھا۔ (اس نے بھکاری سادھو کی طرف اشارہ کیا) آسامی بھگت نے کہا کہ وہ ایک پیتا لے کر آیا ہے۔ ایک ادھرمی اور ناستک بنگالی آسام کے سرحدی علاقے میں تین بودھ بھکشوؤں کو قتل کر کے چٹا گانگ بھاگ آیا ہے اور بودھ کونسل نے شمال مشرقی سرحدی ایجنسی کے انگریز ریجنٹ سے اپیل کی ہے کہ خونی کو پکڑ کر پھانسی دی جائے مگر ریجنٹ نے کوئی کارروائی نہیں کی جس پر بودھوں نے خفیہ فیصلہ کیا ہے کہ خونی کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس کام کے لئے دوسرو پے کی پیشگی رقم اور یہ خنجر بھیجا گیا ہے، اس نے بدھ کونسل کا ایک چھپا ہوا اشتہار بھی دکھایا ہے جس میں بھکشوؤں کے قاتل کو پکڑنے اور سزا دینے کی اپیل تھی، آسامی بھگت مجھ سے کہنے لگا۔“

”آپ یہاں کے مہا پروہت ہیں اور خونی آپ کے علاقے میں ہے۔“

”مگر وہ کون؟“ میں نے پوچھا۔

”تھارو کیشپ۔۔۔ رنگامتی کا رہنے والا ہے۔“

اس سے چٹا گانگ سے آنے والی ایک لالچ گھاٹ پر لگی اور آسامی بھگت تڑپ کر سرگوشی

کے لہجے میں بولا۔

او بھگوان نے اس پاپی کو ہمیں بھیج دیا، دیکھ لو وہ لالچ پر بیٹھا ہے، مسلمان صوفی کے ساتھ

وہی تھارو کیشپ ہے، بھکشوؤں کا قاتل، ادھرمی، ناستک۔۔۔“

لالچ پر اس نے جس آدمی کی شناخت کرائی وہ تم تھے، ہمیں دیکھ کر بھوال کا خون کھولنے لگا، مگر لالچ کچھ دیر ٹھہر کے رنگامتی کی طرف روانہ ہو گئی۔ آسامی بھگت نے رقم کے ساتھ خنجر بھی بھوال کے سپرد کیا اور کہا۔

”تم نے صورت دیکھ لی ہے، دو تین دن کے اندر ٹھکانے لگا دو گے تو اور دان ملے گا۔“

یہ کہہ کر بھگت چلا گیا۔ بھوال تمہیں بھکشوؤں کا قاتل سمجھتا اور تمہارے پیچھے رنگامتی جانے والا تھا کہ تھان مانا کے دن تم خود چندر گونا گئے، اس نے تم پر خنجر پھینکا مگر نازی تھا، نشانہ چوک گیا یہ ہے اصل کہانی جس میں کوئی بات جھوٹ نہیں۔“

میں حیران رہ گیا کیونکہ انہی دنوں آسام میں تین بھکشوؤں کا قتل ہو گیا جس سے بودھوں میں بڑا جوش اور اشتعال پایا جاتا تھا مگر قاتل پکڑ لئے گئے جو چار قبائلی تھے، میں نے پوچھا۔

”کیا تم یہ نہیں جانتے بھکشوؤں کے قاتل پکڑے گئے اور انہیں پھانسی کی سزا سنائی جا چکی ہے۔“

سب الوؤں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ”آسامی بھگت کا نام، پتہ، حلیہ بتا سکتے ہو؟“

”نام پتہ معلوم نہیں، حلیہ بتا سکتا ہوں۔“

پھر مہا پروہت نے جو حلیہ بیان کیا وہ شکر سے ملتا جلتا تھا۔ ”کیا پروہت گنجال کو جانتے ہو؟“

گنجال کا نام سن کر مہا پروہت، بھوال اور دوسرے سادھوؤں کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے۔ ”کون پروہت گنجال؟“

میں نے کئی طریقوں سے پوچھا مگر پتہ چلا کوئی بھی گنجال کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ کسی نے انہیں میرے خلاف آلہ کار بنایا تھا اور وہ شکر ہی تھا، اب میں انہیں بتانے لگا۔

”میں تھارو کیشپ کلکتہ یونیورسٹی کا گریجویٹ اور ایک بودھ گیانی ہوں۔ گیر واپولے بے شک نہیں پہنا مگر بودھ دھرم کو ماننا اور بھگوان بدھ کے فلسفہ نردان پر گہرا وشواس رکھتا ہوں میں نے کسی بھکشو کو قتل نہیں کیا کیونکہ شکا کیہ منی بدھ کا ماننے والا اور جانتا ہوں کہ خون کا بدلہ خون ہے اور تنہا گت نے کہا ہے۔“ جو بودھ گے وہی کاٹو گے۔“ ہر برے کام کا پھل بھوگنا پڑے گا اور اس نے یہ بھی کہا ہے ”آدمی مٹی اور دھول سے میلا نہیں ہوتا۔ پر برقی یعنی خواہشات میں آلودہ ہو کر

میلا ہوتا ہے۔“ بھگوان بدھ نے ست (سچائی) کو بڑا مانا اور اسی کا پرچار کیا۔ اس نے پانچ

دھیان اور چھ ایسے گیان بتائے اور کہا کہ پاپ، جھوٹ، ہنکار اور دھوکے سے آزاد ہونے کا نام

نروان اور مکتی ہے وہ تمہیں اپنے پاپ اور قصور قبول کرنے کی سکھشا بھی دیتا ہے، کیا تم نے صوبہ

اڑیہ کا دھو لی بودھ کتبہ نہیں پڑھا جس پر لکھا ہے۔ ”اپنا قصور قبول کرو اور ایشور میں دشواس رکھو۔ وہی مہان اور تعظیم کے لائق ہے۔“

یہ سنتے ہی مہا پروہت، بھوال اور دوسرے سادھو میرے چرنوں میں اوندھے منہ گر گئے اور میں نے بوڑھے پروہت کی آواز سنی۔

پربھو! ہمیں شاکر دو۔ تم سچ مچ مہا گیانی ہو۔“

”میں تمہیں شاکر کروں گا کیونکہ تھان مانا کے دن تم نے میرے خلاف ایک جرم کیا، تمہارے جرم کا استغاثہ میں نے پیش کیا، میں نے ہی سنا اور مجھی کو فیصلہ کرنا ہے، یہ مقدمہ بھی میرا اور فیصلہ بھی میرا ہے، اس لئے تمہیں معاف کرتا ہوں کیونکہ تھان گت نے جو پانچ دھیان بتائے ان میں دوسرا دھیان یہ ہے ”سب کے دکھوں، غموں کو دھیان میں لاؤ اور اپنے من میں دیا کا دروازہ کھول دو مگر دیا کے ساتھ کچھ شرطیں بھی ہوں گی۔ اب اٹھو اور میری شرطیں سنو۔“

سب اٹھ کر بیٹھ گئے تو میں نے کہا۔ ”پہلی شرط یہ ہے کہ بھوال نے میرے قتل کے لئے جو روپیہ لیا اسے غریبوں میں دان کر دیا جائے، دوسری شرط یہ ہے کہ آئندہ نہ اس قسم کا جرم کرو نہ اپنے جھوٹ کو چھپاؤ اور تیسری شرط یہ لگاتا ہوں اگر آسامی بھگت پھر آئے تو اسے پولیس کے حوالے کر دو۔“

انہوں نے میری تینوں شرطیں مان لیں، میں نے انہیں معاف کر دیا، جب ہم مندر سے نکلے مہا پروہت سمیت سب سادھو ہمیں چندر گونا کے گھاٹ تک چھوڑنے آئے اور ہمیں بڑے تپاک سے چٹا گانگ جانے والے اسنیر پر سوار کرایا، دن ڈھل رہا تھا، جب اسنیر کا ہوڑ گونجا اور وہ پانی میں حرکت کرنے لگا، سادھو کھڑے دیکھتے رہے۔

اسنیر نے چندر گونا کا گھاٹ چھوڑا تو میں نے کایا پنتھا سے کہا۔ ”کایا موسا! شگون اچھا پڑا، ہمارا یہ سفر کامیاب رہے گا۔“

وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی عجیب الخلق انسان ہوں۔



چٹا گانگ پہنچتے پہنچتے گہری شام ہو گئی، ہم نے ایک ہوٹل میں قیام کیا کیونکہ ابھی کچھ ضروری کاغذات تیار کرانا تھے، بعض کاغذات کی عدالتی تصدیق ضروری تھی، دوسرے دن سیٹھ لکشمی نرائن کے پاس پہنچا اور ان کی مدد مانگی، وہ صوفی عبد الجبار کی وجہ سے میرا بڑا لحاظ کرتے اور پریم بھاؤ سے پیش آتے تھے۔ فوراً ساتھ ہو لئے۔ ضلع کچہری سے لے کر کمشنر کے دفتر تک ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا، عجلت کی وجہ سے انہیں بعض کلرک بادشاہوں کی مٹھی بھی گرم کرنا پڑی مگر انہوں نے مل ملا کے سارے کام ایک ہی دن میں کرا لئے جو شاید ایک ہفتے

میں بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

کمشنر کے دفتر اور ضلع کچہری سے فارغ ہو کر ہم سیٹھ جی کے ساتھ کوئی تین بجے ”لکشمی جیولرز“ میں لوٹ آئے اور ابھی آ کے بیٹھے ہی تھے کہ چار پہیوں کی ایک خوبصورت کالی فٹن جس میں سفید نقرئی گھوڑا جتا تھا، دکان کے سامنے رکی اور ایک نوجوان سندر لڑکی بنارس ساڑھی پہنے اتر کر دکان میں داخل ہوئی، ملازموں اور نوکروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں سمجھا کسی امیر گھرانے کی لڑکی زیور وغیرہ خریدنے آئی ہے جی سب نوکر چاکر دست بستہ کھڑے ہو گئے ہیں مگر سیٹھ جی اس کا ہاتھ پکڑ کے ہمارے پاس لے آئے اور بولے۔

”کیشپ بابو! یہ میری بیٹی سرلا لکشمی ہے۔ بی اے میں پڑھتی ہے اور سرلا! یہ رنگامتی کے تھارو کیشپ، بودھ آثار کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ میرا ان کا میل صوفی عبد الجبار نے کرایا تھا۔“ میں نے سرلا کو سرلا نے مجھے پر نام کیا۔ بڑی سلیمانی ہوئی، خوش اخلاق اور ماڈرن لڑکی تھی، فوراً ہی بے تکلف ہو گئی، کل اس کی انیسویں سالگرہ تھی جس کے لئے کچھ چیزیں خریدنے نکلی تھی، کہنے لگی ”کیشپ بابو! آپ بھی آئیے نا میری سالگرہ میں۔ مجھے بودھ آثار سے بڑا لگاؤ ہے، کچھ باتیں پوچھوں گی، آپ آئیں گے تو میرا بڑا مان ہوگا۔“

”آج ہی آسام جا رہا ہوں اور سیٹھ جی جانتے ہیں، رک نہیں سکتا۔“

”ہاں بیٹی! ان کا جانا ضروری ہے۔“ انہوں نے میری وکالت کی۔

مجھے فوراً ایک نئی بات سوچھی۔ ”اگر مجھے مان دینا چاہتی ہوں تو ایک بات مانو گی۔“

میری اس اچانک بے تکلفی پر وہ کچھ حیران ہوئی۔ ”کیا بات منوانا چاہتے ہیں مجھ سے؟“

”میری کوئی بہن نہیں ہے، مجھے اپنا بھائی بنالو۔“

اس نے تعجب اور دلچسپی سے دیکھا، ایک پل دیکھتی رہی پھر اس کا لہجہ بھی فوراً بدل گیا۔

”تم جیسا سندر اور سوشل بھیا مل جائے اور کیا چاہیے۔ ہاتھ بڑھاؤ۔“

میں نے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میری ہاتھ کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسا دیں۔ ”اب یہ ہاتھ

چھوڑوں گی نہیں۔ کیوں پتا جی!“

سیٹھ جی ہمارے اس نئے رشتے پر بے حد خوش تھے، بولے ”سرلا بیٹی! تو نے ایک کھرے آدمی کو بھائی بنایا ہے۔“

وہ نوکر سے مخاطب ہوئی۔ ”ذرا ایک راکھی تو لے آنا۔“

فوراً ہی راکھی آ گئی اور اس نے میری کلائی پر باندھی تو دکان تالیوں سے گونج اٹھی۔

”تم نے راکھی بندھ کر مجھے جکڑ لیا، اب میری بھیٹ قبول کرو۔“

”کیا سونا چاندی دو گے؟“

”جو مانگو گی۔“

”بھینٹ مانگی نہیں جاتی سوئکار کی جاتی ہے۔ چاندی کا ایک روپیہ بھی دے دو گے تو خوش سے سوئکار کروں گی۔“

اب میں سیٹھ لکشمی نرائن کی طرف متوجہ ہوا۔ ”سیٹھ جی! آپ کی دکان پر قیمتی سے قیمتی زیور ہیں۔ سرلا بہن جو زیور پسند کرے، میری طرف سے وہی دے دو۔“

سیٹھ جی، سرلا، کاپا پتھا، نوکر چاکر سب مجھے تعجب کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ سیٹھ لکشمی نرائن بولے۔ ”زیور کی کیا ضرورت ہے، رسم پوری کرنے کے لئے کوئی چھوٹی موٹی بھینٹ کر دو۔“

”نہیں سیٹھ جی! اپنی بہن کو چھوٹی موٹی بھینٹ نہیں دوں گا، کل اس کی سالگرہ ہے ایسے موقع پر بھائی کا تحفہ سب سے بڑھایا ہونا چاہئے۔“

پھر میں نے سرلا کو جسے حیرت کی چپ سی لگ گئی تھی، بازو سے پکڑا اور شوکیس کی طرف لے گیا۔

”چلو پسند کرو، اپنے لئے میری بھینٹ اور دیکھو مال گھٹیا نہ ہو، تم تھارو کیشپ کی بہن بنی ہو۔“

اس نے مجھے، میں نے اسے دیکھا پھر وہ ایک شوکیس کے سامنے رک گئی اور ایک جڑاؤ لاکٹ پر انگلی رکھ دی، میں نے سیٹھ جی کے سیلز مین سے کہا۔ ”لاکٹ نکالو، قیمت بتاؤ۔“

وہ سیٹھ جی کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی، تھوڑی دیر کے بعد لاکٹ اور ڈیڑھ ہزار روپے کا بل میرے سامنے تھا۔ میں نے چیک کاٹ کر سیلز مین کو اور لاکٹ اٹھا کر سرلا کو پیش کیا۔ اس نے میری بھینٹ سوئکار کی۔ اپنے باپ سیٹھ لکشمی نرائن کو دیکھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے رونے کا سبب پوچھا تو بتایا۔

”سرلا کا ایک ہی بھائی تھا جو چھوٹی عمر میں چل بسا۔ اس سے دو سال بڑا تھا۔ اگر زندہ رہتا تو تمہاری عمر کا ہوتا۔ تمہیں سرلا کا بھائی بنتے اور اسے اپنا قیمتی تحفہ دیتے دیکھ کر مجھے اپنا بیٹا یاد آ گیا۔“

پھر انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگالیا۔ ”آج تم نے میرے بیٹے کی کمی پوری کر دی۔“

”میں آپ کا بیٹا پہلے، سرلا کا بھائی پیچھے ہوں۔“

سرلا بھی جذبات میں کھو گئی تھی، پوچھنے لگی۔ ”آسام سے کب لوٹو گے؟“

”سفر کا آغاز تو آدمی اپنی مرضی سے کرتا ہے مگر انت اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ آسام سے مجھے برما جانا ہے، نہ جانے کب لوٹوں، پرار تھنا کرنا جس کام کیلئے چلا ہوں۔ وہ پورا ہو۔“

”تم نے رشتہ ہی ایسا باندھ لیا ہے جب تک لوٹو گے نہیں، پرار تھنا کرتی رہوں گی۔“

ہمیں شام کی ٹرین پر سوار ہونا تھا، میں نے سیٹھ جی سے اجازت لی تو انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ”سرلا بیٹی! تو انہیں ریلوے اسٹیشن چھوڑنے نہیں جائے گی؟“

”کیوں نہیں جاؤں گی؟“

”تو اپنی فٹن پر ساتھ ہی لے جا۔“

”چلو بھیا۔۔۔!“

”تم کہاں جاؤ گی اسٹیشن، بس یہیں سے رخصت ہو لیتے ہیں۔“

”نہیں، تمہیں گاڑی میں بیٹھا کر آؤں گی۔“

باپ بیٹی کے اصرار کے سامنے مجھے ہار ماننا پڑی۔ سیٹھ جی نے گلے سے لگا کر رخصت کیا۔ میں نے ان کے ساتھ ان کے بھی ملازموں کو پرنام کیا اور دکان سے نکلا۔ فٹن میں بیٹھے تو سرلا خوب چہکنے اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی، بہت خوش تھی۔ اس کی نظریں بار بار میرے چہرے پر آ کے ٹک جاتی تھیں۔ اچانک اس نے فٹن کی بتی کی کالک اپنی انگلی پر ملی اور میرے گال پر ایک سیاہ دھبہ لگا دیا۔

”اری۔۔۔ یہ کیا کرتی ہو؟“

”نظر اتاری ہے تمہاری آرتی نہیں اتار سکی۔“

نہ جانے اسے یہ چتا کیوں تھی کہ سفر میں مجھے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ میں رو مال سے منہ پونچھنے لگا تو میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”رہنے دو۔“

پلیٹ فارم پر آسام جانے والی گاڑی تیار تھی۔ کاپا پتھا تو ڈبے میں جا بیٹھا اور سرلا مجھے پکڑ کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی، کہنے لگی۔

”سفر سے لوٹو گے تو مجھ سے ملے بغیر رنگا متی نہیں جانا۔ چٹھی لکھ دو گے تو اسٹیشن پر ریسیو کرنے آؤں گی اور تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی۔ وعدہ کرو چٹھی لکھو گے۔“

میں نے وعدہ کیا تو پھر چپکی۔ ”کیشپ بھیا! جی چاہتا ہے تمہیں گلے مل کے رخصت کروں مگر لوگ سمجھیں گے دو پریمی یا پتی پتی گلے مل رہے ہیں، لوگوں کے ذہن چھوٹے ہوتے ہیں نا۔“

میں ہنس پڑا۔ ”بڑی عجیب سوچتی ہے تمہیں۔“

”خیر لوٹو گے تو تمہیں گھر لے جا کے گلے بھی مل لوں گی۔“

نرائجن نے روانگی کا وصل دیا اور وہ سچ مچ پلیٹ فارم پر ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ ”بھگوان تمہاری رکھشا کرے بھیا۔۔۔“

”مجھ سے جو نانا جوڑ کے چلے ہو یاد رکھنا۔“

اس کی وارنٹی اور گلوگیر آواز نے میرا دل بھی پگھلا دیا۔ میں گاڑی میں سوار ہوا تو بھیگی

آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی اور اس وقت تک پلیٹ فارم پر کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی، جب تک ٹرین کا آخری ڈبہ بھی پلیٹ فارم سے گزر نہ گیا۔۔۔ بڑی جذباتی لڑکی تھی سر لا۔۔۔



گاڑی دیمو پور پہنچی تو سورج نکل آیا تھا، وہاں سے کوہیما کے لئے لاری مل گئی۔ کوہیما سے آگے شمالاً جنوباً ناگہا پر بت کا طویل سلسلہ پھیلا ہے، یہ پر بت تو ہزار سے بارہ ہزار فٹ تک اونچے ہیں۔ جنگل خطرناک اور راستے دشوار گزار۔۔۔ پھر ناگہا قبائل بھی اجنبی لوگوں کا آنا جانا پسند نہیں کرتے مگر ہمیں ناگہا دلیس کے پہاڑوں کو عبور کر کے ہی سنگ کالنگ حکامتی جانا تھا اور پہاڑوں جنگلوں کے درمیان ایک راستہ تھا جس پر سفر کرنے کیلئے گھوڑوں یا خچروں کی ضرورت تھی۔ کوہیما میں لاری سے اتر کر میں ایک آدمی سے کسی سائیکس کا پتہ پوچھ رہا تھا جو ہمیں بھاڑے پر خچر یا گھوڑے مہیا کر سکے کہ اچانک میں ایک صورت دیکھ کر یوں اچھل پڑا جیسے کوئی جوالا مکھی لاوے کو اچھال دے۔

کیا میری آپ بیتی پڑھنے والے یقین کریں گے کہ وہ صورت پر وہت گنجال کے جیسے شکر کی تھی جو ایک لاری میں بیٹھا تھا اور لاری ریاست منی پور کے دار الحکومت امپھال جا رہی تھی، اس نے ہمیں نہیں دیکھا کیونکہ ہم ایک چوبی دکان کی اوٹ میں تھے اسے دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا، پانچ برس پہلے کا یا پنتھا کو دریاے چن ون کے ایک جھونپڑے سے اغوا کر کے امپھال کی پوربی سرحد پر سنھالی سردار کے ڈیرے پر پہنچایا گیا تھا، کیا شکر اسی سنھالی سردار کے پاس جا رہا ہے؟

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کیا کروں کہ لاری چل دی اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔ کا یا پنتھا نے بھی شکر کو دیکھ لیا اور اس کا خون کھولنے لگا تھا، ہم نے ناگہا پر بت کے جنگلوں کا سفر ترک کر کے امپھال جانے کا فیصلہ کر لیا، دوسری لاری ایک گھنٹے کے بعد روانہ ہونے والی تھی مگر شکر کا تعاقب ضروری تھا، ہم نے فرنٹ سیٹ حاصل کر لی اور ایک گھنٹے کے بعد جب لاری روانہ ہونے لگی تو میں نے آسامی ڈرائیور سے پوچھا۔

”کیا تم دس روپے کمانا چاہتے ہو؟“

اس زمانے میں دس روپے ایک لاری ڈرائیور کے لئے بہت بڑا لالچ تھا، اس نے لچائی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”روپیہ کون نہیں کمانا چاہتا بابو!“

میں نے چاندی کے دس روپے نکالے، اس علاقے میں زیادہ تر چاندی کے روپے چلتے تھے اور کہا ”اگر تم اپنی لاری کی رفتار تیز رکھو اور اگلی لاری کو امپھال پہنچتے پہنچتے پکڑ سکو تو یہ دس روپے تمہارے ہو گئے۔“

میں نے روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس نے بتایا۔ ”پہاڑی راستہ ہے، اتار چڑھاؤ، موڑ گھماؤ بہت ہیں، لاری تیز نہیں چل سکتی مگر اگلی لاری کا انجن کمزور اور ڈرائیور کچھ ڈھیلا ہے، اپن اس کو پکڑ لے گا۔“

کوہیما سے امپھال تک پہاڑی مناظر کا سلسلہ بڑا خوبصورت اور دل کش ہے، اگر کوئی اور سے ہوتا تو میں اس سفر سے لطف اندوز ہوتا مگر سارے سفر میں نظریں اگلی لاری کے کھوج میں لگی رہیں، ہر پڑاؤ پر جہاں لاری چند لمحوں کو رکتی، ہم لوگوں کی بھیڑ میں شکر کو تلاش کرتے کہ کہیں وہ رستے ہی میں نہ اتر گیا ہو مگر چار گھنٹوں کے طویل پہاڑی سفر میں نہ کسی جگہ شکر کی صورت نظر آئی نہ کہیں اگلی لاری دکھائی دی۔ ڈرائیور رستے میں ضرورت سے زیادہ کہیں نہیں رکا۔ سفر کی رفتار بھی تیز تھی، اس کے باوجود اگلی لاری نہیں ملی۔ اب امپھال صرف تین چار میل دور تھا اور میں سچ رہا تھا شکر وہاں ہے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکا ہو گا اور ہم اس کی گرد کو بھی نہیں پاسکیں گے، بلکی سی آس اگر تھی تو صرف یہ کہ شاید کا یا پنتھا سنھالی قبیلے کی اس شاخ تک لے جائے جہاں وہ پانچ برس پہلے گرفتار کر کے لایا گیا تھا مگر دن ڈھل رہا تھا، شام سے پہلے امپھال پہنچنا مشکل تھا، پھر رات کو آسام کی سرحدی پہاڑیوں کا سفر ٹھوکریں کھانے کے سوا کیا تھا۔

جوں جوں دن کا اجالا رخصت ہو رہا تھا، ہماری مایوسی بڑھ رہی تھی، جب ایک پہاڑی موٹر کات کر لاری نشیب میں اترنے لگی، دوسرا پر ایک دھبہ حرکت کرتا نظر آیا۔ ڈرائیور بولا۔ ”بابو! تمہارے دس روپے میرے ہو گئے۔ اگلی لاری وہ جا رہی ہے، کہا تھا نا اپن اسے پکڑ لے گا۔“

میں نے اور کا یا پنتھا نے غور سے دیکھا، آدھ پون میل آگے وہی لاری تھی جس میں شکر سوار تھا، ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، معلوم ہوا قدرت مدد کر رہی ہے۔

چراغ جلے دونوں لاریاں آگے پیچھے امپھال پہنچیں، مسافر اترے اور ہم نے کچھ فاصلہ دے کر شکر کا پیچھا کیا، شام کے ملگجے اندھیرے میں تھوڑی دور جانے کے بعد وہ ایک دیران سے طویلے میں گھس گیا۔ قریب ہی ایک سستا ہوٹل تھا جہاں سے اس طویلے پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔ اسی بہانے ہم نے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ سوچا شاید شکر رات یہیں ٹھہرے مگر اس لئے وہ ایک گھوڑی کی لگام تھامے باہر آیا۔ ایک بوڑھا سائیکس پیچھے پیچھے تھا، باہر نکل کر دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں، پھر سائیکس اپنے طویلے میں لوٹ گیا اور شکر گھوڑے پر سوار پورب کی طرف چل دیا ہم فوراً ہوٹل سے نکلے اور پیدل ہی اس کے پیچھے ہو لئے۔

صورت حال بڑی عجیب تھی، شکر گھوڑے پر سوار تھا اور ہم پیادہ پا مگر اس کے سوا اور کوئی

”کیا پتا ٹوٹ پڑی کہ رات کا سفر کیا؟“

”وہ تیرا کیا پتا تھا بند کی گھر سے بھاگ گیا، ساتھ بیٹی کو بھی لے گیا۔“

”یہ سنتے ہی بھولا پر جیسے بجلی گری۔“ بھاگ گیا؟“

”یہی دیکھنے آیا ہوں وہ سنگ کالنگ حکامتی میں پہنچایا نہیں۔ تو نے اس کے بارے میں

کوئی خبر سنی؟“

”نہیں“ بھولا بے حد پریشان لہجے میں بولا۔ ”اب میرا کیا ہوگا؟“

”پہلے کا پتا تھا کا پتہ کرنا ہے پھر تیرے بارے میں سوچیں گے مگر میں ذرا تھوڑی سی نیند

لے لوں۔ رات بھر سفر کیا ہے۔ دن کو بتاؤں گا تجھے کیا اور مجھے کیا کرنا ہے تو گھوڑے کو چارہ

دانہ ڈال دے۔“

یہ کہہ کر شکر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ بھولا کچھ سوچتا ہوا بولے چلتا گھوڑے کو چارہ ڈالنے باہر

اٹھا جو بائیں جانب ایک چھپر کے نیچے کھڑا تھا مگر اسے دوبارہ اندر جانا نصیب نہ ہوا، کایا نے

اسے اس طرح اچانک دبوچ لیا کہ مارے حیرت کے اپنے اوسان کھو بیٹھا اور اسے دیکھتے ہی

غش کھا گیا۔ شکر کی سیوا کرنے میں جھونپڑے میں داخل ہو گیا، وہ آنکھیں موندے پڑا تھا میں

نے آواز دی۔

”شکر! اب تمہیں نیند نہیں آئے گی۔“

وہ ہڑبڑا کر اٹھا، مجھے دیکھ کر پتھر کا ہو گیا۔ پل دوپل کے بعد معاملے کی سنگین نوعیت کا

احساس ہوا تو فوراً اپنے چوہے میں ہاتھ ڈال دیا مگر میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر ہاتھ روک لیا۔

”یہ خنجر بھی تمہارا ہے جو تم چندر گونا کے سادھو بھوال کو دے آئے تھے اور کیوں دے آئے

تھے، یہ بھی تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

شکر کی حالت عجیب تھی، کبھی مجھے دیکھتا کبھی خنجر کو پھر اچانک اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی

مگر میں غافل نہیں تھا، میرے پاؤں کی بھرپور ٹھوک سے زمین پر گرا۔ ابھی اٹھ رہا تھا کہ دوسری

ٹھوک کھا کر وہیں چپت ہو گیا کیونکہ یہ ٹھوک اس کی کپٹی پر پڑی تھی۔ کایا بھولا کو بھی اندر گھسیٹ لایا

اور دونوں کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے گئے پھر پوچھنے لگا۔

”اب ان کا کیا کرنا ہے؟“

”ہم اس وقت قانون کی دنیا میں ہیں اور قانون ہی انہیں سزا دے گا۔“

”مگر دنیا کا قانون کئی بار مجرموں کو چھوڑ دیتا اور کئی بار بے گناہوں کو پکڑ لیتا ہے۔“

”پھر بھی قانون کو بار بار دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔“

کایا چپ ہو گیا میں نے پوچھا۔ ”کیا ہمارے شہر میں تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟“

چارہ نہ تھا کہ اسی حالت میں اس کا پیچھا کریں شہر سے نکل کر اس نے آسام کی سرحد پر پہلی

پھاڑیوں کا رخ کیا۔ کایا پتھانے چلتے چلتے سرگوشی کی۔

”وہ سنھالی قبیلے ہی میں جائے گا۔“

آکاش پر پہلی راتوں کا چاند روشن تھا، اس کی روشنی میں ہم کافی فاصلے پر رہ کر تعاقب

کرتے رہے۔ ناہموار، مڑے مڑے پہاڑی راستے پر گھوڑے کی رفتار اگرچہ تیز نہیں تھی، پھر بھی

کبھی کبھی ہمیں بھاگنا پڑتا اور کبھی کبھی جب وہ کسی موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو صرف

ناپوں کی آواز سے اس کی سمت اور دوری کا اندازہ لگانا پڑتا تھا، بھاگ دوڑ کا یہ سلسلہ کئی گھنٹے

جاری رہا۔

آدھی رات کے سب سے ڈوبتے چاند کی روشنی میں ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ ایک پہاڑی

نشیب سے گزرتا برما کی سرحد میں اتر رہا تھا، آخر سنھالی قبیلے کو جو آسام کی پہاڑیوں میں نہیں

کہیں آباد تھا پیچھے چھوڑتا ہوا برما میں داخل ہو گیا، یہ بات ہمارے لئے ایک سنسنی خیز حیرت

کا باعث تھی کہ اس کا رخ دریا ئے چن ون کے کنارے آباد شہر ہمارے کی جانب تھا۔

سرحد کے ساتھ ساتھ پہلی پہاڑیوں سے آگے سرسبز و شاداب میدانی علاقہ تھا مگر اندھیرا

پھیل جانے کی وجہ سے ہم بھاگتے دوڑتے پیچھا کر رہے تھے۔ اب اس کی رفتار تیز تھی۔ معلوم

ہوتا تھا، گھوڑا اس راستے پر آنے جانے کا عادی ہے تھکن کے مارے ہمارا برا حال تھا، مسلسل

بھاگ دوڑ سے ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ پھر بھی ڈیڑھ دو فرلانگ دور رہ کر ہم اندھیرے

میں ناپوں کی آواز کے پیچھے بھاگتے رہے۔

آسام کی سرحد سے دریا ئے چن ون دس گیارہ میل سے کم نہیں، شکر نے امپھال میں رکنے

اور آرام کئے بغیر سفر جاری رکھا تو ظاہر ہے اس کا یہ سفر کسی خاص مقصد کے لئے تھا اور اب ہم

اس کا مقصد سمجھنے لگے تھے۔ سپیدہ سحری نمودار ہو چکا تھا، جب وہ دریا کے پیچھے گھاٹ پر بھولا

مچھیرے کے چھونپڑے کے سامنے اتر ا۔ اس کی منزل جان لینے کے بعد کایا پتھان کی بے چینی

اور پریشانی دیکھنے والی تھی۔

”تو بھولا ان لوگوں سے ملا ہوا تھا۔“

جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھے بیٹھے ہم نے جھونپڑے کے کواڑ پر دستک کی آواز سنی۔

شکر کچھ دیر کواڑ کھٹکھٹاتا رہا پھر بولنے لگا۔

”او بھولا۔۔۔! کیا دارو پی کے سویا ہے؟ دروازہ کیوں نہیں کھولتا؟“

پھر دروازہ کھلا اور بھولا شکر کو اندر لے گیا، ہم جھاڑیوں سے نکل کر جھونپڑے کی دیوار سے آ

گئے، اندر بھولا نے لائین جلا دی تھی، وہ برمی زبان میں پوچھ رہا تھا۔

”ایک زمیندار میرا دوست تھا، کیا جانے اب زندہ ہے یا مر گیا۔“

”خیر اگر وہ مل جائے اور تمہیں پہچان لے تو ٹھیک ورنہ اکیلے ہی پولیس اسٹیشن جا کر رپٹ لکھواؤ اور کسی پولیس والے کو ساتھ لے آؤ تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ پولیس سے کام لینے کا طریقہ کیا ہے۔“

میں نے کچھ رقم اس کی جیب میں ڈال دی، ساحل پر بھولا کی کشتی بندھی تھی کایا کشتی لے کر پوربی گھاٹ کی طرف ہولیا میں جھونپڑے میں لوٹ آیا اسے گئے دو گھنٹے ہو گئے سورج نکل آیا اور نئے دن کا کام دھندا شروع ہو گیا تھا میں گھر گھر اہٹ کی آواز سن کر باہر نکلا تو دیکھا پولیس کی ایک موٹر بوٹ کنارے لگ رہی تھی، میں آگے بڑھا۔ موٹر بوٹ سے کایا کے ہمراہ ایک سب انسپکٹر اور پولیس کے تین سپاہی اترے۔ سفید لباس میں ایک برمی زمیندار بھی تھا، میں نے لپک کر ان کا سواگت کیا۔ کایا کو صرف اپنا زمیندار دوست ہی نہیں مل گیا بلکہ اچنبھا یہ ہوا کہ ہمالن میں وہ سب انسپکٹر متعین تھا جو چھ برس پہلے سنگ کالنگ حکامتی میں رہ چکا اور کایا کا جاننے والا تھا۔ کایا کو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اس کے ساتھ پیش آنے والے بھیا تک جرم کی تفصیل سنی تو اسی وقت اٹھا اور ساتھ ہولیا۔ یہ سب کچھ خلاف توقع ہوا تھا۔

سب انسپکٹر مجھ سے بڑے پرتپاک انداز میں ملا۔ میں انہیں جھونپڑے میں لے آیا۔ شکر اور بھولا کو گرفتار کر لیا گیا۔ جھونپڑے کی تاشی پر پولیس کو اپنے مطلب کی کئی چیزیں ملیں۔ کایا کے خلاف سب سے بڑا جرم ہمالن میں ہوا تھا اس لئے مجرموں کا چالان ہمالن پولیس ہی کو کرنا تھا مگر جب موٹر بوٹ دوسرے گھاٹ کی طرف لوٹ رہی تھی، میں نے انسپکٹر سے کہا۔

”دونوں مجرموں کو لے کر آپ کا ہمارے ساتھ حکامتی چلنا بھی بہت ضروری ہے۔“

”کیا وہاں کوئی ثبوت جرم ملے سکے گا؟“

”میں نہیں جانتا مگر آپ کے مستغیث حکامتی کے باشندے ہیں جنہیں پانچ برس سے مردہ سمجھا جا رہا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔ مجرم پولیس کی حراست میں ہوں گے تو لوگوں کو یہ بھیا تک جرم جاننے اور کایا پنتھا کو فی الواقع جیتا جاگتا سمجھنے میں مدد ملے گی ورنہ ہو سکتا ہے لوگ میرے موسا کو بھوت پریت سمجھ کر ان سے ڈرنے لگیں۔“

سب انسپکٹر کا تہقہ بلند ہوا۔ ”مسٹر کیشپ! آپ بڑے دور اندیش ہیں، میں ضرور آپ لوگوں کے ساتھ حکامتی چلوں گا، فرض کے رشتے بھی اور انسانیت کے ناتے بھی۔ کایا پنتھا صرف مستغیث نہیں، میرا دوست بھی ہے۔“

برمی زمیندار بولا۔ ”میں بھی تم لوگوں کے ساتھ حکامتی جاؤں گا اور لوگوں کو بتاؤں گا کہ میرے دوست کایا پنتھا کے ساتھ کیسا اندھیر ہوا تھا۔“

ہمالن پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر کے اندراج اور ضروری کارروائی کے بعد سب انسپکٹر نے ہمارے کھانے کا بندوبست کیا۔ اس برتاؤ کو دیکھ کر کایا کا دل بھر آیا اور کھانا کھاتے کھاتے بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

”میں تو سمجھا تھا میرے مرنے کی خبر سن کر دوستوں نے بھی مجھے چھوڑ دیا ہے اور اس بات نے مجھے جیتے جی مار دیا تھا کہ میرا کوئی نہیں مگر آج میں پھر جی اٹھا ہوں۔“

یہ کہتے کہتے اس کے آنسو بہنے لگے۔ انسپکٹر اور برمی زمیندار نے اسے تسلی دی کہ جو بیت چکی اسے بھول جاؤ، میں نے کہا۔ ”کایا موسا! یہ تو قانون کا، دنیا کا نیا ہے جو تم دیکھ رہے ہو، ابھی تمہیں بھگوان کا نیا ہے بھی دیکھنا ہے۔“

کھانے سے فارغ ہوتے ہی مجرموں سمیت پولیس اسٹیشن سے نکلے اور پولیس کی موٹر بوٹ میں دریائے چن ون کے بہاؤ کے خلاف اتر کی طرف روانہ ہوئے۔ حکامتی کے گھاٹ پر اترے تو لوگوں نے تعجب کی نظروں سے دیکھا۔ سپاہی، شکر اور بھولا کو ہتھکڑیاں لگائے آگے آگے چل رہے تھے، سب انسپکٹر اور برمی زمیندار میرے اور کایا کے دائیں بائیں تھے۔ لوگ اس جلوس پر حیران ہوتے۔ کایا پنتھا حکامتی کا سب سے بڑا اور مشہور زمیندار تھا، لوگوں نے اسے پولیس کے ساتھ زندہ سلامت چلتے پھرتے دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں دبائیں مگر کسی قسم کی وضاحت کے بغیر ہم سیدھے پولیس اسٹیشن پہنچے، پرانے اہکار جو کایا کو جانتے تھے، اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ پولیس افسر نیا تھا لیکن اس نے پورا تعاون کیا۔

کایا کے پرانے کاشت کار چان اور دوسرے کسانوں کو پولیس چوکی میں طلب کر لیا گیا۔

انہوں نے اپنے ”مردہ“ مالک کو جیتا جاگتا دیکھا تو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا مگر چان بابا شکر اور بھولا کو زنجیروں میں جکڑے دیکھ کر معاملے کی صورت سمجھ گیا اور روتا ہوا کایا سے لپٹ گیا۔ سب انسپکٹر نے بتایا کہ پانچ برس پہلے جس آدمی کی لاش جلائی گئی وہ کایا پنتھا نہیں تھا۔ وہ تو مجرموں کی قید میں تھا۔

چان بابا شکر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”شکر ہر فصل کی آمدنی وصول کرنے آتا رہا، اس کے پاس جل پناہی کا مختار نامہ تھا۔“

یہ انکشاف پولیس کے لئے بڑا دلچسپ اور اہم تھا۔ حکامتی پولیس کے محرر نے چان بابا کا بیان درج کیا۔ دوسرے کسانوں کی گواہیاں لکھیں۔ پولیس افسر نے شکر سے پوچھا تو خاموش رہا پھر بولا۔ ”جل پناہی مجھے مختار نامہ لکھ دیا تھا۔“

میں نے جل پناہی کی تحریر جو رنگامتی میں لکھوائی تھی، پولیس افسر کے سامنے پیش کر دی کہ اس نے کسی شخص کو کبھی اپنا مختار نہیں بنایا، نہ کوئی مختار نامہ لکھا ہے۔ اس لکھت پر چٹا گانگ کے انگریز

کمشنر کی تصدیق، سرکاری مہر اور دستخط تھے۔ میرے قارئین سمجھ گئے ہوں گے کمشنر کا یہ تصدیقی بیان سیٹھ لکشمی نارائن نے حاصل کیا تھا۔

جل پنا کی تحریر اور چٹا گانگ کے کمشنر کی تصدیق پولیس کی فائل میں شامل کر لی گئی اور شکر کے خلاف اغوا، جس بے جا، اقدام قتل کے علاوہ دھوکا، فراڈ اور خیانت مجرمانہ کا مقدمہ بھی درج ہوا۔ جھوٹا نے اعتراف کیا کہ پانچ برس پہلے اس نے پروہت گنجال اور شکر کے اکسانے پر کایا پنتھا کو مچھلی کے شکار پر بلایا اور گرفتار کرایا تھا۔

اس کارروائی کے بعد میں اور کایا پنتھا پولیس چوکی سے نکلے تو بری زمیندار، چان بابا اور کایا کے کسانوں کے علاوہ لوگوں کا ایک ہجوم ہمارے ساتھ تھا۔ شہر میں کایا پنتھا کے ”جی اٹھنے“ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہم حویلی میں پہنچے جو پانچ سال سے بند پڑی تھی، اس کے غلام خانے میں صرف پوئی اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی، نقلی چندر کانت جل پنا کے مانڈ لے جانے کے ایک ماہ بعد فوجی ہو گیا تھا اور چان بابا نے حویلی کو تالا لگا دیا تھا، تالا اسی نے کھولا اور پوئی نے اپنے مالک کا سواگت کیا۔

ہم حویلی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے، کمروں کے فرش جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے، الماریاں ٹوٹی ہوئیں، چھت کی کڑیوں کے درمیان کئی شکاف، سامان بکھرا ہوا، ہر شے دھول سے آٹی ہوئی، کونوں میں کڑیوں کے جالے تنے ہوئے۔ حویلی ایک ویران عمارت کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔

معلوم ہوتا تھا پانچ برس پہلے کسی شے کو ڈھونڈنے کے لئے نہ صرف سارا سامان الٹ پلٹ دیا گیا بلکہ چھت اور فرش کو بھی ادھیرا، کھدیرا گیا تھا اور میں جانتا تھا وہ شے کیا تھی۔

سارگلیان کی امانت جس کی خاطر کایا پنتھا نے پانچ برس زیر زمین کال کوٹھڑی میں گزار دیئے تھے، حویلی کا یہ نقشہ دیکھ کر وہ پلٹا اور ایک طرف بھاگتا چلا گیا میں اس کے پیچھے تھا وہ کمروں سے گزرتا عقبی دروازے پر پلٹا نہیں تھا، اس نے کندی اتار کر کواڑ کھولے اور اس کمرے کا جائزہ لے کر اطمینان کی گہری سانس لی پھر فوراً مڑا، دروازہ بند کیا اور مجھے کاندھوں سے پکڑ کے بولا۔

”امانت محفوظ ہے۔“

ہم دونوں چپ چاپ لوٹے اور اسی طرح کمروں سے گزرتے بیرونی صحن میں آ بیٹھے جہاں چان بابا نے کچھ کرسیاں بچھا دی تھیں۔ کایا کے کسان حویلی کی جھاڑ پھونک میں مصروف ہو گئے، صحن میں بھی لوگوں کی بھیڑ لگ گئی، جو بھی کایا کی واپسی کا سنتا، حویلی کی طرف بھاگتا۔ اڑوس پڑوس کے مرد، عورتیں سب جمع ہو گئے۔ ادھر چان بابا، ادھر پوئی اپنے مالک کی پتا سنا

کر انہیں حیران کرتے رہے، رات گئے تک لوگوں کا آنا جانا رہا۔ وہ کایا پنتھا کو جینے کی بدھائی دیتے اور کایا بھیگی آنکھوں کے ساتھ ان کی ہمدردی کا شکر یہ ادا کرتا۔

حویلی کا سامان از سر نو درست کر دیا گیا۔ پرانے نوکروں نے گھر کی صفائی ستھرائی کر دی، ویرانی جاتی رہی، چہل پہل لوٹ آئی اور وہی کمرے جو اپنے مالک کے جیون کی طرح پانچ برس تک منحوس اندھیروں میں ڈوبے رہے پھر روشن ہو گئے۔ لوگوں کی بھیڑ چھٹی، نوکر چاکر اپنے اپنے ٹھکانوں پر آرام کرنے چلے گئے اور ہر طرف خاموشی چھا گئی تو کایا پنتھا نے مجھے اٹھایا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ مجھے لے کر حویلی کے پچھواڑے اسی کمرے کی طرف آیا جسے ہم دن کے اجالے میں دیکھ چکے تھے۔ کایا کے ایک ہاتھ میں لائین دوسرے میں کدال تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے چکرورتی چاچا کا وہ بھوت یاد آ گیا جسے میں نے سنے میں کدال، بسولا اور کندا اٹھائے خانقاہ کی کال کوٹھڑی کے بیت الخلاء میں داخل ہوتے دیکھا تھا مگر تب میں نیند میں تھا، اب جاگ رہا تھا۔

کایا نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا، میں پیچھے پیچھے تھا، کمرہ اکوڑے کباڑ سے بھرا ہوا تھا، ہر شے پر گرد کی موٹی تہہ جمی تھی، جگہ جگہ مٹری کے جالے اس کی زبوں حالی کی کہانی بیان کر رہے تھے، اس نے پوربی گوشے سے کچھ سامان پرے ہٹا دیا اور فرش پر کدال چلائی۔ میں چپ کھڑا دیکھتا رہا کیونکہ یہ کام اسی کو کرنا تھا، چند اینٹیں اکھاڑنے کے بعد اس نے ایک فٹ گہرا گڑھا کھودا پھر ہاتھ بڑھا کے لوہے کا ایک بکس نکالا، مٹی جھاڑ کے اس کا زنگ آلود تالا توڑا، اندر چھوٹا سا ایک چوہی بکس اور تھا۔ کایا نے چوہی بکس اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولا تو سونے کی ایک بند ڈبیا لائین کی روشنی میں چمکنے لگی، اس نے ڈبیا کو آنکھوں اور ہونٹوں سے لگایا پھر بولا۔

”تھارو کیشپ! یہی ہے سارگلیان کی وہ مقدس امانت جس کی خاطر مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے، اگر تم نہ ملتے تو خانقاہ کا وہی کمرہ میرا مقبرہ بن جاتا، جس کے اندھیروں میں پانچ برس تک اجالے اور تازہ ہوا کے لئے ترستار ہا، تم نے میرے لئے، میری بیٹی کے لئے بڑے دکھ جھیلے اور مجھے ایک نیا جیون دیا، میں تمہاری قربانی اور مہربانی کا صلہ نہیں چکا سکتا مگر تم ایک بودھ گیانی ہو اور میں نے دیکھا ہے کہ بھگوان کی دیا کا ہاتھ تمہارے سر پر ہے، اس لئے بودھ اتھاس کی یہ نشانی تمہیں بھیٹ کرتا ہوں۔“

”مگر تم نے اپنے سوارگ باشی پاپ کو وچن دیا تھا کہ یہ ڈبیا کسی کو نہیں دو گے۔“

”تم پرانے نہیں، اپنے ہو اور اب پنتھا گرام سے تمہارا بھی ناتا ہے، میرے باپ کی آتما

اس بات پر خوش ہوگی کہ جس طرح ڈبیا مجھے سوئی گئی اسی طرح میں تمہیں سوئپ رہا ہوں۔“
ڈبیا پکڑ کر میں نے بھی آنکھوں سے لگائی۔ اس عجیب احساس سے میرے بدن میں سنسنی
دوڑ رہی تھی کہ سارگلیان کی امانت میرے ہاتھ میں ہے، میں نے اس پر کندہ پالی زبان کے
چار شبد اور چار نام دیکھے بالکل یہی شبد یہی نام اس مورتی پر کندہ تھے جسے میں ساؤ گاری میں
شاسترو کے پاس امانت رکھ آیا تھا۔

”جیون بھید، چار انائے۔“

”تنھا گت، شکا کیہ منی، امی تابھ، آتما روپی۔“

سارگلیان کی ڈبیا مقدس مورتی کے گہرے بھید کی کلید تھی اور میں نے وہ کلید حاصل کر لی تھی۔

○○○

(28)

بھگوان کی کچھری

بودھ اتہاس کی وہ امانت جس میں سارگلیان ایسے مہاپرش نے مقدس مورتی کے بھید کی کلید
رکھ دی تھی اور جسے حاصل کرنے کے لئے پروہت گنجال نے کایا پنتھا پر غیر انسانی مظالم توڑے
اور اسے پانچ برس تک بدترین بندی گھر میں قید رکھا، اب میری ملکیت تھی اور مورتی کے جیون
بھید کے ساتھ ساتھ میں ساؤ خاندان کے اس راز سر بستہ کو بھی معلوم کر سکتا تھا جس پر تین
صدیوں کی مضبوط گرہیں بندھی تھیں۔

حویلی کے پرانے اور بوسیدہ کمرے سے سونے کی ڈبیا نکالنے کے بعد میں اور کایا پنتھا
رہائشی حصے میں لوٹ آئے اور اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے تھے۔ چاروں طرف رات کا گہرا
سناٹا چھایا تھا، اس سناٹے میں کایا نے کوئی مزید بات چیت نہ کی۔ سارگلیان کی امانت میرے
سپر دکر کے وہ جیسے بالکل نچت ہو گیا اور بستر پر لیتے ہی گہری نیند سو گیا تھا مگر مجھے نیند نہیں آرہی
تھی کیونکہ ایک طرف تو میرا ذہن عجیب عجیب خیالات میں الجھ گیا اور دوسری جانب میرے جسم
میں بار بار سنسنی کی ایک لہری دوڑ جاتی کہ میں ایک ایسے جیون بھید سے آگاہ ہوں جو جسے
چوبیس صدیاں پہلے بھگوان بدھ کے شش آنند بھکشو نے ان کی مورتی میں بند کر دیا تھا اور جس کی
کلید سارگلیان نے سونے کی اس ڈبیا میں محفوظ کر دی تھی جو اس وقت میرے سر ہانے پڑی تھی۔
اس آپ بیتی کو پڑھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ سونے کی وہ ڈبیا کتنی اہم، کتنی قیمتی،
کتنی پراسرار تھی، اگر اسے گنجینہ اسرار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور ایسی نادر شے کو حاصل کر لینے
کے بعد مجھ پر ذمہ داری عائد ہو گئی تھی کہ میں اس کی حفاظت کا کوئی مناسب بندوبست کرتا مگر
میں نے اسے اپنے تنکے کے نیچے رکھ لیا تھا اور شاید اسی لئے میرے شریر میں سر سے پاؤں تک
ایک عجیب سنسناہٹ سی جاری تھی اور ذہن میں انجانے اسرار کے دوار کھلتے اور بند ہوتے تھے،
جیسے تیز ہوا سے کسی کھڑی کے پٹ آپ سے آپ بجنے لگتے ہیں۔

میرے غذا وہ اگر کوئی دوسرا اس ڈبیا کو پا لیتا تو شاید اس کی بھی یہی حالت ہوتی اور وہ بھی
ایسی ہی بے چینی محسوس کرتا کیونکہ کسی تاریخی اور انوکھی یادگار کو حاصل کر لینے کے بعد جس کے
ساتھ گہرا راز وابستہ ہو، آدمی کا ذہن اور جسم عجیب سی سنسنی محسوس کرنے لگتا ہے۔ سونے کی اس
ڈبیا کا تعلق جو میرے سر ہانے پڑی تھی، اس تاریخی مورتی سے تھا جو بھگوان بدھ کے سورگ

باش ہوتے ہی بنوائی گئی اور جس کی تلاش ایک عرصے سے جاری تھی۔

شاکیہ منی گوتم بدھ 483 قبل مسیح پر لوک سدھارے تھے اور ہندوستان میں بکری سہت ان کی وفات کے 426 سال بعد شروع ہوتی ہے، اسی برس جب وہ فوت ہوئے آندھکاشو نے کوشی نگر کے سنار سے مورتی بنوائی اور اس میں ان کی مقدس راکھ کے ساتھ کوئی جیون بھیید بھی رکھ دیا تھا، جسے مشہور بودھ اربت سارگلیان نے قریباً دو سو تیس، چالیس سال بعد معلوم کر لیا اور کسی مصلحت کے تحت اس کی حفاظت کا ایک انوکھا انتظام کیا جیسی مورتی کے بھیید تک پہنچنے کے لئے سارگلیان کی ڈبیا کو حاصل کرنا ضروری قرار دے دیا گیا تھا، یہ واقعہ مہاراجہ اشوک اعظم کے زمانے میں پیش آیا۔ اشوکا کا زمانہ جب ہندوستان میں بودھ دھرم کو ترقی ملی 273 تا 233 قبل مسیح متعین کیا گیا ہے۔ میں نے تاریخی پہلو سے غور کیا تو اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رنگتی ہوئی محسوس کرنے کیس جو ڈبیا بالکل غیر متوقع طور پر مجھے ملی۔ وہ بائیس صدیاں پرانی تھی اور ایک ایسے سر حیات کی کلید تھی جس کے لئے بودھوں میں دور قدیم سے کشکش چلی آتی تھی اور جس کے کارن ہر زمانے میں مقدس مورتی کا چرچا رہا۔

چکرورتی چاچا کی تحقیق کے مطابق مقدس مورتی میں بھگوان بدھ کے سر کی راکھ کرامت کا نشان بن گئی تھی کیونکہ اس مورتی کو چھو لینے سے روگی اچھے ہو جاتے تھے۔ قریباً سات آٹھ صدیاں بعد ایسی ہی کرامت یسوع مسیح کی اس صلیب کے بارے میں مشہور ہوئی جسے تیسری صدی عیسوی میں قیصر روم قسطنطین اعظم کی ماں ہلینا کے خواب پر یروشلم میں کالوری کی پہاڑی سے کھدائی کر کے برآمد کر لیا گیا تھا۔ اس صلیب کے ساتھ دو چوروں کی صلیبیں بھی برآمد ہوئی جنہیں مسیح کے ساتھ ہی صلیب پر لٹکایا گیا تھا چنانچہ یہ معلوم کرنے کے لئے ان صلیبوں میں مسیح کی صلیب کو کسی ہے انہیں باری باری بیماروں پر آزمایا گیا جس صلیب کو چھونے سے بیمار اچھے ہو گئے، اسے مسیح کی صلیب سمجھا گیا، بعد میں وہ صلیب الصلوب یا صلیب اعظم کے نام سے مشہور ہوئی جسے عیسائی قیصروں نے سونے اور ہیرے جواہرات سے مرصع کر دیا تھا۔

صلیب مسیح کی کرامت کا یہ واقعہ میں نے عیسائیوں کی کئی کتابوں میں پڑھا ہے، انجیلوں میں بھی لکھا ہے کہ یسوع مسیح نے مرگی کے کئی مریض اور کوڑھی اچھے کئے تھے، شاید اسی لئے انہیں ”مسیحا“ کہا جاتا ہے کہ یسوع مسیح سے پانچ صدیاں پہلے بھگوان نے گوتم بدھ کے روپ میں اوتار لیا اور ذات پات کی تمیز مٹائی تھی، یوں تو مہاراج بدھ اور یسوع مسیح کی تعلیم بھی ملتی جلتی ہے اور ان میں کئی باتیں مشترک ہیں جن میں روگیوں کو اچھا کرنا قابل ذکر ہے مگر مقدس مورتی کی تلاش صرف اس لئے جاری نہ تھی کہ اسے چھو لینے سے روگی اچھے ہو جاتے تھے، ہو سکتا ہے بعض لوگ اسی لئے مورتی کے کھوج میں سرگرداں رہے اور اسی کرامت کو ”جیون بھیید“

بھیجتے ہوں لیکن چکرورتی چاچا نے ”مقدس مورتی“ کے مسودے میں وکی شالی کی ویشیا امب پالی کے حوالے سے جس جیون بھیید کا ذکر کیا تھا وہ تو کچھ اور ہی تھا کیونکہ امب پالی نے بھگوان بدھ سے خواہش کی کہ اسے جیون بڑھانے کا اختیار دے دیا جائے۔

تو کیا مقدس مورتی میں کوئی ایسا راز محفوظ تھا؟..... یہ ایک ایسا انوکھا خیال تھا جس سے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔

سارگلیان نے شرط لگائی تھی کہ اس ڈبیا کو صرف وہی شخص کھولنے کا ادھیکار رکھتا ہے جو مقدس مورتی کو حاصل کر لے، گویا جیون بھیید مورتی میں اور اس کی ترکیب استعمال سارگلیان کی ڈبیا میں محفوظ کر دی گئی تھی جیسی دونوں کو ایک دوسرے سے لازم و ملزوم کر دیا گیا تھا۔

یہی راز سر بستہ مجھے معلوم کرنا تھا سونے کی ڈبیا، مقدس مورتی کے بھیید کی کلید تھی۔ میں اس کلید کو کھولنے کا ارادہ کر چکا تھا اور اب یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ سارگلیان کی ہدایت کے مطابق مقدس مورتی کو حاصل کئے بغیر میں ڈبیا کھولنے کا ادھیکار نہیں رکھتا۔

اگر افشائے راز کے جوش میں اسے کھول بیٹھا تو کسی ناگہانی مصیبت کا شکار نہ ہو جاؤں، میں بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا، آیا ڈبیا کھولنا اور مورتی کا راز معلوم کرنا مناسب بھی ہو گا یا نہیں؟

کبھی خیال آتا آخر پر وہت گنجال بھی تو یہ ڈبیا اسی لئے ہتھیانا چاہتا تھا کہ اسے کھول کر اندر کا حال جان لے، اس لئے اگر میں اسے کھول لوں تو کیا حرج ہے لیکن فوراً ہی کوئی نامعلوم سا خوف میری قوت ارادی پر ضرب لگاتا اور میں یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا کہ سارگلیان کی شرط و تہدید میں ضرور کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔ مجھے اس وقت تک ڈبیا نہیں کھولنی چاہیے جب تک مقدس مورتی ڈھونڈ نہیں نکالتا۔

میں سارگلیان کی امانت حاصل کر چکا تھا مگر سونے کی وہ ڈبیا آستین کے ہانپ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ کایا پتہ تھا پر ساری مصیبتیں اسی کے کارن تو ٹوٹی تھیں، میں کب تک اس کی حفاظت کر سکوں گا۔

وہ رات اور اس رات کا آکاش جو کھڑکی سے نظر آ رہا تھا اور آکاش پر جھلمل جھلمل کرتے ستارے مجھ سے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ مجھے سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے، کیونکہ کسی راز کو چھپانا اسے معلوم کر لینے سے زیادہ مشکل ہے، وہ رات بائیس گزری ہوئی صدیوں میں ڈھل کر میرے ارد گرد گھومنے لگی اور مہاراج سارگلیان کا خیالی حلیہ کسی پراسرار جادو گر کی طرح میری چار پائی کے چکر کاٹنے لگا۔

غالباً رات کا آخری پہر تھا جب میری آنکھ لگ گئی اور آنکھ لگتے نہیں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بھوت اندھیرے سے نکل کر اچانک میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا:

”بہت بے چین ہو ڈیا کھولنے کے لئے؟“

میں کوئی جواب نہ دے سکا کیونکہ جواب دینے کی بجائے یہ سوچنے لگا تھا کہ اس آدمی کو جس کا بھوت مجھ سے مخاطب ہے، میں نے کہیں دیکھا بھی ہے یا نہیں آخر اسے میرے ارادے کی خبر کیسے ہو گئی کہ میں ڈیا کھولنا چاہتا ہوں؟ میری خاموشی دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور کہنے لگا۔

”تم ڈیا کھول سکتے ہو۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”کایا کا پنتھا گرام ہوں میں۔“

سپنے میں خیال آتا ہے کہ مجھے پہلے ہی سمجھ جاتا چاہیے تھا کہ وہ کایا کا باب ہوگا کیونکہ دونوں کی شکلیں کچھ ملتی جلتی سی ہیں۔ پنتھا گرام کی طرف سے ڈیا کھولنے کی اجازت پا کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

”میں نے تو سنا ہے، ڈیا وہی کھول سکتا ہے جو مقدس مورتی کو حاصل کر لے۔ کوآن تان مندر کے مہا پروہت تنگا سو نے تمہیں ہی عبارت پڑھ کر سنائی تھی جو ڈیا پر کندہ ہے، اگر میں سارگلیان کی اس ہدایت کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا تو مجھ پر کوئی کشت نہیں آئے گا کیا؟“

”تم پر کشت نہیں آئے گا۔“

میں اس کی بات سن کر مطمئن نہ ہوا۔ پنتھا کا بھوت ایک سخت پیچھے مڑ کر اندھیرے میں دیکھنے لگا جیسے اندھیرے میں اس کے پیچھے کوئی اور بھی ہو پھر فوراً اندھیرے سے نکل کر ایک اور بھوت آگے بڑھا اور میں حیران رہ گیا کیونکہ وہ بھوت میرے چاچا چکرورتی سہائے کا تھا اور اس نے وہی کفن پہن رکھا تھا۔ جس کفن میں چاچا کو چتا پر رکھ کر جلایا گیا تھا۔ چاچا کا بھوت میرے قریب آ کر بولا۔

”پنتھا گرام ٹھیک کہتا ہے کیشپ! تم سارگلیان کی ڈیا کھول سکتے ہو کیونکہ مقدس مورتی کے جیون بھید کو فاش کرنے کا سہ آگیا ہے۔ قضا و قدر کی قوتیں یہی چاہتی ہیں مگر ڈیا کھولنے سے پہلے تمہیں بھگوان کے کسی مندر میں یہ عہد کرنا ہوگا کہ ہر حال میں مورتی ڈھونڈ نکالو گے۔“

”یہ قول تو پہلے ہی سروپ جی کو دے چکا ہوں۔ اگر مورتی نہیں ڈھونڈوں گا تو سندرمی کو ساؤ گاری سے کیسے نکالوں گا۔“

”مگر ڈیا کھولنے سے پہلے تمہیں ایک اور وچن دینا ہوگا۔“

”کیسا وچن؟“

”یہی کہ مورتی حاصل کر لینے کے بعد تم اس کے جوہر کو۔۔۔“

ابھی فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ کسی نے چاچا کے بھوت کو اندھیرے میں گھسیٹ لیا اور وہ میری نظروں سے غائب ہو گیا، میں سمجھا شاید دونوں بھوت مجھے کوئی ہدایت دینے کے لئے صلاح مشورہ کر رہے ہیں لیکن دونوں میں سے کوئی بھی دوبارہ نظر نہ آیا تو میں سویا سویا چکرورتی چاچا کو پکارنے لگا ایک بات جس کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں یہ تھی کہ اس بار نہ تو مجھے چاچا کے بھوت سے ڈر لگانے میں نے ہڈیوں کڑکڑانے کی آواز سنی حالانکہ کفن کے اندر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہی چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا۔

میں سپنے میں محسوس کرنے لگا کہ چاچا کو پکارتے پکارتے اور آوازیں دیتے دیتے میرا گلا سوکھ گیا ہے، اب میرے حلق سے آواز بھی بڑی مشکل سے نکلتی ہے، نہ جانے چاچا کا بھوت مجھے کیا بتانے والا تھا اور پنتھا گرام کے بھوت نے اسے اندھیرے میں کیوں گھسیٹ لیا؟ میں آخری بار بڑی مدہم بلکہ مری ہوئی آواز میں پوچھتا ہوں۔

”چاچا۔۔۔! مجھے بتاتے کیوں نہیں، مورتی حاصل کرنے کے بعد اس کے جوہر کو کیا کروں؟“

اس کے جواب میں بہت دور گہرے اندھیرے میں ایک عجیب و غریب قہقہے کی آواز سنائی دی، حیرت اور خوف سے میرا جسم پسینے میں بھگینے لگا کیونکہ وہ قہقہہ چاچا کا نہیں پنتھا گرام کا تھا جو کمرے کی بجائے بیرونی غلام گردش سے سنائی دے رہا تھا گویا وہ دونوں کمرے سے تو چلے گئے مگر ابھی تک حویلی سے نہیں گئے تھے۔ میں مورتی اور اس کے جوہر کے بارے میں آخری ہدایت معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا، اس لئے جی میں آئی کیوں نہ بستر سے اٹھ کر خود ان کے پاس پہنچ جاؤں اور پوچھوں آخر ماجرا کیا ہے اچھا مجھے مورتی کے جوہر کے بارے میں کیا کرنا چاہیے۔

یہی سوچ کر بستر سے اٹھتا ہوں تو فوراً ہی ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ دیکھا کہ میں بستر پر بیٹھا ہوں اور میرے پاؤں فرش کو چھو رہے ہیں گویا میں نیند کی حالت میں واقعی کمرے سے نکل کر غلام گردش میں جانے والا تھا۔ قہقہے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی، کھڑکی سے باہر جھانکا تو کتنا ہی دن چڑھ آیا تھا اور دن کے اجالے میں کایا پنتھا غلام گردش میں کھڑا کسی کے ساتھ ہنس ہنس کر رہا اور قہقہے لگا رہا تھا، میں بڑا حیران ہوا گویا سپنے میں جو قہقہہ سنا وہ پنتھا گرام کا نہیں اس کے بیٹے کا تھا۔

گھڑی دیکھی تو دن کے دس بج رہے تھے، میں جلدی سے اٹھا اور سب سے پہلے سونے کی ڈیانتیکے کے نیچے سے اٹھا کر اپنی صدری کی جیب میں رکھ لی جو میٹھ کے نیچے پہن رکھی تھی۔ پھر باہر نکلا، غلام گردش میں کایا پنتھا سے مدہم بھٹ کر ہو گئی جو اپنے ملاقاتی کو رخصت کر کے پلٹ رہا تھا

میں جانے والے کی صرف پشت دیکھ سکا، کوئی مقامی آدمی معلوم ہوتا تھا، کایا نے بتایا۔

”حکامتی کا مشہور باورچی ہے۔“

”باورچی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”آج میں شہر کے لوگوں کو کھانے کی دعوت دے رہا ہوں نا۔ سادھوؤں بھکشوؤں اور پروہتوں کو بھی بلایا ہے۔ سب کو سند لیس بھیج دیا ہے۔“

مجھے دعوت کی بات پسند آئی۔ ”یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے کایا موسا!“

”تم بھی نہادھو کر ناشتہ کر لو، پوئی کب سے انتظار کر رہی ہے۔“

”مگر میں سب سے پہلے یہ پوچھنا چاہتا ہوں، یہاں بھگوان کا سب سے بڑا مندر کہاں ہے؟“

”کیا مندر میں پوجا کرنے جاؤ گے؟“

”نہیں ایک اور کام ہے۔“

اس نے سب سے بڑے مندر کا بتایا پھر اچانک بولا۔ ”ارے کیشپ! میں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ رات میرا باپ پنتھا گرام میرے سپنے میں آیا تھا۔ اس نے مجھے آشیر واد دی اور خوش ہو کر بولا۔ ”کایا! تو نے سارگلیان کی امانت کے لئے جو دکھ بھوگے ہیں، ان کا بدلہ تجھے ضرور ملے گا اور اب تو نے وہ امانت ٹھیک اس آدمی کو سونپی جسے اس امانت کا ادھیکار برسوں پہلے دے دیا گیا تھا۔“

میں کچھ حیران سا ہوا کہ ہم دونوں نے ایک ہی رات پنتھا گرام کو اپنے اپنے سپنے میں دیکھا ہے، پھر یونہی پوچھ لیا۔

”کیا تمہارا باپ اکیلا تھا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ چونک کر بتانے لگا۔ ”اس کے ساتھ کفن پہنے کوئی اور بھی تھا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ جیجا چکرورنی سہائے تھے۔“

”ہاں وہی تھے۔“

”تمہیں کیا معلوم؟“

”میں نے بھی رات انہیں سپنے میں دیکھا۔ دونوں مجھے سارگلیان کی امانت کا ادھیکار دینے آئے تھے۔“

”کیا وہ تمہارے سپنے میں بھی آئے؟“ مارے حیرت کے کایا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

میں نے باری باری دونوں کا رات والا حلیہ بتایا تو کایا حیرت کا بت بن گیا مگر اسے یہ نہیں

بتایا کہ انہوں نے ایک شرط پر مجھے سونے کی ڈبیا کھولنے کی آگیا دے دی ہے اور میں اسے کھولنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

حویلی میں غیر معمولی سرگرمی نظر آرہی تھی اور بیرونی صحن میں چان کے علاوہ کایا پنتھا کے دوسرے کسان بھی مصروف تھے۔ غالباً ضیافت کے انتظام کی تیاریاں ہو رہی تھیں، کایا مجھے حیرت سے دیکھتا پلٹا اور چپ چاپ بیرونی صحن کی طرف چلا گیا۔

سنگ کالنگ حکامتی میں بھگوان کا بڑا مندر دریا کے رخ پورب کی جانب تھا، شام کا اندھیرا اترتے اور حویلی میں ضیافت کا ہنگامہ شروع ہونے سے پہلے ہی میں مندر کی طرف دھڑلایا مگر راستے میں یہ بھی سوچتا جا رہا تھا۔ آخر میں بھگوان کے مندر میں عہد کروں گا؟ کیا مقدس مورتی کو ڈھونڈنے کا عہد؟ جبکہ اس کی تلاش میرے جیون کا سب سے بڑا آدرش ہے اور مجھے اس آدرش کو بار بار دہرانے سے بھی انکار نہیں مگر چاچا چکرورنی کے بھوت نے جس وچن کی شرط لگائی تھی، وہ تو مجھے بتایا ہی نہیں گیا اور مورتی کے جوہر والی بات ادھوری ہی رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود میں مندر کی طرف جا رہا تھا کیونکہ میرے اور کایا پنتھا کے سپنوں میں ایک بات بہر حال مشترک تھی کہ سارگلیان نے بودھ اتھاس کی جو یادگاری چھوڑی اس پر میرا ادھیکار مان لیا گیا تھا۔ کایا پنتھا کو بتایا گیا کہ مجھے یہ ادھیکار برسوں پہلے مل چکا تھا، میں اس فقرے کا مطلب نہ پوچھ۔ کا، ممکن ہے جس طرح مقدس مورتی کی تلاش اور ساؤ گاری سے سمبندھ بہت پہلے میری کتاب تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا اور قدرت کے ان دیکھے ہاتھ آپ سے آپ مجھے اس طرف لے آئے تھے۔ اسی طرح سارگلیان کی امانت کے ذریعے بھی قدرت مجھ سے کوئی پراسرار کام لینا چاہتی ہو، شاید وہ کام اس جیون بھید کو دنیا پر ظاہر کرنا ہے جو چوبیس پچیس صدیوں سے راز سر بستہ بنا ہوا تھا۔

سپنے میں مجھے ڈبیا کھولنے سے پہلے بھگوان کے مندر میں وچن دینے کو کہا گیا تھا اور وچن کی عبارت ادھوری رہ گئی تھی، پھر بھی میں نے اپنے آپ کو قضا و قدر کی مرضی پر چھوڑ دیا جو ایسے موقعوں پر خود ہی میری رہنمائی کرتی رہی تھی کیونکہ میں جانتا ہوں جس طرح دنیا میں ہر شخص کے حصے کا کچھ دانہ پانی ہوتا ہے وہ اسے مل جاتا ہے، اسی طرح ہر بھید کے کھلنے کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے یہ جو کچھ عرصے سے مجھے پے در پے عجیب و غریب واقعات یا حادثات پیش آرہے تھے، ان سب کا محور و مرکز تو ایک ہی تھا۔۔۔ بھگوان کی مورتی۔۔۔ سب کچھ اسی راز سر بستہ کے افشا کے لئے ہو رہا تھا۔

مندر کی طرف چلتے چلتے میں انہی وچاروں میں گم تھا اچانک ایک نئے خیال نے مجھے چونکا دیا کہ بعض لوگ کسی اہم کام کی لیے سے کا انتظار کرتے ہیں مگر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن

کا سہ انتظار کرتا ہے اور جب وہ دنیا کی اسٹیج پر آتے ہیں، وقت ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ کیا میں بھی ایک ایسا ہی آدمی ہوں جس کا سہ کو انتظار تھا؟

بہر حال کچھ بھی ہو، دنیا میں ہر شخص کے حصے بخرے کا کوئی کام مقرر ہے، شاید پراسرار قدرت نے مقدس مورتی کی تلاش، جیون بھید کا افشا اور ساؤ گاری کی مکتی اور نجات کے کام میرے ہی نام لکھ دیئے ہوں۔

یہی سوچتا جب بڑے مندر کے قریب پہنچا گہری شام ہو گئی تھی، پہلے بھی کہیں بتا آیا ہوں کہ برما میں بڑے بڑے خوبصورت اور عالیشان بودھ مندر ہیں جو اپنے فن تعمیر کے اعتبار سے مشرق بعید کے بودھ مندروں کا حسین نقشہ پیش کرتے ہیں کیونکہ اپنی چھتری دار چھتوں کی وجہ سے جو یکے بعد دیگر بتدریج اوپر اٹھتی چلی جاتی ہیں ان میں مشرق بعید کے بودھ فن تعمیر کی یکسانی پائی جاتی ہے۔ حکامتی کا بودھ مندر مانڈلے یا رنگون کے عالی شان مندروں کا مقابلہ تو نہیں کرتا مگر ہمارے یہاں بنگال اور آسام میں پائے جانے والے اکثر بودھ مندروں سے کہیں سبز اور بڑا تھا، یہاں کچھ اور بھی مندر تھے مگر بڑے مندر کے پردہتوں، پجاریوں، سادھوؤں اور بھکشوؤں کی تعداد دوسو کے لگ بھگ تھی۔

جب مندر کے دروازے پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سادھو، بھکشو، پجاری جوق در جوق باہر نکل رہے تھے، بعض بالکل خاموش جیسے چپ کا روزہ رکھا ہو، مگر بعض ایک دوسرے سے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے جس طرح لکھیاں بھنھناتی ہیں۔

جل پنا اور کایا پنتھا سے میں نے تھوڑی سی برمی زبان سیکھ لی تھی، بھکشوؤں کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ سب کایا پنتھا کے ہاں بھوجن کرنے جا رہے ہیں جو موت اور اندھیرے کی دنیا سے لوٹ آیا تھا، میں اس وقت تک دروازے ہی میں کھڑا رہا جب تک بھکشو اور سادھو باہر نہیں آ گئے، مگر ان کے نکلتے ہی میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا تو ایک بوڑھا پجاری جس کا سر شام کے اندھیرے میں بھی کھوے کی کھوپڑی کی طرح چمک رہا تھا، ناگہاں میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سوچا وہ بھی باہر جا رہا ہے اس لئے ایک طرف ہٹ گیا مگر وہ وہیں کھڑا مجھے گھورنے لگا پھر بولا۔

”تم برمی نہیں لگتے۔“

”بنگالی ہو۔“ میں نے برمی زبان میں جواب دیا۔

پجاری نے مجھے مزید غور سے دیکھا۔ ”پوچھا کے لئے آئے ہو شاید مگر یہ تو پوچھا کا سہ نہیں۔“

”بھگوان کی پوچھا کسی بھی سہ ہو سکتی ہے مگر میں مندر دیکھنے آیا ہوں۔“

”تو کل دن کو آنا۔“

”کیا میں آج مندر نہیں دیکھ سکتا؟“

”آج تو سب بھکشو اور سادھو کایا پنتھا کے ہاں کھانے پر چلے گئے ہیں، صرف چند پجاری اور مہا پرودہت نہیں گئے۔“

”میں بھکشوؤں اور سادھوؤں کو دیکھنے نہیں مندر میں بھگوان کے درشن کرنے آیا ہوں۔“

پجاری کتنی کتنی باتوں سے کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ ایک پل چپ رہنے کے بعد بولا:

”اصل بات یہ ہے کہ آج ایک مہان بودھ بھگت یہاں آئے ہیں، پجاری اور مہا پرودہت ان کی سیوا میں رہیں گے۔“

مہان بودھ بھگت کی آمد کا ذکر سن کر میں چونکا خیال آیا کہیں وہ گنجال ہی نہ ہو جو پانچ برس پہلے بھی بودھ بھگت کے روپ میں یہاں آیا اور سارگلیان کی یادگار تھیا نے کی کوشش کرتا رہا تھا، اس خیال کے ساتھ ہی مندر سے میری دلچسپی بڑھ گئی، میں نے کہا۔ ”یہ تو میرے دھن بھاگ ہیں جو میں ایسے دن مندر دیکھنے آیا جب یہاں کوئی مہان بودھ بھگت بھی مہمان ہے، میں بھی ان کے درشن کروں گا۔“

پجاری ٹکڑ ٹکڑ مجھے دیکھنے لگا، میں نے پوچھا۔

”کہاں سے آئے بودھ بھگت؟“

”تبت۔۔۔۔۔ وہ ایک لاماہیں۔“

میرے دل میں پیدا ہونے والے اندیشے کا فور ہو گئے، میرا جھڑا تو گنجال سے تھا مجھے کسی قیمتی الاماسے کیا سروکار، میں نے پجاری سے کہا: ”آپ لوگ بڑے شوق سے مہمان کی سیوا کریں میں تو صرف بھگوان کے درشن کر کے لوٹ جاؤں گا، اگر آپ مجھے اس خیال سے روک رہے ہیں میں سادھوؤں اور بھکشوؤں کی غیر حاضری میں مندر کی کوئی قیمتی شے چرا کر نہ لے جاؤں تو بالکل بے فکر رہیں میں چور نہیں کایا پنتھا کا مہمان اور رشتے دار ہوں۔“

کایا پنتھا کا نام سنتے ہی پجاری ایک دم بدل گیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگے۔ ”تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا کہ کایا کے مہمان ہو۔“

”سوچا بھگوان کے مندر میں سفارش کے بغیر ہی داخل ہو سکوں گا۔“

پجاری مسکراتے لگا پھر اس نے سیدھی راہداری کی طرف ہاتھ اٹھایا اور بولا۔ ”یہ راستہ تمہیں بھگوان کے پاس لے جائے گا ان کے درشن کر کے لوٹ جانا۔“

مجھے بھگوان تک پہنچنے کا راستہ دکھا کر وہ خود بائیں ہاتھ کی غلام گردش میں ہویا، بودھ مندر پر خاموش طاری تھی اور سیدھی مگر طویل راہداری جو بھگوان کے کمرے تک جاتی تھی۔ نیم تاریکی میں ڈوبی تھی کیونکہ اس کے وسط میں صرف دو قدیلیں روشن تھیں، میں ان کی مردہ سی روشنی میں

آگئے بڑھا اور جب اسی جگہ پہنچا جہاں قندیلیں جل رہی تھیں تو دیکھا کہ ایک ویسی ہی راہداری پہلی راہداری کو کاٹتی ہوئی گزرتی ہے جس کے دائیں بائیں بھکشوؤں کیلئے حجرے بنے ہوئے تھے جس سیدھی راہداری سے میں گزر رہا تھا، وہ بالکل سپاٹ تھی۔ اس میں کوئی حجرہ، کوئی دروازہ کوئی دریچہ نہ تھا۔

بال کے قریب پہنچا تو سیدھی راہداری اس چوکور اور مسقف راہداری پر ختم ہو گئی جو بڑے کمرے کی چاروں طرف بھیلی تھی، یہاں بھی قندیلیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی میں پتھر کی وہ لمبی لمبی سیڑھیاں نظر آئیں جو بھگوان کے کمرے میں اترتی تھیں۔ اس کمرے کا فرش سطح زمین سے آٹھ فٹ گہرا تھا، میں سیڑھیاں اتر کر وسیع وعریض ہال نما کمرے میں داخل ہوا تو سامنے ہی بھگوان بودھ کا بارہ تیرہ فٹ بلند مجسمہ دکھائی دیا، جس کے چروں میں ڈھیروں پھول پڑے تھے اور ایسا تھا وہ کمرہ کہ اس میں داخل ہوتے ہی دل پر ایک عجیب سی ہیبت طاری ہوتی تھی۔

اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس بڑے اور اونچی چھت والے کمرے میں میرے سوا دوسرا کوئی نہ تھا، میں وہاں اکیلا تھا مگر بھگوان اکیلا نہ تھا کیونکہ بڑے بھگوان کے دائیں بائیں کئی چھوٹے بھگوان بھی تھے جن کی ایک سی مورتیاں دونوں طرف ایک ترتیب سے ایستادہ تھیں۔ شاید اتنے سارے بھگوان اکٹھے دیکھ کر ان کی خاموش ہیبت کا احساس ہوتا تھا۔

اس کمرے میں پہنچ کر خیال آیا کہ بھگوان سے عہد کرنے تو آگیا ہوں مگر اس کے لئے کوئی چڑھاوا نہیں لایا، میں خالی ہاتھ عظیم مجسمے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بھگوان سے کہنے لگا۔

”بھگوان! میں تیرے لئے کوئی چڑھاوا لے کر نہیں آیا کیونکہ تو خود ہی کہتا ہے کہ میرے پاس جھوٹے چڑھاوے لے کر نہ آؤ۔ بھلا مجھے مندر کے چڑھاوؤں سے کیا لینا ہے جو کچھ تم سادھوؤں اور بھکشوؤں کو دان کرتے ہو اس میں میرا کوئی حصہ نہیں۔۔۔ بے شک تو ٹھیک کہتا ہے بھگوان! کیونکہ تیرا حصہ دان میں نہیں، دان کرنے والے کے من میں ہوتا ہے اور تیرا اصل چڑھاوا تو وہ دکھ ہے جو ہم دوسرے کے لئے اٹھاتے ہیں، وہی دکھ ہماری مکتی اور نجات کا ذریعہ بنتا ہے تو بھگوان! میں بھی تیرا چڑھاوا اپنے من میں لے کر آیا ہوں کیونکہ میں نے دوسروں کے دکھ اٹھائے ہیں اور انھیں کو گواہ بنا کر یہ عہد کرتا ہوں کہ میں وہ مقدس مورتی ضرور ڈھونڈوں گا جس میں کوئی جیون بھید بند ہے تاکہ ان لوگوں کو نروان اور نجات عطا کر سکوں جو اس کے لئے دکھ بھوگ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا، جب مورتی کو حاصل کر لوں گا تب مجھے اس پر اسرار جو ہر کے بارے میں کیا کرنا ہے جو مورتی میں بند ہے، مگر سارگلیان کی مقدس امانت کھولنے سے پہلے میں وچن دیتا ہوں کہ جو بھی تیری مرضی ہوگی، پوری کروں گا۔ اب میں تجھ سے سارگلیان کی ڈیبا کھولنے کی آگیا لیتا ہوں۔“

ٹھیک اسی سے جب میں اپنے وچن کے الفاظ بیان کر چکا، میرے عقب میں ایک مدہم سی چاپ ہوئی جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو ایک سایہ مندر کے دروازے سے چوکور مسقف راہداری میں گم ہو رہا تھا، غالباً کوئی پجاری بڑی عجلت میں کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا تھا، یوں تیز تیز گزرتے ہوئے اگر پجاری نے میرے بعض الفاظ سن بھی لئے ہوں گے تو انہیں سمجھ نہ سکا ہوگا کیونکہ میں نے بھگوان کو بنگلہ بھاشا میں وچن دیا اور اسی سے سارگلیان کی ڈیبا کھولنے کی آگیا لی تھی۔

اس پر شانت اور مطمئن ہو کر میں نے چاہا کہ تھوڑی سی پرارتھنا بھی کر لوں۔ اتنے سارے بھگوانوں کی موجودگی میں میرے اندر خود بخود ایک تحریک پیدا ہو رہی تھی، کہ سنسار کے اس پالنہ دار سے جو اپنی ذات میں ایک ہے لیکن جس کے کتنے ہی روپ ہیں، اپنی کامیابی کے لئے دعا مانگوں پھر وہیں کھڑے کھڑے میں پرارتھنا کرنے لگا کہ ایشور مجھے اپنا آدرش پورا کرنے کی شکتی دے۔

ابھی پرارتھنا کر رہا تھا کہ پھر ایک آہٹ سنی لیکن اب جو کوئی بھی تھا وہ سیڑھیاں اتر کر کمرے میں داخل ہوا۔ یہ جان کر بھی کوئی میرے قریب آگیا ہے، میں نے اپنا دھیان نہیں توڑا اور پرارتھنا میں مگن رہا، پرارتھنا بھی بنگلہ بھاشا کی تھی، فارغ ہوا تو دیکھا ایک بوڑھا سرمنڈا پروہت چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا، میں نے اسے پرنام کیا تو بولا۔

”میں نے سنا ہے تم کا یا پنتھا کے مہمان ہو؟“

”جی۔۔۔ اور آپ؟“

”میں اس مندر کا مہا پروہت جیو کا ہوں۔“

ایک بار پھر پرنام کیا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ کے درشن ہو گئے۔“

”میں حیران ہوں تم نے پرارتھنا تو کی مگر نہ بھگوان کے لئے کوئی چڑھاوا لائے نہ پوجا کے پھول نچھاور کئے۔ جب بھگوان سے کچھ مانگنا ہو تو کچھ نہ کچھ اسے دینا بھی پڑتا ہے۔“

سوچا پرارتھنا تو کر ہی چکا ہوں، اس لئے بوڑھے کو صاف صاف جواب دینا چاہیے۔

”چڑھاوا اس لئے نہیں لایا کہ میں نے بھگوان کی مورتی سے نہیں، بھگوان سے کچھ مانگا ہے اور بھگوان چڑھاوا نہیں لیتا۔“

میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ الفاظ سن کر بوڑھے پروہت کی کیا حالت ہوئی جسمہاک لہجے میں

کہنے لگا۔ ”تم چڑھاوا نہیں مانتے؟ مورتی پوجا نہیں کرتے؟“

”شاید یہی بات ہو۔“

”مگر بودھ دھرم میں تو مورتی پوجا ہوتی ہے۔“

”ہاں ہوتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لوگ بھگوان کی مورتیاں خود ہی بناتے اور خود ہی ان کی پوجا کرتے ہیں، وہ بھگوان کی نہیں اصل میں اپنی ہی پوجا کرتے ہیں۔“

مہا پرہت ہکا ہکا سا مجھے دیکھنے لگا، میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اور بھگوان سے کچھ مانگنے کے لئے اسے دینے کی کیا ضرورت ہے، جب آدمی، آدمی کے سامنے ہاتھ یا بھکتا کا کٹورا پھیلاتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے، کیا بھگوان آدمیوں سے بھی گیا گزرا ہے کہ خالی ہاتھ پھیلائے والے کو کچھ نہ دے؟ پرہت جی! آدمی اور بھگوان، بازار اور مندر میں کچھ نہ کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔“

وہ حیرت زدہ سا بولا۔ ”بازار کا مندر سے کیا واسطہ؟“

”بازار میں روٹی بکتی ہے، عزت بکتی ہے، آدمی کا دھرم ایمان بکتا ہے، حتیٰ کہ بھگوان کی مورتی بکتی ہے، پوجا کے پھول بکتے ہیں، اگر چڑھاوے کے بغیر بھگوان بھی پرارتھنا نہیں سنتا تو اس کا مطلب یہی ہوتا کہ مندر میں بھگوان بکتا ہے اور چڑھاوے اس کا مول ہے، نہیں پرہت جی! مندر میں کاروبار اور لین دین نہیں ہونا چاہیے، کیا یہ ممکن نہیں کہ بھگوان جھوٹے چڑھاوے لے کر آنے والوں کو تو خالی لوٹا دے اور خالی ہاتھ آنے والوں کی جھولی بھر دے۔“

مہا پرہت خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا، میں نے اس کے لئے تھوڑی سی حیرت اور فراہم کر دی۔ ”یہ بھی بتا دوں کہ میں نے بھگوان سے صرف انصاف اور نیائے مانگا ہے۔“

”نیائے مانگا ہے؟ کس لئے؟“

”ان لوگوں کے لئے جن کے ساتھ انیائے ہوا اور بھگوان کا نیائے چڑھاؤں سے خریدا نہیں جاتا۔“

اچانک ہمارے پیچھے سے آواز آئی۔ ”یہ نوجوان ٹھیک کہتا ہے جیو کا! چڑھاوے بھگوان کے لئے نہیں مندروں، پجاریوں اور بھکشوؤں کے لئے ہوتے ہیں۔“

پلٹ کر دیکھا تو دروازے کی سیڑھیوں پر گیروا چولہ پہنے مضبوط جسم کا ایک لمبا ترنکا بوڑھا بھگت کھڑا تھا۔ فوراً خیال آیا، چند گھنٹیاں پہلے غالباً اسی بھگت کا سایہ میں نے دیکھا تھا جو بڑی غلت میں دروازے کے سامنے سے گزرا تھا اور راہداری میں اوجھل ہو گیا، تب وہ غلت میں تھا مگر اب اسے کوئی جلدی نہ تھی، وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترنے لگا، اس کے رنگ میں زردی کی جھلک غالب تھی اور چہرے کے خدو خال میں بیک وقت برما، تبت اور چین کے اثرات گھل مل رہے تھے۔ سوچا شاید یہی وہ لاما ہے جس کی آمد کا ذکر پجاری نے کیا تھا، دوسرے لمحے میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی، جب وہ ہولے ہولے چلتا ہمارے قریب آیا تو مہا پرہت جیو کا اس کے سامنے بڑے ادب سے جھک گیا اور بولا: ”یہ نادان مورتی پوجا نہیں

مانتا پرہو!“

”ہاں جیو کا! آج کل کے پڑھے لکھے بالک مورتی پوجا نہیں مانتے، انہیں کیا معلوم کہ بھگوان پتھر کے شریر میں بھی سنتا اور بولتا ہے۔“

میں نے لاما کو پر نام کیا اور کہا۔ پرہو! پتھر سنتے اور بولتے ہیں یا نہیں، میں اس چھان بین میں نہیں پڑتا مگر اتنا جانتا ہوں تبت کے لاما لوگ اپنے مندروں میں پرارتھنا ان شبدوں میں کرتے ہیں کہ۔۔۔ ”ہم لوگ تنھا گت امی تابھ کی ارادھنا کرتے ہیں، جو دیوا استھان نامی سورگ میں باس کرتے ہیں۔“ وہ اس امی تابھ کی ارادھنا نہیں کرتے جو پتھر میں بسے ہوں، اسی طرح چین کے بودھ بھی جب بھگوان کو یاد کرتے ہیں تو یہی کہتے ہیں۔ ”اے آتما روپی! ہم تمہیں سہمان (عزت) کے ساتھ بلاتے ہیں، اے سکھوتی نامی سورگ باشی، لوگ جت امی تابھ! تم شبھ آگن کرو۔“ (آؤ) تو پرہو! امی تابھ جو بھگوان کے پوتر ناموں میں سے ایک نام ہے، لا محدود جوتی اور بے کنار روشنی کو کہتے ہیں اور وہ محدود جوتی کسی پتھر میں کیسے ساکتی ہے؟“

لاما نے آنکھیں پٹیٹائیں، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ جس مہان بودھ بھگت کے کارن ایک پجاری نے میرے مندر میں داخلے پر جھٹ کی تھی، وہ بودھ دھرم کا کتنا گیان رکھتا ہے؟ میری باتوں نے اسے حیران کر دیا لیکن مہا پرہت کے سامنے اپنی ہار کیسے مان لیتا، اپنے گیان کا سکہ جھاتے ہوئے بولا۔

”اگر تم دھرم کے رتن جانتے تو ایسی بات نہ کرتے بندھو!“

”دھرم کے رتن سات ہیں پرہو!“ میں نے جواب دیا۔ ”پہلا چار سمرتی استھان، دوسرا چار سمیک پردھان، تیسرا چار ردھی، چوتھا پنج بل، پانچویں پنج اندریہ، چھٹا سپت بودھینگ اور ساتواں اشانگ مارگ اور ہر رتن کی کئی قسمیں ہیں آپ بتائیں میں کون سے رتن کی قسمیں بیان کروں؟“

”تمہی لاما اور مہا پرہت جیو کا پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، وہ مجھ جیسے بندھو سے جو عمر میں ان سے کئی درجے چھوٹا تھا، ایسے دھرم گیان کی توقع نہیں رکھتے تھے، دونوں تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تو میں نے کہا۔ ”اگر آپ کو کچھ اور نہیں پوچھنا تو مجھے آگیا دیں۔“

یہ کہہ کر میں ان دونوں کے بیچ سے گزرتا سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور دروازے سے نکل کر راہداری میں آگیا۔ جاتے جاتے ایک بار پلٹ کر دیکھا تو دونوں حیرت سے بت بنے مجھے جاتا دیکھ رہے تھے، مندر کی سیدھی اور طویل راہداری میں چلتے چلتے میں نے سوچا، ان پرہتوں اور بھگتوں کا دھیان مندروں، مورتیوں اور چڑھاؤں میں بٹا ہوا ہے، یہ دھرم کا سچا گیان نہیں رکھتے۔“

میں نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا اور اسی کونے میں بیٹھ کر صدری کی جیب سے ڈبیا نکالی کمرے سے نکل کر نکالا اور نارچ کی روشنی میں ڈبیا کی اس طرف جدھر جیون بھید چار اناے۔ کے شبد اور تھا گت، شاکہ منی، امی تابھ، آتما روپی کے نام کندہ تھے، خنجر کی تیز نوک سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گہری لکیر کھینچ دی پھر اس کی نوک سونے کی پتری میں ٹھوکی، پتری ایک سوت موٹی تھی میں خنجر پر پتھر کی چوٹ مار کے اسے کانٹے لگا، تیز دھار آہستہ آہستہ سونے کو کاٹتی گئی اور میں اسے تین اطراف سے کانٹے میں کامیاب ہو گیا، پھر پتری کو اٹھا کر پھلی جانب موڑ دیا۔

ڈھلکا اٹھتے ہی ڈبیا کے اندر کوئی شے تہہ در تہہ کر کے رکھی نظر آئی، وہی جیون کی کلید تھی، میں نے دھڑکتے دل اور لرزاتے ہاتھ سے وہ شے اٹھائی تو میرے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی کیونکہ سارگلیان کی بائیس صدیاں پرانی امانت میرے ہاتھ میں تھی مگر میں اس امانت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا کیونکہ وہ کسی باریک سی کھال کا تہہ در تہہ ٹکڑا تھا، ابھی میں اس چرمی ٹکڑے کی تہیں کھول رہا تھا کہ ناگہاں باہر ایک کھٹکا ہوا۔

آواز اگرچہ بہت مدھم تھی مگر اس سے وہ مدھم سی آواز بھی کسی دھماکے سے کم نہ تھی، میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی فوراً ہی ”میاؤں“ کی آواز سن کر میری ساری گھبراہٹ جاتی رہی اور میں پہلے کی طرح شانت ہو گیا، غالباً کوئی بلی پچھواڑے کی دیوار سے صحن میں کودی تھی اور اس چھلانگ سے وہ مدھم سی آواز پیدا ہوئی جس نے میرے من میں ایک دھماکا سا کر دیا، بعض اوقات آدمی شیر کی دھاڑ سے بھی نہیں ڈرتا اور بعض اوقات چوہے کے کھڑاک یا بلی کی آہٹ سے لرز اٹھتا ہے۔

میں نے فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پا لیا اور بلی کی چھلانگ کو نظر انداز کر کے جیون بھید کی اس چرمی کلید کو دیکھنے لگا جس پر قدیم متروک پالی زبان میں کچھ لکھا تھا مگر وہ تحریر میرے لئے بیکار تھی اور میں اس میں سے کچھ حاصل نہ کر سکتا تھا کیونکہ میں پالی زبان نہ جانتا تھا۔

ڈبیا کھولنے کے شوق میں بھول ہی گیا تھا کہ اگر اس میں جیون بھید کے متعلق کوئی ہدایت درج ہوئی تو اسے پڑھوں گا کیسے؟ سارگلیان کی اس چرمی تحریر پر بائیس صدیاں بیت چکی تھی اب میں ایک نئی بے چینی، حیرت اور سنسنی میں مبتلا تھا کہ باہر پھر ایک بے آوازی چاپ ابھری شاید بلی دروازے کی جھری سے نکلنے والی روشنی کو دیکھ کر کمرے کی طرف آرہی تھی مگر یہ بلی نہ تھی کچھ اور تھا، کوئی آدمی ننگے پاؤں، بے آواز، بے کھٹکے دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا جس کی جھری سے میں نے دو انسانی پاؤں دیکھ لئے تھے، پھر چرمی تحریر کے ساتھ ڈبیا جیب میں رکھی اور جلدی سے نارچ کی روشنی دروازے پر پھینکی، میں صرف ایک انسانی ہیولا سا دیکھ سکا جو کسی چیتے

مندر سے نکل کر اسی راستے پر ہولیا جس راستے آیا گیا مگر اندھیرے میں اپنے پیچھے کسی اور کو بھی مندر سے نکلتے دیکھا، شاید کوئی پجاری تھا کیونکہ لا ما اور مہا پر و ہت کو تو میں حیرت کے بھنور میں ڈبو آیا تھا، وہ ضرور میرے بارے میں سوچ رہے ہوں گے مگر میں نے ان کا خیال ذہن سے جھٹک دیا اور حویلی کی طرف چلتا رہا۔



سارگلیان کی امانت سے متعلق مجھے سپنے میں جو ہدایت دی گئی تھی وہ میں نے پوری کر دی اور اس ڈبیا کو کھولنے کا ادھیکار حاصل کر لیا تھا جس کے لئے سنگ کانگ حکامتی میں حالات نے کئی ورق الٹ دیئے تھے۔

اسی ڈبیا کے دھیان میں مگن حویلی میں پہنچا تو وہاں روشنیوں اور آدمیوں کا سیلاب اُٹھ آیا تھا، اپنی ارٹھی جلنے کے پانچ برس بعد کا یا پننھا کی واپسی ایک اچنبھے سے کم نہ تھی، لوگ اسے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے تھے اور دعوت نے کچھ اور ہی سماں پیدا کر دیا تھا، شیر کے رئیس، زمیندار، بیوپاری، بڑے بڑے آدمی سبھی کا یا کو گھیرے باتوں میں مشغول تھے کیونکہ سب سے پہلے بھکشوؤں اور سادھوؤں میں بھوجن بانٹا جا رہا تھا جو غلام گردش میں صف بہ صف آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔

میں لوگوں کی بھیڑ سے پچتا بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا اور غسل خانے سے ہوتا اپنے کمرے میں پہنچا، باہر بھکشو، سادھو کھانے میں مصروف اور دوسرے مہمان کھانے کے انتظار میں بیٹھے تھے، کا یا، اس کے کسان، نوکر چاکر سبھی مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے تھے، ان کی مصروفیت نے میرے لئے موقع فراہم کر دیا تھا کہ کسی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر سونے کی ڈبیا کھول سکوں، اچانک حویلی کے پچھواڑے اس پرانے بوسیدہ کمرے کا خیال آیا جہاں کا یا نے بودھ اتہاس کی یہ قیمتی یادگار پانچ برس تک دفن کر رکھی تھی میں نے نارچ اٹھائی اور خالی کمرے سے گزرتا پچھلے صحن میں آیا، وہ کمرہ اسی حویلی کے حصے میں واقع تھا، میں دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

دن میں کوئی شاذ و نادر ہی ادھر آتا تھا مگر اس وقت رات بھی تھی اور دعوت بھی، سب لوگ دعوت کے ہنگامے میں الجھے تھے، کسی نوکر کو بھی میرے کام میں نخل ہونے کی فرصت نہ تھی۔

پہلے بھی بتا چکا ہوں، یہ کمرہ گویا ایک کباڑ خانہ تھا جس میں ٹوٹی پھوٹی یا پھر فالتو چیزیں پھینک دی گئی تھیں، نارچ کی روشنی میں اس کے کواڑ کباڑ کا جائزہ لیا، وہی گوشہ صاف تھا جہاں سے کا یا نے فرش کھود کر ڈبیا نکالی اور میرے حوالے کر دی تھی۔ فرش دوبارہ ہموار کر دیا گیا تھا،

کی طرح دروازے پر لپکا تھا۔

کسی نے باہر سے جتنی تیزی کے ساتھ دروازہ کھول کر حملہ کیا، میں نے بھی اتنی ہی تیزی سے مقابلے کی ترکیب سوچ لی، کواڑ کھلنے سے پہلے ہی ٹارچ بجھا دی اور اندھیرے میں اپنی جگہ چھوڑ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ حملہ آور بڑی تیزی سے چھینٹا، اسی لمحے کوئی بھاری آہنی شے اسی جگہ گری جہاں میں پہلے بیٹھا تھا، پھر ایک سایہ اپنا توازن کھودینے کے باعث فرش پر گرا، اور میں نے اندھیرے میں یک لخت اسے دبوج لیا، میرے بازو ایک جسم کے گرد لپٹ گئے مگر فوراً پتہ چل گیا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، بلا کا مضبوط اور زبردست جسمانی شکست کا مالک تھا کیونکہ میری مضبوط گرفت سے نکلنے کے لئے پوری زور آزمائی کر رہا تھا، آخر اس نے مجھے اپنے اوپر سے اٹھا کر پرے پھینک دیا، اور اندھیرے میں وہ آہنی چیز ڈھونڈنے لگا، جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ ہتھیار ڈھونڈ کر مجھ پر حملہ کرتا، میں سنبھلا اور دوبارہ اس پر ٹوٹ پڑا، اس کی ٹانگ میرے ہاتھ آگئی، میں نے پوری طاقت سے جھٹکا دے کر اسے نیچے گرایا اور دوبارہ اپنی گرفت میں جکڑ لیا، وہ میرے شکنجے سے نکلنے کی پوری کوشش کرتا رہا، مگر میری گرفت سخت سے سخت تر ہوتی گئی، یہ کشمکش کئی منٹ جاری رہی اسی کشمکش میں اس کی گردن میرے ہاتھوں میں آگئی میں نے اس کا سر اٹھا اٹھا کر فرش پر مارا اس مسلسل عمل سے اس کی مدافعت کچھ کمزور پڑ گئی۔ پھر میں نے اپنے دونوں پنجے گردن میں پیوست کر دیئے اور گلا دباتا رہا وہ سانس گھٹنے سے تڑپا، پھر کا، مچلا اور پھر ایک خرراہٹ کے ساتھ جو کسی دم توڑتے ہوئے آدمی کے حلق سے آخری بار نکلتی ہے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

میں نے اسے زیر کر لیا وہ اتنا طاقتور اور سخت جان تھا کہ اسے زیر کرتے مجھے دانتوں پسینہ آ گیا اس کے اچانک حملے سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس میں مجھے یا اسے ہارنا تھا بلکہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی موت ضروری تھی، ایسے حملوں کا انت یہی ہوتا ہے۔

میں اس کے بے جان شریر کو چھوڑ کر جلدی سے اٹھا اور ٹارچ کی روشنی میں اپنے نامعلوم بیری کا چہرہ دیکھا تو بھونچا رہ گیا، فرش پر جہاں ہم دونوں میں زور آزمائی ہوئی تھی بتتی لاما کی لاش پڑی تھی جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے بودہ مندر میں الجھ گیا تھا، مہمان بودہ بھگت کو اس روپ میں دیکھ کر میری جو حالت ہوئی بیان نہیں کر سکتا۔

لاش کے قریب ہی ڈیڑھ فٹ لمبی ایک آہنی سلاخ پڑی تھی جس کے ایک سرے پر لوہے کا گولہ بنا تھا یہ سلاخ بڑی آسانی سے بھاری چولے میں چھپائی جاسکتی تھی بتتی لاما نے اس سلاخ سے مجھ پر حملہ کیا اور اگر اس کا آہنی گولہ میرے سر پر پڑ جاتا تو اس کی جگہ فرش پر میری لاش گری

ہوتی۔

اب مجھے خیال آیا جب میں مندر میں سارگلیان کی امانت کھولنے اور نامعلوم شرط پوری کرنے کا عہد کر رہا تھا بودہ لاما نے چھپ کر میرے الفاظ سن لئے اور جان گیا تھا کہ وہ نادر ڈبیا حاصل کر چکا ہوں، یقیناً وہ بنگلہ بھاشا جانتا تھا، یہ سب کچھ جان لینے کے بعد وہ بڑی تیزی سے راہداری میں غائب ہوئی واقعی واقع میں نے اسی کی جھلک دیکھی تھی، پھر وہ مہمان بودہ بھگت کے روپ میں سامنے آیا اور مورتی پوجا کے بارے میں جھگڑا کرنے لگا، میری واپسی کے بعد وہی میرے پیچھے مندر سے نکلا، اندھیرے میں میرا تعاقب کرتا کایا کی حویلی تک پہنچا اور پچھواڑے کی دیوار پھاند کر اندر آ گیا تھا۔

کیا وہ عجیب و غریب مگر انتہائی خطرناک ہتھیار سے مجھ پر اس لئے حملہ آور ہوا تھا کہ میں مورتی پوجا کو نہیں مانتا اور وہ مجھے سزا دینا چاہتا تھا؟

جی نہیں۔ وہ سارگلیان کی ڈبیا کاراز معلوم کرنے بلکہ مجھے ہلاک کر کے ڈبیا چھیننے آیا تھا اگر وہ جانتا کہ ڈبیا اس وقت بھی میرے پاس موجود تھی جب میں مندر میں اس سے بحث کر رہا تھا تو شاید مندر سے میری واپسی نہ ہوتی یا وہ راستے ہی میں عقب سے حملہ کر کے میرا خاتمہ کر دیتا اور ڈبیا چھین کر فرار ہو جاتا، لاما نے اس خیال سے میرا پیچھا کیا تھا کہ وہ مقدس امانت میں نے کہیں حویلی میں چھپا رکھی ہے اور اب اسے کھولنے جا رہا ہوں۔

اس نے مجھے ہلاک کر کے ڈبیا ہتھیانے کا جتن کیا مگر خود موت کی دہلیز پر پہنچ گیا۔ اچانک اس کے دائیں بازو میں ہلکی سی جنبش ہوئی جس نے مجھے حیران کر دیا، جھک کر نبض دیکھی تو چل رہی تھی، وہ مرنے کا صرف بے ہوش ہوا تھا اس انکشاف کے بعد میں نے فوراً ایک رسی تلاش کی اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور منہ پر رومال کس دیا کہ ہوش آنے پر چلا نہ سکے، اس کام سے فارغ ہو کر کمرے سے نکلا، دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی، کپڑے جھاڑے اور اپنا حلیہ درست کر کے (کیونکہ لاما سے زور آزمائی کرتے ہوئے میرے بال بکھر گئے اور کپڑے گرد آلود ہو گئے تھے) میں بیرونی صحن کی طرف ہولیا۔

کایا پنتھا کو ڈھونڈنے میں دیر نہ لگی، سادھو، بھکشو، بھوجن کر کے چلے گئے اور اب دوسرے مہمانوں کے لئے کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ کایا ایک طرف نوکروں کو ہدایات دے رہا تھا، میں نے قریب جا کر سرگوشی کی۔

”کایا موسا! ذرا میرے ساتھ آؤ۔“

وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ ”ارے کہاں تھے تم کھانا نہیں کھاؤ گے؟“

”کچھ باتیں کھانے سے زیادہ ضروری ہوتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوا۔

”جو کچھ میں نے کہہ دیا وہی میرا مطلب ہے، بس چلے آؤ۔“

وہ کچھ حیران، کچھ پریشان میرے ساتھ ہولیا۔ میں حویلی کے پچھواڑے کی طرف چلنے لگا اور چلتے چلتے بتایا کہ شام کے سے مندر میں گیا اور جب لوٹا تو ایک بدھ بھگت نے میرا تعاقب کیا، وہ میرے پیچھے حویلی میں داخل ہوا اور ایک خطرناک ہتھیار کے ساتھ مجھ پر جھپٹ پڑا، میرا بیان بڑا مختصر تھا جس نے کایا کو مشتعل کر دیا، غصے میں بولا۔

”کیا وہ بھگت بھاگ گیا؟“

”نہیں، یہیں ہے۔“

”کہاں ہے؟“

ہم پچھواڑے کے صحن میں پہنچ گئے تھے، میں نے کمرے کی کنڈی اتاری، دونوں پٹ کھول دیئے، کایا کو لے کر اندر داخل ہوا اور اپنے دشمن لا مار ٹارچ کی روشنی کا دائرہ پھینک کر کہا۔

”یہ ہے وہ بدھ بھگت۔“

اسے دیکھ کر کایا ہنستا فرط تحیر سے یوں اچھلا جیسے زمین نے اسے اچھال دیا ہو۔ ”ارے یہ تو تبت کا لامادری سا کھا ہے۔“

”بدری سا کھا؟“

اور مجھ پر بھی حیرت کا ویسا ہی دوڑا جیسا کایا پتھار پر پڑا تھا۔

”ہاں۔۔۔ پانچ برس پہلے یہی تو میرے پاس آیا اور سارگلیان کی ڈبیا دیکھ کر چلا گیا تھا۔ پروہت گنجال کی بلا اس کے جانے کے بعد نازل ہوئی تھی۔“

”یہ موت کا ایٹمی ہے کایا موسا! میرے لئے بھی موت کا سندیس لے کر آیا تھا۔“ میں نے اسے لوہے کی وہ سلاخ دکھائی جس کے ایک سرے پر اپنی گولہ بنا تھا۔ ”بدری سا کھا نے اسی ہتھیار سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔“

اس نے حیران کن آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ”تم یہاں کیا کر رہے تھے۔“

اب اس سے چھپانا بے کار تھا میں نے حقیقت بیان کر دی اور بتایا۔ ”یہ دراصل سارگلیان کی امانت چھیننے آیا تھا۔“

اس نے سونے کی ڈبیا کھولنے پر اعتراض نہیں کیا صرف اتنا پوچھا۔ ”ڈبیا کے اندر کیا تھا؟“

”ایک چری تحریر جسے میں پڑھ نہیں سکتا کیونکہ وہ پالی زبان میں لکھی گئی ہے۔“

”مگر اب بدری سا کھا کیا کیا کرو گے؟“

”یہ ہوش میں آجائے تو اس کا گلیان سنوں گا۔“

کایا پتھار نے ایک بار پھر مجھے چشم حیرت سے دیکھا۔ ”کیوں نہ اسے ابھی پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔“

”نہیں کایا موسا! اپنا ہر زخم قانون کو نہ دکھاؤ، کچھ زخم اپنے پاس رکھو قدرت خود ان کا علاج کرے گی جب کوئی بھگت بھگوان اور دھرم کے نام پر پہنے ہوئے چولے میں ہتھیار چھپا کر نکلتا ہے تو قانون سے زیادہ دھرم کا مجرم ہوتا ہے۔“

میری بات اس کی سمجھ میں آئی یا نہیں آئی مگر وہ مجھ پر اندھا دھواں کرنے لگا تھا۔ بولا۔

”اس گھر کے کسی مجرم کو قانون کے حوالے کر دیا قدرت کے حوالے، مجھے تمہارا ہر فیصلہ منظور ہے کیونکہ ماضی کے ساتھ میں نے اپنا مستقبل بھی تمہیں سونپ دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے کایا موسا، میں کوئی غیر مناسب فیصلہ نہیں کروں گا، ابھی حویلی میں مہمانوں کی بھیڑ ہے جب یہ بھیڑ چھٹ جائے گی، کسان اپنے ٹھکانوں کو لوٹ جائیں گے اور گھر کے نوکر چاکر سو رہے ہوں گے تب ہم پھر یہاں آئیں گے اور بدری سا کھا کا فیصلہ کریں گے۔“

بوڑھا لا ما ابھی تک چپٹ پڑا تھا، اور اس کے جلد ہوش میں آنے کے کوئی آثار نہ تھے، میں نے لوہے کی سلاخ اٹھالی جس کی ایک ہی ضرب سے کسی بھی شخص کا سر توڑا جاسکتا تھا، پھر ہم دونوں کمرے سے نکلے کوڑ بند کئے کنڈی چڑھائی اور بیرونی صحن کی طرف چل پڑے، جہاں مہمانوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔

رات آدمی سے زیادہ بیت گئی، آکاش پر ستاروں کے کنول روشن تھے، کائنات دھیرے دھیرے پکھل رہی تھی اور وہی کل کا سہ تھا، جب میں کایا پتھار کے ساتھ حویلی کے پچھواڑے اس کمرے میں داخل ہوا، جہاں بدری سا کھا بند تھا۔

وہ ہوش میں آچکا اور گھٹنوں کے بل بیٹھا غالباً رسیاں کھولنے یا ترانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی کیونکہ رسیوں کا ہر بیچ سخت اور ہر گرہ مضبوط تھی کوڑا کھلنے کا کھٹکا سن کر کمرے میں روشنی کا دائرہ دیکھ کر گھبرا گیا، ٹارچ کی روشنی میں سب سے پہلے میں نے اپنا اور کایا پتھار کا چہرہ اسے دکھایا تاکہ وہ ہمیں پہچان لے پھر کہا۔ ”بدری سا کھا! یہ اچھا ہوا کہ تم ہوش میں آ گئے۔ اب ہم تمہیں دوسرے کمرے میں لے جائیں گے اور تمہارے پاؤں کی رسیاں کھول دی جائیں گی تاکہ خود چل سکو، اس کمرے میں جہاں ہم تمہیں لے جائیں گے تمہارا منہ بھی کھول دیا جائے گا تاکہ بول سکو اور ہم تمہارا بیان سن سکیں۔“

اس نے حیرت و استعجاب کی نظروں سے ہمیں دیکھا، میری زبان سے اپنا نام سن کر پریشان ہو گیا مگر ہم اس کی حیرت و پریشانی دیکھتے نہیں آتے تھے، میں نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں

ہو گیا مگر ہم اس کی حیرت و پریشانی دیکھتے نہیں آتے تھے، میں نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں

ہو گیا مگر ہم اس کی حیرت و پریشانی دیکھتے نہیں آتے تھے، میں نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں

کرد اور خود اس کی نگرانی کرو۔“

بوڑھے کسان نے میرے ہر حکم کی تعمیل کی اور بدری ساکھا کو کٹہرے میں لے جا کر خود اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ بدری ساکھا ابھی تک حیران و دم بخود اور حواس باختہ تھا۔ شاید اس طریقہ کار کو مذاق سمجھتا تھا کٹہرے میں آتے ہی اس نے زبان کھولی۔

”تم نے کچہری تو لگا دی اور مجھے کٹہرے میں بھی لے آئے مگر انصاف کون کرے گا، فیصلہ کون دے گا؟“

”بدری ساکھا! اس کچہری میں ہم تم اپنی اپنی وکالت خود کریں گے، ہم دوش لگائیں گے تم صفائی دو گے۔ ہمارے درمیان کوئی ویل نہ ہوگا جو جھگڑے کو طول دے سکے فیصلہ اور نیائے بھگوان کے ہاتھ ہے۔“

یہ کہہ کر میں نے بھگوان کی مورتی کی طرف اشارہ کیا جو کرسی پر رکھی تھی، میرے الفاظ سن کر بدری ساکھا ایک عجیب سی الجھن میں پڑ گیا اور بولا۔ ”کیا مورتی بولے گی؟“

”میں نے سنا ہے بھگوان کی مورتی ایک بار بولی تھی، پھر پتھر ہو گئی اور وہ بائیس صدیاں پہلے سارگلیان کے سے بولی تھی، آج بھی سارگلیان کی ایک امانت کا جھگڑا ہے شاید آج پھر بولے۔“

مٹی لا ما خوفزدہ نظر آنے لگا کیونکہ جو کچھ میں کہہ رہا تھا، اس کی سمجھ سے بالا تھا۔

”بدری ساکھا! تمہاراوشو اس ہے بھگوان پتھر کے شریر میں بھی سنتا اور بولتا ہے، اس لئے تم مورتی پوجا کرتے ہو پھر ڈر کس بات کا۔ اگر مورتی بولی تو سچ ہی بولے گی۔“

اس نے ایک نظر بدھ کی مورتی پر ڈالی جو عدالت کی کرسی پر ساکت و جامد بیٹھی تھی، پھر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا، میں نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

”بدری ساکھا! جس جرم کے الزام میں تم پکڑے گئے وہ پہلے ہی بیان کر چکا ہوں، تم نے حویلی میں داخل ہو کر ایک خطرناک ہتھیار سے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی اور وہ ہتھیار بھی عدالت انصاف کی میز پر موجود ہے اب تم پر دوش لگاتا ہوں کہ مجھے ہلاک کر کے تم مہاپرش سارگلیان کی وہ مقدس امانت چھیننے آئے تھے جسے کایا پنتھا میری ملکیت قرار دے چکا ہے جسے ایک شرط پر کھولنے کے لئے میں نے بھگوان سے آگیا لے لی تھی۔“

کایا پنتھا نے تصدیق کی کہ سونے کی ڈبیا جو سارگلیان کی امانت ہے، میرے حوالے کر چکا ہے اور اب میں ہی اس کا مالک ہوں۔ یہ سنتے ہی بدری ساکھا یک لخت بھڑک اٹھا اور بولا۔

”وہ ڈبیا بودھ اتھاس کی یادگار اور ایک جیون بھید کی کلید سمجھی جاتی ہے جو کسی ایسے آدمی کے ہاتھ نہیں لگنی چاہیے جو بھگوان کی مقدس مورتی کو نہ ڈھونڈ سکے۔ سارگلیان کی یہی ہدایت اس ڈبیا پر کندہ ہے، تم اس تاریخی ہدایت کی خلاف ورزی کر رہے تھے، اس لئے اگر میں نے تم پر حملہ کیا

کی رسی کھول دی پھر آگے آگے کایا اس کے پیچھے پیچھے بدری ساکھا اور میں باہر نکلے صحن میں آتے ہی اس نے سر اوپر اٹھا کر آکاش کی طرف دیکھا شاید وقت کا اندازہ کر رہا تھا، اسی طرح آگے پیچھے چلتے ہم اس حویلی کے اس کمرے میں لے آئے جہاں کایا کا پرانا اور بوڑھا کسان چان ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

کمرہ دیکھتے ہی بدری ساکھا دنگ رہ گیا اور خوف کے مارے اس کے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے لئے کسی ایسے کمرے کا اہتمام کیا جائے گا یہ کمرہ کوئی مقتل، عقوبت خانہ یا بندی گھر نہیں تھا بلکہ سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک بڑی میز اور کرسی بچھا دی گئی تھی اور اس کے سامنے میز پر اپنی گولے والی وہی سلاخ پڑی تھی جس سے بدری ساکھا نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میز کی دائیں جانب لکڑی کا ایک کٹہرا کھڑا کر دیا گیا تھا جیسا کچہریوں اور عدالتوں میں ہوتا ہے، جہاں نالش کرنے والا مستغیث اور ملزم اپنا اپنا بیان دیتے ہیں۔ کمرے کو گویا ایک خاص قسم کی عدالت میں تبدیل کر دیا گیا تھا، مگر اس عدالت کی سب سے اونکھی شے بھگوان بدھ کی مورتی تھی جو منصف کے طور پر کرسی پر براجمان تھی اور اسی کو دیکھ کر بدری ساکھا کا پسینہ چھوٹ گیا تھا، میں نے اس صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”بدری ساکھا! یہ کمرہ جہاں تم اس سے کھڑے ہو انصاف کی کچہری ہے اور یہ کچہری بھگوان کے نام پر لگائی جا رہی ہے تم نے بدھ مندر سے حویلی تک میرا پیچھا کیا۔ چوروں کی طرح دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے اور ایک انتہائی خطرناک آلے سے حملہ کر کے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی جس پر انگریزی قانون کے تحت جو اس وقت برما میں لاگو ہے۔ زیر دفعہ 306 تعزیرات برما“ ارادہ قتل اور اقدام قتل کا جرم عائد ہوتا ہے مگر تم ایک بودھ بھگت اور بھکشوؤں، سادھوؤں کا چولہ پہنتے ہو۔ اس لئے پولیس کے حوالہ کرنے کی بجائے تمہیں بھگوان کی کچہری میں پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ تمہارے خلاف کچھ اور بھی دوش ہیں اور بڑے سخت اور سنگین ہیں وہ دوش جن کے بارے میں تمہیں صفائی کا پورا موقع دیا جائے گا۔ اگر تم نے سچ بولا اور عدالت کو مطمئن کر دیا تو بری کر دیئے جاؤ گے دوشی اور مجرم ٹھہرے تو تمہیں وہ سزا بھگتتا ہوگی جس کے خلاف دنیا کی کسی عدالت میں اپیل نہیں ہو سکتی کیونکہ بھگوان کا فیصلہ اور نیائے اٹل ہوتا ہے۔“

بدری ساکھا میرا بیان سن کر حواس باختہ سا ہو گیا۔ وہ ضمیر کی عدالت میں کھڑا تھا اور شاید اس عدالت کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا، پھر میں چان سے مخاطب ہوا۔

”چان! دوشی کے ہاتھوں کی رسی اور منہ پر بندھا ہوا رومال کھول دو، اسے کٹہرے میں کھڑا

”تو صرف اس لئے کہ وہ مہاپاپ نہ ہونے دوں جس سے دھرم کا بھرم ٹوٹ جائے گا، بس اس کے علاوہ میں اپنی صفائی میں نہ کچھ کہنا چاہتا ہوں نہ کچھ سننا چاہتا ہوں۔“

”مجھے وشواس ہے کہ تم نے یہ جرم کسی کے کہنے پر کیا ہے مگر اس معاملے میں چونکہ کچھ مزید کہنا اور سننا نہیں چاہتے اس لئے میں بھی جرح نہیں کروں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے کایا پنتھا کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ ”میری طرح کایا پنتھا بھی تمہیں دوشی ٹھہراتا ہے، اب وہ تم پر الزام لگائے گا۔“

کایا پنتھا نے تبتی مالا کو مخاطب کرنے کی بجائے بھگوان کی مورتی کو مخاطب کیا اور بولا۔

”بھگوان! میں تیری سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ پانچ برس پہلے یہی بدری ساکھا ایک دن میرے پاس آیا اور سارگلیان کی وہ امانت دیکھنے کی خواہش کی جسے میرا باپ کو آن تان کے بودھ مندر سے لایا تھا۔ میں نے ڈبیا اسے دکھا دی اور یہ چلا گیا، اس کے جانے کے تین مہینے بعد ساؤ گاری کا پروہت گنجال ڈبیا تھیا نے آگیا اور جب میں نے اس کی کوئی بات نہ مانی تو اس نے مجھے اغوا کر لیا۔ میری جھوٹی موت کا سوانگ رچایا، میری بیٹی جل پنا اور میرے دوستوں کو اذیت پہنچائی اور مجھے کانگو کی سرحد کے پاس جو تبت سے ملتی ہے ایک ہولناک بندی گھر میں پانچ برس قید رکھا، دنیا پر میرے بہت سے ادھیکار تھے مگر اس ظالم نے میرے تمام ادھیکار چھین لئے اور مجھے جیون کے ہر سکھ سے محروم کر دیا۔ بھگوان میں تیری عدالت میں بدری ساکھا پر دوش لگاتا ہوں کہ میری تمام مصیبتوں کا کارن یہی لاما ہے جس نے گنجال سے مل کر سارگلیان کی امانت ہتھیا نے کی سازش کی۔ اسی وجہ سے مجھے پانچ برس بدترین عذاب بھوگنا پڑا۔ بس یہی ہے میرا دوش اب تو میرا نیا کر۔“

یہ کہہ کر کایا خاموش ہو گیا، مگر میں نے بدری ساکھا میں ایک عجیب تبدیلی دیکھی اس میں پہلی سی گھبراہٹ اور زارشا نہیں تھی، میں نے پوچھا۔

”بدری ساکھا! کیا تم کایا پنتھا کے دوش کو مانتے ہو؟“

”نہیں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”پانچ برس پہلے میں کایا کے پاس سارگلیان کی امانت دیکھنے ضرور آیا تھا، کوئی بھی بودھ گیانی اور بھگشو اس مقدس یادگار کے درشنوں کی آشا ضرور کرے گا، مگر پروہت گنجال نے اس ڈبیا کے لئے کایا کو اغوا کر لیا بندی بنایا تو اس میں میرا کیا دوش۔ میں نہ تو ساؤ گاری کو جانتا ہوں نہ کسی پروہت گنجال کو۔“

یہ سن کر کایا پنتھا ہکا بکا رہ گیا اور ٹکڑ ٹکڑ مجھے دیکھنے لگا جیسے اب اس کے پاس کچھ نہ رہ گیا ہو، میں خود حیران تھا کہ بدری ساکھا اپنی ذات کو اس تکھیڑے سے الگ کیسے کر سکتا ہے، شاید یہ سمجھ پنے دوش سے انکار ہی ہو یہ تھا کہ آدمیوں کے جھگڑے میں پتھر کی مورتی کیا بولے گی۔

”کیا ساؤ گاری اور گنجال سے تمہارا کوئی سمبندھ نہیں؟“

”سمبندھ کیسا۔ نہ میں ساؤ گاری گیا نہ کبھی گنجال سے ملا۔“

”بدری ساکھا! اگر تم اپنا بیان بدلنا یا درست کرنا چاہو تو ابھی موقع ہے، نہیں تو یہی بیان تمہارے خلاف گواہی کے کام آئے گا۔“

وہ ایک پل کے لئے جھجکا پھر سنبھل گیا۔ ”میں جو کچھ کہتا ہوں اسے بدلنے کا عادی نہیں کیونکہ سچی بات بدلی نہیں جاتی۔ تم مجھ پر جھوٹا دوش لگانے والے ہوتے کون ہو؟“

اس نے بیان نہ بدلا۔ اپنا لہجہ بدل دیا، میں نے کہا۔ ”سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے، اس کا فیصلہ بھگوان ہی کرے گا۔“

”مگر تم نے تو بھگوان کو بھی تماشا بنا دیا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں بوڑھے لومڑی کی سی عیاری چمکنے لگی۔ ”اب دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس نائک کانت کیا ہوتا ہے؟“

”اگر تم اسے نائک کہتے ہو تو اس کانت بھی ایک تماشا ہوگا، کیونکہ سچ بولنے کا جو سے دیا گیا تھا وہ تم نے کھو دیا، اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ سچ کیا ہے۔“

وہ طنز بھرے لہجے میں بولا۔ ”کیا میرے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہو؟“

”ہاں کچھ زیادہ ہی جانتا ہو، سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔“

”تم نے پوربی بنگال کے شہر رنگامتی میں رہنے والے بودھ اسکالر چکرورتی سہائے کا نام سنا ہے؟“

”اچانک اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا لہجے کی شوخی رخصت ہو گئی۔ ”ہاں یہ نام سنا ہوا لگتا ہے۔“

”کبھی چکرورتی سہائے سے ملاقات بھی ہوئی۔“

وہ کچھ چونکا پھر سوچ کر کہنے لگا۔ ”اس نام کے آدمی سے شاید ایک بار ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی تھی۔“

”دوسری بار کہاں ملے تھے۔“

”دوسری بار میں اس سے یا وہ مجھ سے نہیں ملا، میں ایک سیلانی بودھ ہوں۔ آج یہاں، کل وہاں بنگال سے نکلا تو پھر لوٹ کے نہیں گیا، نہ دوبارہ چکرورتی کی صورت دیکھی مگر بار بار اس کا نام کیوں لیتے ہو؟“

”اس لئے کہ میں چکرورتی سہائے کا بھتیجا تھا روکی شپ تم سے مخاطب ہوں اور جانتا ہوں کہ تم نے اس کے ساتھ بھی دھوکا کیا تھا۔“

یہ سنتے ہی اس پر جیسے بجلی گری، زبان گنگ ہو گئی اور اسے چپ سی لگ گئی مگر میرے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ تھا اور میں نے کہا کہ ”اب اپنی کہانی مجھ سے سنو بدری ساکھا! تم دوبارہ چکرورتی چا چا سے ملے۔ پہلی بار 1920ء کے درمیان ڈھاکہ میں جب تم نے انہیں مقدس

مورتی کے بارے میں بتایا۔ دوسری بار 1922ء میں جب وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میوزیم کے ریکارڈ کیپر پاسو بابو سے مل کر لوٹ رہے تھے۔ چٹاگانگ کی بندرگاہ پر تمہاری ان سے مدد بھیجی ہو گئی تھی اور تمہیں پتہ چلا کہ وہ مورتی کی تلاش کے قریب پہنچ گئے ہیں، کیا میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔“

مگر بدری ساکھانے کوئی جواب نہ دیا، پھر میں اسے وہ روداد سنانے لگا جو ”مقدس مورتی“ کے مسودے میں پڑھ چکا تھا کہ وہ کس طرح انا تھ بندہ والی مورتی کا کھوج لگاتا ہوا ساؤ گاری پہنچا۔ منگل ساؤ سے ملا اور اسے پتہ چلا کہ وہ مورتی گوچی ساؤ تین صدیاں پہلے ہی برہم پترندی میں کھو بیٹھا تھا، تب منگل ساؤ کے کہنے پر وہ آنند بھکشو والی مورتی کا کھوج لگانے نکلا، وہ چپ چاپ مگر حیران و پریشان سا اپنی آپ بیتی مجھ سے سنتا اور پسینہ پسینہ ہوتا رہا۔ جیسے اس کے اندر کوئی شے پھل رہی ہو۔ جب میں اس کی کہانی بیان کر چکا تو براہ راست اس سے مخاطب ہوا۔

”بدری ساکھا! اب میں تم پر دوش لگاتا ہوں کہ تمہی وہ آدمی ہو جس نے منگل ساؤ کو اس بات کی خبر دی کہ چکرورتی باسو بابو کے ذریعے مورتی تک پہنچ رہے ہیں، جس کے بعد منگل ساؤ ان کے پیچھے لگ گیا اور چٹاگانگ میں نیل گاڑی کا حادثہ پیش آیا جس نے چاچا کی جان لے لی، جب مجھے یہ سب معلوم ہوا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ چاچا کی موت اور ہماری مصیبتوں کے ذمہ دار تم تھے، تمہی وہ آدمی ہو جس کے ذریعے سارگیان کی ڈبیا کا حال گنجال تک پہنچا اور اس نے کایا پنتھا کا پیچھا کیا۔ اس طرح کایا کی تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کا کارن بھی تم ہو۔ تمہارے خلاف میرے پاس ایسی شہادتیں ہیں جن سے تم انکار نہیں کر سکتے، میں چاہتا تو تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتا تھا، مگر تم نے بودھ بھگت ہو کر بھگوان کے اصول توڑے، تنہا گت کے احکام کی نافرمانی کی، اس لئے میں نے تمہیں بھگوان کی عدالت میں پیش کر دیا کہ وہی تمہارے خلاف فیصلہ دے اور ہمارا نیا دیتے رہے کیونکہ اس وہم میں مبتلا ہو کر بھگوان کی مورتی نہیں بولے گی، نہیں بول سکتی۔ حالانکہ عقیدہ یہ رکھتے ہو کہ پتھر سنتے بھی ہیں، بولتے بھی ہیں مگر بدری ساکھا! آج تم ایک چیتکا روکھو گئے، بھگوان کا فیصلہ سنو گے۔“

جب میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور بار بار بھگوان کی مورتی کو دیکھتا تھا جو عدالت کی کرسی پر رکھی تھی، جب میں نے اپنا بیان ختم کیا اور بھگوان سے مخاطب ہوا کہ بھگوان اب ہمارا نیا دیتے کرو، تب بدری ساکھا چلایا۔

”نہیں..... میں بھگوان کا فیصلہ نہیں سنوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی بے سدھ ہو کر دھڑام سے کٹھرے میں گرا۔ کایا موسا اور چان بابا نے اسے اٹھایا، منہ میں پانی ڈالا اور پھر کھڑا کر دیا، اس کا سارا بدن پسینے میں بھیگ گیا اور خوفزدہ نظروں سے کبھی میری طرف کبھی مورتی کی جانب دیکھتا تھا، میں نے پوچھا۔ ”بدری ساکھا! ابھی بھگوان نے فیصلہ نہیں سنایا اور تم خوف سے گر پڑے، جب مورتی بولے گی تب کیا ہوگا؟“ اس نے فریادوں کی طرح دونوں ہاتھ اٹھائے اور رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”بھگوان کو فیصلہ دینے سے روک دو۔“

”کیوں روک دو؟“

”اس لئے کہ میں دوشی ہوں، میں نے جھوٹ بولا اور بھگوان کا فیصلہ میرے خلاف ہوگا۔“ پھر وہ کٹھرے سے نکلا اور بھاگ کر میرے چرنوں میں آگرا۔ ”تھارو کیشپ! میں تمہارا، کایا پنتھا کا مجرم ہوں تم جو چاہو سزا دے لو مگر مجھے بھگوان کی سزا سے بچالو۔ اس سے نیائے نہ مانگو۔“ ”تم بودھ بھگت ہو، یہ بھی نہیں جانتے کہ آدمی کو اپنے کرموں کا پھل بھوگنا پڑتا ہے۔“ ”جی تو بھگوان کے فیصلے سے بھاگ کر تمہارے چرنوں میں آگرا ہوں، تم میرے لئے جو حکم لگاؤ گے بھگت لوں گا پر بھگوان کا قہر مجھے جلا کر رکھ کر دے گا، مجھے اس کے قہر سے بچالو۔“ وہ میرے قدموں میں پڑا رونے، گڑ گڑانے لگا۔ میں نے کندھوں سے پکڑ کے اٹھایا تو آنکھوں سے نیر بہہ رہے تھے اور تھر تھر کانپ رہا تھا، جب بھگوان کے ڈر سے کسی کے آنسو بہتے ہیں تو اس کے من کا میل کٹنے اور دھلنے لگتا ہے۔ شریر کانپتا ہے تو پتہ چلتا ہے اس کے اندر کا آدمی ابھی مرا نہیں، اس نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا۔ بے کل ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور ذوقی آواز میں بولا۔ ”میرا فیصلہ تم کرو پر بھو!“

”اگر فیصلہ مجھ پر چھوڑتے ہو تو پہلے اپنے جرموں کا اقبال کرنا ہوگا۔“

وہ اسی طرح ہاتھ باندھے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور کہنے لگا۔ ”مجھے اقرار ہے جو کچھ میں نے کہا، وہ جھوٹ تھا جو کچھ تم نے کہا وہ سچ ہے، آٹھ برس پہلے میں نے ہی منگل ساؤ کو تمہارے چاچا چکرورتی سہائے کے بارے میں خبر دی تھی کہ وہ کلکتہ کے باسو بابو کے ذریعے مورتی ڈھونڈ رہا ہے، وہ میں ہی تھا جو پانچ برس پہلے پروہت گنجال سے ملا اور اسے سارگیان کی ڈبیا سے آگاہ کیا مگر جب گنجال نے کایا پنتھا کو اپنا بندی بنالیا اور ڈبیا حاصل نہ کر سکا، میں تبت لوٹ گیا چار سال کے بعد پچھلے دنوں کانگٹو کے راستے پھر آسام میں داخل ہوا اور پہاڑی خانقاہ میں گیا تو وہاں پروہت گنجال پہلے سے موجود اور تھاپا بہادر پر گرج برس رہا تھا، اس نے بتایا، تھارو کیشپ نام کا ایک بودھ گیانی کایا اور اس کی بیٹی جل پنا کو بندی گھر سے نکال کر لے گیا ہے۔ اس نے شکر گوان کے پیچھے برما بھیج دیا ہے کہ بھولا کے ساتھ مل کر اپنا کام کرے اور مجھ سے کہا تم بھی

سنگ کا لنگ حکامتی چلے جاؤ کا یا نے پانچ برس تک جس ڈبیا کے لئے قید کائی مگر زبان نہ کھولی اب اسے ضرور نکالے گا تم جا کر ڈبیا کا کھوج لگانے اور اسے اڑانے کی کوشش کرو۔ گنجال کی ہدایت کے مطابق میں آج ہی یہاں پہنچا اور ابھی کا یا سے مل نہ پایا تھا کہ مندر میں تم مل گئے، یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ ڈبیا تم حاصل کر چکے ہو اور اسے کھولنے والے ہو، اب مجھے کا یا کی بجائے تمہاری چٹا تھی پھر تمہارے پیچھے پیچھے مندر سے نکلا اور حویلی تک آ گیا مگر یہاں دعوت کا ہنگامہ تھا اور میں لوگوں کے سامنے اندر آنا نہ چاہتا تھا در نہ سادھو، بھکشو جو بھوجن کرنے آئے تھے مجھے گھیر لیتے اور میں اپنا کام نہ کر سکتا، اس لئے حویلی کے پچھواڑے پہنچ کر دیوار پھاندنے ہی والا تھا کہ تم بھی پچھواڑے کے صحن میں آتے دکھائی دیے، میں وہیں دھک گیا اور جب تم ایک کمرے میں گھس گئے تو تھوڑی دیر کے بعد مجھے بھی صحن میں کودنے اور حملہ کرنے کا موقع مل گیا میرا خیال تھا کہ تمہیں گھائل کر کے سارگلیان کی ڈبیا لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر جیت تمہاری ہوئی اور میں ہار گیا، یہ ہے میرا دوش، یہ ہے میرا پاپ، اب میں تمہارے فیصلے کا منظر ہوں کہ میرے لئے کیا سزا تجویز کرتے ہو۔“

میں نے، کا یا پتھانے، چان بابا نے اس کا اقبال جرم سنا۔ اسے بھگوان کے انصاف سے ڈرتے، روتے کانپتے دیکھا۔ وہ دونوں بودھ بھگت کی کتھاسن کر دنگ رہ گئے اور اسے کرودھ کی نظروں سے دیکھنے لگے مگر فیصلہ تو مجھے کرنا تھا، کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ”بدری سا کھا! تنھا گت کہتا ہے جو آدمی سزا کا مستحق ہے، اسے سزا دو مگر دوشی اپنے من میں سزا دینے والے کے لئے دشمنی کے بھاؤ کو جگہ نہ دے کیونکہ سزا تو اسے اپنے جرم کے کارن ملتی ہے کیا اسے مانتے ہو؟“

”بے شک تنھا گت نے جنرل سنگھ کو یہی اپدیش دیا تھا۔“

”مگر تنھا گت یہ بھی کہتا ہے کہ جو آدمی دیا کے لائق ہے، اس پر دیا کرو۔“ یہ کہہ کر میں ایک پل خاموش ہو گیا، پھر بولا۔ ”اب تین صورتیں ہیں نمبر ایک، آدمی اپنے کرموں کا پھل بھوگتا ہے، جرم کرتا ہے تو اس کی سزا پاتا ہے، نمبر دو، گناہ گار اپنے پاپ کا پرانچیت کرے، کفارہ بھرے، نمبر تین، آدمی سچے من سے توبہ کرے سچائی کی راہ پر چلے اور دوسروں کے دکھ درد بانٹے، تنھا گت کہتا ہے یہی سکھ چین اور نروان کا راستہ ہے جو بھگوان سے ڈرتا ہے وہ راستی سے نہیں بھگتا، بدری سا کھا! تم نے اپنا فیصلہ مجھ پر چھوڑا ہے تو یہ ہے میرا فیصلہ کہ میں تم پر دیا کرتا ہوں، تمہارے لئے پرانچیت اور توبہ کا دوار کھلا رکھتا اور ایک شرط پر تمہیں چھوڑتا ہوں کہ.....“

یہ سنتے ہی وہ بے اختیار پھر میرے چرنوں میں گر گیا، میں نے اسے پھر اٹھایا۔ ”بار بار

میرے چرنوں میں کیوں گرتے ہو تم عمر میں مجھ سے بڑے ہو۔“

”میں عمر میں بڑا ہوں مگر تم گیان اور دیا میں بڑے ہو پر بھو۔“

”بڑا صرف بھگوان ہے، جس پر مجھے وشواس ہے مگر یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم مجھے ”پر بھو“ کہو کیونکہ شاکیہ منی بدھ نے ہمیں یہی سکھشادی ہے کہ تم بڑے کو پر بھو اور چھوٹے کو بندھو کہو۔ اگر تم بندھو کہو گے تو مجھے برا نہیں لگے گا۔“

”تم دھن ہو تھارو کیشپ۔“

”اب شرط سنو اور یہ ہے میری شرط کہ آئندہ تم پر وہت گنجال سے کوئی سمبندھ نہیں رکھو گے اور مقدس مورتی کی تلاش میں میری مدد کرو گے۔“

اتنی آسان مگر عجیب سی شرط سن کر وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ ”کیا تم بھی مقدس مورتی کے کھوج میں ہو؟“

”اگر مورتی کے کھوج میں نہ ہوتا تو سارگلیان کی ڈبیا کیوں کھولتا، مورتی کی تلاش میرے جیون کا آدرش بن چکی ہے۔“

”پھر ہم دونوں کا آدرش ایک ہے۔“

ایک لخت وہ بھگوان کی اس قد آدم مورتی کی طرف گھوم گیا جو عدالت کی کرسی پر رکھی تھی اور بولا۔

”میں بھگوان کے انصاف سے ڈر گیا تھا اور اب اس کی مورتی کے سامنے وچن دیتا ہوں کہ آج سے تمہارا داس اور تمہاری مرضی کا پابند ہوں۔“

”اب تم بری ہو بدری سا کھا مگر اس مورتی کے سامنے جس سے تم ڈر گئے تھے میں بھی تمہیں گیان کی ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔“

وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”اور وہ گیان یہ ہے کہ پتھر نہ سنتے ہیں نہ بولتے، نہ فیصلہ دیتے ہیں آدمی کا اپنا من بولتا اور فیصلہ دیتا ہے، یہی بھگوان کا نیا ہے۔“

یہ سن کر بدری سا کھا حیرت کے مارے پتھر سا ہو گیا، مگر ہولے ہولے اس پتھر میں ایک نیا جیون دوڑنے لگا اور وہ اس آدمی کی طرح جو ابھی ابھی گیان کی گپھا سے نکل کر آیا ہو بولا۔ ”یہ سچائی مجھے آج معلوم ہوئی کہ بھگوان پتھر کے بدن نہیں آدمی کے من میں رہتا ہے اور دلوں کے تخت پر بیٹھ کر سنتا، بولتا اور نیا کرتا ہے۔“

وہ میرے سامنے جھک گیا اور اس نے یہ گیان قبول کر لیا، ٹھیک اسی سے پوس میں کسی مرغ نے بانگ دی اور ہم سب چونک گئے، باہر لو پھٹ رہی تھی۔

کامتی سے رخصت ہو گیا۔ لیکن جانے سے پہلے بڑے مندر کے مہارپروہت جیو کا کوتا کید کر گیا کہ مندر میں کایا پنتھا کے جیون اور میرے گیان کے نام پر دیے ضرور جلائے، اس طرح بتی لاما اچانک مجھ سے ٹکرایا اور ایک اکی چلا گیا، میں نے ایک ہی رات میں اس کے مقدمے کا فیصلہ کر دیا اور اسے ایک نیا گیان عطا کیا۔

کایا پنتھا کے ساتھ برما آنے کا سب سے بڑا مقصد سارگیان کی امانت حاصل کرنا تھا مگر یہ امانت پالینے کے علاوہ میں نے گنجال کے کچھ کارآمد ہاتھ کاٹ دیئے تھے اور اب جلد از جلد اس کے تعاقب میں نکل جانا چاہتا تھا، یہ بھی بتاتا چلوں کہ شکر اور بھولا کے چالان عدالت میں پیش کر دیئے گئے ان مقدمات میں سرکار خود مدعی تھی، کایا پنتھا گواہ کے طور پر عدالت میں حاضر ہوا اور اپنا مفصل بیان ریکارڈ کرایا۔ شکر اور بھولا کے خلاف بعض تحریری ثبوت پہلے ہی پولیس کے سپرد کر دیئے گئے تھے، کایا کے ساتھ چان کی بھی گواہی ہوئی، کایا نے عدالت میں اس مضمون کی عرضی بھی داخل کر دی کہ وہ ایک ضروری کام کی خاطر کچھ عرصے کے لئے برما سے باہر جانا چاہتا ہے اس لئے عدم موجودگی میں اس کا وکیل عدالت میں حاضر ہوا کرے گا، عدالت نے عرضی منظور کر لی۔

ان کاموں سے نمٹ کر ہم ساؤ گاری کی طرف کوچ کی تیاریاں کرنے لگے کیونکہ ہمارا اصل مقدمہ تو پروہت گنجال کے خلاف تھا مگر بوڑھا چان اس بات پر راضی نہ تھا کہ ہم اس طرح ایک خطرناک دشمن کے پیچھے جائیں، اس نے کہا۔ ”گنجال کے چیلے چانٹے بہت ہیں، آپ بھی کچھ آدمی اپنے ہمراہ لے جائیں۔“

”کیا سفر کے لئے اب میں آدمی بھرتی کرتا پھروں گا؟“ کایا نے پوچھا۔

”بھرتی کرنے کو کون کہتا ہے، کیا ہم لوگ مر گئے ہیں۔“

”تم کہاں بھٹکتے پھرو گے ہمارے ساتھ۔“

”مگر میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گا۔“

چان کا اصرار تھا، کم سے کم پانچ آدمی ضرور ساتھ جائیں وہ خود تو کسی صورت رکنے پر تیار نہ تھا، آخر یہی فیصلہ کیا کہ صرف چان ہمارے ساتھ جائے گا، وہ ایک جہاندیدہ تجربہ کار اور اچھا نشانی بھی تھا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ برما اور آسام کے درمیان ناگاپربتوں اور جنگلوں کے راستوں سے واقف تھا اور ہم ناگاپربتوں سے گزر کر کوہیما جانا چاہتے تھے جہاں سے دیمو پور کے لئے لاری مل سکتی تھی۔

کایا نے ایک دن اپنے تمام کسانوں اور نوکروں کو حویلی میں اکٹھا کیا۔ زمینداری کا سارا

(29)

نیا نیا

برما کی طرف کرنے سے پہلے ایک رات میں نے رنگامتی میں بھگوان کے انصاف کے متعلق سوچا تو دل میں ٹھان لی تھی کہ یکسر بدل جاؤں گا اور ایک بدھ گیانی محقق آثار اور پریکشی کا جامہ اتار کر ایک عادل منصف اور جج کا چولہ پہن لوں گا۔ نرم دلی، رحم اور دیا کو چھوڑ کر عدل، انصاف اور نیائے کی خاطر اپنے ذہن کو مضبوط اور دل کو سخت کر لوں گا، مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ جہاں تک میرے ساتھ ہونے والے کسی جرم یا ظلم کا واسطہ تھا، میں نے اپنے کسی دوستی کو سزا نہیں دی بلکہ سب کے ساتھ نرم دلی اور دیا کا برتاؤ کیا چنانچہ چند رگونا کے بھکاری سادھو (جس نے تھان مانا کے تہوار پر مجھے خنجر سے مارنے کی کوشش کی) اور اس کے ساتھی پروہت پجاریوں کو بھی معاف کر دیا تھا جس پر وہ میرے ساتھی اور ہمدرد بن گئے، البتہ میں نے شکر اور بھولا جیسے مجرموں کو قانون کے حوالے کر دیا جو کایا پنتھا کی طویل اسیری کا ذریعہ بنے اور گنجال کے اشارے پر پھر کوئی ناک کھیلنے والے تھے۔

میں یہی عہد کر کے چلا تھا کہ جہاں انسان کا بنایا ہوا قانون لاگو ہے، وہاں مجرموں کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کروں گا اور جہاں انسان کا نہیں صرف بھگوان کا قانون چلتا ہے۔ وہاں اسی قانون کے تحت انصاف کی کچھری لگاؤں گا، مگر بدری ساکھا کو میں نے انسانی قانون کی بجائے بھگوان کی عدالت میں پیش کرنا ضروری سمجھا وہ دشمن بن کر آیا تھا، دوست بن کر لوٹا۔ اس نے میرے ساتھ کچھ وعدے کئے اور مجھے وشواس تھا کہ وہ ان پر قائم رہے گا، وہ جانتا تھا میرے چاچا چکرورتی کلکتہ سے نقلی مورتی لے کر آئے تھے مگر اصل مورتی کا کھوج لگانے کے لئے، ایک بار پھر اس کے من میں چٹا گانگ کے رستے کلکتہ جانے کی دھن سمائی تھی، میں نے کہا۔

”بدری ساکھا! اس سفر میں اگر کسی ایسے گیانی اور ودھوان کو ڈھونڈ سکو جو قدیم پالی بھاشا پڑھ سکے تو مجھے ضرور خبر کرنا۔“

وہ سمجھ گیا تھا، مجھے ایسے ودھوان کی تلاش کیوں ہے، اس نے وعدہ کیا کہ وہ ہندوستان کی قدیم زبان کے کسی ماہر کو ضرور ڈھونڈ نکالے گا اور مجھے چٹھی لکھے گا، میں نے اسے شکر اور بھولا کی گرفتاری کے بارے میں بھی بتا دیا تھا مگر بدری ساکھا کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ اسی دن

کرتر بتر ہو گئے۔

ناگا پرتوں کا سلسلہ نو دس ہزار فٹ اونچا ہے۔ گھنے، سرسبز جنگل اس علاقے کی دولت ہیں۔ ہم مسلسل سفر کرتے تیسرے دن شام کو کوہیما پہنچ گئے۔ کوہیما جو اس علاقے کا صدر مقام اور دیہور پورا مپھال روڈ پر واقع ہے۔ ایک تجارتی شہر اور ذرا کم بلندی پر ہے، اس کے دھن میں منی پور کی ریاست اور اتری پچھم میں دیہور پور ہے۔ کوہیما پہنچ کر ایک سرائے میں قیام کیا اور رات کو ایسے بے سدھ ہو کر سوئے کہ دن چڑھ جاکے۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میں نے کوچ کا نقارہ بجا دیا کیونکہ پندرہ تاریخ کو ہمیں دیہور پور ریلوے اسٹیشن پر ویشال رائے سے ملنا تھا اور آج پندرہ تاریخ تھی۔ امپھال دیہور پور شاہراہ پر لاریاں چلتی ہیں۔ سرائے سے نکل کر اڈے پر آئے تو دیہور پور جانے والی لاری مل گئی۔

میں اس بات پر حیران تھا کہ تبتی لامانے سارگلیان کی ڈبیا میں بند کلید اسرار کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھا، جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی حالانکہ اس کو اڑالے جانے کے لئے بدری سا کھانے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ سوچا شاید وہ مجھ سے بہت زیادہ مرعوب ہو گیا یا پھر سمجھ گیا تھا کہ ڈبیا سے پالی بھاشا میں کوئی تحریر برآمد ہوئی ہے جسے میں پڑھ نہ سکا اور پرانی زبانوں کے کسی ودھوان کا محتاج ہوں۔

میں نے سونے کی خالی ڈبیا تو کوٹ کی جیب میں رکھ لی اور اس کی چرمی تحریر ایک تعویذ کی طرح بازو سے باندھ لی تھی، یہی چرمی تحریر کلید اسرار تھی جس سے مقدس مورتی کے جیون بھید کا تالہ کھل سکتا تھا، کوہیما سے دیہور پور کی طرف سفر کرتے ہوئے میرا ذہن بار بار اس چرمی تحریر کی طرف چلا جاتا اور میں سوچنے لگتا کہ قدیم پالی زبان پڑھنے والا ماہر کہاں سے ملے گا؟

برٹش میوزیم لندن میں مختلف ملکوں کی پرانی زبانیں پڑھنے والے ماہرین موجود تھے جنہوں نے مصر و بابل کی ہیر و غلانی اور خط میخی کی تحریریں بھی پڑھ لیں اور اس سے قدیم انسانی تہذیبوں کے حالات معلوم کر لئے تھے یقیناً وہ ہندوستان کی متروک پالی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے مگر میں نہیں چاہتا تھا کوئی انگریز سارگلیان کی کلید اسرار کو پڑھے اور مقدس مورتی کے جیون بھید سے آگاہ ہو، یوں تو بدھ دھرم تبت، نیپال، برما اور ہند چین سے جاپان، چین، کوریا، منچوریا اور منگولیا تک پھیلا تھا اور ہر دیس میں وہی پرانے گرنٹھ بودھ تعلیم کے ماخذ تھے جو ہندوستان کی قدیم پالی زبان میں لکھے گئے مگر میں نہیں جانتا تھا کہ بودھ گیارہویں میں پالی زبان کے پڑھنے والے موجود ہیں یا نہیں۔

مورتی کے بھید کی کلید میرے پاس تھی مگر اب مسئلہ صرف اس ”حرف طلسم“ کو پڑھنے کا تھا میں لاری میں بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ اچانک خیال آیا کہ گنجال سارگلیان کی ڈبیا حاصل کر لیتا تو

دھند چان کے بیٹے اور ایک بوڑھے کسان کے سپرد کیا اور بتایا کہ وہ اپنے دشمنوں کی تلاش میں جارہا ہے، کسانوں میں ایک سنسنی پھیل گئی مگر چان نے بتایا ”پروہت گنجال کے علاقے میں قانون کی حکمرانی نہیں، ہم وہاں شکار کھیلنے جا رہے ہیں۔“

کسان شکار کاسن کر مطمئن ہو گئے، بعد میں پتہ چلا چان اس معاملے میں بڑا خوش نصیب اور قسمت کا دھنی ہے جب وہ شکار کا نام لیتا ہے لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا نشانہ خطا نہیں ہوگا۔ بارہ تاریخ کو کایا اور چان نے مختصر سا سامان باندھا، کارتوس ڈبوں میں بند کئے اپنی بندوقیں اٹھائیں اور سہ پہر کے وقت ہم حکامتی کو خیر باد کہہ کر دریائے چن ون کے گھاٹ پر پہنچے، کشتی پر دریا پار کیا اور پچھم کی طرف ہو لئے۔ سہ پہر کو سفر اس لئے کیا تھا کہ رات کو سرحد پار کر سکیں۔ بوڑھا چان ایک ایسی جگہ سے واقف تھا، جہاں سے گزر کر ہم ہندوستان میں داخل ہو سکتے تھے۔

پہلے بھی کہیں بتا آیا ہوں کہ آسام کے ناگا قبائل اجنبی لوگوں کو اپنے علاقے میں گھسنے نہیں دیتے بعض اوقات انہیں لوٹ لیتے اور زخمی کر کے پھینک جاتے ہیں ان کے اپنے رواج، اپنے دستور ہیں اور انگریزی سرکار بھی مداخلت نہیں کرتی۔ چان کی رہنمائی میں رات ہوتے ہی ہم نے سرحد عبور کر لی اور اس راستے سے آگے بڑھے جو قبائلی بستیوں سے دور گزرتا تھا تاکہ ہم کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ چان اس راستے سے پہلے بھی کوہیما کا سفر کر چکا تھا۔ بستیوں سے دور ناگا پرتوں کی وادیوں، گھاٹیوں اور ڈھلانوں پر پھیلے جنگلوں میں درندوں کا خطرہ تھا، خاص طور پر اس علاقے کا چترا، سندربن کے راکل ٹائیگر سے کم خطرناک نہیں، پھر ریچھ، سور، بندر بھی بہت ہیں مگر ایک تو ہمارا برمی رہبر چان بڑا ہوشیار اور چست چالاک تھا، دوسرے ہمارے پاس دو بندوقیں تھیں ہم بے خوف آگے بڑھتے رہے۔

آکاش پر چاند روشن تھا اور اس کی روشنی میں ہم ارد گرد بخوبی دیکھ سکتے تھے، پھر بھی ان پرتوں اور جنگلوں کا سفر آسان نہ تھا چان نے راستہ بھی ایسا اختیار کیا جو کھٹن اور دشوار گزار تھا تاکہ کسی قبیلے سے ٹکبھیڑ نہ ہو سکے، چان کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی مگر اس سفر میں ہم دونوں سے زیادہ باہمت ثابت ہوا۔ اسے ہمراہی بنا کر ہم نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

رات کا پہلا پہر ختم ہوا تو چان ہمیں ایک گھاٹی میں لے اترے اور وہیں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا، ہم باری باری جاگتے سوتے رہے دن کے اجالے میں سفر پھر شروع ہوا، ابھی ہمیں ان جنگلوں سے گزرنا تھا جہاں درندوں کا خطرہ تھا مگر سفر میں اس کے سوا اور کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا کہ جنگلوں میں ہمیں سینکڑوں بندروں نے گھیر لیا اور انہیں بھگانے کے لئے دو فار کرنے پڑے۔ بھوکے بندر شاید ہمارے تھیلے اور خوراک لوٹنا چاہتے تھے مگر بندوق کے دھماکوں سے ڈر

اس کی تحریر کہاں سے کس سے پڑھواتا؟

ذہن اگرچہ فوری طور پر جواب نہ دے سکا مگر اب میں اس خیال کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ پروہت گنجال ضرور کسی ایسے آدمی کو جانتا ہوگا اور میں اس کے وسیلے پالی زبان کے کسی ماہر تک پہنچ سکتا ہوں۔ یہ خیال عجیب بھی تھا، خطرناک بھی اور شاید بے کار بھی، کیونکہ گنجال کو مہلت دینا خود ہمارے لئے اچھا نہ تھا، میں اس خیال کو اپنے ذہن سے نکالنے اور یہ سوچنے میں کھو گیا کہ پروہت گنجال کے حلقے میں ایسا کون سا آدمی ہو سکتا ہے جو چرمی تحریر کا معاملہ کر سکے، کیا مانڈ لے کے ناچ آشرم کا گورو آبنی یا پہاڑی خانقاہ کا پراسرار پجاری پٹاما؟

ابھی انہی وچاروں میں گم تھا کہ لاری دیمو پور پہنچ گئی اور لاری سے اترتے ہی ہم نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا، میں نے وشال رائے سے پندرہ تاریخ کو دیمو پور کے اسٹیشن پر ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا اور کایا کو بھی بتا دیا تھا کہ وشال اپنے دوست تھیوں کالی ناتھ اور کریم کے ہمراہ ہمارے ساتھ ساؤ گاری جائے گا، ادھر ہم پلیٹ فارم پر پہنچے ادھر پوربی بنگال سے آنے والی ٹرین پہنچ گئی مگر دیمو پور اترنے والے مسافروں میں وشال رائے دکھائی نہ دیا، ہم نے ٹرین کے سارے ڈبے دیکھ لئے اور پوری گاڑی کو کھنگال ڈالا لیکن پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ گاڑی وسل بجانی آگے روانہ ہوئی، اسٹیشن ماسٹر سے پتہ چلا کہ اب پوربی بنگال سے کل دن کے گیارہ بجے ٹرین آئے گی ہم یہ سوچتے ہوئے پلیٹ فارم سے نکلے کہ شاید وشال رائے چٹا گانگ بروقت نہ پہنچ سکا اور آسام آنے والی گاڑی چھوٹ گئی ہو، بہر حال ہمیں کال تک اس کا انتظار کرنا تھا۔ کایا پتہ بھی اس سے ملنے کو بے چین اور اس کے بغیر آگے نہ جانا چاہتا تھا۔ ابھی ہم ریلوے اسٹیشن سے نکل رہے کہ میں وشال رائے کو اسٹیشن کی طرف بڑھتے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ دو بنگالیوں کے ساتھ بھاگم بھاگ چلا آتا تھا اور مجھے دیکھ کر دور ہی سے چلایا۔

”ارے کیشپ بابو! شتا کرنا اپنے کو اسٹیشن پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی۔“

وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا، میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”وشال رائے! تم اس ٹرین سے تو نہیں اترے۔“

”اپن تو تمہارے کو لینے ہوٹل سے آرہے ہیں مگر وہ ہوٹل کا حرامی بابو میرے کو بولا کہ بنگال سے دوسری ٹرین ساڑھے چار بجے آئے گی جہی اپنے کو کچھ دیری ہو گئی۔“

”مگر ہم بنگال سے نہیں برما سے آرہے ہیں اور برما سے کوئی ٹرین ادھر نہیں آتی۔“

”یہ تو میرے کو معلوم ہے مگر تم نے ریلوے اسٹیشن پر ملنے کو بولا تھا اس واسطے ہم لوگ گاڑی کا وسل سن کر بھاگے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”اپنے کو آئے تو پانچ گھنٹے ہو گئے، یہ کالی ناتھ اور کریم

بھائی ساتھ تھے نا صبح گیارہ بجے کی ٹرین سے پہنچ گئے اور ہوٹل میں کمرہ لے لیا، کالی ناتھ بولتا تھا

سفر میں کسی کو ملنا ہو تو پہلے پہنچنا اچھا ہوتا ہے۔“

”چلو اچھا ہوا تم لوگ پہلے پہنچ گئے اب کایا پتہ سے ملو۔“

میں نے کایا کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بے اختیار لپٹ گئے۔ کایا پتہ وشال رائے کی بہن روپ تارا کی دردناک کہانی اور منجوری کے ساتھ میری سگائی کا قصہ سن چکا تھا۔ اسی طرح وشال رائے بھی کایا اور جل پنا کی پتا کا حال جانتا اور اس سے میرے رشتے ناتے سے آگاہ تھا۔ دونوں ایک ہی آدمی کے ظلم کا شکار ہوئے اور قدرت نے میرے ذریعے انہیں ملا دیا، میں ان کے ملاپ کا نقطہ تھا۔ دونوں یوں ملے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ وشال کہنے لگا۔

”کایا بھائی! کیشپ بابو نے میرے کو تمہارے بارے میں سب کچھ بول دیا تھا، جل پنا بیٹی کا بھی بول دیا تھا۔ تمہاری قید کا سن کر میرے کو بڑا دکھ ہوا۔ آنکھیں رو پڑیں۔ بس اور کیا بولوں۔“ اور یہ کہتے کہتے وشال رائے کا لہجہ سچ سچ گلو گیر ہو گیا۔ آنکھوں میں پانی تیر گیا۔ کایا اس کی دلی کیفیت کو سمجھ گیا اور غمگین آواز میں بولا۔

”وشال بھیا! میں نے بھی روپ تارا کی موت کا سنا تو دل پکڑ کے بیٹھ گیا، ہم دونوں ایک ہی سانپ کے ڈسے ہوئے ہیں۔“

”مگر کیشپ بابو نے سانپ کی بانہی کو ڈھونڈ لیا ہے اور اب اس کا سر کچل دیا جائے گا۔“ وہیں چان بابا کا کریم اور کالی ناتھ سے تعارف کر دیا گیا۔ چان برمی کے سوا اور کوئی زبان نہ جانتا تھا مگر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑے خلوص سے ملا کیونکہ سب کی منزل ایک تھی، مقصد سفر بھی ایک تھا۔

اسٹیشن سے نکل کر ہم اس ہوٹل میں آئے جہاں وشال رائے ٹھہرا تھا اور وہیں ٹھہر گئے۔

سیاح اور شکاری ادھر آتے جاتے رہتے ہیں، ہم نے بھی خود کو شکاری ظاہر کیا اور رات کا کھانا کھانے کے بعد میں انہیں سفر کا نقشہ بتانے لگا۔

”سویرے ہم دیمو پور سے ناؤ گونگ جانے والی ٹرین پر سوار ہو کر سیل گھاٹ جائیں گے اور کشتی کے ذریعے دریائے برہم پتر کے شمالی ساحل پر اتریں گے وہاں سے شمال کے رخ کا ٹکٹو کی پہاڑی خانقاہ کی طرف سفر کریں گے۔“

”خانقاہ کا سفر کیوں کرتے ہو کیشپ بابو! اپنے کو سیدھا ساؤ گاری لے چلو نا، پہلے سانپ کو مارو پھر آگے کو بڑھو۔“

”میرا چار کچھ اور ہے وشال جی۔“

”تو اپنے کو بول دو نا کیا وچار ہے؟“

نے مجھے اور مدایا بھکشو کو ٹھہرایا تھا۔

اب کے ہمیں خانقاہ میں اترنے کی بجائے تھا پابہادر کے گھر دھاوا بولنا تھا اور کایا پنتھا جانتا تھا کہ اس کا گھر بالکل خانقاہ سے ملا ہوا ہے، اس کے دروازے تک پہنچنے کے لئے گلی سے گزرنا ضروری تھا جس کی دونوں طرف پتھر کے گھر وندوں میں خانقاہ کے پہرے دار قبائلی رہتے تھے کچھ پہرے دار پٹاما پجاری کی طرح خانقاہ کے اندر ہی رہتے تھے مگر گلی سے گزر کر تھا پابہادر کے مکان پر دھاوا بولنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

اس چھوٹی سی قبائلی بستی میں گنتی کے دس بارہ گھر وندے تھے جن میں عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی تعداد سولہ سترہ سے زیادہ نہ تھی مگر وہ سولہ سترہ خونخوار بھیڑیوں کے غول سے کم نہ تھے جن کا کام ہی خانقاہ کی دیکھ بھال کرنا اور تھا پابہادر کا ہر حکم بجالانا تھا۔ ان لوگوں سے نمٹنے کے لئے سوچ پجاری کی ضرورت تھی۔

اپنا سفری بھوجن کر کے ہم نے معاملے کی صورت پر غور کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ آدھی رات کے بعد جب بستی والے گہری نیند میں ہوں گے سردار تھا پابہادر کے گھر چھاپا مارا جائے، ہمارے پاس تین بندوقیں تھیں اور انہیں تین بندوقوں کے ساتھ ہمیں پندرہ سولہ بھیڑیوں کی گلی میں گھسنا تھا۔ تھا پابہادر کی بندوق میں خود دیکھ چکا تھا مگر یہ بات کایا پنتھا کو بھی معلوم نہ تھی کہ بستی میں کتنے لوگوں کے پاس آتشیں اسلحہ ہے میرے اپنے پاس ایک خنجر کے سوا اور کچھ نہ تھا میں تو صرف بھگوان کے بھروسے اس مہم پر نکلا اور یہی بھروسہ میرا اصل ہتھیار تھا۔

گیارہ بارہ بجے کے درمیان صورتحال کا جائزہ لینے باہر نکلا تو دور دور تک کوئی آواز، کوئی آہٹ نہ تھی، قبائلی بستی پر بتوں کے گہرے سناٹوں کی گود میں سر رکھے چپ چاپ لیٹی تھی۔ چاند نکل آیا تھا اور چاندنی پہاڑوں، گھاٹیوں، بستی کے گھر وندوں، خانقاہ اور چراگاہ میں دھوپ چھاؤں کا منظر پیش کر رہی تھی، گہری کھائی کی جانب خانقاہ کی عقبی دیوار کے ایک موکھے سے آج بھی مدھم سی روشنی نظر آتی تھی، معلوم نہیں اس کے بندی گھر میں کوئی قیدی بھی تھا یا روشنی اس کمرے میں کی گئی تھی جہاں بھگوان بدھ اور اندر دیوتا کے مجسمے ایستادہ تھے یا یہ وہ کمرہ تھا جہاں شروع شروع میں جل پنا کور کھا گیا تھا۔

میں کھائی پر ایک نظر ڈال کر مڑا اور بے کواڑ گھر وندے کے دھن میں پہاڑی ٹیلے اور چراگاہ کے درمیان دے پناؤں چلتا بستی کی سمت بڑھا کریم اپنی کلباڑی لے کر چپکے سے میرے پیچھے ہولیا تھا، ہم دونوں آگے پیچھے ٹیلے کی چھاؤں میں چلتے اصطبل کے پچھواڑے پہنچ گئے قریب ہی بھیڑ بکریوں کا باڑہ تھا جس کی ایک جانب چند بلیاں گاڑ کر چوبلی چھت ڈال دی گئی تھی تاکہ برفباری کے دنوں میں بھیڑ بکریاں محفوظ رہیں۔ باڑے اور اصطبل کی اتری جانب چند

”میں سانپ کو باہنی تک پہنچنے والی راہیں اور باہنیں کاٹ دینا چاہتا ہوں۔“

”پرسیا نے بولتے ہیں، پہلے سانپ کو مارو، اس کے بچوں کی چننا بعد میں کرو۔“

”تم نے ابھی تک سانپ کے بچوں کو نہیں دیکھا، وشال جی۔ نہیں تو پہلے انہی کو مارنے کی چننا کرتے۔ میں پہاڑی خانقاہ میں اس لئے جانا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے ایک ساتھی کو وہیں چھوڑ آئے تھے۔“

”کون سا ساتھی؟“

”مدایا بھکشو، جس نے جل پنا کو بچانے کے لئے اپنی جان داؤ پر لگا دی جس نے سات برس پہلے تمہاری بہن روپ تارا کی خاطر گنجال سے جھگڑا کیا تھا۔“

”تم نے میرے کو پہلے کبھی مدایا بھکشو کا نہیں بولا تھا۔“

پہلے مجھے بھی اس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا مگر اب اتنا جانتا ہوں کہ پرلوک میں روپ تارا کی آتما اس کے لئے بے چین ہوگی۔

”اگر تم ایسا بولتے ہو تو ایسا ہی ہوگا، میرے کو تم پر پورا دوش اس ہے۔“

”کیشپ ٹھیک کہتا ہے وشال بھیا۔“ کایا پنتھا نے میری تاکید ضروری سمجھی۔ ”مجھے بھی

مدایا بھکشو کی بڑی چننا ہے، نہ جانے ہمارے بعد تھا پابہادر اور گنجال نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہوگا؟“

”ٹھیک ہے کیشپ بابو! تمہارے کو جو اچھا لگے وہی کرو۔“

سب نے اس خیال کو پسند کیا کہ ساؤ گاری کی بجائے ہمیں پہلے کانگٹو کی طرف سفر کرنا چاہیے چنانچہ دوسرے دن ہم ناؤ گونگ کے رستے سیل گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ شہر دریائے برہم پتر کے جنوبی ساحل پر واقع ہے مگر ایک تو گاڑی لیٹ ہو گئی دوسرے ناؤ گونگ سے آگے ریل کی پٹری پر مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ ٹرین بڑی مدھم رفتار سے چلتی رہی اور ہم شام کو سیل گھاٹ پہنچے۔ رات وہیں قیام کیا اگلے دن دریائے برہم پتر کے چوڑے پاٹ کو عبور کر کے شمالی ساحل پر اترے اور کانگٹو کا رخ کیا۔ اس سفر کے لئے میں نے جو راستہ اختیار کیا وہ سیدھا کانگٹو کی طرف نکلتا تھا، میں اپنے قارئین کو سفر کی تفصیلات میں الجھانا نہیں چاہتا اور قصہ مختصر کر کے آگے بڑھتا ہوں تیسرے دن ہم کانگٹو کے اونچے پر بتوں کے حاشیوں پر چلتے شام کے قریب خانقاہ کی پہاڑیوں میں پہنچ گئے۔

ایک گھائی کے درمیان رک کر ہم نے اندھیرا اترنے کا انتظار کیا، پھر اس اندھیرے میں آگے پیچھے چلتے چراگاہ سے گزرے اور بے کواڑ کے اس گھر وندے میں داخل ہوئے جہاں باگی

کے نکلے پر بیٹھیں گے۔ وصال رائے خانقاہ کے دروازے پر پہرے دے گا صرف میں اور کایا سردار تھاپا کے گھر میں داخل ہوں گے مگر اس پروگرام پر عمل کرنے کے لئے ہمیں مزید ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تا کہ کتے کی آواز سن کر اگر کوئی قبائلی جاگ گیا تھا تو پھر سو جائے۔



رات کا ایک بج رہا تھا، جب ہم پوری تیاری کر کے نکلے۔ کریم تو ٹیلے کے ساتھ ساتھ اصطبل کی طرف ہولیا اور ہم سب چراگاہ سے گزر کر گلی میں داخل ہوئے مگر باڑے کے کتے نے شاید ہمیں پھر دیکھ لیا وہ بھونکنے لگا اور کریم نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا چان اور کالی ناتھ کو نکلے پر چھوڑ کر ہم تیزی سے گلی میں گھس گئے یہاں ایک اور مصیبت دوسرے کتے کی شکل میں ہمارا انتظار کر رہی تھی جو وصال رائے پر لپکا اور بندوق کا بٹ کھا کر بھونکتا ہوا اصطبل میں پھلانگ گیا اور باڑے کا رکھوالا بھی بھونک رہا تھا مگر اس اثناء میں وصال رائے خانقاہ کے سامنے اور میں اور کایا تھاپا بہادر کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔

ابھی ہم اندر جانے کی سوچ رہے تھے کہ اندر کھٹکا ہوا شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ کتے کیوں بھونک رہے ہیں، کوئی دروازے کی طرف آ رہا تھا، دوسرے لمحے کو اڑ کھلے اور سردار تھاپا خود لالین اٹھائے دروازے میں نمودار ہوا مگر اسے باہر نکلنے یا گلی میں جھانکنے کی مہلت نہ مل سکی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں کایا کی بندوق اس کی چھاتی سے لگ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لالین چھپٹ لی اور حکم دیا۔

”تھاپا بہادر! اندر چلو۔“

سردار تھاپا نے ہمیں دیکھا اور دم بخود رہ گیا، اگر آسمان سے بجلی گری ہوتی تو بھی اس کی وہ حالت نہ ہوتی جو ہم دونوں کو دیکھ کر ہوئی۔ سر کے بڑھے ہوئے بال اور داڑھی مونچھوں کا جھاڑ جھنکاڑ صاف ہو جانے کے باوجود اس نے کایا پتھار کو پہچان لیا اور میری پہچان تو کچھ مشکل نہ تھی، حیرت اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں جیسے منجمد ہو کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بندی گھر کے دو مفرو قیدی واقعی اس کی سیوا کے لئے حاضر ہو گئے ہیں۔ وہ دروازے ہی میں پتھر ہو گیا تھا۔ میں نے سختی سے کہا۔

”تھاپا! پیچھے ہٹو۔“

ساتھ ہی کایا نے اسے بندوق کی نال سے پرے دھکیل دیا اور میں نے اپنے پیچھے دروازے کے کوڑ بند کر کے کنڈی لگا دی یہ دیکھ کر تھاپا کو ایک اور جھٹکا لگا۔ ہمارے آگے آگے لٹے قدموں چلتا وہ کمرے میں آیا۔

باہر ایک کتا ابھی تک بھونک رہا تھا مگر دوسرا خاموش ہو چکا تھا کریم کی کلہاڑی نے ہمیشہ

گھروندے تھے جن کی پچھلی طرف اونچا ٹیلہ اس طرح پھیلا تھا کہ عقب سے ان گھروندوں میں اترنا ممکن نہ تھا۔ ٹیلہ عقبی جانب سے ایک قدرتی حصار کا کام دیتا تھا۔ ابھی ہم نے اصطبل کے پچھواڑے کھڑے ہو کر تھاپا بہادر کے گھر پر ایک نظر ڈالی تھی جو خانقاہ کی عمارت سے ملا ہوا تھا کہ اچانک باڑے میں کوئی کتا بھونکنے لگا جس کی آواز رات کے سنائے میں بڑی بھانک معلوم ہوئی۔ غالباً اس نے باڑے کے چوبی تختوں کی بڑی جھریوں سے ہماری پرچھائیں دیکھی یا ہماری بوسونگھ لی تھی ہم کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر بڑی تیزی کے ساتھ پلٹے اور ٹیلے کی چھاؤں میں چھپتے اپنی کمین لگاہ کی طرف آ گئے۔

کتے کا بھونکنا خطرے کا لازم تھا جس نے ہمارے جسموں میں سنسنی پیدا کر دی۔ اونچے پر بتوں میں گھری اس وادی اور چھوٹی سی بستی میں کتا بے وجہ نہ بھونکا تھا۔ اس کی آواز قبائلی پہرے داروں کو ہوشیار کر سکتی تھی، میں نے کتے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا حالانکہ ریوڑ کا یہی رکھوالا اس وقت بھی مجھ پر بھونکا اور لپکا تھا جب میں مدایا بھکشو کے ساتھ پہلی بار یہاں آیا اور چراگاہ میں بانگی سے ملا تھا۔

دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوئے لگا کہ میں اتنی اہم بات کو کیسے نظر انداز کر گیا۔ دور افتادہ ویران بستیوں میں کتے بہترین نگہبان ہوتے ہیں مگر ہمارے عقب میں ریوڑ کا رکھوالا دو تین بار بھونک کر خود بخود چپ ہو گیا اور اس کی آواز سے قریب آدھی رات کو بیدار ہوتا ہوا خطرہ ایک بار پھر پہاڑوں کے مہیب سناٹوں کی بانہوں میں آرام کرنے لگا۔

کتے کی آواز نے ہمارے ساتھیوں کو بھی چونکا دیا تھا۔ وہ سمجھے شاید ہم دیکھ لئے گئے یا ہم پر کوئی افتاد آ پڑی ہے کیونکہ جب میں اور کریم اپنی کمین گاہ میں واپس پہنچے وہ سب کے سب بندوقیں سنبھالے بے کوڑ دروازے پر کھڑے تھے۔ وصال رائے سب سے آگے تھا مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”کتا کیوں بھونکا تھا؟“

”شاید اس نے ہمیں دیکھ لیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر کسی آدمی نے نہیں دیکھا، سب سو رہے ہیں، کتا بھی دوبارہ نہیں بھونکا۔“

”اپنے کو یہ بولو۔ تھاپا کے گھر کا رستہ بھی دیکھا؟“

”ایک ہی رستہ ہے گلی کا۔ پچھواڑے سے ہم اس کے گھر نہیں اتر سکتے اور گلی کے رستے گئے تو کتوں کا خطرہ ہے۔ وہ بھونک بھونک کر بستی والوں کو جگا دیں گے۔“

اس بات پر سب کو تشویش ہوئی چنانچہ کریم کو دروازے کی پہرے داری سونپ کر ہم اپنے دھاوے کا پروگرام تیار کرنے لگے۔ طے یہ پایا کریم اصطبل کے پچھواڑے کتوں کی نگرانی کرے گا ہم لوگ چراگاہ کا چکر کاٹ کر دھن کی جانب سے گلی میں داخل ہوں گے چان اور کالی ناتھ گلی

”ہانگی کہاں ہے؟“

وہ سوال سن کر دنگ رہ گیا۔ چہرے پر غم و غصہ نے کروٹ لی۔ ”تم کون ہوتے ہو ہانگی کا پوچھنے والے؟“

”یہ میں کچھلی ملاقات میں بتا چکا ہوں۔“
”تم نے جھوٹ بولا تھا کہ ہانگی سے تمہارا کوئی سمبندھ نہیں۔“
”جھوٹ بولنے کا عادی نہیں ہوں۔“

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ”مجھے وشواس نہیں تم پر۔“
”جب پہلی بار تم نے ہانگی کے بارے میں پوچھا تھا، بندوق تمہارے ہاتھ میں تھی، اب دوسری بار ہانگی کی بات چلی ہے تو بندوق ہمارے ہاتھ میں ہے مگر میرا جواب پھر وہی ہے جو پہلے تھا، تم وشواس کرو یا نہ کرو، سچائی بدل نہیں جائے گی۔“
وہ گڑبڑا سا گیا۔ ”پھر ہانگی پریم کرتی ہوگی تم سے۔“

”سردار تھاپا! بھگوان نے عورت کو صرف پریم کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ خواہ وہ باپ ہو، بیٹا ہو، بھائی ہو یا کوئی پردیسی۔“
”مگر ہم اپنی لڑکیوں کو کسی پردیسی سے پریم کرنے کی آگیا نہیں دیتے۔ اس کی بڑی بہن رنگی نے بھی ایک پردیسی سے پریم کیا تھا جس کی سزا اسے دی گئی اور اب ہانگی۔“ وہ کچھ کہتے رک گیا اور میرے ذہن میں بھیا نک خطروں کے سانپ رینگنے لگے۔

”کیا ہوا ہانگی کو؟“
اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا مجھے شبہ ہوا تھا پانے ہانگی کو مار ڈالا ہے اور اس شبے کے ساتھ ہی بدن میں جوالا بھڑک اٹھی۔ لہو کھول گیا میں دیوانوں کی طرح چلایا۔
”ہانگی کو کیا ہوا؟“

میری آواز اتنی اونچی، اتنی تیز اتنی گرج دار تھی کہ پتھر کی دیواروں میں چھید کرتی نکل گئی اور اس کی گونج باہر گلی میں بھی سنی گئی ہوگی مگر اس آواز کی دھار تھاپا بہادر کا دل نہ چیر سکی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔

”بولتے کیوں نہیں تھا پان! جواب دو، ہانگی کہاں ہے؟“
وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور میرا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ ہنٹر کوندے کی طرح لپکنے لگا۔ ”تمہیں ہانگی کے بارے میں بولنا ہوگا۔“
”زبان کھولنا ہوگی۔“
”تم چپ نہیں رہ سکتے۔“

کے لئے خاموش کر دیا تھا پھر بھی کتے کی آواز سن کر اگر کوئی پہرے دار قبائلی باہر نکلتا تو وشال رائے اور چان کو معلوم تھا انہیں کیا کرنا ہے۔

کمرے میں پہنچ کر تھاپا اس جانب کھسکنے لگا جہاں کونے میں اس کی بندوق رکھی تھی۔ قریب ہی دیوار پر چری ہنٹر بھی لٹک رہا تھا جس سے تہہ خانے میں میری پٹائی کی گئی تھی، وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے اچانک رک گیا اور ذرا جرات کر کے بولا۔
”تم لوگ سیندھ لگا کر بھاگ گئے تھے پھر کیوں آ گئے؟“
”سوچا تمہیں ڈھونڈنے میں تکلیف نہ ہو۔“

”ایک بات پوچھوں، بتاؤ گے؟“
”کیوں نہیں۔“

”سیندھ لگانے کے لئے کوٹھڑی میں کدال کس نے پہنچائی تھی؟“
میں سمجھ گیا کہ ہمیں باتوں میں لگا کر اچانک اپنی بندوق جھپٹ لینا چاہتا ہے چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر بندوق اٹھالی اور وہاں لائین رکھ دی، تھاپا کے دل میں آس کی آخری لو بھی بجھ گئی اور چہرہ تاریک ہو گیا۔ میں نے بندوق اپنے کندھے پر لٹکائی اور دوسرے کمرے میں جھانکا، کمرہ خالی تھا۔ آج رات تھاپا گھر میں اکیلا تھا ہانگی نہیں تھی۔ اسے نہ پا کر میرا ماتھا ٹھنکا اور نظریں تھاپا کے چہرے پر گڑ گئیں۔

”کیا اب بھی یہ جاننا چاہتے ہو کہ کدال ہمیں کس نے پہنچائی تھی؟“
چنگ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ تھوک نکل کر بولا۔ ”ہاں۔“
”وہ ایک بھوت تھا جو کدال، بسولا اور کمند کوٹھڑی میں رکھ گیا تھا تا کہ ہم سیندھ لگا کر نکل جائیں۔“

”بھوت۔“ اس کے لہجے میں خوف، حیرت، تضحیک سب کچھ تھا۔
”مانو یا نہ مانو بھوت ہی تھا مگر اب میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تم سے۔“
اچانک باہر گولی کا دھماکہ ہوا، ایک چیخ بھی بلند ہوئی، تھاپا گھبرا کے بولا۔
”یہ بندوق کس نے چلائی؟“
”کوئی تمہارا ہی آدمی ہوگا۔“

”میرے کسی آدمی کے پاس بندوق نہیں۔“
میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ”پھر کوئی ہمارا آدمی ہوگا۔“
اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ ”تو آدمی لے کر آئے ہو؟“
”آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے تھا پان بہادر!“ یہ کہہ میں نے دیوار سے ہنٹر کھینچ لیا اور پوچھا۔

”کہاں ہے بانگی۔۔۔ جواب دو۔“

مگر اس میں بولنے اور جواب دینے کی سکت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ہنٹر کی آخری ضرب کے ساتھ ہی بے سدھ ہو گیا وہ چاندنی میں خون آلود دریدہ لباس میں کسی مردے کی طرح چت پڑا تھا۔ اس کے کراہنے اور سکسنے کی آوازیں بند ہو چکی تھیں اور اب گلی کے زخمی سکوت میں کواڑوں کے پیچھے قبائلیوں کی سرگوشیاں بھنھنا رہی تھیں، میں نے جھک کر تھاپا کی نبض دیکھی پھر کریم اور کالی ناتھ کو اس کی نگرانی کے لئے اپنے پاس بلایا بے کے سردار کو بستی والوں کے سامنے پیٹا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا، مگر اب بھی ان کی طرف سے کسی رد عمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ وہ بندوقوں کے ذرے سے باہر نہیں نکلے اور دروازوں کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے کواڑوں سے جھانکتے چہروں کو مخاطب کیا۔

سردار تھاپا نے نہیں بتایا کہ بانگی کہاں ہے، اگر تم میں سے کوئی جانتا ہے تو باہر آ جائے۔“
چند لمحے اضطراب انگیز خاموشی طاری رہی اور کسی نے جواب نہ دیا، میں نے اپنا سوال دہرایا۔ ”میں بانگی کے بارے میں جانتا چاہتا ہوں کیا کوئی بتائے گا۔؟“
صرف ایک دروازہ کھلا، ساٹھ باسٹھ سال کی ایک بڑھیا باہر نکلی اور میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

”کون ہو تم؟“

”ماں جی! میں وہی بندی ہوں جو سیندھ لگا کر یہاں سے نکل گیا تھا۔“

”اب کیوں آئے ہو؟“

”نیا لے کر آئے۔“

”بڑھیا چونکی۔ ”بانگی سے تمہارا کیا ناتا ہے۔؟“

”وہ ایک دیوی ہے جس کی پوجا کر سکتا ہوں مگر چھو نہیں سکتا۔“

”تمہیں اس کی چنتا کیوں ہے؟“

”مجھے شبہ ہے تھاپا نے اسے جان سے مار دیا ہے، وہ مجھے جانتی ہے، میری رہائی چاہتی تھی

اور سردار تھاپا سے جھگڑی تھی میرے لئے۔“

”تھاپا نے اسے جان سے نہیں مارا۔“ بڑھیا نے اطلاع دی۔

”پھر کہاں ہے بانگی؟“

”بندی گھر میں، مگر اسے دیکھ کر تمہیں دکھ ہوگا۔ وہ چل پھر نہیں سکتی۔“

”چل پھر کیوں نہیں سکتی۔؟“

”تھاپا نے اس کے دونوں پاؤں کاٹ دیے ہیں۔“

”اگر نہ بولے تو تمہاری چمڑی ادھیڑ دوں گا۔“

”بولو۔۔۔ بولو۔۔۔ بولو۔۔۔“

مگر تھاپا نہ بولا۔ ہنٹر کی ہر ضرب پر اپنے ہونٹوں کو کاٹتا رہا۔ اس نے غالباً یہ سوچ کر اپنے آپ کو اذیت کے لئے تیار کر لیا تھا کہ ایسی ہی اذیت مجھے بھی پہنچا چکا تھا۔ ہنٹر نے اس کے جسم پر کئی زخم لگائے پھر بھی ہر وار سہہ گیا جب ایک ضرب گردن پر پڑی تو اس نے بلبلا کر بنی ہوئی چمڑی رستی کو پکڑ کر کھینچا اور ہنٹر چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے جھٹکا دے کر اسے فرش پر گرا دیا اور پے در پے ہنٹر برسا بے، اس کا ضبط جواب دے گیا وہ مچھلی کی طرح تڑپنے اور گھائل بھڑیے کی مانند چیخنے چلانے لگا مگر بانگی کے بارے میں زبان پھر بھی نہ کھولی میں نے بھی ہاتھ نہ روکا۔

”تمہیں میرے سوال کا جواب دینا پڑے گا تھاپا، بولو بانگی کہاں ہے؟“

اس کے کپڑے پھٹ گئے جسم سے خون رسنے لگا مگر نہ بولا اور گھات لگا کر کمرے سے نکل گیا اور گلی کے دروازے کی طرف بھاگا۔ کایا پتھ بندوق چلانے ہی والا تھا کہ میں چلایا۔
”اسے گولی نہ مارنا۔“

پھر کایا کو اپنے سامنے سے ہٹاتا میں بھی تھاپا کے پیچھے لپکا، وہ بیرونی دروازہ کھول چکا تھا کہ میں نے پیچھے سے جالیا اور اس کی پنڈلی پر ٹھوکر ماری وہ تیور کر باہر گلی میں گرا اور ساتھ ہی وشال رائے نے آسام کی قبائلی بولی میں بستی والوں کو لٹکارا جو اپنے کواڑوں کی اوٹ سے گلی میں جھانک رہے تھے۔ ”اگر کوئی آدمی باہر نکلا تو گولی مار دوں گا۔“

باہر کا پورا منظر ہمارے حق میں تھا۔ وشال رائے خانقاہ کے دروازہ پر اور چان گلی کے دوسرے سرے پر بندوقیں تھامے پوزیشنیں لئے بیٹھے تھے اور چان کے دائیں بائیں کالی ناتھ اور کریم کی کلہاڑیوں کے پھل چاندنی میں چمک رہے تھے۔

میں تھاپا کے پیچھے پیچھے دروازے سے نکلا اور فوراً اس کے سر پر پہنچ گیا ابھی وہ اٹھ رہا تھا کہ ہنٹر کی ضرب کھا کر پھر گرا اور پھر چیخا اب میری آواز گلی میں گونجی۔

”بتاؤ تھاپا! بانگی کے ساتھ کیا کیا تم نے؟“

وہ گلی میں تڑپتا رہا اور دور یہ پتھر لے گھر وندوں کے آدھ کھلے کواڑوں سے کئی آنکھیں جھانکتی رہیں مگر کوئی شخص دروازے سے باہر نہ نکلا۔ کایا پتھ ابھی بندوق سیدھی کئے گلی میں آ گیا اور میرے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ تھاپا نے ابھی تک اپنی زبان نہیں کھولی تھی اور میں اس کی زبان کھلوانے پر تلا ہوا تھا۔

”بولو تھاپا! بانگی کہاں ہے؟“

میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور خود بڑھیا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے، گلوگیر آواز میں بولی۔ ”ہم سب کو بانگی کا بڑا دکھ ہے۔ وہ بستی کے سب لوگوں کو چاہتی تھی، سب لوگ اسے چاہتے تھے۔ تھاپا اس کے پاؤں کاٹتے ہوئے نہیں کانپا مگر بستی والے اس کے کٹے ہوئے پاؤں دیکھ کر کانپ گئے اور تھاپا سے بگڑ گئے۔ اس دن کے بعد کسی آدمی نے سردار کا حکم نہیں مانا صرف پٹاما پجاری اور خانقاہ کے دو پہریدار اس کے ساتھ ہیں، بستی والے اب تھاپا کو اپنا سردار نہیں مانتے جیسی کوئی آدمی اسے بچانے باہر نہیں نکلا۔ ہمارے مرد بندوقوں اور گولیوں سے نہیں ڈرتے وہ اس لئے چپ رہے کہ تھاپا بہادر کو اس کے باپ کی سزا ملے، انہوں نے خود سردار پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تمہیں اس پر ہاتھ اٹھاتے دیکھتے رہے مگر اس کا باپ بڑا اور سزا بہت چھوٹی ہے۔“ یہ کہہ کر بڑھیا پلو سے اپنے آنسو پونچھنے لگی میں اس کی باتیں سن کر دنگ رہ گئی کہ وحشی قبائلی اپنے سردار سے باغی ہو چکے ہیں اور انہوں نے بانگی پر ہونے والے ظلم کے خلاف تھاپا سے بغاوت کر دی ہے میں ان کی خاموشی کو اپنے آتشیں اسلحہ کا اعجاز سمجھا اور اس بات پر مطمئن تھا کہ وہ بندوقوں سے، گولیوں سے ڈر کر گھروں میں دبک گئے ہیں اور کوئی آدمی ہمیں روکنے ہمارا راستہ کاٹنے باہر نہیں نکلا لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا، اب تک جو کچھ ہوا، اس میں ہماری بہادری یا بندوقوں کا حصہ کم اور بھگوان کی دیا کا حصہ زیادہ تھا، جس نے سردار تھاپا کی بازی پہلے ہی الٹ دی اور ہمارے لئے راستہ صاف کر دیا تھا مگر بانگی کے متعلق جو خبر ملی اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا، میں اسے دیکھنے، اس سے ملنے کے لئے بے چین ہو گیا اور وشال رائے سے بولا۔ ”خانقاہ کا دروازہ کھول دو۔“

دروازہ کھل گیا کیونکہ وہ اندر سے بند نہیں تھا اور بستی کے لوگوں کی طرح خانقاہ کے پہرے دار بھی اس کے کواڑوں کی جھریوں سے باہر جھانک رہے تھے، وہ کواڑ کھلتے ہی ایک دم پیچھے ہٹے تو میں نے چلا کر کہا۔

”پٹاما! اگر تم میری آواز سن رہے ہو تو اپنے پہرے داروں سے کہو، وہ بانگی کو لے کر باہر آجائیں، خود بھی پانچ منٹ کے اندر باہر آ جاؤ۔“

فورا ہی خانقاہ کے اندر ہلچل سی مچ گئی مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ پانچ منٹ سے پہلے ہی دو پہرے دار ایک کھاٹ اٹھائے خانقاہ سے باہر نکلے ان کے آگے آگے ایک بوڑھے بودھ پجاری نے لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ بدستور امتیریا کے پجاریوں کی طرح اس کے سرداڑھی، مونچھوں کے بال منڈے ہوئے اور بدن پر دھوتی، کرتا اور چادر نما چولہ قسم کے صرف تین کپڑے تھے، یہی پٹاما پجاری تھا۔

خانقاہ کے سامنے ایک چھوٹا سا مستطیل چبوترہ تھا، وشال رائے اسی چبوترے پر بیٹھا تھا۔

پٹاما پجاری کے پیچھے پیچھے پہرے دار کھاٹ اٹھائے اس کے قریب سے گزرے اور چبوترے کی تین چار سیڑھیاں اترنے کے بعد کھاٹ گلی میں رکھ دی جس پر بانگی ایک کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ وہ ابھی تک اس بات سے بے خبر تھی کہ اسے بندی گھر سے باہر کیوں لایا گیا ہے۔

جونہی بانگی کی کھاٹ باہر آئی گلی کے دورویہ گھروندوں کے دروازے کھل گئے اور بستی کے لوگ جن میں جوان اور بوڑھی عورتی بھی تھیں، کھلے کواڑوں سے باہر نکل آئے مگر کوئی آگے نہ بڑھا، سب کے سب دروازوں پر ہی کھڑے رہے۔ اس اثناء میں بڑھیا جس نے بانگی کے بارے میں بتایا تھا کھاٹ پر جھکی اس سے بات چیت کرنے لگی۔ بانگی نے اس سے پوچھا تھا۔

”کیا تھاپا نے بلایا ہے مجھے؟“

”نہیں بانگی پردیسی آئے ہیں۔“

وہ بری طرح چونکی۔ ”کون پردیسی؟“

اس کی حیرت دور کرنے کے لئے (کیونکہ ابھی تک اس نے مجھے دیکھا نہ تھا پھر جہاں میں کھڑا تھا وہاں خانقاہ کی عمارت کا سایہ تھا) میں نے جیب سے نارنج نکال کر اس کی روشنی کا دائرہ اپنے چہرے پر ڈالا تا کہ وہ مجھے دیکھ لے، پہچان لے اور کہا۔

”وہ پردیسی میں ہوں بانگی۔“

مجھے دیکھتے ہی اس کے حلق سے ایک چیخ سی نکلی۔

”پردیسی۔۔۔ تھارو۔۔۔ تم آ گئے۔۔۔“

”ہاں بانگی، میں آ گیا مگر مجھے آنے میں بہت دیر ہو گئی۔“

”میرا من کہتا تھا تم ضرور آؤ گے۔“ اس کی آواز کمزور تھی۔

میں نے روشنی کا دائرہ اس کے چہرے کی طرف پھیر دیا، اس کا زرد، زرد، دھواں، دھواں سا چہرہ دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی نے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو اور صرف چند بوندیں باقی رہنے دی ہوں، سندر گال جن پر کبھی شفق کی سرخیاں سی بکھری رہتی تھیں، پچک کر پیلے پڑ گئے تھے۔ خالی خالی ویران سی آنکھوں سے وہ حسرتیں جھانک رہی تھیں جو پوری نہ ہو سکیں چند ہی دنوں، چند ہی راتوں میں اس کی عمر کے کئی سال بیت گئے تھے۔ وہ زندہ تھی مگر چہرے پر موت کی بساط بچھی تھی، میں نے بانگی کو نہیں دیکھا۔ بانگی کا صرف ایک ہیو لا سا دیکھا اور کانپ اٹھا، پھر میں نے بڑھیا سے کہا۔ ”بانگی کے پاؤں سے کمبل ہٹا دو۔“

بڑھیا نے کانپتے ہاتھوں سے کمبل ہٹایا تو میں اپنی چیخ روک سکا نہ آنسو۔ بانگی کے دونوں پاؤں ندارد تھے اور ٹنڈ منڈ ٹخنوں پر بہت سی پٹیاں بندھی تھیں جن پر خون اور دوا کے ملے جلے دھبے تھے، یہ منظر اتنا ہولناک اور لرزہ خیز تھا کہ مجھے چکر آ گیا اور نارنج میرے ہاتھ سے گر گئی

اور میں لڑکھڑا گیا اگر کایا مجھے پکڑ نہ لیتا جو باؤ کی گارڈ کی طرح میرے ساتھ ساتھ تھا تو میں وہیں گر گیا ہوتا۔

ٹھیک اسی لمحے چاند خانقاہ کی اوٹ سے نکل آیا اور اس کی روشنی کھاٹ کی پائنتی پر پڑی جس سے بانگی کی ٹنڈ منڈ بغیر پاؤں کی ٹانگیں صاف نظر آنے لگیں جنہیں دیکھ کر میرے قریب کھڑی بڑھیا چیخ مار کے رونے لگی اور اس کی چیخ نے بستی میں کہرام مچا کر دیا، چھ سات عورتیں جو مردوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ آئی تھیں بانگی کی حالت پر سسک پڑیں اور ایک دوا اپنے سر پر دو بٹریں مار کے چلائیں۔ ”بائے تھاپا۔۔۔ بائے تھاپا۔۔۔“

ان کی بے چین آنکھوں، تڑپتی آہوں، سسکتی کراہوں اور احتجاجی دو بٹریوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ بستی والے بانگی سے پیار کرتے ہیں۔ میری اپنی حالت غیر تھی اور میرے ساتھی بھی ایک جوان، سندس قبائلی لڑکی کے اس لمبے پر بڑے دکھی تھے۔ اس اور اس چاندنی رات میں جب عورتوں کی آہوں، کراہوں، سسکیوں اور آنسوؤں سے گلی کی فضا بوجھل ہو گئی تھی۔ بانگی نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور بڑی نجیب سی، بیمار سی آواز میں بولی۔ ”پر دیسی تھارو! تم دکھی ہو کہ تھاپا نے میرے پاؤں کاٹ ڈالے، بستی کی عورتیں میری حالت پر اس لئے روتی ہیں کہ اب میں چل پھر نہیں سکوں گی مگر جانتے ہو، یہ سب کیوں ہوا؟“

”مجھے کچھ اندازہ ہے مگر تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”جب تم بندی گھر کی کوٹھڑی میں سیندھ لگا کر بھاگ گئے تھاپا بہادر پاگل ہو گیا اس نے دوش مجھ پر لگایا۔ کہتا تھا میں تم سے پریم کرتی ہوں اور میں نے ہی تمہاری کوٹھڑی کے پہرے دار منگلا سے مل کر تمہیں کدال پہنچائی تاکہ تم سیندھ لگا کر نکل جاؤ اور اسی دوش میں جو میں نے نہیں کیا تھا، تھاپا نے میرے پاؤں کاٹ ڈالے۔“

”تو نے اسے بتایا نہیں کہ زردوش ہو۔“

”تھاپا نے میری ایک نہ سنی صرف پروہت گنجال کی سنتا رہا، جسے شکر ساؤ گاری سے بلا لایا تھا اور گنجال کہتا تھا، بانگی اس بندی سے مل گئی، جیسی اسے بھگا دیا۔“

”گنجال نے جھوٹ کہا تھا۔“

”مگر یہاں سچ جھوٹ سچ کا نیا کون کرتا ہے۔“

”نیاے ہو گا بانگی! میں اسی لئے آیا ہوں۔“

”تم میرا نیاے کرو گے؟“

”ہاں۔۔۔ مگر منگلا کے ساتھ کیا ہوا؟“

”تھاپا نے اسے گولی مار دی تھی۔“

اسی لمحے کریم کی آواز سنائی دی، اس نے بتایا۔

”تھاپا ہوش میں آ گیا ہے۔“

”اسے یہاں لے آؤ۔“

بانگی تھاپا کے ہوش میں آنے کی بات سن کر چونکی، اس نے ابھی تک اپنے ظالم باپ کو دیکھا تھا نہ یہ جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ اسی اثناء میں کالی ناتھ اور کریم، تھاپا کو بازوؤں سے پکڑے کھاٹ کے پاس لے آئے اور بانگی باپ کو اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

تھاپا کا لباس تار تار ہو رہا تھا جو دھول اور خون سے اٹا ہوا تھا۔ ہنٹر کے چمڑے نے جگہ جگہ سے اس کی کھال ادھیر دی تھی اور ماس پھٹ جانے سے خون نکل آیا تھا۔ اس حالت میں اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے، بانگی کو، بڑھیا کو، کایا پنتھا کو، وصال رائے کو اور ایک طرف کھڑے پٹاما پجاری اور خانقاہ کے دونوں پہرے داروں کو دیکھا پھر بستی کی عورتوں اور مردوں پر نظر ڈالی۔ یہ منظر کچھ ایسا تھا کہ تھاپا بہادر کا ذہن چکرا کے رہ گیا۔ وہ معاملے کی صورت سمجھنے سے قاصر تھا اور اب حیران نظروں سے بھی مجھے، کبھی بانگی کو گھورے جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”تھاپا بہادر تم نے پوچھا تھا، میں دوبارہ کیوں آیا ہوں، اگر تمہارا دوشی ہوتا تو کبھی نہ آتا مگر مجھے آنا پڑا کیونکہ میں نے آکاش پر لکھے ہوئے بھگوان کے فیصلے کو پڑھا اور عہد کیا تھا کہ زردوشوں اور بے چاروں کے ساتھ نیائے کروں گا اور ہتیاروں کو ان کے جرموں کے کائے میں تولوں گا اور انصاف کی کچھری لگاؤں گا اب میں تم پر دوش لگاتا ہوں کہ تم نے پروہت گنجال سے مل کر برما کے زمیندار کا یا پنتھا کو پانچ سال تک اپنا بندی بنائے رکھا اور اس کا جیون برباد کر دیا حالانکہ اس کا کوئی دوش نہ تھا، کوئی جرم نہ تھا۔“

اسی سے ایک ادھیڑ عمر قبائلی اپنا دروازہ چھوڑ کر آگے آیا اور بولا۔

”تھاپا نے ہمیں بتایا تھا کہ کایا نے پروہت جی کی سونے کی ایک ڈبیا چرائی ہے جس میں کوئی انمول شے بند تھی۔“

”تھاپا نے تم لوگوں سے جھوٹ بولا کیونکہ سونے کی وہ ڈبیا کایا کا باپ کو آن تان کے بودھ مندر سے لایا تھا اور پروہت گنجال اسے ہتھینا چاہتا تھا جب کایا نے اسے بیچنے سے بھی انکار کر دیا تو اسے برما سے اغوا کر کے اس خانقاہ میں پہنچا دیا گیا۔“ یہ کہہ کر میں نے تھاپا بہادر سے پوچھا۔ ”کیا تم جانتے ہو اس ڈبیا کے اندر کوئی انمول شے بند تھی؟“

تھاپا خاموش رہا۔ اس کا چہرہ چاندنی میں بھی سیاہ ہو رہا تھا، میں کہنے لگا۔

”تھاپا بہادر، پروہت گنجال اور پتی لا مابدری ساکھا میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ سونے کی

اس ڈبیا میں کیا تھا کیونکہ وہ کایا پنتھا کی ملکیت اور اس کے باپ کی امانت تھی۔۔۔ اور تھاپا بہادر

اب میں تم پر ایک دوش لگاتا ہوں کہ تم نے کایا کی بیٹی جل پنا کو بھی صرف اس لئے بندی گھر میں ڈالا کہ لڑکی کو اذیت دے کر وہ ڈبیا حاصل کر سکو، جب میں مدایا بھکشو کے ساتھ جل پنا کو رہا کرانے آیا تو تم نے مجھے بھی کایا کے ساتھ زیر زمین کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ میں دوش لگاتا ہوں تم پر کہ ہمارے فرار کے جھوٹے الزام میں تم نے منگلا پہرے دار کو گولی ماری اور بانگی کے دونوں پاؤں کاٹ ڈالے حالانکہ بانگی نے یا منگلا نے کوٹھڑی میں ہمیں کوئی چیز نہیں پہنچائی تھی۔ تم خونی، قاتل اور کائر ہو اور اسی کارن بستی کے لوگ اب تمہیں اپنا سردار نہیں مانتے کیونکہ تم ان سے جھوٹ بولتے اور ان سے غلط کام لیتے رہے ہو۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اپنے پاؤں کو مانتے ہو یا کوئی جھت کرتے ہو، تمہارے پاس بولنے کو یہی سہ ہے۔“

تھاپا بہادر نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”میں مانتا ہوں، سونے کی ڈبیا کایا کے باپ کی تھی مگر پروہت گنجال کا وچار تھا، وہ بودھ اتھاس کی یادگار ہے اس لئے کسی بڑے گمانی ہی کے پاس رہنی چاہیے اگر کایا وہ ڈبیا پروہت جی کو بھیٹ کر دیتا یا ان کے ہاتھ بیچ ڈالتا تو اسے پانچ برس تک کشت نہ بھوگئے پڑتے۔ میں نے جل پنا کو، تمہیں، گونگے مدایا کو بندی بنایا کیونکہ پروہت گنجال کا یہی حکم تھا۔ منگلا کو گولی اس لئے ماری کہ مجھے اس پر شک ہو گیا تھا کہ شاید تم سے مل گیا اگر نہیں ملا تھا تو اتنا غافل ہو گیا کہ تم سیندھ لگاتے رہے اور وہ سوتا رہا۔ بانگی کے پاؤں اس لئے کاٹے کہ پروہت جی نے اس کی آنکھوں میں تمہارے پریم کی بھاشا پڑھ لی۔ ان کا خیال تھا کہ بانگی بھاگ جائے گی اور میں نے اس کے پاؤں کاٹ دیئے۔“

بستی کے لوگ اس کا بیان سن کر دنگ رہ گئے میں حیران تھا اس نے پروہت گنجال کے بے بنیاد خیال پر اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لئے اپا ج کر دیا۔

”تھاپا! تم اتنے اندھے ہو گئے کہ یہ بھی نہ سوچا بانگی تمہارے بڑھاپے کی لاٹھی ہے اور کسی اندھے کو اپنی لاٹھی اپنے ہی ہاتھوں نہیں توڑنی چاہیے۔“

”میں پروہت گنجال کا داس ہوں اور اس دنیا کو انہی کی نظروں سے دیکھتا ہوں اچھا کیا ہے برا کیا ہے، مجھے معلوم نہیں۔“

اس جواب نے سب کو دم بخود کر دیا۔

”اب آخری بات پوچھنا چاہتا ہوں، تم نے گونگے مدایا کے ساتھ کیا کیا؟“

”مدایا کو میں نے پروہت جی کے حوالے کر دیا تھا، وہ ان کے ساتھ ساؤ گاری لوٹ گیا۔“

”مگر وہ ساؤ گاری کبھی نہیں پہنچے گا کیونکہ تمہارا گورو اپنے دشمنوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں۔“

تھاپا پھر چپ ہو گیا، میں بھی پل دو پل خاموش رہا اور وہاں ایک ایسی ہولناک خاموشی طاری ہوئی کہ سانسوں کی آمد و شد کے سوا ہوا کی سرسراہٹ بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے اس

خاموشی کو توڑ دیا اور کہا۔ ”تھاپا بہادر! میں نے تمہاری بستی میں تمہارے لوگوں کے سامنے انصاف کی کچہری لگائی، تمہارے باپ گونائے، تمہارا بیان سنا۔ اب میرا فیصلہ سنو اور یہ ہے میرا فیصلہ کہ جس طرح تم نے بانگی کے پاؤں کاٹ ڈالے اسی طرح تمہارے بھی دونوں پاؤں کاٹ دیئے جائیں کیونکہ بھگوان کے قانون میں ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں کاٹنے کا حکم ہے اور اس فیصلے کو بدلنے کا ادھیکار صرف بانگی کو ہے مگر وہ تمہیں شہا کر دے تو تمہارے پیر نہیں کاٹے جائیں گے۔“

بانگی کی آواز سنائی دی۔ ”پر دیسی تھارو! تم سچ مچ بھگوان کا روپ ہو، تم نے ٹھیک نیاے کیا ہے۔ میں تھاپا کو شہا نہیں کروں گی۔“

تھاپا کا رنگ اڑ گیا اور میں نے بقیہ فیصلہ سنایا۔ ”پاؤں کاٹنے کے آٹھ پہر بعد منگلا کو قتل کرنے کے جرم میں تھاپا کو گولی ماری جائے گی کیونکہ بھگوان کے قانون میں جان کا بدلہ جان ہے، اگر منگلا کے وارث خون معاف کر دیں تو تھاپا کی جان بچ سکتی ہے۔“

فوراً ہی ایک عورت ایک کسن بچی کا ہاتھ تھامے آگے آئی اور بولی۔ ”میں منگلا کی بیوی ہوں، تھاپا نے مجھے ودھوا اور میری بچی کو انا تھ کر دیا ہے میں اپنے پتی کا خون معاف نہیں کرتی۔“

تھاپا پر ایک اور بجلی گری، میں نے پھر کہا۔ ”کایا پنتھا کے ساتھ جو انیائے ہوا، اس کا نیاے بھگوان پر چھوڑتا ہوں اور مجھے دشوا ہے، تھاپا کو اس کا بدلہ اس لوک میں نہیں تو اگلے لوک میں بھگتا پڑے گا، اب تھاپا کے پیر کاٹے جائیں گے۔“

یہ الفاظ سننے ہی تھاپا بہادر یوں ہلا جیسے آندھی کے تیز جھونکے میں کوئی اونچا درخت بل کھاتا ہے اور دوسرے لمحے دھڑام سے گر پڑا میں اسے اتنا کم ہمت اور کمزور نہیں سمجھتا تھا۔

بستی کے مرد بھی جو ابھی تک اپنے دروازوں کے آس پاس کھڑے تھے، آگے بڑھ آئے کیونکہ ایسی عجیب کچہری انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اور ایسا کھرا فیصلہ بھی کبھی نہ سنا تھا۔

اب وہ تھاپا کے پاؤں کاٹنے کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ بے ہوشی کی حالت میں تھاپا کو خانقاہ کے چبوترے پر لٹا دیا گیا۔ منہ پر پانی کے پھینٹے مار کر ہوش میں لایا گیا پھر کالی نا تھا اور کریم نے

میرے اشارے پر بیک وقت کلہاڑیاں چلائی اور اس کے دونوں پیر کاٹ دیئے۔

تھاپا کی ایک ہولناک بھیا نک چیخ بلند ہوئی جو پریتوں کے سنائے میں دور تک گونجتی چلی گئی، وہ کٹے ہوئے بیل کی طرح تر پنے پھڑکنے لگا اور دوبارہ بے سدھ ہو گیا۔ پٹاما پجاری نے

اس کے خون میں اتھڑے ٹخنوں پر جہاں سے بیج کاٹے گئے تھے، ایک محلول چھڑکا، گوشت پر کوئی تیز مرہم لگایا اور پنیاں باندھنے لگا۔ پٹاما نے یہی عمل بانگی کے ساتھ اس وقت کیا تھا، جب تھاپا

نے اس کے پیر کاٹے تھے مگر تھاپا کا خون بند ہو سکا نہ بے ہوشی ٹوٹی اور اسی حالت میں گردن

ذہلک گئی، جب پٹاما پجاری نے بتایا کہ وہ مر گیا ہے تو اتنے کیم شیم آدمی کے اس طرح مرنے پر مجھے بھی حیرت ہوئی، اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی تھی، میں نے دیکھا بانکی نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہی ادھیڑ عمر قبائلی جو پہلے بولا تھا، پھر بولا۔ ”تھاپا کو مرنا تھا یوں نہ مرتا تو منگلا کے دوش میں گولی کھا کے مرتا مگر یوں اس کے کرموں کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔“

بانکی نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور ادھیڑ عمر قبائلی سے مخاطب ہوئی۔ ”گو بھی چا چا! اب تم قبیلے کے سردار ہو۔ تھاپا کی چتا کل جلا دی جائے گی اور اس طرح اس کے کرموں کا بوجھ کچھ اور ہلکا ہو جائے گا مگر اس بات کا دھیان رکھنا پر دیسی ہمارے مہمان ہیں، بس میں اور کچھ نہیں کہوں گی۔“

یہ گویا اس نائک کا ڈراپ سین تھا۔ گو بھی نے پٹاما پجاری کو حکم دیا کہ ہمیں خانقاہ میں ٹھہرائے اور ہماری سیوا کرے۔



رات کا آخری پہر ختم ہونے والا تھا، جب ہم پٹاما پجاری کے ساتھ خانقاہ میں آگئے مگر چان بندوق سنبھال کر باہر چوتھرے پر بیٹھا رہا اور اس نے دروازہ کھلا رکھا تا کہ ہماری نگرانی کر سکے مگر اس پہاڑی خانقاہ کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔

پٹاما پجاری مجھے، کایا پنتھا اور وشال رائے کو اس کمرے میں لے آیا جہاں کبھی بس پنا کو ٹھہرایا گیا تھا۔ کالی ناتھ اور کریم ساتھ والے کمرے میں تھے، صبح ہونے والی تھی، وشال رائے کے سوا کوئی بھی نہ سو کا مگر کمر سیدھی کرنے کے لئے میں لیٹ ضرور گیا اور لیٹے لیٹے سوچنے لگا اگر تھاپا بہادر منگلا کو گولی نہ مارتا، بانکی کے پیر نہ کاٹا اور بستی والے اس سے بگڑ نہ جاتے تو ہم تین بندوقوں اور بھاری کارتوسوں کے باوجود شاید بستی پر قابو نہ پاسکتے مگر جیسا میں نے ایک بار کایا پنتھا سے کہا تھا، بھگوان کرو دھ میں دھیما اور دیا میں تیز ہے۔ ظالموں، پاپیوں کو ڈھیل دیتا اور ان پر جنت پوری کرتا ہے مگر جب کسی اتیا چاری کو پکڑتا ہے تو اسے بھاگنے کی مہلت نہیں دیتا، یہی تھاپا کے ساتھ ہوا تھا۔

ہمارے آنے سے پہلے ہی بستی میں ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ ہمیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، بس ہم آئے اور دھاوا کر کے تھاپا بہادر کو دبوچ لیا، کچھری لگائی اور اس کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا، کسی نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ تم فیصلہ کرنے والے سزا دینے والے کون ہو؟ تھاپا پکڑا گیا مارا گیا یہ تو اصل میں بھگوان کی گرفت تھی۔ وہ ظالموں کو اسی طرح پکڑتا اور ایسی عبرت ناک سزا دیتا ہے کہ اپنے بھی بیکانے بن جاتے ہیں۔

صبح ہوتے ہی ہمیں ناشتہ دیا گیا اور ناشتہ کرنے کے بعد میری آنکھ لگ گئی کافی دیر سو یا رہا

پھر کسی نے جگا دیا۔ دیکھا تو کمرے میں میں تھاپا پٹاما پجاری، کایا پنتھا اور وشال رائے کہیں نکل گئے تھے، گھڑی دن کا ایک بج رہی تھی، سوچا پٹاما نے دوپہر کے کھانے کے لئے جگا دیا ہے مگر اس نے بتایا۔

”بانکی ملنا چاہتی ہے۔“

پھر خانقاہ کے دونوں پہرے دار اس کی کھاٹ کمرے میں رکھ کر پٹاما کے ساتھ ہی باہر نکل گئے۔ میں نے اٹھ کر بانکی کا سواگت کیا اور سوچ رہا تھا، اس کے باپ کی موت پر افسوس کروں یا خاموش رہوں کہ اس نے خود ہی یہ ذکر چھیڑ دیا۔

”ہم نے آج سویرے تھاپا کی ارٹھی جلا دی تھی۔“ اس کے لہجے میں کوئی رنج، کوئی افسوس نہیں تھا۔ ”پردیسی تھارو! اگر تم نہ آتے تو ایسا نیاے کبھی نہ ہوتا۔“

میں حیران تھا۔ کیا کہوں، کیا نہ کہوں آخر پوچھا۔ ”بستی والے کیا کہتے ہیں؟“

”کہتے ہیں جو کچھ ہوا، اچھا ہوا۔ وہ تمہیں دیوتا سمان سمجھنے لگے ہیں، میرا باپوان کی نظروں سے گر گیا تھا۔ اسے خود تو سزا نہیں دے سکے، مگر تم نے سزا سنائی تو بولے۔ یہ بھگوان کا نیاے ہے۔“

”مگر وہ کیسا باپ تھا اسے تجھ پر بھی ترس نہ آیا اور تیرے پاؤں کاٹ ڈالے۔“

”وہ گنجال کا داس تھا، اسی کی بات مانتا تھا۔“

”اسے تجھ سے بھی پوچھنا چاہیے تھا کہ گنجال نے پریم کا جو دوش لگایا ہے وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں؟“

”پوچھا تھا اس نے۔“

”پھر تم نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا تھا۔ باپو پریم ہو جاتا ہے کیا نہیں جاتا۔“ بانکی نے مجھے حیران سا کر دیا، ایک بل ٹھہر کے بتانے لگی۔ ”وہ باپو کم اور تھاپا بہادر زیادہ تھا۔ میرے پیچھے ہی پڑ گیا اور بات بڑھانے لگا کہ کہ تو ضرور پردیسی سے پریم کرتی ہے، تب میں نے اس کی بات چھوٹی کر دی کہ ہاں کرتی ہوں اور اس نے مجھ پر کلہاڑی چلا دی۔“ یہ سن کر میں سکتے میں آ گیا۔ وہ پوچھنے لگی۔ ”تمہیں اچھی نہیں لگی میری بات؟“

میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور کہا۔ ”اچھی لگی ہے مگر تو نے بات چھوٹی نہیں کی بڑی کر دی۔“

”ہاں..... میں نے بات کچھ زیادہ ہی بڑی کر دی ہے مگر اب تمہیں پردیسی تھارو نہیں بلکہ بھگوان کا روپ سمجھتی ہوں، شاید تم اسی روپ میں مجھے مل سکتے تھے۔“

”میں بھگوان نہیں انسان ہوں بانگی! تو مجھے وہی پردیسی تھارو سمجھتی رہ۔“

”مگر اب میں وہ نہیں رہی، میرے لئے تمہارے روشن کر لینا ہی سب سے بڑی پوجا ہے،

کچھ دن یہاں رہو تا کہ تمہاری پوجا کر سکوں۔“

”سویرے مجھے ساؤ گاری کی طرف کوچ کرنا ہے۔“ وہ میرے کوچ کی خبر سن کر کچھ بھگ گئی،

میں نے اسے تسلی دی۔ ”مگر میں پھر آؤں گا، تمہیں دیکھنے، تم سے ملنے۔“

اور اس کی بجھتی آنکھوں میں پھر جوت سی جلنے لگی۔ اسی لمحے کایا پنتھا اور وصال رائے

کمرے میں داخل ہوئے اور دونوں نے بانگی کے سامنے اپنے سر جھکا دیئے، اتنی عظیم تھی وہ قبائلی لڑکی۔

○○○

(30)

چاند گرہن کا معما

سردار تھا پابہادر مر گیا۔

پہاڑی بستی میں اس کی چتا جل کے راکھ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ان مظالم کا بھی خاتمہ ہو گیا جن کی دہشت بدروحوں کی طرح بستی والوں پر طاری تھی اور وہ خوف کے مارے اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکتے تھے، مگر تھا پاپا اپنے ظلم کا ایسا بھیا نک نشان چھوڑ گیا جس نے سب کو دکھی کر دیا، اس کی بیٹی سدا کے لئے روگی اور دکھی ہو گئی تھی۔

جب میں نے بانگی کو پہلی بار دیکھا وہ مجھے کانگٹھو کے برفانی پر بتوں اور ان پر بتوں کی دلکش وادیوں کی سندر تا لگی جس نے ایک چرواہی کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ لڑکی چراگاہ میں بھیڑ بکریاں چراتی اور نیچر کے حسین چتر میں رنگ بھرتی تھی، اس کے چہرہ پر پہاڑی گھاٹیوں اور وادیوں کا حسن نکھرا ہوا اور جوان شریہ میں ان موسموں کا رنگ روپ رچا بسا تھا جو نئی رتوں کے سندس لے کر آتے اور اونچے پر بتوں کی وادیوں میں اپنے ان مٹ اثرات چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔

بانگی ان وادیوں میں قدرت کی ایک شوخ، رنگین، سندر دھنک کی مثال تھی، اس کمان کے خم دھرتی سے سرگوشیاں کرتے تو کنارے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں بلکہ ان سے بھی پرے آکاش کی نیلی چھتری کو چھوتے تھے، جوتش و دیا کا نجوم کا کوئی ماہر بانگی کو دیکھتا تو اسے آسمان کا نواں راس یا گمٹ قرار دیتا مگر مجھے جوتش و دیا نہیں آتی پھر بھی میں اونچے پر بتوں کی تند و تیز ہواؤں اور برفانی وادیوں کی گود میں پلی اس لڑکی کو پیار کی اونچائیوں کی ایک گمشدہ سمجھتا ہوں جسے نیچر نے سنوارا اور نکھارا تھا مگر اب وہ ایک بے رنگ دھبے کی طرح کھاٹ سے لگ گئی تھی جیسے نو تیر ہی کے کھیل میں پانسے الٹ پڑ جانے سے بازی پٹ ہو جاتی ہے۔

بانگی بھی اپنی بازی ہار گئی اور اس نے اپنے ہی باپو کے ہاتھوں ایسی مات کھائی تھی کہ اس کے جیون کا رنگ ماند پڑ گیا۔ اسے پابریدہ دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے ان سندر وادیوں کی رنگین دھنک ٹوٹ گئی ہو، جیسے نیچر کی یا میری اپنی کوئی شے کھو گئی ہو، اس کی یہ حالت میرے ہی کارن ہوئی تھی، جیسی میرا من اس کے لئے اندر ہی روتا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے اپنی کہانی سنانے یا میرے ایک مہینہ پرانے سوال کا جواب دینے آئی تھی، میں نے اس سے صرف دو دن کا پیار مانگا تھا اور اس نے میرے لئے جیون بھر کا

بلیدان دے دیا، کیا بانگی مجھے یہی بتانے آئی تھی کہ وہ پہلی سی لڑکی نہیں رہی کیونکہ اپنا جج ہو گئی ہے اور میرے کسی کام نہیں آ سکتی مگر وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی اور میں سمجھ گیا تھا کہ کیا چھپا رہی ہے۔ وہ اپنا آپ چھپا رہی تھی مجھ سے۔ اس کی آشاؤں کے سارے دیئے بجھ گئے تھے اور اپنے بجھے دیئے میرے چرنوں میں رکھ کر لوٹ گئی تھی۔ اب میرے اندر کا تھارو کیشپ مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں نے اس کے بجھے دیئے اپنے پیار کی جوتی سے دوبارہ کیوں نہ جلا دیئے، میں نے اس سے پریم کیوں نہ کیا کہ کھاٹ سے لگی، تھاپا کی ڈسی، مری بانگی پھر سے جی اٹھتی۔

وشال رائے اور کایا پنتھار کی موجودگی کو نظر انداز کر کے میں سوچنے لگا، وہی کرنا چاہیے تھا جو میرے اندر کا آدمی کہہ رہا ہے مگر بانگی نے میری خاطر بڑا بلیدان دے کر میری نظروں میں ایک پوتر دیوی کا درجہ حاصل کر لیا تھا، جی میں اسے چھو بھی نہ سکا یا پھر وشال رائے اور کایا پنتھار کی اچانک آمد کے باعث اس کے شریر کو ہاتھ نہ لگا پایا تھا۔

اس عجیب و غریب صورت حال نے مجھے دو حصوں میں بانٹ دیا، میرا ایک حصہ بدستور بانگی کے دھیان میں کھویا رہا اور دوسرا حصہ وشال رائے اور کایا پنتھار سے مخاطب تھا مگر میں کچھ سمجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کہتے، کیا چاہتے ہیں۔ غالباً انہوں نے کچھ پوچھا تھا اور میں نے کوئی الٹا سا جواب دیا تھا یا کوئی جواب ہی نہیں دیا تھا جس پر وہ دونوں حیرت سے مجھے دیکھتے رہے کہ میری چپ کا کارن کیا ہے۔ ان کی موجودگی کے احساس نے اچانک مجھے دو سے پھر ایک کر دیا اور جب میری محویت کا حلقہ ٹوٹا، وشال رائے کہنے لگا۔ ”کیشپ بابو! میرے کو کچھ بولنا ہے۔ سنو گے؟“

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ”بولو وشال جی! کیا بولتے ہو؟“

”وہ چان اور کالی ناتھ اور کریم ہیں نا، سب بندی گھر کی کوٹھڑی دیکھنے کو بولتے ہیں جس میں تم نے اور کایا نے سیندھ لگائی تھی، میرے کو بھی تہہ خانہ دیکھنا ہے تم ذرا ہمارے ساتھ چلو نا۔“

”تم لوگ کایا موسا کو ساتھ لے جاؤ میرا من ٹھیک نہیں۔“

یہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ بے شک میرا دھیان تو بانگی میں الجھا تھا مگر شریر آنا فانا جلنے بیٹنے لگا تھا۔ یہ رات بھر جاگنے کا نتیجہ بھی نہیں تھا کیونکہ میں نے دن کو نیند پوری کر لی اور دو پہر کو جاگا تو بالکل ہلکا پھلکا تھا۔ نہ تھکاؤٹ تھی، نہ کسٹندی، اب بدن بخار میں پھنکا جاتا تھا، میں نے انہیں زمین کے پیٹ میں اتری ہوئی کوٹھڑی دیکھنے کے لئے تو کہہ دیا مگر اچانک خیال کہ ان کے ساتھ بستی کا کوئی معتبر آدمی بھی ہونا چاہیے۔

”کایا موسا! سردار گوٹھی کہاں ہے؟“

”میں نے ابھی اسے خانقاہ کے باہر دیکھا تھا۔“

”ذرا اسے بلاؤ۔“

کایا پنتھار فوراً کمرے سے نکلا اور جب لوٹ کے آیا تو بستی کا نیا سردار اس کے ساتھ تھا، اس نے مجھے پرنام کیا، میں نے پوچھا۔ ”سردار گوٹھی! کیا تہہ خانے والی کال کوٹھڑی کی سرنگ بند کر دی گئی ہے جسے کھود کر ہم بھاگے تھے؟“

”نہیں پر بھو!“ گوٹھی نے جواب دیا۔ ”تھاپا نے پروہت گنجال سے کہا تھا کہ وہ کوئی راج مستری بادے جو سرنگ بند کر سکے پر ابھی تک کوئی راج مستری نہیں آیا۔“

مجھے خیال آیا۔ ”گنجال کے اپنے اندر ایک سیندھ لگ گئی اور اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل چکی ہے، وہ دھرتی پر بیرنگانے کیلئے جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے اسے سرنگ بند کرانے کا ہوش کہاں ہوگا۔“

”تو پھر یوں کرو، میرے ساتھی وہ کال کوٹھڑی دیکھنا چاہتے ہیں، تم ان کے آگے آگے تہہ خانے میں اترو گے۔“

”جو آ گیا پر بھو۔“

”مگر تہہ خانے میں اترنے سے پہلے مجھے بانگی کے پاس لے چلو، میں اس سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

میں اٹھا تو بخار کچھ اور تیز ہو گیا تھا، وہ میرے آگے آگے چل پڑا اور چلتے یوں لگا کہ صرف شریر ہی نہیں تپ رہا بلکہ میرا اندر بھی بھٹی کی طرح گرم ہے، میں حیران تھا، یہ ایک ایسی مجھے کیا ہو گیا ہے۔

بانگی اپنے گھر منتقل ہو چکی تھی جب میں گوٹھی کے ساتھ اندر داخل ہوا بستی کی کئی عورتیں اس کی کھاٹ کے ارد گرد بیٹھی تھیں۔ شاید وہ سردار تھاپا بہادر کی موت کا پر سادینے آئی تھیں۔ آخر وہ بانگی کا باپ اور بستی کا سردار تھا، ہمیں دیکھتے ہی سب ایک دم کھڑی ہو گئیں اور وہی بڑھیا جس نے رات بانگی کے بارے میں بتایا تھا، آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھونے لگی تو میں نے جلدی سے پاؤں پیچھے کر لئے اور بڑھیا کو سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔

”مائیں بیٹوں کے چرن نہیں چھوتیں۔“

”بڑھیا نے بڑے پریم بھاؤ سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”بانگی کہتی ہے تم بھگوان کا روپ ہو۔“

”بھگوان تو ہر آدمی کے اندر بستا ہے ماں جی!“

”ست ہے ست ہے۔“ اور بڑھیا یہ شبد الاپتی عورتوں کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گئی۔

بانگی کی آنکھوں سے الجھن سی جھانک رہی تھی وہ تھوڑی دیر پہلے مجھ سے خانقاہ میں مل کے آئی اور اب حیران تھی کہ میں اتنی جلد اسے دیکھنے آ گیا تو کہیں کوئی بات بگڑ نہ گئی ہو، جب گوٹھی بھی

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی جس میں گزرے موسموں کا رنگ تھا، کھاٹ سے لگے شریر پر کپکپاہٹ طاری ہوئی جیسے اندر کوئی کشمکش جاری ہو مگر کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ ”ہاں“ کہے یا ”نہ“ کہے وہ مجھے دیکھتی رہی۔
 ”آگیا دے دے، ہاں کہہ دے۔“ میں نے سرگوشی کی۔
 وہ منہ سے کچھ نہ بولی مگر ہونٹوں پر، گالوں پر، آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ کی لہر گزرنے لگی۔

میں نے دیکھا یہ لہر اس کے پورے شریر میں سر سے لے کر کتے پیروں تک دوڑ رہی ہے، اس کا پورا جسم کانپ رہا، مسکرا رہا ہے۔ اس مسکراتی لہر کو میں اس کی ”آگیا“ سمجھا اور اس سے پیار کیا۔

اسی سے میں نے کانٹو کے پرتوں کے درمیان پھر ایک حسین دھنک سی لہراتی دیکھی۔ میرے دل میں پریم کا یادیا کا ایک سوتا ابلنے لگا۔ میں نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور اسی کیفیت میں ”یا حسی۔۔۔ یا قیوم“ کہہ کر اس کے ٹنڈ منڈنخوں پر بندھی پٹیوں پر ہاتھ پھیرا اور اس خیال سے ہاتھ ہٹالیا کہیں وہ براتہ مان جائے کہ میں اس کے پیروں کو کیوں چھو رہا ہوں حالانکہ اس کے پیر تو رہے نہ تھے، اگر ہوتے تو شاید انہیں چوم لیتا۔

میں نہیں جانتا، بانگی کے من میں کیا تھا اور وہ بھی کسی عجیب سی کیفیت سے گزری تھی یا نہیں مگر اس کی خوبصورت آنکھوں میں کوئی شے حرکت کر رہی تھی۔ ادھر میں اس اچنبھے پر حیران ہو رہا تھا کہ اب میرا شریر گرم نہیں تھا۔ دل کی بے چینی ختم ہو چکی تھی۔ میں ایک سکون سا محسوس کر رہا تھا۔ اچانک بانگی کے چہرے پر دھنک سی کھل اٹھی۔ شریانوں میں نیا خون دوڑنے لگا اپنی زخمی ٹانگیں بولے بولے سمیٹ کر اٹھی اور تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں ڈرا کہ بٹنے جلنے سے کہیں اس کے گھاؤ دکنے نہ لگیں، وہ بولی۔

”جب سے پیر کے میں کھاٹ سے لگ گئی تھی، بٹنے جلنے سے بھی ٹیسیں اٹھتی تھیں مگر تمہارے پیار نے اتنی شکتی دے دی کہ آج پہلی بار اٹھ کے بیٹھی ہوں۔“

اور اس کے ساتھ وہ شے جو میں نے اس کی آنکھوں میں حرکت کرتے دیکھی تھی، آنسو بن کر پلکوں سے بہہ نکلی۔ میں حیران رہ گیا۔ ”میں تجھے ہستی مسکراتی دیکھنا چاہتا ہوں تو رونے کیوں لگی؟“ وہ روتے روتے بولی۔ ”میری کتنی چنتا ہے تمہیں۔“

”دل میں پریم ہو تو چنتا ہوتی ہے۔“

میں اس کے سونے من میں آشاؤں کے دیئے روشن کر رہا تھا اس کے بلیدان کا تھوڑا سا صلہ چکانے آیا تھا، وہ پلو سے آنسو پونچھ کے کہنے لگی۔

جانے لگا میں نے کہا۔

”سردار گو مہی! تہہ خانے سے لوٹ کے آؤ تو مجھے خبر کر دینا۔“

وہ ”بہت اچھا“ کہہ کر چلا گیا اور میں نے بانگی کو بتایا۔

”میرے ساتھی گو مہی کے ساتھ تہہ خانے کی کال کوٹھڑی دیکھنے جا رہے ہیں۔“

”تم نہیں گئے؟“

”میں تیرے لئے بے چین ہوں تجھے دیکھنے آگیا۔“

”بیٹھو“ اس نے ایک موڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

”تیری کھاٹ پر بیٹھ جاؤں؟“

”موڑھے پر آرام سے بیٹھو نا۔“

میں نے موڑھا گھسیٹ کر کھاٹ کے ساتھ لگا دیا اور بیٹھتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بانگی! مجھے دکھ ہے یہ سب کچھ میرے کارن ہوا۔“

اس نے بات ٹال دی اور میری کلائی تھام کر بے چینی سے بولی۔

”ارے۔۔۔ تمہیں تو بڑا تیز بخار ہے۔“

”تپ رہا ہوں۔“

”مگر تھوڑی دیر پہلے تم اچھے بھلے تھے۔“

”تیرے لوٹتے ہی تپ چڑھ گئی۔“

”پھر کیوں آئے؟“

”ایک آشا لے کر۔۔۔ مانے گی؟“

”کیسی آشا؟“ وہ حیران آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”تجھ سے پیار کرنا چاہتا ہوں۔“

پیار کا نام سن کر بانگی کے زرد گال ایک دم سرخ ہو گئے مگر اس نے آنکھیں میرے

چہرے سے نہ ہٹائیں۔

”مجھ ابھاگن سے پیار کرو گے؟“

”ہاں۔۔۔ میری آشا پوری کر دے۔“

”میں نے تمہیں بھگوان کا روپ مانا ہے۔“

”صرف ایک بار پر دیسی تھا رو مان لے۔“

”جو بات میرے نصیب میں نہیں اسے کیوں دہراتے ہو؟“

”مگر تیرے نصیب میں میرے پیار کا کچھ حصہ ہے۔“

”میں نے تمہارا کہا پورا کر دیا۔ اب میرا بھی کہا مانو گے؟“

”بول کیا کہتی ہے مانو گا تیرا کہا۔“

”بچن دیتے ہو؟“

”دیا بچن تجھے۔“

”پھر میری اتنی چنتا چھوڑ دو۔“

میں سوچ رہا تھا، شاید کوئی حسین فرمائش کرے گی مگر اس کے الفاظ نے مجھے حیران کر دیا:

”کیوں چھوڑ دوں تیری چنتا؟“

وہ ایک پل ٹھہر کے اور اپنے لہجے میں وشواس کی شکلی بھر کے کہنے لگی۔ ”میں نے تمہیں ہستی والوں کے سامنے بھگوان کا روپ کہا ہے، تم بھگوان ہی بنے رہو۔ میری اتنی چنتا کرو گے تو اپنے آکاش سے گر جاؤ گے۔“

اس پہاڑی لڑکی نے اتنی بڑی بات کہہ دی جس کے بارے میں شاید میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پل دو پل مجھے کچھ نہ سوچا کہ اس بات کا کوئی جواب بھی ہو سکتا ہے یا نہیں جس طرح جھیل کی سطح دیکھ لینے سے اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا، اسی طرح بانگی کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اونچی یا اتنی گہری بات کہہ دے گی، میں نے کچھ سوچ کے کہا۔ ”بھگوان بھی تو لوگوں کی چنتا کرتا ہے۔“

”مگر بھگوان کسی لڑکی کو چومنے کی آشا لے کر دھرتی پر نہیں اترتا۔“

اس نے دوسری بار بھی مجھے مات دے دی۔ اب میں اسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اور وہ بولی۔

”آج تم نے مجھ سے پیار کیا ہے تو اس لئے کہ میرے من میں جینے کی آشا جاگ اٹھے اور وہ آشا جاگ اٹھی ہے، یہ پیار میرے جیون کی انمول پونجی ہے جسے اپنی یادوں کے آنچل میں باندھ کے رکھوں گی مگر میں چاہتی ہوں تم جب بھی میرے سامنے آؤ بھگوان کے روپ میں آؤ تاکہ لوگ تمہیں مہان سمجھیں اور تم مہان ہو بھی۔ عام آدمی ہوتے تو ان پر بتوں پر لوٹ کے نہ آتے۔“

یہ وچار کسی معمولی لڑکی کے نہیں ہو سکتے تھے، مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بانگی عام پہاڑی لڑکیوں سے بہت مختلف، بہت الگ تھلگ ہے اور میری عزت اور مہانتا کا بڑا خیال ہے اسے، میں ہنس کے بولا۔

”تو تو سچ سچ مجھے گیان سکھانے لگی۔“

”میں ایک ان پڑھ، گنوار لڑکی تمہیں کیا گیان سکھاؤں گی مگر چاہتی ہوں کہ میری بات

مانو۔ مانو گے نا؟“

”مانوں گا، بول اور کیا کہتی ہے؟“

”میرے اور اپنے بیچ فاصلہ رکھو نہیں تو لوگ باتیں کریں گے۔“

میں نے اسے، اس نے مجھے دیکھا اور میں نے موڑھا کھسکا کے کھاٹ سے ڈیڑھ دو فٹ پرے کر لیا۔

”کیا میرے تیرے بیچ اتنا فاصلہ کافی ہے؟“

اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تیر گئی اور بھیگی پلکوں سے مجھے دیکھنے لگی اسی لمحے دروازہ کھلا اور سردار گونبھی داخل ہوا، اس نے بانگی کو تکیے کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا تو حیران رہ گیا چہرے پر سرخی کی جھلک دیکھی تو اور حیران ہوا۔ ”اری بانگی بیٹا! پٹاما تو کہتا تھا تجھے اٹھنے بیٹھنے میں ابھی ایک مہینہ اور لگے گا۔“

”پر مہمان نے میرا ہاتھ پکڑا، میرے کٹے پیروں کو چھوا اور میں اٹھ کے بیٹھ گئی۔ اب تو ٹانگ بھی ہلا سکتی ہوں، یہ دیکھو۔“

بانگی سچ سچ اپنی ٹانگ ہلانے لگی۔ میں نے گھبرا کے ٹوکا۔ ”کیا کرتی ہے، گھاؤ دکھ جائیں گے۔“

”مجھے تو لگتا ہے گھاؤ اچھے ہو گئے۔“

”گو بھی چا چا اذرا پٹاما کو بلا لاؤ۔ میری پٹیاں کھول کر دیکھے تو سہی گھاؤ ہیں بھی یا نہیں۔“

سردار گونبھی انہی پیروں لوٹ گیا۔ بانگی اپنی ٹانگیں بار بار ہلاتی اور مجھے حیرت پاش نظروں سے دیکھتی تھی، اچانک اس نے پوچھا۔

”تم نے مجھے پیار کیا، میرے گھاٹل ٹخنوں کو چھوا اور تمہارے ہاتھ لگتے ہی میں اچھی ہو گئی۔ پہلے تو ٹانگ ہلانے سے ٹیسیں اٹھتی تھیں اب کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ سب کیا ہے؟ تم نے کون سا منتر پھونک دیا ہے مجھ پر؟“

میں خود حیران تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا مجھے، آنا فانا تپ چڑھی، من میں بانگی کو پیار کرنے کا شعلہ بھڑکا پھر اسے پیار کرتے ہی آنا فانا تپ جاتی رہی۔ اس کے گھاؤ اچھے ہو گئے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے کرشمہ سمجھوں یا کرامت؟ میں نے اس کی پٹیوں کو چھوا بھی ”کچھ پڑھا بھی۔“ ”یا حسی۔۔۔ یا قیوم“ صوفی عبد الجبار کے بتائے ہوئے دوشبہ ہی تو ہیں مگر جب کبھی بھگوان پر پورے وشواس کے ساتھ یہ شبد من کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں کوئی انہونی بات ہو جاتی ہے تو بانگی کے گھاؤ بھی شاید انہی شبدوں کی برکت سے اچھے ہو گئے تھے۔

وہ ابھی تک حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی، خاموشی کی زبان میں اپنا سوال بار بار دہرا

سب کھڑے تھے، ناگاہ اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کے میری طرف دیکھا۔ ”بیٹھ جاؤ پر بھو!“
میں اس کے الفاظ پر چونکا۔ پہلی بار اس زبان سے اپنے لئے ”پر بھو“ کا شبد سن کر میں
موڑھے پر بیٹھنے لگا تو بولی۔

”کھاتے پر بیٹھو اور مجھے سنا کرو۔“

میں کھاتے ایک جانب بیٹھ گیا۔ ”کس بات پر شاکر دوس؟“

”میں انجان تمہیں گیان سکھار رہی تھی۔“

کسی کو گیان سکھانا تو بڑی بات نہیں۔“

”پر بھگوان کو کون گیان سکھائے گا، کیا سورج کے سامنے دیا جلاں بھول اور نادانی نہیں؟“

”بہنگوان تو برا آدمی کے اندر ہوتا ہے، اس پر دشوار ہو تو کھن کا م بھی حل ہو جاتے ہیں۔“

کمرے میں ”ست ہے۔۔۔ ست ہے۔“ کا شور اٹھا، یہ بستی کے انہی لوگوں کی آواز تھی جو سردار تھا پابہادر کے ظلموں اور اپرا دھوں پر زبان نہ بلا سکتے تھے مگر اب سچائی کے گن گار ہے تھے۔ میں اٹھا اور بستی کے نئے سردار سے مخاطب ہوا۔

”سردار گوتھی! بجلوان کی دیا سے بانکی کے گھاؤ ٹھیک ہو گئے ہیں، اب اسے جیسا کھیاں

بنوادو، چلنا پھرنا سکھاؤ، کل ہم بستی سے کوچ کریں گے، اس کا نیا جیون شروع ہو گا۔

وہ کمر تک جھک گیا۔ ”جو آگیا پر بھنوا“

میں نے رخصت ہونے کے لیے قدم اٹھایا تو بانگی بولی۔ ”ٹھہرو ابھی۔“

میں وہیں رک گیا۔ اس نے گوتھی کو اشارہ کیا وہ پٹا ماسچاری اور عورتوں کو لے کر باہر نکل گیا۔

اب کمرے میں میں تھا، بانگی تھی اور ہمارے درمیان ایک حیرانی سی تھی جس کا کوئی نام نہ تھا۔

”تو نے سب کو بھیج دیا، مجھے کیوں ٹھہرا لیا؟“

”تنہائی میں پوجا کروں گی تمہاری۔“

اس کی آنکھوں سے ایک نئی بانگی جھانک رہی تھی، پلر دوپل مجھے بڑے دھیان سے دیکھتی

رہی پھر اسے خیال آیا کہ میں کھڑا ہوں۔

”بیوقوفوں کے نہیں؟“

میں موڑے پر بیٹھ گیا تو کچھ حیران سی ہوئی۔ ”کیا دور بیٹھو گے مجھ سے؟“

”تو نے کیا تھا تا تیرے اور اپنے بیچ فاصلہ رکھوں نہیں تو اوگ باتیں کریں گے۔“

”میں نے سب کے سامنے تمہیں اپنے پاس بٹھا کر وہ فاصلہ مٹا دیا تھا۔“

میں چوڑکا، واقعی اس نے ایسا کیا تھا۔

”تو نے سب کے سامنے مجھے ماتھا کیوں نہ کیا، یربھو کیوں کہا؟“

رہی تھی کہ ”تم نے کونسا منتر پھونکا ہے مجھ پر؟“

مگر میں کیا بتاتا، کیا جواب دیتا۔ اسی اثناء میں سردار گوٹھی، پٹاما پجاری کو لے آیا۔ ان کے پیچھے تین چار عورتیں بھی تھیں۔ شاید سردار نے انہیں بھی بانگی کی حالت کے بارے میں کچھ بتا دیا تھا اور وہ اس کی پٹیاں کھلنے کا سماں دیکھنے آ گئی تھیں۔

پٹاما پجاری کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ بانکی اٹھ کر بیٹھ سکتی ہے مگر جب اپنی آنکھوں سے اسے کھاٹ پر بیٹھے دیکھا تو ہکا بکا سا رہ گیا۔ قریب آیا تو بانکی نے بغیر پاؤں کے دونوں ٹانگیں کھاٹ پر ٹکا دیں اور بڑے وشواس سے بولی۔

”پیشیاں کھول دو پشاما۔“

پٹا مائے لرزتے، کانپتے ہاتھوں سے ایک کٹے پیر کی پٹیاں کھولیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں کوئی زخم نہ تھا۔ سارے گھاؤ اچھے ہو چکے تھے پھر دوسری ٹانگ کی پٹیاں کھلیں اور ادھر بھی وہی نقشہ تھا۔ پٹا مایہ پجاری، سردار گو مہمی، اس کے ساتھ آنے والی عورتوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، خود بانگی کے لئے بھی یہ ایک ناقابل یقین منظر تھا مگر کرامت ظہور میں آ چکی تھی جس نے سب کو بھونچکا سا کر دیا تھا۔ اچانک بانگی نے اعلان کر دیا۔

”مہمان نے میرے کٹے پیروں کو چھوا تھا، کچھ پڑھا تھا۔“

سب کی حیرت زدہ نگاہیں مجھ پر ٹک گئیں۔ پٹاما کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوف کی پرچھائیں بھی کانپ رہی تھیں، اسی سے بانکی خود کھاٹ سے اتر کی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے چہروں میں گر گئی۔ اس کے ساتھ دوسرے بھی جو کمرے میں موجود تھے۔ ”بھگوان۔۔۔ ہے۔۔۔ بھگوان۔۔۔۔۔“ کا جاپ کرتے جلدے میں گر پڑے۔ میں گھبرا کے موڑھے سے اٹھا اور

- 119 -

”یہ اچھا نہیں کہ آدمی، آدمی کے سامنے ذنڈوت کرے۔ ماتھا ٹیکے، پاؤں پڑے۔“ مگر کسی نے میری بات پر توجہ نہ دی۔ میں نے کہا ”اگر تم نہیں اٹھے تو میں چلا جاؤں گا یہاں سے۔“

پہلے بانکی نے سراٹھا کے مجھے دیکھا پھر دوسرے بھی اٹھے اور میں نے بانکی کو بازوؤں سے پکڑ کر پھر کاٹ پر بٹھا دیا۔ اب اتنا ادھیہ کارتول گیا تھا کہ سب کے سامنے اسے چھو لوں، ہاتھ لگا سکوں۔ وہ سب مجھے بھگوان کا اوتار سمجھ بیٹھے تھے اور میں جانتا تھا جو کچھ ہوا، اس کا کارن کیا ہے؟ میرے گورو صوفی عبد الجبار نے مجھے بھگوان پر، ایشور پر، خدا پر گہرے وشواس کا سبق دیا تھا۔ ایک وظیفہ یاد کرایا تھا جس کے کارن اس بستی میں کال کوٹھڑی سے رہائی کے بعد یہ دوسرا حیرت انگیز کرشمہ ظہور میں آیا، جس نے سب کو تصور حیرت بنا دیا۔

بانکی کھاٹ پر اپنے کٹے پیروں کے بل گھٹنے اٹھائے بیٹھی تھی۔ میں کھڑا تھا، دوسرے بھی

”میرے پاس آ کے بیٹھو، بتاتی ہوں۔“

میں موڑھے سے اٹھ کر کھٹ پر جا بیٹھا۔ ”بتائیوں بہا تھا پر بھو؟“

اس نے بڑی دھیمی، بڑی دلکش بڑی پراسرار آواز میں جسے صرف میں سن سکتا تھا وہ سن سکتی تھی، آہستہ سے کہا ”پر بھو۔“

اس ایک شہد میں اس کا پریم، اس کی آتما، اس کی بھگتی، اس کا جیون سب کچھ سمٹ آیا تھا۔

”کیا دیکھتی ہے میری آنکھوں میں؟“

”اپنے آپ کو۔“

”اور میں سمجھا شاید تو ان آنکھوں میں پر دیسی تھارو کوڈھونڈ رہی ہے۔“

”اسے تو میں نے اپنے بر پھو کے روپ میں ڈھونڈ لیا۔“

بانگی کی باتیں مجھے حیران کئے دے رہی تھیں۔ اچانک اس نے پوچھا۔

”کل سچ بچ چلے جاؤ گے؟“

”اگر جانا میرا آدرش نہ ہوتا تو تیرے پاس رکتا اور تجھے وہ گھائیاں، وادیاں دکھاتا جہاں تو بھاگی پھرتی تھی کبھی۔“

”بس بس۔۔۔“ اس نے اپنی انگلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں۔

”کبھی کبھی مجھے یاد کرنا کرو گے نا؟“

”تو جتنی ہے میں تجھے چھوڑ کے جا رہا ہوں مگر ایسا نہیں تو ہر سے میرے من میں رہے گی۔“

اور میں جہاں جاؤں گا تو میرے ساتھ ہوگی۔“

”مجھے وشواس ہے ایسا ہی ہوگا۔“ اور اس نے ایک بار پھر انکھیں بند کر لیں۔

”مگر میں یہاں سے نچت تب جاؤں گا، جب تو قول دے کہ خوش رہے گی۔“

اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔ ”لو پر بھو قول دیتی ہوں خوش رہنے کا۔“

میں کہہ رہا تھا۔ ”اب جانے کی آگیا دے، سویرے ملوں گا۔“

اس نے ہاتھ جوڑ کے پر نام کیا، میں کمرے سے نکلا تو سوچ رہا تھا اس نے مجھ سے ایک

نات توڑ لیا۔ دوسرا نات جوڑ لیا ہے اب وہ بانگی نہیں بلکہ اپنے پر بھو کی میرا بن گئی تھی۔



گلی سے گزرا تو بستی کے قبائلی مرد، کیا عورتیں ہاتھ جوڑ جوڑ کے پر نام کرتے اور کچھ ایسی

نظروں سے دیکھتے جیسے میں ابھی ابھی آکاش سے اتر آیا بدھ گیا کے مقدس بڑ کے نیچے گیان

دھیان کی سادھی لگا کر آیا ہوں۔

خانقاہ کے اندر بھی میری کرامت کا چرچا تھا اور میرے ساتھی سن چکے تھے کہ بیمار اور

گھائل بانگی جو پیر کٹ جانے کے بعد کھاٹ سے لگ گئی تھی کس طرح میرے ہاتھ لگتے ہی بھلی چٹکی ہو گئی، سارے گھاؤ آنا فنا اچھے ہو گئے۔ پٹیاں کھل گئیں اور اٹھ کے بیٹھ گئی۔ یہ سب کچھ وشال رائے، چان، کالی ناتھ اور کریم کیلئے تو ضرور ایک اچھا تھا مگر کایا پنتھا کے لئے نہیں، وہ اس سے بڑا اچھا اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا جب میں خانقاہ میں داخل ہوا، پٹاما پجاری کی آنکھوں ایک کواڑ کی اوٹ سے مجھے جھانک رہی تھیں مگر میں اسے نظر انداز کرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو دروازے کے پاس ہی ٹھٹک گیا۔ اور میرے ساتھی جمع تھے اور کایا پنتھا انہیں بتا رہا تھا۔

”کیشپ کے ایک مسلمان گورو ہیں صوفی عبد الجبار۔ رنگامتی میں رہتے ہیں، میں ان سے

مل چکا ہوں۔ بڑے غنی اور رشی منی قسم کے آدمی ہیں۔ یہ ساری انہونی باتیں انہی کی پرارتھنا سے

ہوتی ہیں۔ وہ کیشپ سے بڑا پیار کرتے اور اسے اپنے بیٹے مان سمجھتے ہیں۔“

ابھی کایا کا بھاشن جاری تھا کہ میں کمرے میں داخل ہوا اور وہ چپ ہو گیا، ابھی کی نظریں

ایک دم میرے چہرے پر جم گئیں، ان نظروں میں میرے لئے پریم اور وشواس تھا، میرے بیٹھے

ہی وشال رائے کہنے لگا۔

”کیشپ بابو اسب ٹوٹ بولتے ہیں تم کسی روگی کو ہاتھ لگاتے ہو تو اس کا روگ کٹ جاتا

ہے ذرا ایک ہاتھ میرے کو بھی لگا دو۔“

میں نہیں پرا۔ ”تمہیں کیا روگ ہے؟“

”اپنی کاروگ تم جانتے ہو، جب تک روپ تارا کی موت کا بدلہ نہیں لیا، میرے کو کل

نہیں آئے گی۔“

”اتنے بے کل کیوں ہوتے ہو وشال جی! سنساں میں ہر ادلے کا بدلہ ہے میرے گورو صوفی

عبد الجبار کہتے ہیں۔ انصاف کی گھڑی کبھی نہیں ملتے پر کبھی آدمی کو سے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

”میرے کو سے کا انتظار کرتے کرتے نو دس برس بیت گئے۔“

نجانے انگریزی کا یہ فقرہ میری زبان پر کیسے آگیا۔ ”The day will come“

ابھی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ وشال رائے کہنے لگا۔ ”انگریزی میں کیا بولتے ہو، اپنی

بھاشا میں بولو۔“

”وہ دن ضرور آئے گا، وشال جی! جب تمہارا دنیا سے ہوگا۔ کل ہم ساؤ گاری جا رہے ہیں

جہاں روپ تارا کا دیہانت ہوا تھا، کل تم اپنے دوشی سے ملو گے اور شاید کل تمہارے بدلے کا

دن ہوگا۔“

میرے الفاظ میں کوئی ایسی بات تھی کہ کوئی کچھ نہ بولا، وشال رائے کم صم سا بیچارہ، بعض

اوقات الفاظ تھوڑے ہوتے ہیں مگر ان کے اندر بہت کچھ ہوتا ہے اور وہ چند الفاظ ہی آدمی کو شانت کر دیتے ہیں۔ مگر وشال رائے کا دل جیسے ساگر کی غضب ناک لہروں کی طرح بیچ و تاب کھارتا تھا۔

رات کا بھوجن کرنے کے بعد ہم سب اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے تاکہ پوری طرح آرام کر سکیں، سویرے ہمیں پھر ایک کٹھن سفر کرنا تھا۔

پہاڑی بستی کے حالات اگرچہ بالکل بدل گئے اور قبائلی ہمارے دوست اور ہمدرد بن گئے تھے۔ خانقاہ پر بھی ہمارا قبضہ تھا اور ہمارے آرام کا پورا خیال رکھا گیا تھا، پھر بھی چان واحد آدمی تھا جو اس وقت بھی بستر پر نہ لیٹا اور بندوق سنبھالے خانقاہ کے دروازے پر پہرہ دیتا رہا اور اس رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔

ابھی صرف پہاڑ گزر رہا تھا باہر پہاڑوں کا پراسرار سناٹا چھا گیا اور خانقاہ کے اندر بھی خاموشی کا پہرہ تھا، جب میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بیداری سے نیند کے جنگل کی طرف سفر کرنے لگا۔ نیند کا یہ سفر کبھی سست اور کبھی تیز ہو جاتا، میرا ذہن اور اس کے ساتھ جیسے شری بھی اڑا جاتا تھا اور میں بڑے عجیب منظروں سے گزر رہا تھا کہ ناگاہک دیکھتا ہوں، خود تو خانقاہ کے کمرے میں بستر پر سویا ہوا ہوں مگر سوئے سوئے دیواروں کے پار بھی دیکھ سکتا ہوں چنانچہ میں دیکھتا ہوں کہ خانقاہ کے اس کمرے میں جہاں بھگوان بدھ اور اندر دیوتا کے بڑے بڑے مجسمے نصب تھے۔ پٹاما پجاری ایک تھیلے میں کچھ چیزیں ڈال رہا ہے جیسے کہیں جانے کی تیاری رہا ہو۔ وہ تھیلیا اپنے کندھے سے لٹکا کر کمرے سے نکلتا اور چوروں کی طرح بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا اور دروازے کی باریک سی جھری سے جھانکتا ہے تو باہر چبوترے پر چان بندوق اٹھائے چوکی کر رہا ہے۔ اس چوکی کے کارن پٹاما پجاری دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ غصے سے پلٹتا اور اندھیری رابداری میں دبے پاؤں چلتا ایک طرف گھوم جاتا اور اس دروازے پر آتا ہے جس کے کوارٹاریک، بوسیدہ زینے میں کھلتے ہیں، یہ زینہ گھومتا ہوا 38-40 فٹ گہری کال کوٹھڑی میں اترتا ہے اور پٹاما اس کی چکر دار دیوار پر ہاتھ رکھے ہوئے بے آواز تہہ خانے کی بوسیدہ پتھر کی سیڑھیاں اترنے لگتا ہے۔

میں کمرے میں بستر پر بھی سو رہا ہوں اور پٹاما کا پیچھا بھی کر رہا ہوں کہ کہاں جاتا اور کیا کرتا ہے دبے پاؤں سیڑھیاں اترتا۔ وہ ناف زمین تک اتری ہوئی کال کوٹھڑی کے دروازے پر پہنچتا اور اسے کھول کر اندر داخل ہوتا ہے پھر اوپے کا جنگل کھولتا اور دیہ سلائی جلا کر کوٹھڑی کو دیتا ہے۔ دیہ سلائی کی دم توڑتی روشنی میں وہ ڈر بہ نما موکھے سے جانوروں کی طرح گھٹنوں کے بل مڑتا اور بیت الخلاء میں پہنچتا ہے پھر دوسری دیہ سلائی جلا کر اس گہری سرنگ کو دیکھتا ہے

جو کایا پنتھا اور میں نے 13 دن میں کھودی تھی۔ سرنگ تاریک ہے مگر پٹاما اس میں داخل ہو جاتا اور ہولے ہولے نیچے اترنے لگتا ہے۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ کمند کے بغیر گہری کھائی میں کیسے اتر سکے گا۔ یہ خیال بھی آتا ہے، وہ خانقاہ سے چوروں کی طرح کیوں بھاگ رہا اور تھیلے میں کیا لئے جاتا ہے؟ فوراً سوچتا ہوں اس کا یوں نکل جانا اچھا نہیں مجھے شور مچانا چاہیے چنانچہ میں زور سے چلاتا ہوں۔

”پٹاما بھاگ رہا ہے۔۔۔ پٹاما بھاگ رہا ہے۔“

اپنی آواز کا شور سن کر میں خود بھی جاگ اٹھتا ہوں اور میرے قریب سوئے ہوئے وشال رائے اور کایا پنتھا کی آنکھ بھی کھل جاتی ہے، وہ بستر پر بیٹھ جاتے اور مجھے حیران سی نظروں سے دیکھتے ہیں اور یہ پٹاما نہیں کیونکہ اب میں بھی بستر پر بیٹھا ہوں وشال رائے نے پوچھا۔

”یہ تمہارے کو کیا ہوا کیشپ بابو! تم سوئے سوئے بڑ بڑا رہے تھے؟“

”کیا بڑ بڑا رہا تھا؟“

تم ہولے۔ ”پٹاما بھاگ رہا ہے، پٹاما بھاگ رہا ہے اور میرے کو دوشواس ہے، تمہاری آواز پٹامانے بھی اپنے کمرے میں سن لی ہوگی۔“

میں مسکرا دیا۔ ”نجانے مجھے کیا ہو گیا ہے، ابھی ابھی سپنا دیکھا کہ پٹاما پجاری تہہ خانے میں اتر اور سرنگ کے رستے بھاگ رہا ہے، میں نے سپنے ہی میں شور مچا دیا کہ پٹاما بھاگ رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے میرے شور سے تمہاری نیند خراب ہو گئی۔“

اچانک کایا پنتھا پریشان سا نظر آنے لگا۔ ”وشال بھیا! اگر کیشپ نے سپنا دیکھا ہے تو پٹاما ضرور بھاگا ہے۔“

”چنانہ کرو کیا! اسے بھاگنا ہوتا تو دن کو بھاگ جاتا۔ رات کو بھاگ کر جائے گا کہاں؟“

”آؤ ذرا دیکھیں تو۔۔۔۔۔“

دونوں اٹھ کر پٹاما کے کمرے کی طرف ہوئے اور فوراً ہی پریشان سے لوٹ آئے۔ کایا نے بتایا۔ ”پٹاما اپنے کمرے میں نہیں ہے۔“

”تو پہاڑی طوطا اڑ گیا۔“

وشال رائے حیرت پاش نظروں سے مجھے دیکھے جارہا تھا۔ ”کیشپ بابو! تم نے میرے کو

یہی بوا اٹھانہ کہ پٹاما سرنگ کے رستے بھاگا ہے۔“

”ہاں، شاید وہ نیچے اتر گیا ہو مگر ابھی کھائی سے نہ نکل۔ کا ہو گا۔ اسے وہیں پکڑ لو۔“

میں لپک کر فرش پر آیا اور ان دونوں کے ساتھ باہر لپکا، کریم اور کالی ناتھ بھی کلہاڑیاں لیکر ساتھ ہوئے۔ وشال اور کایا نے اپنی بندوقیں اٹھا رکھی تھیں چان نے خانقاہ کا دروازہ کھولا

اور ہمیں اس حالت میں نکلنے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ پٹاما کو ڈھونڈنے وہ بھی ہمارے ساتھ جانا چاہتا تھا، میں نے کہا۔

”تم یہیں رہو اور کسی کو خانقاہ سے باہر نہ نکلنے دو۔“

بستی کی گلی میں ناگاہ سردار گوٹھی سے ٹد بھڑ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک قبائلی بھی تھا، وہ جی ان ہوئے کہ ہم رات کو اچانک دھاوا کر کے کدھر جا رہے ہیں، میں نے بتایا۔

”پٹاما پجاری خانقاہ سے بھاگ گیا ہے، اسے ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔“

یہ ایک عجیب انکشاف تھا، گوٹھی اور قبائلی دونوں ہمارے ساتھ ہو لئے۔ اندھیری رات میں بستی کے پچھوڑے بھاگتے ہم اس گہری کھائی پر پہنچے جو خانقاہ کے عقب میں واقع تھی مگر دور و نزدیک کوئی سایہ بھی حرکت کرتا دکھائی نہ دیا، میں نے تاریک کھائی میں نارنج کی روشنی پھینکی مگر کھائی سنسان پڑی تھی۔ سوچا پٹاما نکل گیا اور اس کا نکل جانا ہمارے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں کھائی میں روشنی پھینکتا کنارے کنارے آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک خانقاہ کی عقبی دیوار اور سرنگ کے نیچے بلے کے ڈھیر پر جو گہری کھائی میں جوں کا توں پڑا تھا، ایک گہرا سادھوہ روشنی کے دائرے میں آیا اور گوٹھی پکارا۔

”وہ ہے پٹاما۔“

میں نے نارنج کی روشنی اس گہروے دھبے پر مرکوز کر دی۔ وہ پٹاما ہی تھا جو ایک بھاری پتھر کے پاس بے سدھ پڑا تھا، معلوم نہیں جیتا تھا یا مر گیا۔ اب کھائی میں اترنے اور اسے باہر نکالنے کا مسئلہ تھا، سردار گوٹھی نے اپنے ساتھی کو فوراً بستی کی طرف دوڑایا جو سرے آیا پھر وہی کھائی میں اتر، پٹاما کو رے کے ذریعے باہر نکالا گیا وہ مرا نہیں صرف بے ہوش تھا مگر اس کا جسم پتھروں کی رٹڑ سے بری طرح چھپلا گیا، بعض جگہوں سے گوشت اڑ گیا اور زخموں سے خون بہہ رہا تھا، غالباً وہ سرنگ ہی میں پھسل گیا اور اس کے ابھرتے کونوں سے ٹکراتا گھائل ہوا۔ سرنگ سے نکلا تو لڑھکتا ہوا گہری کھائی میں گرا اور سر بھاری پتھر پر پڑا جس کی چوٹ سے بے سدھ ہو گیا، جب باہر نکالا گیا، اسے ہوش آگیا وہ زخموں کی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔

پٹاما کو خانقاہ میں لایا گیا، اس کے ایک شاگرد پہرے دار نے زخموں پر کوئی دوا لگائی، پٹیاں باندھیں مگر وہ درد کی شدت سے ٹپ رہا تھا، سردار گوٹھی نے پوچھا۔

”پجاری جی! تم خانقاہ سے بھاگے کیوں؟“

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی اثناء میں، میں نے وہ تھیلا اٹھالیا جو مرہم پٹی کے دوران اس کے کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا۔ پٹاما نے کینہ تو رنظروں سے مجھے دیکھا اور چلایا۔

”اسے ہاتھ نہ لگاؤ۔“

مگر میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس میں ایک مورتی بھگوان بدھ کی جوانی کے سے کی اور ایک مورتی اندر دیوتا کی تھی۔ دونوں مورتیاں چاندی کی اور بڑی کاریگری سے بنائی گئی تھیں، مگر تھیلے سے جو انوکھی شے نکلی وہ ایک تہہ کیا ہوا مونا، کھر درا کاغذ تھا، صرف کاغذ نہیں بلکہ ایک بہت بڑا چتر تھا، میں نے اس چتر کو کھولا تو دنگ رہ گیا۔

ہاتھ کے بنے ہوئے اس رنگین چتر میں تین پہیوں والا ایک رتھ دکھایا گیا تھا جس کے آگے سفید رنگ کے دس گھوڑے جتے تھے، رتھ پر ایک ہرن سوار تھا اور دسوں گھوڑوں کی راسیں اس کے ہاتھوں میں تھیں۔ ہرن کے سینگوں پر چاند کی مانند ایک گول مک تھا جس کے بالے میں ستائیس ستارے چمک رہے تھے۔

میں اس چیز کو دیکھ کے بڑا حیران ہوا۔ قدیم زمانے کے رتھوں میں عموماً دو پیسے ہوتے تھے مگر یہ رتھ تین پہیوں کا تھا۔ میرے ساتھیوں کے ساتھ سردار گوٹھی نے بھی حیرت کی نظروں سے دیکھا اور ایک بار پھر پوچھا۔

”تم نے بتایا نہیں، کیوں بھاگ رہے تھے یہاں سے؟“

پٹاما پھر خاموش رہا۔ گوٹھی کے چہرے پر الجھن اور غصے کے آثار تھے۔

”یہ تمہیں کچھ نہیں بتائے گا سردار گوٹھی! میں بتاتا ہوں، تھاپا بہادر کومرتے اور تمہیں سردار بننے دیکھ کر پٹاما نراش ہو گیا اور جب اسے پتہ چلا ہم سویرے ساؤ گاری کی طرف کوچ کریں گے، اسے اپنے گرد پروہت گنجال کی چٹا ہوئی۔ اس نے سوچا یہاں سے بھاگ کر گنجال کو ہمارے آنے کی خبر کر دے تاکہ وہ ہمارے سواگت کی تیاری کر لے۔ کیوں پٹاما اسی لئے بھاگے تھے نا۔“

پٹاما کی چپ نہیں ٹوٹی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

”مگر سرنگ کے رستے بھاگنا تمہاری بھول تھی کیونکہ تمہیں معلوم نہ تھا کہ کمند کے بغیر سرنگ سے گزرنا اور گہری کھائی میں اترنا بڑے جوکھوں کا کام ہے جب ہم بھاگے تو کمند سے کھائی میں اترے تھے۔“

آخر پٹاما بول پڑا۔ ”تمہارے پاس کمند کہاں سے آئی تھی؟“

”ایک بھوت لایا تھا۔“

بھوت کا نام سن کر وہ کچھ خوف زدہ نظر آنے لگا۔ ”تمہاری بھوتوں سے یاری ہے کیا؟“

”صرف یاری نہیں رشتے داری بھی ہے۔“

میرے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ مجھے پٹوں میں اکثر چکرورتی چاچا کا بھوت نظر آتا

رہا ہے۔ اس لئے میں نے ”رشتہ داری“ والی بات غلط نہیں کہی تھی مگر میں چاچا کے بھوت سے ڈرتا ہوں۔ پناما پجاری میری سنجیدہ اور چچی تلی بات سن کر کچھ اور پریشان ہو گیا۔ اسے پہلے ہی شبہ تھا، شاید بھوت پریت میرے قبضے میں ہیں۔

”بانکی کے گھاؤ بھی تمہارے بھوت نے اچھے کیے ہیں۔؟“

”نہیں اسے بھگوان کی دیایا چتا رکھو۔“

”مگر پروہت جی کے سامنے تمہارا منتر نہ چل سکے گا۔“

”جب تمہارے پروہت جی سے سامنا ہو گا، تب دیکھوں گا وہاں کیا چلتا ہے، کیا نہیں

چلتا۔ اس سے تو مجھ سے چتر کی بات کرو، کس کا چتر ہے یہ؟“

نجانے کیوں میرا ذہن اسی پر اسرار چتر میں الجھ کے رہ گیا تھا۔ پناما پجاری نے مجھے حقارت کی نظر سے دیکھا اور بولا۔ ”تم اس دھرم کا یا کو نہیں سمجھ سکتے۔“

اچانک میں نے سوال کیا۔ ”تم ہنایان بدھ ہونا؟“

وہ چونک سا گیا۔ ”تم کیا جانو۔“

”اب تم کہو گے میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم بدھستو اوالو کستوار کے نام کی پوجا کرتے ہو۔“

یہ نام سن کر وہ مارے حیرت کے اچھل پڑا مگر اس کا شریر زخموں سے چور تھا، اس لئے کراہ

کے پھر لیٹ گیا، اب کچھ زیادہ ہی ڈراؤرا، سہا سہا نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر خوف کی پرچھائیاں

سی کانپ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں نے تم سے چتر کے بارے میں پوچھا تھا پناما؟“

اس کے چہرے پر ایک اور سایہ آ کر گزر گیا، آنکھوں سے وہم جھانکنے لگا، وحشت زدہ آواز

میں بولا۔ ”اپنے بھوت سے کیوں نہیں پوچھتے؟“

شاید جاننا چاہتا تھا کہ بھوتوں سے ناتے والی بات سچ ہے یا جھوٹ؟ وہ مجھے کچھ بتاتے بھی

ہیں یا نہیں؟ اور میں پریشان تھا کہ اس سے چتر کی حقیقت کیسے اگلاؤں، اچانک میرے اندر

کے آدمی نے سرگوشی کی۔

”تھارو کیشپ! سوم دیوتا کو کیوں بھولتے ہو جس کی کتھا پناما پجاری جل پنا کو سناتا رہا۔“

ایک لخت میرے ذہن کا دوار کھل گیا اور یاد آیا۔ ہندو شاستر اور پورانوں میں سوم دیوتا (چندر

ماں) کے رتھ کا ذکر آتا ہے کہ اس کے تین پیسے ہیں، تو یہ سوم دیوتا اور اس کے رتھ کا چتر ہے۔ اس

انکشاف کے بعد میں یونہی ایک دوپل مراقبے میں بیٹھا سر ہلاتا رہا، جیسے کچھ سن رہا، کچھ سمجھ رہا

ہوں، پھر سر اوپر اٹھایا اور پناما کو مزید ہراساں کرنے کے لئے پر جلال آواز میں کہنے لگا۔

”پناما! میں نے تم سے پوچھا یہ چتر کس کا ہے تم نے نہیں بتایا، مگر میرے بھوت نے اس کی

اصلیت کھول دی اور مجھے بتایا ہے کہ یہ چتر سوم دیوتا کا ہے جیسی اس کے تین پیروں والے رتھ

میں دن نقرہ گھوڑے جتے ہیں اور سوم دیوتا کا نام ہر گانک ہے جس کے ساتھ ہرن کا نشان دکھایا

جاتا ہے اور اس کا ایک اور نام ستانشو ہے، یعنی سفید کرن والا اور اس کے گول مکٹ پر جوستائیس

ستارے ہیں تو یہ اصل میں دکش کی ستائیس بینیاں ہیں جو سوم سے بیابھی کنیں، اس لئے نلشتر

(ستارے) کہلاتی ہیں۔“

یہ سنتے ہی پناما کا رنگ فق ہو گیا زخموں کے باوجود خوف سے چیخ مار کر اٹھ بیٹھا اور گھبرا کے

بولا۔ ”مجھے شاکر دو۔“

میرے ساتھی، سردار گوٹھی اور قبائلی بھی دم بخود تھے کہ میں نے کس طرح اس پر اسرار چتر کا

بھید کھول دیا اور کیا سچ کچ مجھے یہ سب کچھ کسی بھوت نے بتایا ہے؟ مگر میرا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا

کہ آیا اس چتر کا ان گرہن زدہ لڑکیوں سے بھی کوئی سمجندہ ہے جنہیں ساؤ گاری کے مندر میں

بھگوان کی نرتلیاں بنا کے رکھا جاتا اور سدا کنواری رہنے کا اپدیش دیا جاتا ہے؟ کوئی بات تھی

ضرور۔ اب اس چتر سے میری دلچسپی کچھ اور بڑھ گئی اور میں چاہتا تھا۔ پناما اس کے بارے میں

کچھ کہے، کچھ اعتراف کرے۔ میں نے اس کے خوف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تم ہنایان بودھ ہو اور بدھستو اعتقیدے میں دشو اس رکھتے ہو مگر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ

ہندوؤں کے سوم دیوتا اور اس کے چتر سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟ مگر جواب سچ ہونا چاہیے۔“

پناما کچھ سوچنے لگا جیسے کوئی فیصلہ کر رہا ہو پھر بولا۔ ”اگر سچ ہی سننا چاہتے ہو تو ان لوگوں کو

باہر بھیج دو۔“

میں سمجھا چتر سے کوئی ایسا بھید وابستہ ہے جسے سب کے سامنے بتانا نہیں چاہتا۔ میری

نظریں سردار گوٹھی کی نظروں سے ملیں وہ اشارہ سمجھ گیا اور سب لوگوں کو لے کر کمرے سے نکل

گیا۔ صرف میں اور پناما رہ گئے، تنہائی میں پناما کا برتاؤ کچھ بدلا بدلا سا تھا، ہمدردی کے لہجے

میں بولا۔

”اس چتر کے بارے میں بتانے سے پہلے میں تمہیں کچھ اور بھی بتانا چاہتا ہوں جیسی میں

نے لوگوں کو باہر بھیجنے کے لئے کہا تھا۔“

میں حیران ہوا۔ ”اور کیا بتانا چاہتے ہو؟“

”کچھ دھرم کا یا کے بارے میں سنو گے تو تمہارے ہی بھلے کی بات ہے۔“

”مگر بات لمبی نہ ہو۔ اپنا مطلب مختصر لفظوں میں بیان کرو۔“

اب پناما مجھے سمجھانے لگا۔ ”تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے تم دھرم کی کچھ شدہ بدھ رکھتے

اور بھوت پریت کو بلانے کا منتر بھی جانتے ہو پھر بھی ابھی بالک گہرو ہو اور نہیں جانتے کہ یہ

باتیں دھرم کا یا کے سامنے بالکل بیچ ہیں۔ اس قسم کے شعبہ سے جو تم لوگوں کو دکھاتے ہو صرف اگیانیوں کو حیران کر سکتے ہیں مہا گیانیوں اور بھگتوں کو نہیں۔“

”میں نے کہا تھا بات کو لمبا نہ کرو صرف اپنا مطلب بتاؤ۔“

”مطلب یہ تم پر وہت جی سے جھگڑا کرنے نکلے ہو مگر ان کی بھگتی اور شکتی کو نہیں جانتے۔ وہ گیان دھیان کے اس پڑاؤ پر ہیں جہاں تمہارے بھوت پریت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”تو پروہت گنجال گیان دھیان کے کس خاص پڑاؤ پر ہے؟“ میں نے تھوڑی سی دلچسپی کا اظہار کیا۔

”ہاں جی تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ ان سے جھگڑا مول لینا اچھا نہیں۔“ پٹاما اب مجھ پر دھرم کا یا کا رعب ڈالنے لگا۔ ”دھیان کی چار حالتیں یا چار شریں ہوتی ہیں۔ پروہت جی پہلی دو حالتوں سے گزر چکے اور اب تیسری شری کی تپیا کر رہے ہیں، بس تھوڑے دنوں کو چوتھی شری جانی جانے والے ہیں جسے ارہت اوستہا کہتے ہیں، اس اوستہا میں اندر باہر کے سارے دشمن آدمی کے بس میں ہو جاتے ہیں اور من میں اپار شانتی پیدا ہوتی ہے، اس حالت میں اگر بھگت سانس بند کر کے دھیان لگائے تو کچھ کھائے پے بغیر بھی بہت دنوں جیتا رہتا ہے کیونکہ وہ سنسار کے قاعدے قانون سے اوپر چلا جاتا ہے اگر تمہیں کچھ سیکھنا ہے تو پروہت جی کے داس بن جاؤ۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی ”اور ارہت اوستہا کے آگے بھی ایک حالت ہے جسے اوستہا کہتے ہیں اور جس کی تپیا کرنے والا بھگت خود بدھ (عقل کل) بن جاتا ہے اور بھگوان وشنو کے نویں اوتار کارو پ لیتا ہے۔ ہے نا؟“

پٹاما پر حیرت کا دورہ پڑا۔ ”تو تم دھرم کا یا اور گیان کے بارے میں بھی جانتے ہو؟“

”میں نے تم سے گیان دھیان کے بارے میں نہیں پوچھا تھا پٹاما؟“

وہ ایک بار پھر مجھے مرعوب کرنے لگا۔

”مگر تمہیں پروہت جی کے بارے میں ضرور جان لینا چاہیے، وہ بڑے شکتی مان اور لوگوں کو اپنے بس میں کر لینے کی ودیا جانتے ہیں۔“

”تم مجھے یہی بتانا چاہتے ہو نا، پروہت گنجال لوگوں کو بستر پر سوئے سوئے اپنی مرضی کے سپنے دکھا سکتا، اور نیند کی حالت میں انہیں اپنے پاس بھی بلا لیتا ہے۔“

پٹاما پتاری بھونچکا سا رہ گیا۔ ”پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا پروہت جی چاہیں تو بے جان مورتیاں چلنے پھرنے لگتی ہیں۔“

پٹاما کی اس بات نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ میں نے ساؤ گاری میں بھگوان بدھ کی اس

قد آدم مورتی کو جو اجل بدھ بوزھے ساگر ساؤ جی کے تابوت، نما کٹیا کو مہر میں ایستادہ تھی، اپنی آنکھوں سے حالت بیداری میں چلتے پھرتے دیکھا اور کانوں سے اس کے پیتل کے پاؤں ٹھسنے کی آواز سنی تھی۔ خون منجمد کر دینے والا یہ منظر غالباً میں نے دو تین بار دیکھا تھا اور اس کی کوئی وجہ یا علت میری سمجھ میں نہ آ سکی تھی۔ صوفی عبد الجبار سے پوچھا تو انہوں نے بھی اس کیفیت کو رویا اور کشف سے تعبیر کیا اور کہا، پیتل کی ایک بے جان مورتی چونکہ چل پھر نہیں سکتی لہذا اس کشف کی کوئی تعبیر کرنا ہوگی مگر آج پٹاما کی زبانی معلوم ہوا یہ شعبہ پروہت گنجال کے گیان دھیان سے ظہور میں آیا تھا جو انہونی کو ہونی اور ناممکن کو ممکن بنا دینے کی شکتی رکھتا ہے، میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔

”اچھا یہی بتاؤ گنجال کے حکم سے بے جان مورتیاں چلنے پھرنے کیسے لگتی ہیں؟“

”یہ سب کچھ دھرم کا یا اور گیان دھیان کی شکتی سے ہوتا ہے۔ سادھو، گیانی، بھگت، رشی جب دھیان کی سادھی لگاتے اور سنسار کے قاعدے قانون سے اوپر چلے جاتے ہیں تب اپنے شریر سمیت ہوا میں اڑنے لگتے بلکہ اپنی کایا، اپنی شکل صورت بھی تبدیل کر لیتے ہیں اور جو کچھ چاہتے ہیں ہو جاتا ہے۔“

”کیا جکتے ہو پٹاما! یہ دھرم کا یا ہے یا مدار کی کا بھنڈا؟“

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”ہمارے دھرم میں یہی لکھا ہے۔“

”یہ دھرم نہیں پا کھنڈ ہے کیونکہ دھرم کا یا تو اپنی ذات کے گیان یا عرفان کا نام ہے جس کے بعد آدمی نروان کا یا یعنی اپنی ملتی اور نجات کی ودیا حاصل کرتا ہے اور آخری درجہ جھوک کا یا کا ہے تم سمجھتے ہو گیانی اور بھگت تپیا کر کے ہوا میں اڑنے لگتے اور اپنی شکل و صورت تبدیل کر لینے پر قادر ہو جاتے ہیں مگر یہ سب خیالوں اور خوابوں اور سپنوں کی باتیں ہیں۔ جن کا حقیقت کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں، کوئی آدمی خواہ کتنا ہی بڑا بھگت یا رشی کیوں نہ ہو۔ نہ ہوا میں اڑ سکتا ہے نہ اپنی کایا بدل سکتا ہے بلکہ بھگوان کی دیا کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ گیان دھیان کا مقصد اپنے آپ کو پہچانا اور کرودھ، ہنکار سے بچنا ہے یہی تھا گت کی سکھشا ہے۔“

پٹاما کا ذہن منتشر ہونے لگا۔

”پھر پروہت جی نے دوسروں کو اپنی مرضی کے سپنے دکھانے اور اپنے بس میں کر لینے کی شکتی کیسے پراپت کر لی؟“

”اس کا دھرم کا یا سے کیا ناتا؟ ایسی باتیں تو کئی شعبہ باز بھی جانتے اور اپنی قوت ارادی یا نظر کی شکتی سے لوگوں کو حیران کر دیتے ہیں ہاں جنتر منتر کا یہ سفلی علم یا کالی ودیا پراپت کرنے کے لئے بھی آدمی کو اندر جال اور عملیات کی کڑی تپسیا کرنی پڑتی ہے، اگر گنجال کے پاس دھرم کا یا کی

کوئی شکتی ہے تو پانچ برس میں کایا پنتھا سے سارگلیان کی ذبیا کا پتہ کیوں معلوم نہ کر سکا؟“
 ”مگر تم جانتے ہو کایا کو پروہت جی کا حکم نہ ماننے کی کیا سزا ملی؟“
 ”گنجال کو بھی اس ہتیا چار کا بدلہ ملے گا اور بڑا کڑا بدلہ ہو گا کیونکہ آکاش پر بھگوان اور دھرتی پر انسان نے نیائے کرنے کی ٹھانی ہے۔“

پناما کچھ بکھ سا گیا۔ میں نے کہا ”گنجال کی بات چھوڑو۔ اس چتر کے بارے میں بتاؤ۔“
 اس کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا پھر بھی بولا۔ ”تم نے تھیک کہا تھا، یہ سوم دیوتا کا چتر ہے۔“
 ”مگر تمہارے پاس کیوں ہے؟“

”ہم بتایاں بودھ، برہما، اندر، سور یہ، سوم اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔“
 ”یہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر صرف سوم دیوتا کا چتر کیوں۔ مت بھولو تم نے سچ بولنے کا وعدہ کیا تھا۔“

”تو پھر سچ یہ ہے، سوم دیوتا سندرتا کا لوبھی اور برہما کی نسل سے انتقام لے رہا ہے۔“
 ”کیسا انتقام؟“
 پناما تفصیل بیان کرنے لگا۔

شاستروں میں لکھا ہے کہ اگلے یک میں سوم دیوتا نے (دیوتاؤں کے پروہت) برہسپت کی سندراستری تارا کو اغوا کر لیا تھا جس پر دیوتاؤں میں بڑی خوفناک جنگ ہوئی تھی، آخر برہما جی کے کہنے پر سوم دیوتا کوتارا واپس کرنا پڑی جس سے اس کے دل میں کروہ پیدا ہوا اور اس نے برہما کی نسل سے بدلہ لینے کا ایک انوکھا ڈھنگ نکالا۔ وہ دھرتی پر کسی سندرتا کی کو اس سے چن لیتا ہے جب وہ اپنی ماں کے گربھ میں ہوتی ہے پھر اس پر اپنا سایہ ڈالتا اور شریر کے کسی حصے پر اپنی مہر لگا دیتا ہے، جب لڑکی جنم لیتی ہے، اس کے جسم پر چاند گرہن کا نشان ہوتا ہے جس سے وہ سوم دیوتا کی امانت سمجھی جاتی ہے۔ دیوتا کسی منس کو اس کے پاس نہیں آنے دیتا اور آکاش سے اس کی رکھوالی کرتا ہے اگر کوئی نادان پھر بھی کسی گرہن زدہ لڑکی سے پریم کرنے لگے تو سوم دیوتا چالاکی سے ان میں کھنڈت ڈال دیتا اور ملاپ نہیں ہونے دیتا۔

پناما کی بات پہلو دار بھی تھی معنی خیز بھی، جس کے کئی معنی نکلتے تھے مگر میں نے کسی شے کا اظہار نہیں کیا اور پوچھا۔ ”اس کہانی کا چتر سے کیا واسطہ؟“

”تم نے اس بات پر دھیان نہیں دیا کہ سوم دیوتا کے سینگوں پر چندر ماں کا جو گول چکر بنا ہے، اس میں رائی سے بھی باریک چھوٹے چھوٹے دانے ابھرے ہیں، گرہن زدہ لڑکی کے شریر پر بھی چاند گرہن کا بالکل ایسا ہی داغ یا نشان ہوتا ہے۔“
 ”پھر کیا ہے؟“

”جب لڑکی چتر کی اس گول مہر اور باریک دانوں کو دیکھتی ہے تو چونکتی ہے کہ اس کے شریر پر ایسی ٹھپے کی چھاپ ہے گرہن زدہ لڑکی موہ مایا کے جال میں پھنس کر پریم کے سپنے دیکھنے لگے اور اپنا گھر بسانے کی سوچے تو اسے بتا دیا جاتا ہے کہ وہ سوم دیوتا کی مہر کی ہوئی لڑکی ہے، اگر اس نے کسی سے پریم کیا تو دیوتا دس گھوڑوں والے رتھ میں بیٹھ کر پیچھا کرے گا اور اس کے پریمی کا ناش کر دے گا جس سے لڑکی ڈر جاتی ہے۔“

”کیا وہ اس بات پر وشواس کر لیتی ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو ویسا ہی ہو گا؟“
 ”کیوں نہیں۔“ پناما بتانے لگا۔ ”پہلے اسے پورانوں اور شاستروں میں لکھی باتیں بتائی جاتی ہیں تاکہ وہ جان لے کہ سوم اگر برہسپت کی بیہتانی تارا کے لئے دیوتاؤں سے جنگ لڑ سکتا ہے تو اپنی مہر زدہ لڑکی کے پریمی کو کیسے چھوڑ دے گا۔ یہ باتیں بتا کر کچھ دن اسے سوچنے کی مہلت دی جاتی ہے، ساتھ ساتھ ناچ بھکتی کے نئے بھاؤ سکھائے جاتے ہیں۔ ناچ کا ریاض کرایا جاتا ہے کیونکہ وہ بھگوان کی نرتگی ہوتی ہے اور اس ریاض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف بھگوان یا اندر دیوتا کی شرن میں آکر سوم دیوتا کے انتقام سے بچ سکتی ہے اور اگر اندر دیوتا اس کے ناچ بھکتی کو سویکار کر لے تو وہ اس کے سوارگ کی اپسرا بن سکتی ہے پھر ایک رات بدھ دیو اور اندر کی مورتیوں کے سامنے اسے سوم کا یہ چتر دکھایا جاتا اور پوری کہانی پھر دہرائی جاتی ہے۔ اسی رات وہ موہ مایا کے جال سے نکلتی اور اپنے من سے پریمی کا خیال نکال کر بھگوان یا اندر کی شرن میں آجاتی اور سدا کنواری رہنے کا وچن دیتی ہے۔“

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیا کسی نرتگی پر ایسا عمل کیا گیا؟“
 ”جل پنا سے پہلے ساؤ گری کی نرتگی روپ تارا بھی موہ مایا کے جال میں پھنس گئی تھی اور اسے ناچ کا چلہ کاٹنے کے لئے اس خانقاہ میں بھیجا گیا تھا، وہ صرف سات دن یہاں رہی کیونکہ ساتویں رات جب اسے سوم دیوتا کا چتر دکھایا گیا۔ اس نے پریمی کو چھوڑ کر خود کو اندر دیوتا کے سپرد کر دینے کا وچن دیا اور پروہت جی کے ساتھ ساؤ گری لوٹ گئی مگر سنا ہے اس نے اپنا وچن توڑ دیا تھا جس پر وہ دیوتا کے انتقام کا نشانہ بنی۔“

پناما کے اس بیان نے میری سوچ کا نیا دوار کھول دیا۔ ”یہ بتاؤ جس رات لڑکی پر عمل ہوتا اور چتر دکھایا جاتا ہے، اس رات گنجال کہاں ہوتا ہے؟“

”اس رات پروہت جی خانقاہ میں ہوتے ہیں مگر لڑکی کے سامنے نہیں آتے بلکہ الگ کمرے میں اپنی سادھی لگا کر پوجا پاٹ کرتے ہیں، سویرے لڑکی خود جا کے ان کے چرن چھوتی اور بتاتی ہے کہ اس نے بھول کا پرانشیت کر لیا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ اس رات پروہت گنجال کہیں قریب ہی بیٹھ کر اپنے دھیان کی سادھی لگاتا،

”گنجال کے اس طلسمی نائک کانت کیا ہوگا، یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے اور اگر اپنے گورو کے انجام میں شریک ہونا نہیں چاہتے تو یہ سارے پاکھنڈ ختم کر دو جسے تم دھرم کا یا کا نام دیتے اور گیان دھیان کی شکتی سمجھتے ہو۔ تم یہ نہیں جانتے وہ اپنے لئے نرکھ کا پٹ کھول رہا ہے۔ تمہارے لئے بھلائی کا یہی راستہ ہے کہ اس کا ساتھ چھوڑ دو ورنہ دھرم کے نام پر کنواری کنیاؤں کا جیون ناش کرنے کے دوش میں تمہارے خلاف بھی کچھری لگے گی۔“

پٹاما بکا بکا سارہ گیا۔

”اور یہ بھی سن لو میں دیتوں، دیوی دیوتاؤں اور اپسراؤں کے خیالی وجود اور ظہور پر وشوا اس نہیں رکھتا۔ بھوت پریت کو نہیں مانتا مگر سپنے میں کبھی کبھی اپنے چاچا چکرورتی سہائے کا بھوت ضرور دیکھ لیتا ہوں جو مقدس مورتی کو ڈھونڈے بغیر پرلوک سدھار گئے، اب میں ان کا مشن پورا کرنے نکلا ہوں اور گنجال کی پراسرار شکتی میرا راستہ نہیں روک سکتی۔ اسے اپنے برے کرموں کا پھل بھوگنا ہوگا کیونکہ یہ میرا نہیں آکاش کا یا کا فیصلہ ہے۔“

پٹاما حیرت کے بھور میں غوطے کھا رہا تھا کہ یک لخت میں نے سوال کیا۔

”کیا تم قدیم پالی بھاشا پڑھ سکتے ہو؟“

وہ چند لمحے اچنبھے سے مجھے دیکھتا رہا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”اگر پروہت گنجال سارگیان کی ڈبیا حاصل کر لیتا تو اس میں بند پالی لکھت کس سے پڑھاتا؟“

غالباً وہ اس بات پر حیران ہو رہا تھا میں سارگیان کی کلید اسرار حاصل کر چکا اور اب اس تحریر کا بھید جاننے کی فکر میں ہوں وہ ایک دو پل کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”یہی بات ایک بار میں نے پروہت جی سے پوچھی تھی اور مجھے بتایا گیا تھا کہ دھات اور پتھر کے جگ کی کوئی لکھت بھی ملے تو ساؤ گاری میں اسے پڑھ لیا جائے گا۔“

یہ انکشاف بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔ ”کیا پروہت گنجال پرانی بھاشاؤں کو پڑھنے کی دیا جانتا ہے یا ساؤ گاری میں کوئی اور آدمی ہے؟“

”اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا پروہت جی نے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے گیان دھیان کی شکتی سے پرانی بھاشائیں پڑھ لیتے ہوں۔“

میں یک لخت کھڑا ہو گیا اور سردار گو بھی کو آواز دی۔ اس نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے پٹاما کی طرف اشارہ کیا۔

”سردار گو بھی! بانگی کی طرح پٹاما کی دیکھ بھال بھی تمہارے سپرد کرتا ہوں، اس کا خیال رکھو شاید اچھا ہو کہ بستی والوں کو دھرم کی سکھشادے اگر جانا چاہے تو روکنا نہیں مگر اپنے لوگوں کا بھلا

لڑکی کو ٹرانس میں لیتا اور اس پر اپنی پراسرار شکتی کا اثر ڈالتا ہوگا، جل پنا بھی ایسے ہی عمل کے لئے پہاڑی خانقاہ میں لائی گئی تھی مگر اس کا ذہن گنجال کے اثر میں نہ آ سکا تو تھا پنا بہادر کو حکم دیا گیا کہ اسے زیر زمین کوٹھڑی میں کایا پنتھا اور مجھ سے ملایا جائے، یہ گنجال کا آخری حربہ تھا جسے میں نے ناکام بنا دیا۔ اس کا پراسرار گورکھ دھندا میری سمجھ میں آ گیا، پہلے وہ پٹاما پجاری کے ذریعے لڑکی کے ذہن کو دیو مالائی کہانی سے متاثر کرتا اور سمجھ میں نہ آنے والی باتیں بار بار دہرائی جاتیں۔ اس مسلسل عمل سے لڑکی نفسیاتی طور پر متاثر ہونے لگتی تو ایک رات گنجال خود اپنے دھیان کی شکتی سے اسے مسحور کر دیتا۔

معلوم نہیں پٹاما پجاری اس کی اس حکمت سے واقف تھا یا اس کی پراسرار قوت کو دھرم کا یا کا اعجاز سمجھتا تھا مگر میں نے ضروری سمجھا کہ یہ طلسم توڑ دوں۔

”سنو پٹاما! تم امی تابھ بدھ کے پیروکار ہو کر ہندو شاستروں اور پورانوں کے دیو مالائی قصوں پر وشوا اس رکھتے ہو، میں نہیں رکھتا، تم نے سوم دیوتا کے انتقام لینے اور سندر لڑکیوں کو ان کی ماؤں کے گربھ میں چاند گرہن کا نشان داغنے کی جو کہانی سنائی ہے، وہ اس لئے غلط ہے کہ گرہن کا نشان تو بد صورت لڑکیوں اور بعض لڑکوں کے جسم پر بھی پڑ جاتا ہے بلکہ ایسا نشان بغض جانوروں پر بھی ہوتا ہے اس لئے برہما جی کی نسل سے سوم دیوتا کے انتقام کی کہانی پراسرار جھوٹی ہے اور جس عمل کی بنیاد جھوٹ پر ہو، وہ روحانی اور پوتر کیسے ہو سکتا ہے؟“

یہ دلیل سن کر پٹاما بغلیں جھانکنے لگا۔ ”پھر سندر اور کنواری لڑکیوں کے شریہ پر پانڈا گرہن کا نشان کیوں ہوتا ہے؟“

”تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ایسی لڑکیاں بڑی بھاگوان سمجھی جاتی ہیں، ان کے بیاہ ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کو جنم دیتی اور ہنسی خوشی اپنا جیون گزارتی ہیں۔“

”مگر پروہت جی کی ویدیا کہتی ہے کہ گرہن زدہ لڑکی صرف بھگوان کی زنتکی ہوتی ہے، اگر وہ کسی سے پریم کرے تو اس پر کشت آتا ہے۔“

”گنجال کی ویدیا دھرم کی ویدیا نہیں۔“

”اور کیا ہے؟“

”کالی ویدیا۔۔۔ سفلی علم جس پر اس نے دھرم کایا اور تپتیا کے پردے ڈال رکھے ہیں۔ وہ جس کارن گرہن کے نشان کو بھگوان کی زنتکی کی شرط قرار دیتا ہے۔ اس کے پیچھے ساؤ گاری کے پراسرار بھید چھپے ہیں جنہیں بہت جلد فاش کر دیا جائے گا، پھر کوئی گرہن زدہ لڑکی بھگوان کی زنتکی بن کر ساؤ گاری میں ناچ نہیں کرے گی۔

میں نے اسے یہ بھی بتا دیا۔

پاتے ہوئے گنجال کو یہاں نہ آنے دو۔“

پناما نے ایک بار پھر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا مگر میں اس پر توجہ دیئے بغیر باہر نکلا۔ جب اپنے کمرے میں آیا، رات کا تیسرا پہر بیت چکا تھا اور کایا پٹنھا اور وشال رائے میرا انتظار کر رہے تھے، میں نے انہیں بتایا۔

”پناما پجاری گنجال کا مہرہ ہے مگر اب اس کے کام کا نہیں رہا۔“

یہ کہہ کر میں بستر میں دیک گیا انہوں نے بھی دوسری بات نہیں کی۔



سویرے جب ہم نئے سفر پر روانہ ہونے کے لئے خانقاہ سے نکلے۔ سب قبائلی مرد، عورتیں گلی میں جمع تھے۔

خانقاہ کے چبوترے پر بانگی بے پاؤں کی ٹنڈ منڈ ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی اور پناما پجاری جس کے ہاتھوں، پیروں اور کچھوے کی مانند صاف کھوپڑی پر پٹیاں بندھی تھیں، اس کے پاس ہی چبوترے کے نیچے کھڑا تھا مجھے دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے پر نام کیا اور بولا۔

”پر بھو! اگر مجھ سے کوئی گستاخی اور بھول ہو گئی تو شاکر دینا۔“

میں پناما کے اس انداز گفتگو پر حیران رہ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”پیس نے جان لیا ہے تم اتم گیانی اور سچ مچ بھگوان کا روپ ہو جیسا بانگی کہتی ہے، تم نے جو کام سردار گو مہی کو سونپا ہے، اسے میں پورا کروں گا اور وچن دیتا ہوں کہ پروہت گنجال اب یہاں پاؤں بھی نہیں دھر سکے گا کیونکہ اس کے کارن بانگی کے پیر کھے، منگا کی جان گئی۔ سردار تھاپا مرا۔ میں گھائل ہوا اور بستی والوں پر پیتا آئی، مجھے رات ہی گیان ہوا ہے کہ گنجال ہمارے برے لیکھوں کی سیاہی ہے۔“

میری حیرت کچھ اور بڑھ گئی۔ ”یہ گیان تمہیں کیسے ہوا؟“

”رات کے پچھلے پہر میں نے ایک پینا دیکھا اور سپنے میں گنجال کو ایک بڑے چمکاؤر کے روپ میں اپنے لمبے لمبے پھیلائے اڑتے دیکھا جس سے میں سمجھ گیا کہ وہ دھرتی کی کوئی بد روح ہے کیونکہ شاستروں میں لکھا ہے۔ خبیث روہیں چمکاؤروں کا روپ دھار لیتی ہیں۔“

پناما پجاری کے سپنے نے بستی والوں کو بھی دنگ کر دیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے میرے پیر چھبے کیونکہ میں چبوترے پر کھڑا تھا اس نے اپنا وہ تھیلا جس میں بھگوان بدھ اور اندر دیوتا کی چاندی کی خوبصورت مورتیاں اور سوم دیوتا کے رتھ کا چتر تھا میرے چرنوں میں رکھ دیا اور بولا۔ ”تم ساؤ گاری جارہے ہو پر بھو! میری طرف سے یہ امانت پروہت گنجال کو لوٹا دینا اور کہنا پناما تمہارے انجام میں شریک نہیں ہوگا۔“

پناما کی اس تبدیلی پر مجھے اور میرے ساتھ بستی والوں کو بھی دلی خوشی ہوئی۔ بانگی نے چبوترے پر بیٹھے بیٹھے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

”یہ سب کچھ تمہارے اس آدرش کے کارن ہوا جسے لے کر تم یہاں آئے اور اب ساؤ گاری کی طرف جارہے ہو، پر میری آشا ہے جانے سے پہلے ہمیں کچھ گیان کی باتیں بتاتے جاؤ۔ تاکہ تمہارے جانے کے بعد ہم وہ باتیں ایک دوسرے کو سنائیں اور تمہیں یاد رکھیں۔“

میں سوچ میں پڑ گیا ان سے کیا باتیں کروں پھر اچانک کسی انجانی شکتی سے میرے من میں ایک زبردست تحریک پیدا ہوئی اور میں کہنے لگا۔

”جس طرح گھر سے گھر کی دیوار اور کھیت سے کھیت کی منڈیر ملی ہوتی ہے، اسی طرح آدمی بھی آدمی کا چارہ اور سہارا ہوتا ہے کیونکہ بھگوان نے اسے ایک دوسرے کا سنگی ساتھی بنایا ہے مگر آدمی بھگوان کے اس قانون کو نہیں سمجھتا اور کرودھ، ہنکار کا شکار ہو کر اپنے بھائی کا خون کر دیتا اور بھول جاتا ہے کہ اس کی گردن بھی کسی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح باپ بیٹی سے آنکھ پھیر لیتا، شکتی مان کمزور اور مجبور کے ساتھ انیائے کرتا اور گوروا اپنے چیلے کو دھوکا دیتا ہے مگر آکاش پر اور دھرتی پر بھی صرف ایشور ایک ایسا ساتھی ہے جو کسی دکھ اور مصیبت میں ساتھ نہیں چھوڑتا اور جب آدمی سچے من سے اسے پکارتا ہے، وہ اپنی دیا کا ہاتھ لمبا کر دیتا اور دکھیاروں کو تھام لیتا ہے، جیسے تمہارے گھروں کی دیواریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، اسی طرح تمہارے من بھی آپس میں ملے ہوئے چاہئیں تاکہ تم دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے کام آسکو۔“

تھا گت کہتا ہے، ذات پات، امیر غریب کی تمیز مٹا کر انسانوں کی سیوا کرنا، دوسروں کے کام آنا اور دکھیاروں کی خبر گیری کرنا ہی نروان کا اصل راستہ ہے جو سادھو، بھکشو، گیانی دھرم میں بے ایمانی کرتا ہے، اس کا کلیان نہیں ہوگا۔ تھا گت یہ بھی کہتا ہے کہ نروان من کی پرشانت اوستھا کا نام ہے اور سچ بولنے، ہنکار سے بچنے اور دوسروں کے کام آنے سے من کو شانتی ملتی ہے۔

سنسار میں ہر آدمی کے دو روپ ہوتے ہیں، ایک وہ جسے لوگوں سے چھپاتا ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ دوسرا وہ جس کی سب کے سامنے نمائش کرتا ہے کھرا آدمی وہی ہے جو اندر باہر سے ایک ہو اور جو اس کے من میں ہے، وہی زبان پر ہو۔ وہی آدمی نروان پاتا اور سو رگ میں باس کرتا ہے، تم بھی کھرے آدمی بنو۔ آج میں تم سے رخصت ہوتا اور بانگی کو ان سندروادیوں کی آتما اور میری بھی آتما ہے، تمہارے سپرد کئے جاتا ہوں، پہلے یہ تم لوگوں کی سیوا کرتی تھی، اب تم اس کی سیوا کرنا اگر بانگی کو کوئی دکھ پہنچا تو کوسوں دور میری آتما دھی ہوگی لیکن میں تم سے ملنے اور یہ دیکھنے پھر آؤں گا کہ تم میری آتما سے کتنے تھکے ہو۔“

ابھی یہ الفاظ میرے ہونے پر تھے کہ بانگی چیخ کر میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئی اور میں

(31)

کرامت

کانگٹو سے ہم نے جنوب کے ان برف پوش پریتوں کا رخ کیا جو رتنا گری کی وادی تک پھیلے تھے۔ ان وادیوں، گھاٹیوں کے حاشیوں پر مڑے مڑے راستے میرے اور کایا پنتھا کے دیکھے بھالے تھے۔ کانگٹو تک سفر اونچے پہاڑوں کے کنارے بڑی ہوشیاری اور خاموشی سے کرنا پڑا کیونکہ اس کے موڑ اور پیچ و خم بڑے بھیانک ہیں جن پر موت کی پگڈنڈیوں کا شبہ ہوتا ہے۔ ان اونچے اور برف سے ڈھکے پہاڑوں سے جب ہم دھن کی طرف مڑے تو قدرے اطمینان ہوا کیونکہ جنوب کی سمت راستے ذرا کم دشوار گزار ہیں۔ کانگٹو سے مڑتے ہی وصال رائے کہنے لگا۔

کیشپ بابو اڈیم پور میں جب تم نے ساؤ گاری سے پہلے پہاڑی خانقاہ میں چلنے کا بولا تو میرے کویوں لگا تھا، ہم اپنی منزل کھوٹی کر رہے ہیں مگر اب بولتا ہوں اگر ہم لوگ ادھر نہیں آتے تو بڑے گھائے میں رہتے، تم نے بانگی کو نیا جیون دے کر بستی والوں کو اپنا داس بنالیا۔“

میں چپ رہا۔ بانگی کی قربانی کا خیال مجھے بے چین کر رہا تھا مگر وصال رائے پھر بولا۔

”ایک بات اور بول دوں۔ وہ پہاڑی لڑکی میرے کورپ تارا کی چھوٹی بہن لگی، بالکل اسی کے موافق بولتی تھی حالانکہ اس نے روپ تارا کو دیکھا بھی نہیں تھا۔“

”دیکھا تھا اس نے روپ تارا کو۔“

”کہاں دیکھا تھا؟“

”اسی خانقاہ میں۔“

”کیا بولتے ہو کیشپ بابو! وصال تڑپ اٹھا۔“

”ٹھیک بولتا ہوں۔ پناما پجاری نے بتایا تھا مجھے روپ تارا بھی خانقاہ میں لائی گئی تھی، اس نے بھی سات دن ناچ بھگتی کا چلہ کاٹا تھا پھر گنجال کے ساتھ ساؤ گاری لوٹ گئی۔“

وصال رائے چلتے چلتے رک گیا۔ ”تم نے میرے کو یہ بات بستی میں کیوں نہ بول دی؟“

”بول دیتا تو کیا ہوتا؟“

”میں اس کمرے کے درشن کرتا جہاں وہ ٹھہری تھی۔“

”میرے اور کایا موسا کے ساتھ تم دو راتیں اسی کمرے میں تو گزار آئے ہو مگر کو نہیں

نے اپنے پیروں پر اس کے گرم گرم آنسوؤں کی نمی محسوس کی۔ میں نے پیر پیچھے نہیں ہٹائے اور اسے اپنے چرتوں سے لپٹ کر نیر بہانے کا ادھیکار دیا اور یہ ادھیکار ہر لڑکی کو نہیں دیا جاتا، پھر میں نے، سب نے اس کی آنسوؤں میں بھگی آواز سنی۔

”پر بھو! تم نے مجھے ابھاگن کو اتنا مان دیا کہ مجھے جیون کی ساری خوشیاں مل گئیں اور اپنی آتما کہہ کر مجھے سہاگن کر دیا، تم سچ سچ بھگوان کا روپ ہو اور سدا بھگوان کے روپ میں میرے سامنے آئے تاکہ سب کی نظروں میں اونچے رہو۔ میرا باپ دنیا کو گنجال کی آنکھوں سے دیکھتا تھا، میں سنسا کو تمہاری آنکھوں سے دیکھتی ہوں اور سنسا مجھے سندر نظر آتا ہے۔“

”پھر روتی آنکھوں سے نہیں مسکراتی نظروں سے مجھے رخصت کرو۔“

اس نے باری باری میرے دونوں پیر چومے اور گردن اوپر اٹھائی تو چہرے پر دھنک کا رنگ بکھرا تھا اور بھگی پلکوں کی چلمن سے پوتر مسکراہٹ جھانک رہی تھی۔

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کے بستی والوں کو نمسکار کیا اور جانے کی آگیا لی مگر کوئی نہیں بولا۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے، سب چپ تھے، میں چوتھے سے اترا اور سردار گوبھی کی طرف بڑھا اور وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا اور گلو گیر آواز میں بولا۔

”پر بھو! جب ساؤ گاری سے لوٹو گے بانگی کو بیساکھیوں کے سہارے چلتا پھرتا پاؤ گے۔“

میں نے پلٹ کر بانگی کی بھگی پلکیں اپنی انگلیوں کے گوشوں سے صاف کیں، اس طرح میں بانگی سے رخصت ہوا۔

میرے پیچھے پیچھے کایا پنتھا اور وصال رائے بھی بانگی کے سر پر ہاتھ رکھ کر جدا ہوئے جیسے باپ بیٹیوں سے جدا ہوتے ہیں، دونوں کی آنکھیں بھگی گئی تھیں۔ سردار گوبھی اور کچھ لوگ دور تک ہمیں رخصت کرنے آئے۔

○○○

چلتے رہو۔“

وہ پریشان سا ہو گیا پھر چلتے چلتے کہنے لگا۔

”میں نے سنا ہے مرنے والے جن کمروں میں بیٹھتے ہیں، جن راستوں سے گزرتے ہیں، ان کی آتماں راستوں پر بھٹکتی ہے، ان کمروں میں جھانکتی ہے مگر آتما کا کوئی شری نہیں ہوتا۔“

میں تعجب سے اس کی بات سنتا رہا اور وہ جذبات کی رو میں بہتا چلا گیا۔

”تو روپ تارا کی آتما نے بھی میرے کو دیکھ لیا ہوگا اور جان گئی ہوگی کہ میں اس کے واسطے کتنا دکھی ہوں اور میرے کو بھی چین پڑے گا جب اس کے دوشی کا لیکھا چکا دوں گا۔“

وشال رائے کو اپنی بہن سے بڑا پیار تھا، اس کی یاد ہر وقت دل میں جلتی، سلگتی رہتی تھی۔ یہ جان لینے کے بعد کہ وہ بھی خانقاہ میں لائی گئی اور اسی کمرے میں ٹھہری تھی جہاں وہ دو راتیں گزار آیا تھا۔ اس کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی، پھلتی آواز میں بولا۔

”اگر تم روپ تارا کی بات میرے کو خانقاہ میں بول دیتے تو اچھا تھا۔“

”وہ کیوں؟“

”میں ان دیواروں سے لپٹ کے روتو لیتا۔“ اور سچ مچ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”جی تو نہیں بولا تھا۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اپنے آنسو روک لو ووشال رائے! تمہارے رونے سے روپ تارا کی آتما دکھی ہوگی۔“

اس نے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ آنسو روک لئے کچھ بولا بھی نہیں اور اپنی بہن کا غم سینے میں دبائے چپ چاپ چلتا رہا۔

کالی ناتھ اور کریم ہمارے پیچھے پیچھے تھے تو کایا پنتھا اور چان چند قدم آگے آگے۔ کایا اور ووشال دونوں گنجال کے ڈسے ہوئے، حالات کے ستائے ہوئے تھے۔ ان کے اپنے دکھ، اپنے گھاؤ ہی بہت تھے مگر میں نے محسوس کیا کہ بانکی کے ایسے نے انہیں مزید اس اور ٹمگین کر دیا اور اپنے اپنے غموں کے بوجھ میں انہوں نے بانکی کے غم کا بھی اضافہ کر لیا تھا۔ میری حالت ان سے کچھ مختلف تھی۔ ان کے دکھوں اور بانکی کے ایسے کے علاوہ مجھے ایک اور غم بھی تھا، مدایا بھکشو کا غم۔

اس سفر میں گونگے مدایا کا خیال بار بار سستا تا اور پریشان کرتا رہا۔ میں سوچتا، پروہت گنجال اسے ساؤ گاری میں واپس نہیں لایا ہوگا۔ مدایا کی آنکھوں کے سامنے گنجال نے کتنے ہی جرم، کتنے ہی پاپ کئے تھے، اپنے کرموں پر پردہ ڈالنے کی خاطر اس نے بچارے مدایا کو کہیں راستے ہی میں جان سے مار ڈالا اور کسی کھڈ میں پھینک دیا ہوگا، بھلا وہ اپنے جرموں کا جیتا جاگتا ثبوت ساتھ کیوں لئے پھرتا۔

میں سوچ رہا تھا اگر مدایا بھکشو نہ ملتا تو میں پہاڑی خانقاہ تک پہنچ سکتا، نہ کایا پنتھا کا سراغ ملتا۔ خانقاہ والی مہم میں گونگے مدایا کا بڑا حصہ تھا اور اسی کے طفیل میں کایا پنتھا اور جل پنا سے مل پایا۔ اس کے انجام کے بارے میں سوچتا تو دل بیٹھنے لگتا دراصل بعض گھڑیاں ایسی نامبارک ہوتی ہیں جن میں آدمی اپنے محسنوں سے بچھڑ جاتا انہیں کھو بیٹھتا ہے کچھ ایسی ہی نامبارک گھڑیوں میں بانکی کے پیر کٹ گئے تھے۔ مدایا بھکشو گنجال کے یا پھر موت کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ ان دونوں صدموں نے میرے من میں شکاف ڈال دیئے اور پروہت گنجال سے نفرت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس سے نمٹنے کے لئے ذہن میں کئی خاکے بنتے، کئی نقشے بگڑتے اور میں ابھی تک طے نہیں کر پایا تھا کہ جو نیا کھیل شروع ہوا ہے اس کی آخری چال کیا ہوگی۔

میرے ساتھ کایا اور ووشال جیسے آدمی تھے جو گنجال کی جان کے دشمن تھے، چان، کالی ناتھ اور کریم ایسے شکاری تھے، جو صرف گنجال کا شکار کھیلنے نکلے تھے اور اب جوں جوں ہم کانگو سے دور اور رتنا گری کے قریب ہوتے جا رہے تھے، ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں، ہر کوئی اسی شکار کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کے لئے ہم گھروں سے نکلے تھے، مگر یہ شکار ایک سانپ کا تھا جو اپنے خفیہ راستوں کو پہچانتا اور بے آواز چلتا تھا۔

سہ پہر کے قریب جب دن ڈھل گیا ہم شمالی پر بت کی اسٹڈیم نما قدرتی سیڑھیاں اتر کر اس کی ترائی میں داخل ہوئے اور رتنا گری کے گھنے جنگل میں ٹھنڈے پانی کا چشمہ پار کر کے انا تھ بندو کی سادھی پر پہنچے کیونکہ ساؤ گاری کی طرف بڑھنے سے پہلے ہمیں کچھ سوچنا، کچھ طے کرنا تھا۔

میں اور کایا پنتھا یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مدایا بھکشو کی وہ کمند جسے ہم پہاڑی خانقاہ سے فرار کے بعد انا تھ بندو کی سادھی پر چھوڑ گئے تھے، وہیں پڑی تھی اور کسی نے اسے چھوا تک نہ تھا کیونکہ اسے جس حالت میں رکھا گیا تھا جوں کی توں اسی حالت میں موجود تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک مہینے کے دوران ساؤ گاری کا کوئی باسی سادھی پر نہیں آیا۔ مجھے عجیب سا خیال آیا کہ شاید مدایا بھکشو کی آتما ان جنگلوں میں بھٹکتی اس کند کی دیکھ بھال کرتی ہے جس کے ذریعے ہم نے بندھی گھر سے رہائی پائی تھی۔

ساؤ گاری کا فاصلہ یہاں سے تین چار میل سے زیادہ نہ تھا اور ساؤ گاری گنجال کا قلعہ تھا، اب جب کہ اس کے ساتھ کھلی جنگ تھی، اس قلعے میں سوچے سمجھے بغیر داخل ہونا خطرناک تھا، وہ مجھے کایا پنتھا اور ووشال رائے کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جائے گا اور نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ ساؤ گاری اس کا گھر تھا، اپنے گھر میں اسے اونچا بولنے، چیخنے چلانے، شور مچانے اور اپنے سہارے محافظ ہم پر چھوڑ دینے سے کوئی نہ روک سکتا تھا، سوال یہ تھا۔ گنجال پر وار کیسے اور کدھر

دنیا سے کوسوں دور جہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں، ایسی عظیم عمارت بنانا پاگل پن کی علامت ہے۔ وشال رائے نے کہا ”میرے کو لگتا ہے گوچی ساؤ نے جو خود بھی اس ویرانے میں مرکب کیا، کسی گہرے بھید کو چھپانے کے لئے یہ جگہ پسند کی ہوگی۔“

”پرا بھی تک کوئی اس گہرے بھید کی گرہ کھول نہیں سکا کہ گوچی ساؤ نے اپنے پر یوار کو اس ویرانے میں کیوں لا بسایا تھا۔ تین صدیاں بیت گئیں، ساؤ پر یوار کونسل درنسل یہاں رہتے ہوئے، ہر نسل اس بھید کو سینے سے لگا کر بیٹھی رہی۔ مگر اب ساؤ گاری کے اسرار کھلنے کا سے قریب آ گیا ہے۔“

میرے ان الفاظ نے ایک جادو سا پھونک دیا اور سب چپ ہو گئے وہ غالباً سوچ رہے تھے کیا گنجال بھی ساؤ گاری کا کوئی بھید ہے؟

انہوں نے اپنی بندوقیں بھاری کپڑوں کے نیچے اس طرح چھپا رکھی تھیں کہ کوئی دیکھ نہ سکے مگر ضرورت کے وقت انہیں فوراً نکال لیا جائے۔ اسی احتیاط کے ساتھ چلتے ہم ساؤ گاری کے واحد پھانک پر پہنچے جو دکھن کی جانب تھا، چوکیدار مجھے دیکھ کر بولا۔

”پرنام کیشپ بابو! آپ کدھر چلے گئے تھے، مالک آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہار گئے۔ بیمار پڑ گئے۔“

”اب کیسے ہیں سروپ جی؟“

”کیا بتاؤں آپ خود ہی جا کر دیکھ لیں۔“ چوکیدار کی آواز بھرا گئی۔

میں بری طرح چونکا۔ ”بتاؤ کیا ہوا سروپ جی کو؟“

”ان کی حالت ٹھیک نہیں، وہ بتانے لگا۔“ بہت دن ہوئے آپ کا کھوج لگانے اتر کو گئے تھے مگر نراش لوٹ آئے اور آٹھوں پہر آپ کو یاد کرنے لگے، پھر بستر سے لگ گئے۔ اب تو ان کا روگ بہت بڑھ گیا ہے، کل سے کچھ بولتے بھی نہیں۔“

میرا ماتھا ٹھنکا۔ ”پر وہت گنجال کہاں ہے۔“

”سب لوگ دوا دارو میں لگے ہیں، پر وہت گنجال بھی بچھا بچھا سا ہے نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔“

”سندرمتی آئی کہ نہیں؟“

”کل جب مالک کی حالت بگڑنے لگی، پیگو کو بائی پارہ بھیج دیا گیا کہ جا کر سندرمتی کو لے آئے مگر آنے میں دو تین دن تو لگ جائیں گے۔“

میں یہ سب کچھ سن کر دنگ رہ گیا۔ سروپ جی کی اچانک بیماری سے بہت کچھ بگڑ سکتا تھا۔ پیگو کو بائی پارہ کی طرف دوڑانے کا مطلب یہ تھا معاملہ خطرناک ہے اور سندرمتی کو اس لئے بلایا

سے کیا جائے۔ وشال رائے نے تجویز پیش کی۔

”دشمن کے قلعے میں گھسنے کی بجائے دشمن کو قلعے سے باہر نکالو۔“

”وہ کیسے؟“

”میرے کو ایک ترکیب سوچھی ہے۔ کالی ناتھ گنجال کے پاس ٹھاپا بہادر کا سندیس لے کر جائے اور بولے کہ تھاپا نے ملنے کو بولا اور بلایا ہے۔“

”گنجال، کالی ناتھ کے سندیس پر کبھی دشواس نہیں کرے گا سوچے گا تھاپا نے اپنا آدمی نہیں بھیجا، ایک اجنبی کو کیوں بھیج دیا۔“

”مگر کالی ناتھ بول دے گا کہ وہ شکر کا آدمی ہے اور اس کے ساتھ کایا پنتھا کو لے کر ماسے پکڑ کے لایا ہے۔“

”اس سے تو اور گڑبڑ ہوگی، کیا خبر گنجال نے شکر کو کیا ہدایات دے کر برما بھیجا تھا اور کایا کو دوسری بار پہاڑی خانقاہ میں لایا جائے گا یا نہیں۔ فرض کرو اگر شکر کایا کو پکڑ کے لے آتا ہے تو اتنی اہم خبر اسے خود لے کر آنا چاہیے۔“

”یہ تو تم ٹھیک بولا کہ خبر نہیں کہ کایا کے بارے میں ان کا اصل پروگرام کیا ہے، ادھر اپنے کو اس ٹائم کوئی اور تدبیر نہیں سوچھتی، تمہی کچھ بولو کیتا کرنا چاہیے۔“

میں نے ان سب کو چونکا دیا۔ ”تم سب کو یہاں چھوڑ کر کیوں نہ میں اکیلا ہی ساؤ گاری میں جاؤں۔“

”میرے کو تمہارا اکیلا جانا منظور نہیں۔“ وشال رائے بولا۔ ”جب ہم گنجال کا شکار کرنے کے واسطے اکٹھے نکلے ہیں تو اکٹھے ہی چلو۔“

سب نے اس بات پر اتفاق کر لیا اور مجھے بھی یہ رائے اچھی لگی مگر میں نہیں جانتا تھا کہ ساؤ گاری میں حالات کی صورت کیا ہوگی۔ اس لئے یہ بات واضح کر دی کہ جب تک میں نہ کہوں، ان میں سے کسی کو بھی آپ سے آپ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”ٹھیک ہے کیشپ بابو! جیسا تم بولو گے ویسا ہی ہوگا۔“

یہ بات طے کر کے ہم انا بھ بنڈو کی سادھی سے روانہ ہوئے۔

○

شمالی جنگل سے گزر کر جب پہاڑی ویرانے میں اس یکا و تنہا عمارت کے پاس پہنچے جو تین صدیوں سے کتنے ہی اسرار و عجائبات کو اپنے سینے میں چھپائے کھڑی تھی۔ شام کے اندھیرے نے اپنے پر پھیلا دیئے تھے اور ان تلکجے اندھیروں میں ساؤ گاری کوئی جادو نگری معلوم ہوتی تھی۔ میرے ساتھی اس قلعہ نما عمارت کو دور ہی سے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرنے لگے کہ مہذب

جا رہا ہے کہ سروپ جی اپنی خاندانی وصیت اسے منتقل کر سکیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ساؤ گاری کے حالات اتنی تیزی سے بدل جائیں گے۔ میرے نزدیک سروپ جی کی بیماری کا کارن گنجال ہی تھا جس نے انہیں مجھ تک پہنچنے نہ دیا اور اب وہی ان کا علاج بھی کر رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے پوچھا۔

”سروپ جی اوپر چوبارے میں ہیں یا نیچے والے کمرے میں؟“

”کل تک چوبارے میں تھے مگر آج تیسرے پہر انہیں نیچے اتار لیا گیا۔“

”تو اب کہاں ہیں؟“

”مندر میں۔“

”مندر میں کیوں؟“

”یہاں کی یہی ریت ہے۔“ چوکیدار اداس لہجے میں بولا۔ ”جب ساؤ پر یوار کا کوئی پرکھ انت کال (جان کنی) کو پہنچتا ہے اسے مندر میں لایا جاتا ہے۔ آخری دوا اور آخری پرار تھنا مندر میں ہوتی ہے۔“

چوکیدار کی زبان سے ”انت کال“ کا شبد سن کر میری جو حالت ہوئی، بیان نہیں کر سکتا۔ ایک تلوار تھی جو مجھ پر لپکی ایک بجلی تھی جو دل پر گری اگر سروپ جی کا دیہانت ہو گیا تو انہیں دیئے ہوئے وچن کے مطابق مجھے اور سندرمستی کو ان کی جگہ سنبھالنا تھی اور ساؤ خاندان کے پرکھوں کی طرح وہ سب کچھ کرنا تھا جو تین صدیوں سے ہوتا آ رہا تھا۔ میں بدحواس سا ہو کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا اور ڈیوڑھی سے بہ عجلت گزرتا ساؤ گاری کے وسیع و عریض صحن میں داخل ہوا جس کا رقبہ کئی ایکڑ پر مشتمل تھا، میرے ساتھی میری پریشانی کا مطلب نہیں سمجھتے تھے، تاہم میرے پیچھے لپکے وہ باہر ہی اس قلعہ نما عورت کی اونچی فصیل اور برجیاں دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ صحن میں پہنچے تو چاروں طرف گوٹ کی مانند غلام گردشوں نے انہیں مہبت سا کر دیا، چشم حیرت سے غلام گردشوں، ان کے حجروں اور دور شمال کی طرف دو منزلہ، سہ منزلہ عمارتوں کو دیکھتے میرے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا مگر ساؤ گاری میں دیانتی کے آثار نظر نہ آتے تھے، صحن یا غلام گردشوں میں کسی کی صورت بھی دکھائی نہ دی کیونکہ ساؤ گاری کے پرانے باسی شمال مشرق کی جانب ایک الگ تھلگ محلے میں رہتے اور شاید شام کے بھوجن میں مصروف تھے۔

صحن کے پتھوں پتھوں کبڑے درختوں کے ساتھ ساتھ اس روش پر چلتا جو رہائشی عمارتوں کی طرف جاتی تھی، میں سامنے والی غلام گردش میں پہنچا اور پورب کو مڑ گیا۔ مندر اسی جانب تھا۔ شام کے گہرے اندھیروں میں ساؤ گاری پر ایک المناک پراسرار خاموشی سی طاری تھی اور اس

خاموشی میں میرے دل کی دھڑکنیں لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھیں کیونکہ سروپ جی کے پرلوک سدھار جانے کی صورت میں میں گرفتار بلا ہو سکتا تھا، ذہن میں نئے نئے سو سے ریگنے لگے اور اب من ہی من میں پرار تھنا کر رہا تھا کہ اے بھگوان! سروپ جی کو کچھ نہ ہو وہ جیتے رہیں اور انت کال سے لوٹ آئیں۔

یہی پرار تھنا کرتا ابھی مندر کو جانے والی راہداری میں داخل ہوا تھا کہ ناگاہ مندر کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور ان کا شور میرے دل میں نئے دھماکے پیدا کرنے لگا میرے ساتھی بھی گھنٹیوں کے اچانک شور پر بری طرح چونک اٹھے۔ یہ ناچ پوجا کا سہ تھا نہ دن کیونکہ ناچ پوجا منگل کے دن اور سورج نکلنے پر کی جاتی تھی۔ تب مندر کی گھنٹیاں بجتی تھیں، ان دنوں بھگوان کی کوئی نرتکی بھی یہاں موجود نہ تھی۔ جل پنا جا چکی تھی، پھر پوجا کا ناچ کون کرے گا۔ گھنٹیاں کیوں بجنے لگی ہیں؟ اور خود ہی میرا من اس خیال سے کانپ اٹھا کہ شاید سروپ جی کا دیہانت ہو گیا یا ہو رہا ہے اور یہ گھنٹیاں ان کی آخری گھڑیوں کا اعلان کر رہی ہیں۔

یہ سوچ کر میں لپکتا جھپکتا مندر کے دروازے پر پہنچا، سیڑھیاں پھلانگتا اندر داخل ہوا اور ایک بڑے ستون کے پاس ٹھٹھک گیا۔ میرے ساتھی میرے پیچھے آ کر رک گئے۔ مندر میں بھگوان بدھ کے عظیم الہیت مجسمے کے چرنوں میں جس کا سر چھت کو چھو رہا تھا، بہت سے دیے روشن تھے، جن سے چراغاں سا ہو رہا تھا۔ فضا میں صندل کی خوشبوورچی بسی تھی، بھگوان کے چرنوں سے بہت کرچوڑے کے پاس فرش پر ایک بستر بچھا تھا جس پر سروپ ساؤ جی ایسی حالت میں پڑے تھے کہ ان کی آنکھیں چھت پر لگی تھیں، گلے میں گھنگرو بول رہا تھا اور موت ان کے سر پر کھیل رہی تھی، یہ دیکھ کر مجھ پر ایک سکتہ سا گزر گیا۔

میں نے کچھ اور بھی دیکھا۔ سروپ جی کے آس پاس پروہت گنجال، ساؤ گاری کا گونا کھیا، شاستر اور دو سادھو کھڑے تھے۔ گنجال تچھے سے ان کے منہ میں شاید پانی ڈال رہا تھا۔ پانکتی کی طرف اجل بدوش بوڑھے دادا سا گرساؤ جی کی پاکی رکھی تھی اور بڈھا پاکی میں نیم دراز اپنے پوتے کے مرنے کا حسرتناک سماں بڑے اسہاک سے دیکھ رہا تھا۔ پاکی سے ڈرا بہت کر ساؤ گاری کے گونگے بھکشو ایک قوس نما دائرے میں آلتی پالتی مارے بھگوان سے خاموش پرار تھنا کر رہے تھے، میں حیران ہوا کہ وہ چھ نہیں پورے سات ہیں۔ پھر ایک ایک کر کے گنتی کی وہ سات ہی تھے اور میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ مدایا بھکشو بھی ان کے درمیان موجود تھا، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اسے مندر میں دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی، لگتا تھا کہ میں سپنا دیکھ رہا ہوں۔

سب لوگ سروپ جی کی جان کنی کے جگر خراش منظر میں اتنے کھو گئے تھے کہ کسی نے ہماری

بوڑھے کے کانوں سے لگا دیا اور اس کا گول سپیکر گنجال کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اسپیکر میں بولا۔
”آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں دادا۔“

اس کے جواب میں بوڑھے نے جو کچھ کہا۔ اسے میں نے بھی سنا اور گنجال نے بھی مگر گنجال کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، بوڑھے نے کہا تھا۔

”گھنٹیاں بند کرادو اور سب لوگوں کو لے کر مندر سے نکل جاؤ، صرف تمہارو کیشپ سروپ کے پاس رہے گا تا کہ سروپ مرنے سے پہلے گوچی ساؤ کی وصیت اور ساؤ پر یوار کا بھید اسے بتا سکے۔“
پروہت گنجال نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”دادا۔ کیا تمہارو کیشپ کو ساؤ پر یوار کی وصیت سننے کا ادھیکار ہے۔“

”ہاں..... ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

”مگر وصیت تو ساؤ پر یوار کا وارث ہی سن سکتا ہے اور وہ سندرمتی ہے۔“

”تمہارو کیشپ بھی وارث ہے۔“

فرط تحریر میں گنجال کے ہاتھ سے اسپیکر چھوٹ گیا اس نے دوبارہ اسپیکر اٹھایا اور کہا۔

”سروپ جی پرانت کال کا سہ ہے وہ سن نہیں سکتے، بول نہیں سکتے۔“

”اگر سروپ نہیں بولے گا تو میں بولوں گا اور تمہارو کیشپ کو وہ بات بتاؤں گا جو ساؤ پر یوار میں سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔“

اس طرح ساگر ساؤ جی نے زبان سے کچھ بتائے بغیر میرے اور سندرمتی کے ناتے کا انکشاف کر دیا اور پروہت گنجال نے اٹھ کر اپنا سروپ ساؤ جی کے سامنے جھکا دیا۔ ”دھن ہو کیشپ جی۔“

میں اگرچہ ساؤ خاندان کا بھید اور گوچی ساؤ کی وصیت جاننے کے لئے بڑا بے چین رہا اور سروپ جی سے اس بارے میں بحث بھی کر چکا تھا مگر اب جب کہ تین صدیاں پرانا راز آپ

سے آپ مجھ پر منکشف ہونے والا تھا میرا من کر رہا تھا کہ گوچی ساؤ کی وصیت سننے سے انکار کر دوں۔ ساؤ گاری کے پرکھوں کی طرح مجھے اس ویرانے میں سنیاں نہیں لینا تھا بلکہ میں تو سندرمتی کو بھی اسرار کے تانے بانے سے نکالنے آیا تھا مگر سروپ جی کی موت مجھے اس تاریک گھبراہٹ

میں جکڑنے والی تھی اور میرے آزاد جیون کا خاتمہ ہونے والا تھا گنجال مجھے دھبا دکہ کر پیچھے ہٹا کہ بوڑھے ساگر ساؤ جی کی ہدایت پر عمل کرے اس کے اشارے پر مندر کی گھنٹیاں بجنا بند ہو گئی

تھیں اور ایک لخت ایک پر ہول خاموشی کا احساس ہوا میں اس خاموشی میں کسی انجانی طاقت سے پکارا۔

”رک جاؤ پروہت گنجال! سروپ جی نہیں مر سکتے۔“

گنجال انہی قدیموں پر رکتا ہوا۔ سب لوگ حیرت پاش نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ خود

میں نے اپنے الفاظ پر غور کیا تو حیرت زدہ رہ گیا کہ آخر یہ الفاظ میری زبان سے کیسے نکل گئے۔
میں ایک دم توڑتے ہوئے انسان کو کیسے بچا سکتا ہوں، میرے پاس کیا ہے؟

ناگاہ میرے اندر سے ایک آواز آئی۔ ”تمہارے پاس کچھ ہے تو سہی۔“

”کیا ہے، بولو کیا ہے میرے پاس۔“ میں نے جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی، مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میرے اندر کا آدمی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا، پھر اس کی کوئی آہٹ تک

سنائی نہ دے سکی اور لوگ مجھے یوں دیکھ رہے تھے گویا میں کوئی مجبوط الحواس، پاگل آدمی ہوں، ایک لخت ایک عجیب خیال ذہن میں سرسرایا جس نے مجھے چونکا دیا میں ڈوبتے دل کے ساتھ

سروپ کے پاس فرش پر بیٹھ گیا اور ان کا ٹھنڈا بے جان ہاتھ جس سے زندگی کی ساری حرارت رخصت ہو چکی تھی، اپنے ہاتھ میں لے کر تڑپا اور ساتھ ہی دوشبد، دو نام میرے من کے کھلے کواڑ

سے نکل کر ہونٹوں پر آ گئے۔

”یا حسی۔۔۔ یا قیوم۔“

بس یہی دو نام تھے جنہیں زیر لب دہراتا، پکارتا اور تڑپتا رہا کیونکہ سروپ جی کا اس طرح رخصت ہونا میرے لئے ناقابل برداشت صدمہ تھا، میں نے وظیفہ پڑھتے سے اپنے من میں

یہ بات ٹھان لی تھی کہ دنیا کا پالنے والا، جگت کا ایشور جی و قیوم خدا مجھے اس صدمے سے بچالے۔
شاید میں نے ایک سو ایک بار من کی پوری لگن کے ساتھ ان ناموں کا ورد کیا جو دوبار پہلے بھی

میری مشکل کشائی کر چکے تھے، پھر سروپ جی کے ساکت چہرے اور ہونتی چھاتی پر پھونک ماری اس کے ساتھ ہی میں نے ان دوشبدوں، دو ناموں کی تیسری معجز نامائی دیکھی اور سروپ جی کے

شریر میں ایک ہلکی سی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ ہو لے ہو لے ان کی ٹنگی ٹوٹی اور پتلیاں آنکھوں میں جنبش کرنے لگیں، دوسری عجیب بات یہ ہوئی کہ گلے میں بولتے گھنگرو کی آواز بدلنے اور

مہم پڑنے لگی، حتیٰ کہ سانس کا چلتا گھرا بند ہو گیا، جیسے موت کی باڑھ اتر گئی اور آئی ٹل گئی ہو، ان کا سر ہلا، گردن ہلی اور نظریں چھت سے اتر کر بھگوان بدھ کے رخسے پر آئیں۔ پھر وہاں سے

پروہت گنجال کے چہرے پر ٹک گئیں جو مبہوت سا کھڑا تبدیلی کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے پتھر کی کی بے جان مورتی کے شریر میں آتما اور جیون کی لہر کو حرکت کرتے دیکھ رہا ہو۔ اس کے

زردیک یہ ایک انہونی اور ناقابل یقین بات تھی کہ ایک ایسا شخص جس کے گلے میں موت کا گھرا چل رہا ہو، پر لوک کو چھوڑ کر لوٹ آیا ہے۔ جبکہ اس کی ویدک ودیا کچھ اور کہتی تھی جو نہی نظریں

سروپ جی کی نظروں سے ملیں وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔

”کیشپ جی آگئے ہیں۔“

اب سروپ جی کی سماعت بھی لوٹ آئی تھی۔ گنجال کی آواز کے ساتھ ہی ان کی نظروں کا

سروپ جی بھی اس بات پر چونکے تھے کہ میں نے انہیں جیون دیا ہے حیرت زدہ سے بولے۔

”میں نہیں جانتا کہ کیا ہوا مگر چند گھنٹیاں پہلے میں کسی اور ہی سنسار میں تھا اور اس دنیا سے بہت دور نکل گیا تھا، نہ تم لوگوں کو دیکھ سکتا نہ تمہاری آواز سن سکتا تھا، میں نے دیکھا ایک بہت بڑا کالا سمندر ہے جس میں بہا جا رہا ہوں اور دور ایک ساحل نظر آتا ہے جہاں عجیب سے رنگ کا اجالا ہو رہا ہے۔ اس اجالے میں بہت سے ان دیکھے لوگ ساحل پر میرا سواگت کرنے آئے ہیں، مگر ایک آدمی ہاتھ ہلا کر مجھے لوٹ جانے کا اشارہ کر رہا ہے اور وہ آدمی میرے سؤرگباشی پتا جی منگل ساؤ تھے، میں دیکھتا ہوں کہ کالا سمندر آدھا ادھر، آدھا ادھر اور میں بیچ میں ہوں۔ اب نہ آگے بڑھ سکتا، نہ لوٹ سکتا تھا مگر اپنا تک یوں لگا کسی نے پچھلے ساحل سے ہاتھ بڑھا کر جسے میں چھوڑ آیا تھا مجھے پکڑ لیا اور سمندر سے نکال کے پھر ساحل پر پہنچا دیا، شاید تم لوگ اس بات پر دوشواس نہ کرو کہ وہ ہاتھ جس نے مجھے کالے سمندر سے نکالا میںوں لمبا تھا اور میں نے محسوس کیا، وہ بھگوان کا ہاتھ ہے۔“

سروپ جی کی بات سن کر گنگال بتانے لگا۔

”انت کال کی گھڑی میں کیشپ جی نے آپ کا ہاتھ پکڑا کر اور بیٹھ کے کوئی جاپ کرتے رہے پھر کچھ پھونک دیا اور آپ پر لوک سے لوٹ آئے۔ میں اس انتر دھیان پر انہیں پرنام کرتا ہوں“ اور گنگال نے سچ سچ میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

سروپ جی نے میرے انتر دھیان اور جاپ کی بات سنی تو چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی اور بڑے غور سے مجھے دیکھنے لگے۔

”کیشپ بیٹے! اگر وہ تمہارا ہی ہاتھ تھا جو مجھے کال روپی ساگر سے کھینچ لایا تو تم سچ سچ بھگوان کا روپ ہو اور میں بھی تمہیں پرنام کرتا ہوں۔“

ابھی وہ ہاتھ جوڑ ہی رہے تھے کہ میں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔

”سروپ جی! یہ ہاتھ پرنام کرنے کے لئے نہیں مجھے اشیر واد دینے کے لئے ہیں۔“

”پھر سروپ جی کیوں کہتے ہو، پتا جی کہونا مجھے۔“

”پتا ہی مانا ہے آپ کو۔“

اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گئے، مجھے پکڑ کے گلے سے لگایا۔ ماتھا چوما اور پروہت گنگال سے مخاطب ہوئے۔

”سناتم نے تمہارے کیشپ میرا بیٹا ہے؟“

”یہ بات میں دادا سے سن چکا ہوں۔“

اس نے پاکی کی طرف اشارہ کیا اور سروپ جی نے اپنے اجل بدوش دادا ساگر ساؤ جی کو

زاویہ مجھ پر گرا، میں ابھی تک ان کے قریب ہی فرش پر بیٹھا تھا، بس مجھے دیکھا اور دیکھتے رہے پھر آنکھوں سے دو نمونے نمونے قطرے ڈھلک آئے، شاید زبان سے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر الفاظ آنسوؤں سے پیچھے رہ گئے اور انہوں نے دو قطروں کی زبان میں مجھ سے پوری داستان کہہ دی، میرا دل بھی پکھل کر آنکھوں میں آ گیا، میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو پونچھے تو میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اشارہ کیا کہ ان کے ساتھ لگ جاؤں، میں جھک کر ساتھ لگا۔ انہوں نے مجھے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا اور بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رونے لگے۔

ان کے رونے نے سب کو زلا دیا، چند لمحے اسی طرح مجھے ساتھ لگائے ہلکتے رہے، میں نے انہیں شانت کیا۔ تسلی دی پھر سب نے ان کی آواز سنی۔

”کیشپ بیٹے! تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں آپ کہیں کھو گیا تھا۔“ یہ آواز زندگی کا ثبوت تھی جس نے سب کے من میں نئی جوت جلا دی۔ انہوں نے پروہت گنگال کو بھی اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ ”گنگال سے پوچھو میں تمہارے لئے کتنا بے چین تھا۔“

”میں کیشپ جی کو بتا چکا ہوں کہ آپ ان کے کھوج میں پہاڑی خانقاہ بھی گئے تھے۔“

میں حیران تھا گنگال کی اس دیدہ دلیری کو اس کی ذات کا گن سمجھوں یا کھوٹ، سروپ جی کہنے لگے۔ ”شاسترو کا خیال تھا کہ شاید تمہیں خانقاہ میں قید کر دیا گیا ہے، ہم نے خانقاہ کا ایک ایک کمرہ دیکھا وہاں جل پنا تھی تم نہیں تھے۔“

”اچھا ہوا تمپ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔“

”کہاں چلے گئے تھے؟“

”ایک مہا پرش نے مجھے اپنا خاص مہمان بنالیا تھا۔“

”کون تھا وہ مہا پرش؟“

”اسے اپنی تپسیا اور شکتی پر بڑا مان ہے اور بہت جلد ارہت اوستھا میں داخل ہونے والا ہے۔“

گنگال نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس بات پر حیران اور متذبذب تھا کہ میں نے انگلی اس پر نہیں رکھی، صرف اشارے کنائے سے کام لے رہا ہوں، پھر بات سے بات نکلی۔

”آپ سے بڑا شکتی مان کون ہوگا کیشپ جی! جہاں ویدک ویدیا کا انت ہو جاتا ہے۔ وہاں آپ کا انتر دھیان چلتا ہے، یہ تو کوئی ارہت اوستھا سے بھی آگے کی تپسیا ہے، آپ کی شکتی نے

سروپ جی کو نیا جیون دیا۔“

اس کے لہجے میں میری پرارتھنا، روحانی شکتی اور کرامت کا اعتراف بھی تھا اور حیرت کے جھروکوں سے اندر کا خوف بھی جھانک رہا تھا، شاید سمجھ نہیں پایا تھا کہ چند منٹ کے اندر ایک آدمی جان کنی کے بھنور سے کیسے نکل آیا اور کال ساگر کی لہروں نے ڈوبتے شریر کو کس طرح چھوڑ دیا۔

دیکھا جو پاکی میں بت سا بنا ہمیں تگے جا رہا تھا، سروپ جی بوڑھے سے نظریں ہٹا کر گنجال کی طرف متوجہ ہوئے۔

”دادا نے کیشپ کے بارے میں تم سے کچھ کہا؟“

”ہاں کہا۔“ وہ بتانے لگا۔ ”جب ہم سمجھے کہ آپ کے پرانے تیا گنے کا سہ آگیا ہے اور جیون کی صرف چند گھڑیاں باقی رہ گئی ہیں، تب دادا نے کہا کہ میں سب لوگوں کو لے کر مندر سے نکل جاؤں اور کیشپ جی ساؤ پر یوار کی وصیت سننے کے لئے آپ کے پاس رہ جائیں کیونکہ یہی آپ کے بعد ساؤ گاری کے وارث ہیں۔“

”دادا نے سچ کہا ہے۔“

گنجال نے میری طرف دیکھا پھر سروپ جی سے بولا۔

”میں اس چناؤ پر آپ کو دھن باد کہتا ہوں مگر یہ بات آپ نے مجھ سے چھپائے رکھی۔“

اسی لمحے بوڑھے ساگر ساؤ جی نے ہاتھ ہلا کر مجھے اپنے پاس بلایا اور موت کی طرح ٹھنڈے ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام کر اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔

”ہریگ میں کچھ لوگوں کو موت پر، کچھ لوگوں کو جیون پر ادھیکار ہوتا ہے اور ہم انہیں رشی منی کہتے ہیں۔ اس یگ کے رشی تم ہو۔“

میں پہلے بھی بتا آیا ہوں کہ ایک تو بوڑھے کا بوجہ ناقابل فہم تھا، دوسرے وہ قدیم آسامی زبان کے متروک الفاظ استعمال کرتا تھا جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اس کی یہ بات بھی میرے، سروپ جی اور پروہت گنجال کے سوا شاید ہی کسی نے سمجھی ہو، پھر اس نے کہا روں کو پاکی اٹھانے کا اشارہ کیا کیونکہ وہ اپنی کٹیا کو مہر میں واپس جانا چاہتا تھا ساؤ گاری کے گونگے بھکشو ہی اس کے کہار تھے وہی اسے کبھی کبھار نیچے لاتے اور اوپر لے جاتے تھے۔

پاکی اٹھی تو میں نے دیکھا صرف مدایا بھکشو ساتھ نہیں گیا بلکہ ایک طرف کھڑا حیرت سے مجھے دیکھتا رہا۔ یوں لگا کچھ کہنا اور کچھ بتانا چاہتا ہے، میں اس کی طرف توجہ دیتا مگر ناگہا مندر کا سماں بدل گیا اور وہ کھیل شروع ہوا جس کی شاید کسی کو توقع نہ تھی۔

○

گونگے کہار بوڑھے کی پاکی اٹھائے مندر کے دروازے کی طرف بڑھے تو سروپ جی اور شاید پروہت گنجال نے بھی پہلی بار کچھ اجنبی لوگوں کی صورتیں دیکھیں جو مندر کی اسٹیج سے بہت پرے نیم تاریک گوشے میں کھڑے تھے۔ بوڑھے کی پاکی دروازے سے نکل گئی تو سروپ جی نے ان کی طرف ہاتھ اٹھا کر پوچھا:

”کون ہیں یہ لوگ؟“

”میرے ساتھ آئے ہیں۔“ میں نے فوراً وضاحت کی۔

”پھر دور کیوں کھڑے ہیں انہیں آگے بلاؤ۔“

انہوں نے خود ہی ہاتھ ہلایا اور ذرا اونچی آواز میں (کیونکہ اب ان کی جسمانی طاقت کچھ بحال ہو چکی تھی) میرے ساتھیوں کو آگے آنے کی دعوت دی۔ کایا پنتھا، وشال رائے نیم تاریک گوشے سے نکل کر آگے بڑھے۔ چان، کالی ناتھ اور کریم وہیں کھڑے رہے۔ کایا اور وشال نے سروپ جی کے پاس آ کر پرنام کیا تو دیوؤں کی روشنی میں ان کی شکلیں بالکل واضح ہو گئیں۔ پروہت گنجال انہیں دیکھ کر بری طرح چونکا اور اس طرح گھبرا کر کھڑا ہو گیا، جیسے جنگل کے باگھ گھر میں گھس آئے ہوں، میں نے اسے اتنا پریشان و بدحواس پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید سروپ جی نے اس کی بدحواسی پر توجہ نہیں دی اور مجھ سے کہنے لگے۔

”اپنے ساتھیوں کی جان پہچان نہیں کراؤ گے؟“

”پروہت گنجال نے پہچان لیا ہے انہیں۔“ گنجال کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

”مگر میں کسی کو نہیں پہچانتا۔“

”آپ انہیں جانتے نہیں پہچانیں گے کیسے، شاید نام سنے ہوں۔“

سروپ جی کچھ چونکے۔ ”کیا نام ہیں ان کے۔“

میں نے کایا پنتھا کی طرف انگلی اٹھائی۔ ”یہ برما کے شہر سنگ کالنگ حکامتی کا زمیندار اور

جل پنا کا باپ کایا پنتھا ہے۔“

”کایا۔۔۔ پنتھا۔۔۔“ انہوں نے بڑی حیرت، بڑی بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”مگر

میں نے سنا تھا جل پنا ایک انا تھ لڑکی ہے، اس کے پتا کا دیہانت ہوئے پانچ برس ہو گئے۔“

”جس آدمی کو جیتے جی گہری قبر میں اتار دیا جائے وہ لوگوں کے لئے مرجاتا ہے مگر کایا پنتھا

قبر سے نکل آیا ہے اور آپ کو بتائے گا کہ ابھی اس کا دیہانت نہیں ہوا۔“

کایا پنتھا بولا۔ ”میرے مرنے کی خبر جھوٹ تھی، مجھے کچھ لوگوں نے اپنا بندی بنا لیا تھا۔“

سروپ جی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے، میں نے ان کی حیرت میں کچھ اور

اضافہ کر دیا۔ ”پچھلے دنوں جب میں رنگامتی سے لوٹا آپ کو دو عورتوں کی ایک تصویر دکھائی تھی یہ

ہے وہ تصویر“ میں نے اپنی جیب سے تصویر نکال کر ان کے ہاتھ میں دے دی۔ ”ان دو عورتوں

میں ایک جل پنا کی ماں چندر بالا ہے اور تصویر کی دوسری عورت چندر بالا کی رگا بہن اور میری

چاچی ماں کسم بالا ہے جس کے نام آپ نے رنگامتی میں ایک منی آرڈر بھی بھیجا تھا۔“

اس انکشاف پر سروپ جی بالکل بوکھلا سے گئے۔ ”تو جل پنا تمہاری موسیٰ کی بیٹی ہوئی۔“

”اسی ناتے میں کایا پنتھا کو اپنا موسا کہتا ہوں، اب آپ خود سوچ سکتے ہیں، جب جل پنا

ساؤ گاری سے نکال دی گئی۔ میں اس کی تلاش میں دیوانہ وار کیوں نکل گیا، وہ ہمارے پر یوار کی پکھڑی آتا تھی۔“

سروپ جی گم صم ہو گئے۔ گنجال کا چہرہ دھواں دھواں سا نظر آنے لگا، میں نے دوسرے ساتھی کا تعارف کرایا۔

یہ ہے پور بی بنگال کے چکمہ قبیلے کا سردار وشال رائے، بھگوان کی زنتکی روپ تارا کا بھائی جس نے آٹھ برس پہلے رام گارتھ کے جنگل میں آپ کے پتا منگل ساؤ کو ”داؤ“ سے گھائل کر دیا تھا۔“

وشال رائے کا نام سن کر سروپ جی اچھل کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے بولے۔

”تم نے کہا تھا وشال رائے مر چکا ہے۔“

”وشال رائے اسی دن مر گیا تھا، جس دن اس کی بہن کو اغوا کر لیا گیا مگر رام گارتھ کے جنگل میں آدھا وشال رائے جی اٹھا تھا اور مرا ہوا آدھا وشال رائے پروہت گنجال کے کھوج میں بھٹکتا رہا۔“

گنجال کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ سروپ جی دم بخود رہ گئے۔

”کیا تم وشال رائے کو پتا جی کے خون کا دوشی نہیں مانتے؟“

”نہیں۔۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے نزدیک کسی جوان لڑکی کو اسی کی مرضی کے بغیر بھگالانا قتل کے جرم سے کم نہیں۔“

”مگر یہ تو مانتے ہو کہ وشال رائے نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔“

”قانون ان لوگوں کے لئے ہے، جو قانون کی دنیا میں رہتے ہیں۔“

”اور جو لوگ قانون کی دنیا سے دور ہوں؟“

”ان پر ایشور، بھگوان، خدا کے قانون کی حد لگائی جائے گی۔ اور ایشور کے قانون میں ہر جرم کی سزا، ہر پاپ کا بدلہ ہے، آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان تاکہ نیائے ہو۔ دس برس پہلے روپ تارا کو اغوا کر کے ساؤ گاری لایا گیا، یہاں وہ جیس بے جا میں رکھی گئی، ایشور کا قانون وشال رائے کو ادھیکار دیتا ہے کہ اس ایتا چار کا بدلہ لے۔“

سروپ جی نے اپنا سر پکڑ لیا۔ پریشان ہو گئے۔ ”اگر تم کہتے ہو تو ایسا ہی ہو گا مگر جس طرح وشال رائے کو اپنی بہن کا دکھ ہے، اسی طرح میں اپنے باپ کے لئے دکھی ہوں۔“

اچانک وشال رائے بول پڑا۔ ”سروپ جی! میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں کیونکہ کیشپ بابو نے میرے کو بول دیا تھا، تمہارے سے جھگڑا نہیں کرنا، جس طرح تم کیشپ کو اپنا بیٹا بولتے ہو، اسی طرح یہ اپنا اور کایا پتھا کا بیٹا ہے اگر میں کچھ غلط بول جاؤں تو میرے کو شتا کر دو کیونکہ اپن

قائدے قانون کی بات ذرا تھوڑی جانتا ہے، بس تم گنجال کے جھگڑے میں نہیں پڑو۔“ سروپ جی نے وشال رائے کی باتیں سنیں تو نہ جانے کس سوچ میں پڑ گئے، میں نے دیکھا کہ اسی اثناء میں کالی ناتھ اور کریم نیم تارک گوشتے سے نکلے اور ستونوں کی اوٹ میں دبے پاؤں چلتے بڑی ہوشیاری سے مندر کے عقبی دروازے پر پہنچ گئے تاکہ گنجال ادھر سے بھاگ نہ سکے، سب لوگوں کا دھیان ہماری طرف تھا، اس لئے کسی نے ان پر توجہ نہ دی، موت آدمی کے روپ میں گنجال سے کچھ اور قریب ہو گئی اور سروپ جی وشال رائے سے پوچھ رہے تھے۔

”کیا تم گنجال سے جھگڑا کرنے آئے ہو؟“

”جھگڑا کرنے نہیں نیائے کرنے آیا ہوں، کیا اپنے کو نیائے بھی نہیں کرنے دو گے؟“

”مطلب کیا ہے تمہارا؟“

”جو کچھ بول دیا وہی میرا مطلب ہے، گنجال میرا دوشی ہے، میرا دوشی میرے کو دے دو اور تمہارے سے اپنا دوشی اس لئے مانگا ہے کہ تم ساؤ گاری کے وارث ہو، مالک ہو۔“

انہوں نے دو ٹوک جواب دیا۔ ”میں ساؤ گاری کا وارث ہونے کے ناتے ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ جھگڑا تمہارا اور گنجال کا نہیں، ساؤ گاری کا ہے۔“

”جھگڑا کسی کا ہو، اپنے کو دوشی سے مطلب ہے۔“

”مگر ساؤ گاری کی دنیا میں کسی گریہ زدن لڑکی کو بھگوان کی زنتکی بنا دینا کوئی دوش نہیں۔“ سروپ جی کی اس بات نے مجھے وشال رائے، سب کو حیران کر دیا، وشال تو بالکل بھونچکا سا رہ گیا۔ اب یہ بھی بول دو تم اس دوش کو دوش کیوں نہیں مانتے؟“

”اس لئے کہ گریہ زدن لڑکی ساؤ گاری کی ضرورت اور ناچ پوجا ساؤ پر یوار کا دھرم ہے۔“

وشال رائے غصے میں پھٹ پڑا۔ ”کسی دوسرے پر یوار کی لاج، پت، آبرو چھین لینے کو تم دھرم بولتے ہو۔“

اس کی آواز اتنی اونچی اور گرجدار تھی کہ مندر میں ایک گونج سی پیدا ہوئی، لوگ پریشان اور سروپ جی بدحواس ہو گئے، میں نے محسوس کیا وہ اپنی بات سمجھا نہیں سکے۔ وشال رائے سمجھ نہیں سکا اور بات تھی بھی کچھ ایسی پیچیدہ اتنی پراسرار جسے عام لوگ سمجھ نہ سکتے تھے۔ میں نے پٹاما پجاری سے تھوڑی سی تفصیل سنی تھی اور حیران رہ گیا تھا، وہ تھیلا جس میں اس کی بھیجی ہوئی مورتیاں اور چتر تھا، اس وقت کایا پتھا کے ہاتھ میں تھا، سوچا ذرا یہ مہرہ چل کر دیکھوں، بازی کوئی نیاز خ بدلتی ہے یا نہیں اور وشال رائے کو ٹوک دیا کہ بات نہ بڑھائے۔

”وشال جی! جس آدمی سے تمہارا جھگڑا نہیں اس کے سامنے اتنا اونچا کیوں بولتے ہو۔“

”ان کو بولونا، ہمارے جھگڑے میں دخل نہ دیں۔“

میں کچھ بولا نہیں، یہی اس کی بات کا جواب تھا اور پٹاما کا تھیلا کا یا پٹتھا کے ہاتھ سے لے کر گنجال کی طرف بڑھایا، وہ بساط کے جس خانے میں کھڑا تھا۔ وہیں سے بولا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”تمہاری امانت۔“ میں نے بات کا مہرہ اٹھا کر آگے کر دیا۔

وہ حیران ہوا۔ ”کیسی امانت؟“

”جو تم پٹاما پجاری کو دے آئے تھے۔“

پٹاما کا نام سن کر چونکا۔ ”کیا ہے اس تھیلے میں؟“

”بدھ دیو اور اندر دیوتا کی دو چاندی کی مورتیاں اور سوم دیوتا کا ایک چتر جس سے تم گرہن زدہ نہ تکی سے سدا کنواری رہنے کا وچن لیتے ہو۔“

میری چال ٹھیک پڑی تھی، گنجال اچھل کر پیچھے ہٹا اور سروپ جی کے چہرے پر بھی ایک سایہ سا گزر گیا وہ ابھی تک گنجال کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور میں چاہتا تھا انہیں گنجال سے الگ کر لوں میں نے پوچھا۔

”پٹاما پجاری نے مجھے سوم دیوتا کے انتقام کی کہانی سنائی ہے۔ کیا وہی ساؤ پر یوار کا دھرم ہے؟“

”پٹاما صرف شاستروں اور پورانوں میں لکھی ہوئی کہانیاں بیان کرتا ہے، وہ ساؤ پر یوار اس کے دھرم کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“

میں سمجھ گیا۔ نہ تکی کے کوار چھل کی بات ساؤ گاری کے اسرار سے تعلق رکھتی ہے، جسے شاستروں اور پورانوں کی کہانیوں میں لپیٹ دیا گیا ہے۔ دھرم کی بات میں الجھنا بے کار تھا کیونکہ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ اس لئے میں نے اپنی چال کا رخ بدلا۔

”دھرم کے بارے میں آپ سے پھر کبھی بات کروں گا۔ اس سے جھگڑا دھرم کا نہیں، روپ تارا کے قتل اور کایا پٹتھا کی قید کا ہے۔“

”یہ تم نے روپ تارا کے قتل کی بات کہاں سے نکال لی۔ وہ بے چاری اپنی موت مری تھی۔“

”میرا خیال ہے اسے قتل کیا گیا تھا۔“

”کس نے کیا تھا؟“ سروپ جی مجھ سے سوال بن گئے۔

میں نے مدایا بھکشو کو اپنے قریب بلایا اور بھگوان بدھ کی سوگندے کر پوچھا۔ ”بتاؤ روپ تارا کیسے مری تھی۔“

گونگا مدایا ایک پل خاموش رہا پھر ہاتھ کے اشاروں، آواز کے اتار چڑھاؤ اور فرش پر انگلی سے کوئی کوئی لفظ لکھ کر بتانے لگا اور اس نے جو کچھ بتایا وہ اس طرح تھا۔

”جب سے روپ تارا ناچ بھگتی کا چلہ کاٹ کر آئی تھی، مجھی مجھی رہتی تھی، ایک دن مجھے

سے بولی۔ ”تم نے جو وچن مجھے دیا تھا پورا کر دو گے؟“

وہ چاہتی تھی، میں اسے ساؤ گاری سے نکال کر پوربی بنگال پہنچا دوں اور خود بھی اس کے ساتھ چلوں، بس میں نے ہامی بھری۔ اسی رات پروہت گنجال ایک کٹورے میں دوا لے کر میرے پاس آیا اور حکم دیا۔ ”یہ دوا روپ تارا کو پلا دو کیونکہ وہ کسی دوسرے کے ہاتھ سے دوا نہیں پئے گی۔“ میں نے پوچھا۔

”کیا ہے یہ؟“

”سوم رس۔“ گنجال نے بتایا۔ ”روپ تارا ٹھیک نہیں اور کل ناچ پوجا کا دن ہے، سوم رس پی لے گی تو مندر میں ناچ سکے گی۔“

روپ تارا مجھ پر وشواس کرتی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے سوم رس پی لیا اور گہری نیند سو گئی، سویرے جگانے کیلئے اس کے کمرے میں گیا تو نہیں اٹھی کیونکہ جب آتما شریر چھوڑ جائے تو کوئی نہیں اٹھ سکتا، وہ مر چکی تھی، میں گنجال کی طرف بھاگا اور دوش لگایا کہ اس نے روپ تارا کی جان لے لی ہے۔ گنجال بولا۔

”روپ تارا سوم دیوتا کی بھینٹ چڑھ گئی کیونکہ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔“

میں تڑپ اٹھا۔ ”یہ اتنا چار ہے اور میں سروپ جی کو بتاؤں گا۔“

مگر گنجال نے مجھے دھمکی دی کہ میں برمی زمیندار کا یا پٹتھا کا خون کر چکا اور قانون کی نظروں میں خونی ہوں۔ میں روپ تارا کو لے کر جو بھگوان کی نہ تکی تھی، پوربی بنگال بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس لئے بھگوان کا دوشی ہوں، اگر میں نے زبان کھولی تو دیوتا میرا بھی ناش کر دے گا، میں صرف بلیدان دے کر بچ سکتا ہوں۔ یہ باتیں سن کر میں ڈر گیا اور کوئی نظر نہ آنے والی ہستی مجھ سے سرگوشی کرنے لگی، تم وہی کرو گے جو پروہت گنجال چاہتا ہے اس طرح میں بلیدان دینے پر تیار ہو گیا اور گنجال کے کہنے پر اپنی زبان کٹوا دی۔“

مدایا بھکشو کا لرزہ خیز بیان سن کر سروپ جی کسی گہری فکر میں ڈوب گئے۔ پروہت گنجال جس کے اندر ایک قاتل چھپا بیٹھا تھا، نظریں چرانے لگا۔ نئی چال زیادہ کارگر ہوئی۔ سروپ جی کچھ اکھڑے اکھڑے نظر آتے تھے۔

”آپ نے سن لیا۔ روپ تارا اپنی موت نہیں مری۔ ماری گئی تھی۔ اب کایا پٹتھا کی قید کا حال بھی سن لیں۔“

میرے اشارے پر کایا پٹتھا اپنی روداد غم بیان کرنے لگا۔ اس نے سارگلیان کی امانت پھر بدری ساکھا اور پروہت گنجال کی ملاقات سے لے کر پہاڑی خانقاہ کی ناف زمین میں اتری ہوئی کوٹھڑی تک ہولناک واقعات سنائے تو سروپ جی کا بوڑھا جسم کا پینے لگا اور کپکپاتی ہوئی آواز میں کہنے لگے۔

”مجھے معلوم نہ تھا خانقاہ میں کوئی ایسی کوٹھڑی ہے اور گنجال تھا یا بہادر سے غیر انسانی کام بھی لیتا ہے۔“

”وہ کوٹھڑی دنیا کا بدترین بندی گھر ہے۔“

”تم نے دیکھی ہے کوٹھڑی؟“

”اس میں تیرہ دن قید بھی رہا ہوں۔“ میں نے انہیں بتایا۔ ”جل پنا کی تلاش میں پہاڑی خانقاہ تک پہنچ گیا تھا مگر گنجال اور تھا یا بہادر نے پکڑ کر کایا پتھا کے ساتھ اس کوٹھڑی میں قید کر دیا جس دن آپ مجھے خانقاہ کے کمروں میں ڈھونڈتے پھر رہے تھے میں زیر زمین کوٹھڑی میں بند تھا۔“

اس انکشاف پر سروپ جی کی جو حالت ہوئی، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے گنجال کو دیکھنے لگے میں نے گنجال کے خلاف یہ کچھری بھگوان کے مندر میں لگائی اور سروپ جی کو اس کا منصف بنایا تھا کہ وہی اس کے خلاف فیصلہ صادر کریں۔ ان کی خاموشی ایک دھماکا بن کر ٹوٹی اور وہ گنجال پر برس پڑے۔

”تم نے روپ تارا کی جان لی، سارگلیان کی ڈبیا کے لئے بے گناہ اور زردوش کایا پتھا کو پانچ برس تک عذاب دیا۔ تھارو کیشپ کو مار دینے کی ٹھانی اور مجھ سے جھوٹ بولتے چھل کرتے رہے کہ کیشپ پہاڑی خانقاہ تک پہنچا ہی نہیں۔ کیا تمہارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ ہے۔“

گنجال اب تک خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا تھا۔ اسے اسی کے گھر میں مات ہو رہی تھی اور میں سمجھتا تھا اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا مگر جس طرح بجلی کے چمکنے سے اندھیرے میں اور دراڑیں پڑ جاتی ہیں، اسی طرح جب گنجال بولا تو اس نے ہمارے ذہنوں میں شگاف ڈال دیے اور بڑی خوفناک تھی اس کی آواز، وہ سروپ جی کی طرف ہاتھ لہرا کر کہنے لگا۔

”میں جن باتوں کو کھولنا نہیں چاہتا تھا، آپ انہی کو کھول کر بیٹھ گئے اور پوچھتے ہیں کہ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ ہے یا نہیں؟ ہے کیوں نہیں۔ میرے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے مگر آپ کے پاس سننے کی ہمت نہ ہوگی۔ آپ جسے میرا جھوٹ اور چھل کہتے ہیں وہ میری ودیا کی دانائی اور میرے ارادے کی شکتی ہے اور میں بڑا آدمی اسی کو سمجھتا ہوں جو اپنی شکتی اور طاقت کا اظہار کر سکے۔ مدایا نے روپ تارا کی موت کا دوش مجھ پر لگایا ہے مگر اسے سوم رس آپ کے دادا ساگر ساؤ جی کے حکم پر پلایا گیا تھا، یہ بات بھی آپ کے لئے اچھنھا ہوگی کہ سارگلیان نے اس ڈبیا میں مقدس مورتی کے جیون بھید کی بات ظاہر کر دی تھی اور آپ کے

بوڑھے دادا نہیں چاہتے تھے وہ بھید کسی اور پر کھلے میں نے کایا پتھا سے کہا تھا وہ ڈبیا دان کر دے، اس کے منہ مانگے دام لے لے مگر کایا نہیں مانا تو اسے دھرتی کے پیٹ میں اتار دیا گیا تاکہ ڈبیا کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ پہنچ سکے، ہاں تھارو کیشپ کے ساتھ میں نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا کیونکہ کبھی کبھی اپنے بچاؤ کے لئے مجھے دوسروں پر وار کرنا پڑتا ہے۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”کیشپ جی! شاکرنا میں نے سچ بول دیا ہے۔“

گنجال کی باتیں سن کر سروپ جی کی ہمت تو سچ سچ جواب دے گی اور وہ مجھ سے گئے مگر میں نے بات آگے چلائی۔

”پروہت گنجال! اگر تم نے سچ بول دیا ہے تو سچ سن بھی لو کہ جو مجھ سے دشمنی مول لیتا ہے میں اس کا پوری طرح پیچھا کرتا ہوں، اس کے جرموں پر نظر رکھتا اور اس کے ادلے کا بدلہ چکاتا ہوں کیونکہ میں قانون کی طرح بہرا اور انصاف کی طرح اندھا ہوں۔“

گنجال خوفزدہ سا ہو گیا پھر میں نے جیب سے سونے کی ڈبیا نکالی اور اس کی طرف لہرا کر کہا۔

”یہ ہے سارگلیان کی وہ امانت جسے تم اپنی یا ساگر ساؤ جی کی مرضی سے حاصل کرنا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے۔“

پروہت گنجال کی نظریں کسی بھوکے چیل کی طرح ڈبیا پر جھپٹیں، میں نے ڈبیا کا ڈھکنا کھول دیا۔ ”ڈبیا اندر سے خالی ہو چکی ہے کیونکہ میں نے اس کے اندر کی لکھت محفوظ کر لی ہے۔“

گنجال کی آنکھوں سے وحشت جھانکنے لگی اور دل میں پنہاں کسی خوف سے آواز بھرا گئی۔ ”آپ نے ڈبیا پر لکھی ہدایات کی پروا نہیں کی حالانکہ اندھ بھکشو والی مورتی ڈھونڈنے سے پہلے کسی کو اسے کھولنے کا ادھیکار نہ تھا، یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔“

”مجھے بعض ایسے ادھیکار دیئے گئے ہیں جو دوسروں کو نہیں دیئے جاتے۔“ پھر میں نے اس کے سینے کی طرف انگلی اٹھالی۔ ”پروہت گنجال! تم نے روپ تارا، کایا پتھا اور میرے بارے میں سچ بول کر ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ اب میں بھی تمہاری معلومات میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا اور اطلاع دیتا ہوں کہ شکر جسے تم نے پچھلے دنوں برما بھیجا تھا، اب لوٹ کے نہیں آ سکے گا وہ بھولا سمیت برمی پولیس کی حوالات میں ہے۔ دونوں کے خلاف بہت سی دفعات کے تحت مقدمہ چل رہا ہے اور انہیں لمبی سزا ہوگی۔“

گنجال کا رنگ اڑ گیا۔ شکر اور بھولا کے بارے میں یہ اطلاع بالکل خلاف توقع تھی، میں اس کی معلومات میں مزید اضافہ کرنے لگا۔

”بدری ساکھا بھی اب تمہارے کسی کام نہیں آ سکے گا۔ وہ بھگوان کی عدالت میں اقبال جرم

کے بعد تبت کو لوٹ گیا ہے اور قبائلی بستی کا سردار تھا پابہادر بھی تمہارے کسی حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا نام جیتے جیتے آدمیوں کی فہرست سے کاٹ دیا گیا اور وہ تمہاری دنیا سے بہت دور چلا گیا ہے، اس کی ارٹھی کی راکھ بکھر چکی اور بانگی نے بوڑھے گوبھی کو سردار بنا دیا ہے۔ پٹاما پجاری بھی تمہاری ساری دھرم کا یا کو جان گیا ہے۔ اب تم پہاڑی خانقاہ تو کیا اس بستی میں بھی پاؤں نہیں دھر سکتے، پٹاما نے تمہاری امانت تمہیں لوٹا دی اور یہ سندیس بھیجا ہے کہ وہ تمہارے انجام میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ مجھے دشوار ہے یہ ساری باتیں جان لینے کے بعد سمجھ جاؤ گے کہ مجھ سے دشمنی مول لے کر تم نے اپنے بچاؤ کے سارے راستے بند کر لئے ہیں۔“

یہ سنتے ہی گنجال کے ذہن اور جسم پر ایک بھونچال سا طاری ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا اندر باہر سے ٹوٹ پھوٹ کر ڈھیر ہو جائے گا مگر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھالا اور غصے میں بھڑک کے بولا۔ ”کیٹپ جی! آپ خوش ہیں کہ آپ نے میرے سارے پتے بکھیر دیئے، سارے راستے بند کر دیئے مگر ایک راستہ ایسا بھی ہے جسے کوئی بند نہیں کر سکتا، اب میرا آپ کا سامنا اسی راستے پر ہو گا اور میں دیکھوں گا آپ کتنے شکست منان ہیں اور آپ کو کیا کیا ادھیکار دیئے گئے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی گہروی چادر کو جھٹک دیا، بڑے جوش کے ساتھ پلٹا اور تیزی سے عقبی دروازے کی طرف بڑھا مگر چار پانچ قدم چل کر ٹھٹکا اور فوراً جھٹکے سے ایک دو قدم پیچھے ہٹا۔ سامنے کالی ناتھ اور کریم کی کلہاڑیوں کے پھل چمک رہے تھے۔ دونوں مندر کا عقبی راستہ روکے کھڑے تھے۔ وشال رائے نے پیچھے سے آواز دی۔ ”پر دہت گنجال میں نے تیرے کو بول دیا تھا کہ تو میرا دوشی ہے اور آج میرے بدلے کا دن ہے، آج تیرے کو بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا۔“

”چپ رہو۔“ اس نے وشال رائے کو حقارت سے جھڑک دیا اور اپنی نظریں کالی ناتھ اور کریم پر ٹکا دیں اس کی آنکھیں اپنی پرسرار بھاشا بولنے لگی پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ خود بھی بڑی پڑھیت پر رعب آواز میں بولا۔

”اپنی کلہاڑیاں پھینک دو۔ راستہ دو، یہ میں کہتا ہوں۔“

دوسرے ہی لمحے کالی ناتھ اور کریم کلہاڑیاں پھینک کر دروازے سے ہٹ گئے، یہ ایک حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات ہوئی تھی جس نے سب کو دم بخود کر دیا۔ وشال رائے بوکھلا گیا اور کایا پٹھا نے گھبرا کر اپنے بری کسان کو آواز دی۔

”چان! شکار نکل نہ جائے۔“

چان، کریم اور کالی ناتھ سے تھوڑے فاصلے پر ایک طرف کھڑا تھا، نہ جانے اس نے بندوق کب نکال لی تھی، کایا پٹھا کی آواز سنتے ہی نال سیدھی کر دی اور اسی لمحے گنجال اس کی طرف

ہاتھ بڑھا کے گر جا۔

”چان تم بندوق نہیں چلاؤ گے..... تم بندوق نہیں چلاؤ گے۔ یہ میں کہتا ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔“

اس کی آواز کا شعلہ چان کے حواس پر لپکا، چان نے بندوق نہیں چلائی۔ پیچھے ہٹا اور سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا اس کے دماغ کو زبردست جھٹکا لگا ہے۔ ابھی ہم گنجال کی پرسرار طاقت کے اس شعبدے سے سنبھل نہ پائے تھے کہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ لپکتا جھپکتا عقبی دروازے سے نکل گیا، یوں لگا گنجال کے روپ میں کوئی چھلوا تھا کہ ابھی تھا اور ابھی نکل گیا، ہمیں ہوش اس وقت آیا۔ جب دروازے کے بھاری کواڑ بند ہو گئے۔

میں، میرے ساتھی کایا اور وشال جلدی سے دروازے کی طرف دوڑے، ہمارے پیچھے سروپ جی، شاسترو، گونا کھیا اور مدایا بھکشو بھی لپکے، ہمیں بھاگتے دوڑتے دیکھ کر کالی ناتھ اور کریم کے کھوئے حواس لوٹ آئے۔ انہوں نے فرش سے اپنی کلہاڑیاں اسی طرح اٹھائیں جیسے جانتے نہیں تھے، وہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر کیسے آ گئیں۔ چان بھی سر کو ہتھیلی سے پیچھتا تا کھڑا ہو گیا۔

میں نے آگے بڑھ کے بند کواڑ کھولنا چاہے مگر کواڑ نہیں کھلے معلوم ہوا گنجال نے دروازہ ہی بند نہیں کیا باہر سے کنڈی بھی چھڑھا دی تھی۔ وہیں پٹاما پجاری کا وہ تھیلا پڑا تھا جس میں چتر اور مورتیاں تھیں۔ غالباً جب گنجال لپکتا، جھپکتا باہر نکل رہا تھا، تھیلا ہاتھ سے گر گیا جسے اٹھانے میں اس نے وقت ضائع نہیں کیا، میں نے فرش سے تھیلا اٹھا کر پھر کایا کے سپرد کر دیا اور پلٹ رہا تھا کہ بھگوان بدھ کے چرنوں میں چلنے والے سارے دیئے ایک دم بجھ گئے اور مندر میں گھنا گھور اندھیرا چھا گیا۔ معلوم نہیں یہ کیا طلسم ہوا تھا، سب لوگ گھبرا گئے، بدحواس ہو گئے بعض کی خوف سے چیخیں نکل گئیں میں نے فوراً نارچ نکال کے روشن کی اور روشنی کی لکیر بیرونی دروازے کی طرف پھینکی جس سے ہم اندر آئے تھے۔

دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے اور اب مندر سے نکلنے کا صرف ایک راستہ رہ گیا تھا میرے پیچھے پیچھے سب لوگ اس طرف بھاگے کہ کہیں یہ دروازہ بھی بند نہ ہو جائے اور ہم مندر ہی میں گھر جائیں۔

(32)

سانپ

پروہت گنجال نے مندر کا عقبی دروازہ اس لئے بند کر دیا تھا کہ ہم اس کا پیچھا نہ کر سکیں۔ مگر بھگوان کے چرنوں میں جلتے والے سارے دیوں کے یک لخت بجھ جانے سے جو گھبراہٹ اور سراپیمگی پھیلی اس نے سب کو پریشان کر دیا۔ مندر کے گھور اندھیرے میں میری ٹارچ نجات کی روشنی ثابت ہوئی اور ہم اس روشنی میں بڑے دروازے کی طرف بھاگے جو کھلا تھا۔ دروازے تک آتے آتے سروپ جی سے یہ بھی طے کر لیا کہ وہ ساؤ گاری کے بیرونی پھانک کارخ کریں گے تاکہ پروہت گنجال کو پھانک سے باہر نہ جانے دیں۔ (ساؤ گاری سے نکلنے کا یہی ایک دروازہ تھا) اور میں اس کے کمرے کی طرف جاؤں گا جو مندر کے پیچھے واقع تھا۔ باہر نکلتے ہی میں نے شاترو سے کہا۔

”گنجال کے کمرے کی طرف.....“

وہ اس راہداری میں پھیدکتا چلا گیا جو مندر کی دیوار کے ساتھ ساتھ پچھتم کو چلی گئی اور اس کے عقبی دروازے کو مڑ جاتی تھی۔ سروپ جی بیرونی پھانک کو ہولے۔ ویشال رائے، کالی ناتھ، کریم اور گونگا بھکشو مدایا ان کے ہمراہ تھے۔ جبکہ کاپلٹھا، چان، گونا کھیا میرے ساتھ آئے تھے اور بونا شاسترو ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ ان دوسراہوؤں کو جو سروپ جی کے انت کال (جان کنی) کی رسومات میں پروہت گنجال کے ساتھ تھے، کسی نے مندر سے نکلتے نہیں دیکھا۔

سروپ جی کا موت کی چوکھٹ سے لوٹ آنا بلاشبہ ایک معجزہ تھا جس نے سب لوگوں کو حیران کر دیا، مگر گنجال نے مندر میں اپنی پراسرار شکتی کا جو سحر پھونکا وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا، سب لوگ بھونچکے سے رہ گئے اور اس حالت میں اس کا مندر سے نکل جانا ہمارے لئے کسی خطرے کی نشاندہی کرتا تھا، وہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا یا ہمارے لئے نئی مشکلیں، نئی پریشانیاں پیدا کر سکتا تھا لہذا ضروری تھا اسے روپوش نہ ہونے دیا جائے اور وہ ہماری نظروں کے سامنے رہے۔ سروپ جی بھی اس کا نیا روپ دیکھ کر پریشان ہو گئے اور کم از کم میرے معاملے میں اسے دوشی سمجھتے تھے، جبکہ ویشال رائے اس کے خون کا پیا سا ہو رہا تھا۔ مدایا بھکشو کی گواہی کے بعد وہ گنجال کو کسی صورت زندہ چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا، خواہ اس کوشش میں اس کی اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

پروہت گنجال جاتے جاتے مجھے چیلنج دے گیا تھا کہ اب میرا اس کا آئنا سامنا ایک نئے راستے پر ہو گا اور وہ دیکھے گا کہ میں کتنا بڑا شکتی مان ہوں اور میں یہ چیلنج قبول کر کے ہی اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ شاسترو کے پیچھے پیچھے سیدھی راہ داری سے گزر کر ہم مندر کے عقب میں اس چوڑی راہداری میں پہنچے جو شرقاً غرباً تھی۔ شاسترو ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ وہی گنجال کے کمرے کا دروازہ تھا، میں نے بے دھڑک اس کے دونوں پٹ کھول دیئے اور ٹارچ کی روشنی میں اندر داخل ہوا مگر کمرہ خالی پڑا تھا وہاں کوئی نہیں تھا شاید گنجال چھپ گیا یا کہیں بیٹھ کر ہم پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔

راہداری میں دونوں جانب جتنے کمرے تھے، سب ایک ایک کر کے دیکھ لئے، وہ کہیں بھی نہیں ملا اور ہم حیران تھے کیا کہاں کیونکہ مندر کی عقبی راہداری جس میں گنجال کا کمرہ تھا، دوسری طرف سے بند تھی اور ادھر سے نکل جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہم کمروں، حجروں کی چھان بین کے بعد تیزی سے پلٹے۔ میرا خیال تھا اس سے جب ہم مندر کا عقبی دروازہ بند دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے گنجال بیرونی پھانک کی طرف نکل گیا تھا، شاید سروپ جی نے اسے جالیا ہو۔

یہی سوچ کر ہم پلٹے اور مندر کی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگتے اس غلام گردش میں آگئے جو کوٹ کی طرح ساؤ گاری کے وسیع و عریض پارک یا صحن کے چاروں طرف پھیلی تھی، اسی لمحے سروپ جی بھی پھانک سے لوٹ کر پوربی غلام گردش میں آتے دکھائی دیئے۔ ہم لپک کر ان کے پاس پہنچے، گنجال انہیں بھی نہیں ملا تھا۔ سروپ جی نے بتایا۔ ”چوکیدار کہتا ہے تمہارے آنے کے بعد شام کو اس نے پھانک بند کر دیا تھا اور تب سے نہ کوئی باہر سے اندر آیا نہ کوئی اندر سے باہر گیا۔ گنجال پھانک سے باہر نہیں نکلا۔“

”وہ اندر بھی نہیں ہے، ہم نے اس کا کمرہ اور آس پاس کے سب کمرے چھان مارے مگر اس کا کھوج نہیں ملا۔“

”پھر کہاں چلا گیا؟“

اچانک شاسترو کو کچھ یاد آیا۔ سرگوشی کے لہجے میں بولا۔

”پر بھو! باؤلی کو بھول گئے ہو کیا؟“ باؤلی کا نام سنتے ہی خیال آیا اگر گنجال کو ساؤ گاری سے باہر جانا ہے تو اسی راستے جائے گا اور میں شاسترو کو اپنے ساتھ گھسینا غلام گردش میں بھاگنے لگا، سب لوگ وہیں حیران و پریشان سے کھڑے ہمیں دیکھتے رہ گئے۔

باؤلی تک پہنچنے کے لئے شاسترو نے وہ راستہ چھوڑ دیا جو دوسری منزل کی بھول بھلیوں سے گزر کر شمالی صحن میں اترتا تھا اور اس محلے کی طرف ہولیا، جہاں گونا کھیا کا پر یوار اور ساؤ گاری کے پرانے باسی رہتے تھے، ایک مڑے مڑے راستے کو عبور کر کے ہم اس تاریک گلی میں داخل

سرنگ کے اندر سانپ کو پھن پھیلائے دیکھ کر مجھے پھریری آگئی۔ شاستر وہ بھی مہبوت سا کھڑا اسے بڑے تعجب سے دیکھ رہا تھا، اگرچہ کنڈلی مار لینے سے اس کے نچلے دھڑ میں کئی بل پڑ گئے تھے۔ پھر بھی اندازے کے مطابق گیارہ بارہ فٹ لمبا ہو گا مگر عمر رسیدہ اور بوڑھا معلوم ہوتا تھا اس کی چستکبری کھال کے سفید دھبے بھی سیاہی مائل ہو رہے تھے۔ اچانک شاستر وپکارا۔ ”ارے یہ تو انا تھ بن کا سانپ ہے وہاں ایک پہاڑی کھوہ میں رہتا تھا یہاں کیسے آگیا؟“

”انا بھ بن کا سانپ؟“

میں زیر لب بڑبڑایا اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ وہی ہے بالکل وہی۔“

شاستر کی آنکھوں میں حیرت نے لہری۔ ”کیا آپ بھی اسے دیکھ چکے ہیں؟“

”جس دن پنا سے ملنے انا تھ بن گیا تھا، اسی دن اس مہاشے کے درشن کئے تھے، یہ پہاڑی کھوہ سے مجھے اور جل پنا کو گھنے جنگل میں جاتے دیکھتا رہا تھا۔“

”مگر انا تھ بن کو چھوڑ کر اس نے یہاں کیوں بسیرا لے لیا؟“

”میں کیا جانوں۔“

سانپ کا جنگل سے نکل کر ساؤ گاری میں، وہ بھی خفیہ سرنگ تک آجانا خطرے سے خالی نہ تھا، سرنگ سے نکل کر وہ گونا گویا کے محلے میں بھی پہنچ سکتا تھا، حیرت کی بات یہ تھی وہ ہم سے ذرا خوفزدہ نہ تھا بلکہ ٹکٹی بندھے الٹا ہمیں خوفزدہ کئے جا رہا تھا۔

جب میں نے پہلی بار اس سانپ کو انا تھ بن کے سندر سورگ میں دیکھا۔ اس پر کچھ اور ہی گمان ہوا تھا۔ آدم کی جانب یا برہما کے سورگ میں بھی تو ایک سانپ تھا، جس طرح آدم و حوا جنت میں تنہا تھے اور شیطان نے سانپ کا روپ دھار کر حوا کو گمراہ کیا اور آدم سے دشمنی کی ابتداء کی تھی۔ اسی طرح جب جل پنا کے ساتھ انا تھ بن کے سورگ سے گزرا تھا، تب میں نے بھی اس سانپ کو اپنے پیار کی جنت کا شیطان سمجھا اور اس پر تمثیلی طور سے گنجال کا شبہ کیا تھا جو میرا، جل پنا کا مشترکہ دشمن تھا، مگر آج جب میں شاستر کے ہمراہ گنجال کو ڈھونڈتا باؤلی تک آیا اور اس کی تہ میں اترتا تو انا تھ بن کا سانپ سرنگ میں ہمارا راستہ روکے کھڑا تھا جس سے خیال گزرا یہ سانپ تو سچ مچ گنجال کا چوکیدار لگتا ہے۔

میں نے بڑی توجہ، بڑے دھیان سے چستکبرے سانپ کو دیکھا جو چار فٹ تک سر اٹھائے، پھن پھیلائے، کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک چھوٹی سی ٹوپی بنی تھی اور چوڑے پھن میں ایک چہرے کا عکس دکھائی دے رہا تھا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ عکس گنجال سے ملتا جلتا ہے۔ گویا وہ گنجال ہی تھا اسی حیرت میں میرا ہاتھ شاستر کے کندھے پر پڑا۔ ”ارے

ہوئے، جس کی ایک جانب ساؤ گاری کی دو منزلہ، سہ منزلہ عمارتیں فصیل کی طرح کھڑی تھیں، دوسری طرف بستی نما آبادی کے مکانوں کی دیواریں اٹھی تھیں۔ ان کے بیچ وہ گلی تھی، جسے پار کر کے ہم شمالی صحن میں پہنچے اور باؤلی کی سمت لپکے جسے چوبلی تختوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ نارچ کی روشنی میں ان تختوں کو دیکھا تو لگتا تھا۔ کسی نے انہیں چھو بھی نہیں۔ شاستر وناش لہجے میں بولا۔ ”میں نے سوچا تھا شاید گنجال اس راستے بھاگا ہو گا مگر وہ ادھر نہیں آیا، ایک مہینے پہلے جب آپ یہاں سے نکلے یہ تختے میں نے اسی ترتیب سے رکھے تھے جس طرح پڑے ہیں۔“

”چلو ایک نظر باؤلی کے اندر بھی دیکھ لیتے ہیں۔“

”بے کار ہے پر بھو! جب تختے اٹھائے ہی نہیں گئے تو کوئی نیچے کیسے اتر سکتا ہے۔“

شاستر کی بات معقول تھی پھر بھی میں نے کہا۔ ”ادھر آ ہی گئے ہیں تو دیکھ لینے میں کیا جرح ہے۔“

”آپ کہتے ہو تو یہ بھی سہی۔“ شاستر نے ایک تختہ اٹھایا، ہم نارچ کی روشنی میں سیڑھیاں اترتے چوکور باؤلی کی تہ میں پہنچے۔ اس کے نقشے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی جو کچھ پہلے تھا وہی اب تھا۔ فرش کے پتھروں میں جو درزیں، دراڑیں پڑی تھیں، ان میں کہیں گھاس، کہیں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں، البتہ بارش کا وہ پانی خشک ہو چکا تھا، جو پچھلی بارشوں میں چھت کے تختوں سے ٹپکا تھا، تیرہ چودہ فٹ گہری باؤلی میں سرنگ کے دہانے کا ایک پتھر ہٹا ہوا تھا جو نہی میں نے اس دہانے میں جھانکا ایک زبردست پھنکار نے میرا سوا گت کیا اور میں اچھل کر پیچھے ہٹا۔ دہانے سے پانچ گز دور سرنگ میں ایک بہت بڑا چستکبر اسانپ فرش سے کوئی چار فٹ اوپر سر اٹھائے، پھن پھیلائے جھوم رہا تھا، شاستر وہ بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سانپ پیچھے ہٹا نہ آگے پڑھا، بس وہیں پھن پھیلائے ہمیں گھورنے لگا، سرنگ کے اندھیرے میں اس کی آنکھیں سبز موتیوں کی طرح چمک دمک رہی تھیں۔

ایک ماہ پہلے میں اسی سرنگ کے راستے ساؤ گاری سے نکلا تو یہاں کوئی سانپ نہیں تھا۔ میں بچپن ہی سے سپیروں اور جوگیوں کو دیکھتا رہا ہوں جو پوربی بنگال میں شہر شہر، گاؤں گاؤں، سانپ کندھوں پر ڈالے، گلے میں لٹکائے یا بند کھانچوں میں اٹھائے گھومتے پھرتے ہیں مگر میں سانپوں سے ہمیشہ خوف زدہ رہا ہوں حالانکہ لڑکے بالے بڑے شوق سے سانپوں کو سپیرے کی بین پر جھومتے دیکھتے ہیں، کچھ لوگ سانپ پالتے، انہیں دودھ پلاتے ہیں۔ ہندو سانپوں کو پوجتے بھی ہیں، ساون کی پانچویں تاریخ کو ناچ پنچمی کا تہوار بھی ہوتا ہے جس میں ناگ دیوتا کی باعدہ پوجا کی جاتی ہے اور اس کے سامنے دودھ کے کٹورے رکھے جاتے ہیں، اس کے باوجود میں سانپ کو انسان کا ازلی دشمن سمجھتا اور اس سے ڈرتا ہوں۔

شاسترو! ذرا دیکھ تو کیا اس سانپ کی صورت گنجال سے نہیں ملتی۔

اسی لمحے سانپ بڑے غصے سے پھنکارا اور شاسترو پھدک کر پیچھے ہٹا مگر اس کی حیرت اور بدحواسی دیکھنے والی تھی، چہرے پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں، بڑے پریشان لہجے میں بولا۔

”آپ بھی یہی سوچتے ہو پر بھو۔“

ان الفاظ سے ظاہر تھا کہ اس کا ذہن بھی سانپ اور گنجال میں الجھا ہوا تھا اور وہ شناخت کر رہا تھا کہ کہیں یہ گنجال ہی تو نہیں۔

”تیرا کیا خیال ہے؟“

سوال کا جواب دینے کی بجائے اس نے ایک عجیب سی فرمائش کر دی۔

”ذرا نارچ بند کرنا۔“

میں نے نارچ بند کی تو باؤلی میں اندھیرا چھا گیا اور سرنگ کی گہری تاریکی میں سانپ کی آنکھوں کے جلتے دیئے بھی اچانک بجھ گئے۔ غالباً خطرہ محسوس کر کے اس نے اپنا رخ بدل دیا یا ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ سرنگ کے گھنے گھور اندھیرے میں اب کچھ بھی نظر نہ آتا تھا اور اس اندھیرے میں ہمارا سرنگ کے دہانے پر کھڑے رہنا مناسب نہ تھا، اس خیال سے کہیں بے آواز چلتا سانپ ہمارے پاس پہنچ جائے، میں نے نارچ دوبارہ جلائی تو سرنگ میں کچھ بھی نہ تھا، نہ سانپ نہ اس کا سایہ، فرش، چھت، دیواریں اور ایک فرلانگ دور پتھر کے پیچ دارزینے پر روشنی ڈالی مگر وہ غائب ہو چکا تھا، سانپ کورینگے چلتے کچھ وقت لگتا ہے میں نے نارچ صرف ایک منٹ کے لئے بند کی ہوگی اور اس اثنا میں وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ چھپ گیا، جیسے کوئی چھلاوایا آسیب تھا کہ پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا۔ ذہن میں کئی دسو سے رینگنے لگے۔ اچانک کچھ فاصلے پر دیوار اور فرش کے جوڑ میں ایک سوراخ نظر آیا پھر یہ معلوم کرنے کے لئے سوراخ کتنا بڑا ہے اور کیا وہ آسیب اسی میں تو نہیں گھس گیا۔ ابھی میں سرنگ کے دہانے پر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ شاسترو نے روک دیا۔ ”پر بھو! اب تو باؤلی میں بھی خطرہ ہے اور آپ سرنگ میں جا رہے ہو۔“ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ اب باؤلی میں ٹھہرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ کیا معلوم سانپ، چھلاوا، آسیب یا جو کچھ بھی وہ تھا ناگاہ کہاں سے نکل آئے۔ اس سے میں خود ہی سا ہورہا تھا۔

”نکلو یہاں سے۔“

ہم دونوں پوری اکیس میٹر حیاں چڑھ کر کیونکہ میٹر حیاں اترتے یا چڑھتے انہیں گنا میری عادت ہے، باؤلی سے باہر آگئے اور اسے پھر چوبی تختوں سے ڈھانپ دیا، شاسترو پوچھنے لگا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ شیش ناگ سو سال کے بعد اپنی جون بدل لیتا ہے؟“

میری دلچسپی بڑھی۔ ”کیا یہ شیش ناگ تھا؟“

یہی سنا ہے کہ انا تھ بن کی پہاڑی کھوہ میں رہنے والا سانپ شیش ناگ ہے اور شیش ناگ ایک صدی گزرنے پر کوئی بھی روپ دھار سکتا ہے میں ان پڑھ ہوں مگر آپ تو پڑھے لکھے گیانی ہو آپ کا وچار جاننا چاہتا ہوں۔

میں سوچنے لگا، کیا کہوں کیا نہ کہوں خود ہی سانپ پر پروہت گنجال کا شبہ کر کے میں نے شاسترو کے ذہن میں تو ہم پرستی کا دروازہ کھولا اور اب شیش ناگ کے جون بدلنے کا سوال کر کے اس نے مجھے ایک نئی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔

”تجھ سے کس نے کہا کہ شیش ناگ سو سال کے بعد اپنی جون بدل لیتا ہے۔“

”بہت سے لوگ کہتے ہیں، گونا کھیا بھی یہی کہتا ہے کرم دھرم والے تو اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔“

”وہ کیا کہتے ہیں؟“

”ان کا وچار ہے، سادھو گیانی اپنی تپسیا سے ایسی شکتی پراپت کر لیتے ہیں کہ جو چاہیں ہو جاتا ہے جیسا روپ چاہیں دھار لیتے ہیں جیسی جون بدلنا چاہیں بدل لیتے ہیں۔ خواہ وہ جون کسی منٹ کی ہو یا جانور کی یا سانپ کی۔“ میں حیرت سے اس کی بات سنتا رہا۔ اس نے پوچھا ”پر بھو! بہت سے لوگ اس بات کو مانتے ہیں کہ مرنے کے بعد آدمی کی آتما سانپ اور بچھو کے شریر میں بھی چلی جاتی ہے پر یہ سادھو گیانی جیتے جی اپنی جون کیسے بدل لیتے ہیں؟ سانپ بچھو کیسے بن جاتے ہیں؟“

میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”نہ کسی نے سانپ کو جون بدلتے دیکھا ہے نہ سادھو کو، سب قصے کہانیاں ہیں۔“

”پھر آپ نے کیوں کہا تھا سانپ کی صورت گنجال سے ملتی ہے۔“

”ارے بدھو! شکل ملنا کچھ اور بات ہے جون بدلنا کچھ اور۔“

”میں سمجھا نہیں پر بھو!“

میں اسے سمجھانے لگا۔ ”بعض آدمیوں کے چہرے جانوروں سے ملتے جلتے دکھائی دیتے ہیں، کسی صورت پر بندر کا شبہ ہوتا ہے، کسی پر بن مانس کا، کوئی شکل کتے جیسی ہوتی ہے اور کسی کا حلیہ لومڑ کا سا لگتا ہے۔ مجھے سانپ کی صورت پر گنجال کا شبہ ہوا پھر ایک بات اور تھی۔“

وہ حیرت کی نظروں سے مجھے دیکھے جارہا تھا، میں نے بتایا۔ ”بعض دھرم سانپ کو آدمی کا، آدم کی اولاد کا بیری سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جنت میں شیطان نے سانپ کا روپ دھار کر حوا کو بہکایا تھا۔ میں پروہت گنجال کو رتنا گری کے سورگ کا سانپ سمجھتا ہوں، جو مجھے ہل پنا کو دس لینا چاہتا تھا مگر وہ اصل سانپ نہیں بلکہ سانپ جیسا اور سانپ کی خصلت والا ہے، اب سمجھا

میں نے کیوں کہا تھا سانپ کی شکل گنجال سے ملتی ہے۔“

شاسترو میری بات سمجھایا نہیں مگر کچھ الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ ”تو آپ یہ کہتے ہو کہ آدمی جیتے جی اپنی جون نہیں بدل سکتا۔“

”ارے جیتے جی کیا مر کے بھی نہیں بدل سکتا۔ یہ بھی سن لے مرنے کے بعد آتما کو جو نیا شریر ملتا ہے اس کا سنسار سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا، وہ تو پر لوک کی بات ہے، وہیں کچھ ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔“

”مگر پر بھو! جب آدمی اپنی جون نہیں بدل سکتا تو بیٹھے بیٹھے غائب کیسے ہو جاتا ہے؟“

”کس کی بات کرتا ہے!“

”پروہت گنجال کی۔“

”کیا تو نے اسے بیٹھے بیٹھے غائب ہوتے دیکھا کبھی؟“

”ہاں۔۔“ وہ بتانے لگا۔ ”بہت دنوں پہلے کی بات ہے، تب آپ ساؤ گاری میں نہیں آئے تھے، ایک شام میں پروہت گنجال کو مالک کا کوئی سندیس پہچانے گیا اور جب بات چیت کر کے کمرے سے نکلا تو یاد آیا کہ ہاتھ کا کپڑا وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ کپڑا لینے دوبارہ کمرے میں گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کپڑا تو وہیں پڑا ہے جہاں میں نے رکھا تھا لیکن گنجال نہیں تھا جسے میں ابھی کمرے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا آوازیں دیں، ڈھونڈا مگر کوئی کمرے میں ہوتا تو ملتا، اس بات نے مجھے پریشان کر دیا۔ دوسرے دن شکر سے ذکر کیا تو بولا۔ ”گورو جی اچانک ایسے ہی غائب ہو جاتے اور کبھی کبھی دو دو تین تین دن غائب رہ کر اچانک لوٹ آتے ہیں، ایک دن پوچھا تو کہنے لگے۔ گپھا میں تپسیا کرنے جاتا ہوں، پر کسی سے بولنا نہیں اور مجھ سے پوچھنا نہیں کہ گپھا کہاں ہے اور میں وہاں کیسے جاتا ہوں کیسے آتا ہوں۔“

بات بڑی عجیب اور حیرت انگیز تھی، غالباً اسی بات نے شاسترو جیسے منطقی کو جو ہال کی کھال اتارنے کا عادی تھا۔ چکر میں ڈال دیا اور وہ گنجال کے بارے میں کسی اور ذہن سے سوچنے لگا تھا اس کی وجہ یقیناً وہ پراسرار شکتی تھی جس کا مندر میں مظاہرہ کر کے گنجال نے سب کو دم بخود کر دیا تھا اور اب شاسترو اس وہم کا شکار ہو رہا تھا شاید وہ اپنی جون بھی بدل سکتا ہے اور سرنگ میں ہماری ملاقات سانپ کے روپ میں دراصل گنجال سے ہوئی ہے۔

میں اس کے ذہن سے یہ وہم نکال دینا چاہتا تھا۔ اسی لمحے میرے دماغ میں ایک نئی کوٹھڑی کا دروازہ کھل گیا۔ ”ارے شاسترو! یہ تو بتا، سانپ نے انا تھ بن کی پہاڑی کھوہ میں کب بسرا کیا تھا؟“

”میں تو نہیں جانتا پر گونا کھیا کہتا ہے کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا سانپ کو وہیں دیکھ

رہا ہے۔“

”اور گنجال ساؤ گاری میں کب سے ہے؟“

”سروپ جی بتاتے ہیں جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا ہے، تب سے گنجال کو یہیں دیکھ رہے ہیں۔“ میرے ذہن جو نیا دوار کھلا تھا، کھٹاک سے بند ہو گیا کیونکہ سانپ تو گونا کھیا کے اور گنجال سروپ جی کے ہوش سنبھالنے سے پہلے موجود تھے، ایک انا تھ بن میں دوسرا ساؤ گاری میں، دونوں میں ایک اور مشابہت نکل آئی تھی، میرا ذہن پراگندہ ہونے لگا۔

”آؤ چلیں۔“ میں نارچ کی روشنی میں واپس ہولیا۔ گنجال کی تلاش بے سود تھی۔ شاسترو بھی چپ چاپ میرے ساتھ ہولیا نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا مگر کوئی نیا سوال نہیں کیا۔ بس چپ چاپ جھا جھا سا چلتا رہا، میں بودھ دھرم اور بودھ اتھاس کا گیانی ہونے کے علاوہ کلکتہ یونیورسٹی کا گریجویٹ بھی ہوں، میری ودیا تو ہم پرستی کے ساتھ ساتھ گیان دھیان اور تپسیا کے غیر مرئی، غیر عقلی شعبوں کی بھی نفی کرتی ہے مگر کوئی نامعلوم سی طاقت میری ودیا، میرے دشو اس کو متزلزل کئے دیتی تھی، پروہت گنجال کے بارے میں ذہن الجھتا جاتا تھا۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ انا تھ بن میں رہنے والا سانپ اپنا سالوں پرانا ٹھکانہ چھوڑ کر ساؤ گاری کے اندر کیوں آ گیا؟

ہم اس گلی سے گزر رہے تھے جس کی ایک جانب ساؤ گاری کی اونچی عمارت تھی، دوسری طرف گونا کھیا کے محلے کی دیواریں تھیں کہ گلی کے نکر پر گونا کورکتے دیکھا، وہ بڑا پریشان نظر آ رہا تھا۔ اسے صرف ساؤ گاری اور اس کے پرکھوں سے مطلب تھا کسی اور سے نہیں، اس نے بتایا سروپ جی میرے لئے بڑے پریشان ہیں، مجھے فوراً ان کے پاس پہنچنا چاہئے۔ ہم نے گلی کا موڑ کاٹا اور گونا کھیا کو چھوڑ کر سیدھی راہداری میں ہولے۔



گنجال کی پراسرار روپوشی میرے لئے حیرت کا باعث تھی تو سروپ جی مجھ سے کہیں زیادہ پریشان نظر آتے تھے۔ جب سے انہوں نے سنا تھا کہ گنجال نے مجھے بھی پہاڑی خانقاہ کے تہہ خانے میں قید کر دیا اور مجھ سے بیر رکھتا ہے، وہ بڑے بے چین، بڑے فکر مند ہو گئے تھے، مجھے دیکھتے ہی ان کی پریشانی جاتی رہی، انہوں نے نئے مہمانوں کے لاہریری سے ملحقہ کمروں میں رہائش کا بندوبست کر دیا۔ مدایا نے اپنے چھ گونگے بھکشوؤں کے ساتھ مل کر دد لمرے جھاڑ پونچھ دیئے اور وہاں بستر لگا دیئے تھے۔ ایک کمرہ کا یا پنتھا اور وصال کے لئے، دوسرا چان، کالی ناتھ اور کریم کے لئے۔

سروپ جی مدایا بھکشو کے ساتھ وصال رائے اور کا یا پنتھا والے کمرے میں تھے۔ میں نے

محسوس کیا گونگا مدایا یہ جان کر کہ وشال روپ تارا کا بھائی اور اس کا بدلہ لینے آیا ہے، سراپا ایثار بن گیا تھا اور وشال رائے بھی اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔

رات کافی بیت گئی تھی اور ابھی کسی نے رات کا بھوجن نہیں کیا تھا، سروپ جی نے مجھے اور شاستر کو لے کر نکلے تو میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ چان اپنا بستر راہداری کے فرش پر بچھا رہا تھا، میں نے پوچھا۔

”تم نے بستر یہاں کیوں بچھالیا؟“

”بستر سونے کے لئے نہیں بیٹھنے کے لئے بچھایا ہے۔“

”ساؤ گاری میں پہرے کی ضرورت نہیں چان“

”یہاں تو پہرے کی زیادہ ضرورت ہے گنجال نکل گیا اور ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔ نہ جانے رات کو کدھر سے نکل آئے اور دھاوا کر دے۔“

چان کی بات معقول بھی تھی اور غیر معقول بھی اس لئے کہ اگر گنجال رات کو سچ بچ دھاوا کرنے آ گیا تو اس کے سامنے چان کی بندوق پھر گونگی ہو جائے گی اور کچھ بول نہیں سکے گی، سروپ جی کہنے لگے۔

”کیشپ بیٹے! جہاں چاہتا ہے پڑا رہنے دو۔“

ہم اسے چھوڑ کر اوپر آ گئے۔ پیگو کی بیوی تارا مہمانوں کے لئے بھوجن تیار کر رہی تھی۔ سروپ جی نے شاستر کو اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے بھیج دیا اور مجھے اپنے کمرے میں لے آئے۔ یہ کمرہ دوسری منزل پر اتر کی طرف اس تنگ راہداری کے قریب واقع تھا جو بوڑھے دادا ساگر ساؤ جی کے ”کنیا کومبز“ کو جاتی تھی، اپنی بیماری، جان کنی اور میری پرارتھنا کے کارن موت کی چوکھٹ سے لوٹ آنے پر ان کا دل بڑا گداز ہو رہا تھا، وہ کمرے میں آتے ہی بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے اور کافی دیر تک لپٹے رہے، میں نے محسوس کیا کہ رو رہے ہیں نہ جانے ان کے من میں کیا تھا، میں فوراً بازوؤں کے حلقہ سے نکلا اور پوچھا۔

”اب آپ کے رونے کا کارن کیا ہے؟“

”میں تم سے شرمندہ ہوں کیشپ بیٹے!“ وہ گلوگیر آواز میں بولے۔ ”میں نے تم سے جل پنا کے لئے جھگڑا کیا، اسے ساؤ گاری سے نکال دیا اور تمہیں میری وجہ سے خانقاہ میں قید رہنا پڑا۔“

”ہر واقعے کے پیچھے بھگوان کی کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے، اگر میں قید نہ ہوتا تو کایا موسا کا پتہ کیسے چلتا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے مجھے بتا کیوں نہ دیا کہ جل پنا سے تمہارا کوئی ناتا ہے۔“

میں نے انہیں کاؤچ پر بٹھایا اور خود بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ”آپ کو موسیٰ چندر بالا

کی تصویر تو دکھائی تھی کچھ اشارے بھی کئے تھے مگر آپ کے من میں جل پنا کے لئے دیا کا کوئی گوشہ باقی نہ تھا۔“

”یہی تو بھول تھی میری، جب میں نے سنا وہ تم سے پریم کرتی ہے تو دل پر گھونسا سا پڑا۔ میں سمجھتا تھا، تم پر صرف سندرمتی کا ادھیکار ہے جس کے ساتھ تمہارا لگن ہو چکا۔ اس لئے جل پنا کو تم سے پریم کرنے کا کوئی ادھیکار نہیں مگر مجھے آج پتہ چلا کہ جل پنا کا تم پر سب سے بڑا ادھیکار ہے اور یہ ادھیکار قدرت نے دیا ہے اسے۔“ پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر کہنے لگے۔ ”آج میں اپنی تحریر کی یہ شرط توڑتا ہوں کہ تم مقدس مورتی ڈھونڈ لو گے تو تمہاری ہر بات مانوں گا اور تم کسی دوسری لڑکی سے بھی پریم کر سکو گے صرف شرط ہی نہیں توڑتا بلکہ اپنی خوشی سے آگیا دیتا ہوں کہ جل پنا کے بارے میں اپنی مرضی پوری کرو۔“ ان الفاظ نے مجھے حیران کر دیا میں نے ابھی تک ان سے جل پنا کے پریم کی بات نہیں کی تھی اور ان کی شرط پوری کئے بغیر کرنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر حالات کی زبان نے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جسے شاید میں بیان نہ کر سکتا۔ سروپ جی میرے اور جل پنا کے اس گہرے ناتے کو سمجھ گئے جو ٹوٹ نہیں سکتا تھا، میں نے سوچا جب بات کھل گئی اور وہ خود مجھے جل پنا کے اپنانے کے لئے آگیا دے رہے ہیں تو انہیں کچھ اور بھی بتا دینا چاہیے۔ ”آپ نے جل پنا کے لئے آگیا دی ہے نا؟“

”ہاں، وہ تمہی کو اپنا بھگوان سمجھتی ہے۔“

”مگر جل پنا کے علاوہ ایک لڑکی اور بھی ہے، وشال رائے کی بیٹی منجوری، ماں نے اس سے میری سگائی کر دی تھی اور۔۔۔۔۔“

میں انہیں وہ صورت حال سمجھانا چاہتا تھا جس نے ایک ساتھ مجھے کئی رشتوں میں باندھ دیا تھا، مگر وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔

”وشال رائے کے ایک ہی فقرے سے سمجھ گیا تھا کہ کایا پنتھا اور وشال رائے سے تمہارا وہی ناتا ہے جو مجھ سے ہے میں جانتا ہوں کہ تم کسی مجبوری کے تحت یہ سب باتیں مجھ سے نہیں کہہ سکے کیونکہ ہمارے سماج میں ایک سے زائد بیاہ کرنے کا رواج نہیں میں اسی لئے جل پنا کے پریم کی خبر سن کر آپ سے باہر ہو گیا تھا۔“

مگر کیشپ بیٹے! مجھے اب معلوم ہوا ہے تم عام آدمی نہیں بلکہ عام آدمیوں کے برعکس تمہارے ادھیکار بہت زیادہ ہیں۔ دادا نے ٹھیک کہا تھا۔ ”ہریگ“ میں کچھ لوگوں کو موت پر، کچھ لوگوں کو جیون پر ادھیکار ہوتا ہے اور ہم انہیں رشی منی کہتے ہیں۔ اس یگ کے رشی تم ہو۔ اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور میں تمہارے سب ادھیکار مانتا ہوں، یوں بھی پرانے ہندو اور بودھ سماج میں لوگ کئی کئی بیاہ کرتے رہے ہیں، یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔

”پھر تو رنگامتی ضرور چلوں گا، مجھے جل پنا سے بھی معافی مانگنی ہے۔“
”میرے پتا ہو کر آپ اس سے معافی مانگیں گے؟“

سروپ جی نے حیرت پاش نظروں سے مجھے دیکھا، میں نے کہا۔ ”اسے صرف آپ کی اشیر واد چاہیے۔“

وہ اچانک کہیں گم ہو گئے ان کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں لیکن کان شاید میری بات سن نہیں رہے تھے کیونکہ سوچ کا عمل تیز تھا، جس نے سماعت بے کار کر دی تھی، یک لخت انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے اور بولے۔

”جب تم مجھے پتا کہتے ہو میرے اندر ایک نیا جیون دوڑنے لگتا ہے اور ایک مری ہوئی آشا جی اٹھتی ہے میں چاہتا ہوں، اب مجھے اسی شہد سے یاد کیا کرو۔“

انہوں نے میری پیشانی چوم لی اور میں کہنے لگا۔ ”آپ نے اپنی تحریر کی شرط توڑ کر مجھے جل پنا اور منجوری کو اپنانے کی آگیا دے دی ہے نا مگر میں ایسا بیٹا نہیں جو باپ کی شرط کا پالنہ نہ کر سکے میں آپ کی شرط نہیں توڑوں گا، پتا جی۔“

”کیا مطلب؟“

”جل پنا اور منجوری سے میرا ملاپ اس سے ہو گا جب آپ کی شرط کے مطابق مقدس مورتی ڈھونڈ لوں گا۔“

”وہی مورتی ہماری تمام مصیبتوں کا علاج ہے، مورتی مل گئی تو سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔“ وہ یک لخت خاموش ہو گئے پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ”ساؤ خاندان تین صدیوں سے مورتی کی تلاش میں ہے، نہ جانے اسے ڈھونڈنے میں اور کتنے سال لگ جائیں۔ اسی لئے میں نے اپنی شرط توڑ دی تا کہ تمہاری خوشیاں ادھوری نہ رہیں جو بھگوان تمہیں دینا چاہتا ہے، تم شرط پوری کرنے پر زور دیتے ہو مگر میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں۔“

”پتا جی! مورتی نہیں ڈھونڈوں گا تو سندرمتی کو ساؤ گاری کی دنیا سے اپنی دنیا میں کیسے لے جاؤں گا۔“

”بھگوان تمہیں سندرمتی کی آشا پوری کرنے کی شکتی دے۔“

اسی لمحے شاستر وکھانا لے کر آگیا۔ اس نے بتایا۔ ”مہمانوں نے بھوجن کر لیا اور اب بستر پر آرام کر رہے ہیں۔“

مجھے بھوک نہیں تھی مگر سروپ جی کے اصرار پر کھانے لگا شاسترو نے ان کے لئے کھجڑی تیار کرائی تھی۔ وہ بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد شاستر و خالی برتن اٹھانے آیا تو اس نے جانے کی آگیا بھی لی۔ سروپ جی نے تاکید کی۔

شاستروں کے مطابق دیوتا بھی کئی عورتوں سے پریم کرتے اور انہیں اپنے رنواس میں شوبھا دیتے تھے، وکش نے اپنی ستائیس کی ستائیس بیٹیاں سوم دیوتا سے بیاہ دی تھیں اور اگر سندرمتی کے علاوہ میری کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں اس کا لگن بھی تمہارے ساتھ کر دیتا کیونکہ میں تمہیں دیوتا سامان سمجھتا ہوں۔“

اپنے تین ناتوں کے جواز میں جو باتیں مجھے کہنا تھیں وہ سروپ جی نے خود کہہ دیں اور بڑے کھلے دل سے آگیا دے دی کہ میں سندرمتی کے علاوہ جل پنا اور منجوری سے بھی تعلق رکھ سکتا، بیاہ کر سکتا ہوں۔ گویا میری ساری مشکل انہوں نے خود ہی حل کر دی۔ میرے خیال میں یہ تبدیلی اس معجزے یا کرامت سے ظہور میں آئی تھی جس کے باعث سروپ جی موت کی چوکھٹ سے لوٹ آئے تھے۔ میری پرارتھنا کے اعجاز اور جادو کے اثر کو دیکھ کر ہی ساگر ساؤ جی نے مجھے اس یگ کا رشی مانا اور سروپ ساؤ جی دیوتا سامان سمجھنے لگے تھے۔ دادا پوتے کے علاوہ ساؤ گاری کے مندر میں کچھ اور لوگوں نے بھی وہ ناقابل یقین کرامت دیکھی تھی اور نہ جانے مجھے کیا سمجھنے لگے، یہ سارا فیض، یہ ساری بھلائی تو صوفی عبد الجبار کے طفیل تھی، جن کی تربیت نے مجھے یہ عزت اور مہانتا بخشی تھی، اب میں سروپ جی کو بتانے لگا۔

”ماں کی چٹھی آنے پر جب میں رنگامتی گیا تب یہ نہیں جانتا تھا کہ جل پنا سے میرا کوئی خاندانی ناتا ہے یا ماں میری سگائی و شال رائے کی بیٹی منجوری سے کرنا چاہتی ہے، میں تو اس سے صرف سندرمتی سے لگن کی آگیا لینے گیا تھا مگر وہاں پر اسرار قدرت نے رشتے ناتوں کی ایک عجیب سی بساط بچھا دی جس نے مجھے پریشان کر دیا۔ ایک طرف جل پنا تھی، دوسری طرف منجوری اور بیچ میں سندرمتی، مگر جب صوفی عبد الجبار نے بتایا کہ میری تقدیر میں تین عورتیں لکھی ہیں اور میرے ہاتھ پر بیاہ کی تین لکیریں ہیں تب میں نے بھگوان کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا۔“

وہ حیرانی سے پوچھنے لگے۔ ”صوفی عبد الجبار کون؟“

”میرے گورو! انہی کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھا تو آپ کے پران لوٹے تھے۔“

یہ انکشاف ان کے لئے بڑا حیرت انگیز تھا۔ ”تم ایک مسلمان صوفی کے شاگرد ہو؟“

”ہاں! انہوں نے خوابوں اور سپنوں کے بارے میں مجھے سکھشا دی ہے، بڑے سیدھے سادے اور بھلے آدمی ہیں۔“

”جنہوں نے تمہیں سکھشا دی وہ تو بڑے مہان آدمی ہوں گے، میں ان کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔“

”اب کے رنگامتی گیا تو آپ کو بھی لیتا چلوں گا، جل پنا بھی وہیں ہے، ماں کے پاس اور اسے صوفی چاچا کی نگرانی میں چھوڑ آیا ہوں۔“

”قبوہ بنالائوں؟“

وہ نہیں جانتی تھی۔ میں قبوہ چھوڑ چکا ہوں، مگر سوچا قبوے کی گرم گرم پیالی مل جائے تو سفر کی تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔“

”اگر تکلیف نہ ہو تو ایک پیالی بنالائوں۔“

”ابھی بنا کے لاتی ہوں۔“

تارا نے قبوہ بنانے میں دیر نہ لگائی مگر لوٹ کے آئی تو گھونگھٹ کا اسے ہوش نہیں تھا اس نے قبوے کی پیالی میری طرف بڑھائی میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو شرمائی گئی اور دوسرے ہاتھ سے گھونگھٹ کھینچ لیا۔ وہ نیپالی خدو خال کی خوبصورت عورت تھی، پہلے بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

میں نے پیالی اس کے ہاتھ سے پکڑ لی اور قبوہ بنانے کا شکریہ ادا کیا۔

”کچھ اور تو نہیں چاہیے سرکار؟“

”نہیں، بس اپنا گھونگھٹ سنبھال کے رکھا کرو۔“

”آپ سے کیا گھونگھٹ نکالوں گی مالک؟“ اس نے گھونگھٹ الٹ دیا۔ ”میں تو باندی ہوں۔ اس گھر کی۔ آپ کی۔“

وہ چند لمحے اسی طرح کھڑی رہی پھر دونوں ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا اور دروازے سے نکل گئی۔ میں قبوے کی چسکیاں لیتا رہا پھر لیٹ گیا۔

اس رات میں نے پھر سپنا دیکھا اور بڑا بھیا نک تھا وہ سپنا

مجھے اچھی طرح یاد ہے قبوہ پینے کے بعد میں نے کچھ آسودگی محسوس کی اور سو گیا مگر وہ رات کا پچھلا پہر تھا جب سوئے سوئے دھات کے پاؤں گھسنے کی مخصوص آواز سنائی دی اور مجھ پر ایک عجیب سا خوف طاری ہونے لگا، خیال آیا رات میں دروازے کی کنڈی لگانا بھول گیا تھا۔ اب اٹھ کر لگا دوں لیکن پیتل کے پاؤں گھسنے کی دہشت کچھ ایسی تھی کہ بستر سے اٹھ بھی نہ سکا۔ ہولے ہولے وہ دہشتناک آواز قریب آتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ میرے اعصاب بھی جواب دینے لگے مگر پیتل کے پاؤں گھسنے کے ساتھ ساتھ میں ایک اور بھیا نک آواز بھی سن رہا تھا۔ ہڈیوں کے کڑکڑانے کی آواز یک لخت دونوں کواڑ چو پٹ کھل گئے اور میں نے کھلے دروازے سے بھگوان بودھ کی مورتی کو جو بڑھے سا گر ساؤ جی کے کٹیا کومبز میں ایستادہ رہتی تھی، کمرے میں داخل ہوتے دیکھا، اس کے چلنے کا مخصوص انداز بڑا خوفناک تھا مگر جس ہستی نے مجھے لرزہ براندہ کر دیا وہ بڑھا سا گر ساؤ جی تھا کیونکہ وہ بھی مورتی کے پیچھے پیچھے کمرے میں

”دیکھ شاسترو! مہمانوں کا خیال رکھنا اور رات کو ہوشیار رہنا۔“ جب وہ لوٹ گیا تو مجھ سے کہنے لگے۔ ”دادا تم سے ملنا چاہتے ہیں، میرے ساتھ ہی چلو، انتظار کر رہے ہوں گے۔“ میں نے گھڑی دیکھی، بارہ بجنے والے تھے۔ ”اب تو بہت دیر ہو گئی۔ میں سویرے مل لوں گا۔“

”جیسے تم چاہو۔“

”کیا دادا کو گنجال کے بھاگنے کی خبر مل گئی؟“

”نہیں، پرنام کرنے جاؤں گا تو بتا دوں گا۔“ سروپ جی کا معمول تھا، سونے سے پہلے دادا کو پرنام کرنے ضرور جاتے تھے۔ بڑھا تو شاید آدھی رات کے بعد ہی کہیں سویا کرتا تھا اور کیا خبر سوتا بھی تھا یا رات کا کئی کے بستر پر کروٹیں ہی بدلتا رہتا تھا۔ پھر بھی اس کے جیون میں دن رات کا شمار ہو رہا تھا، سروپ جی اس کے تابوت نما کمرے میں جانے کے لئے اٹھے تو میں نے کہا:

”دادا سے کہہ دیجئے گا کہ وہ پروہت گنجال کی چٹانہ کریں اور آپ بھی اسے بھول جائیں۔“

”ارے..... وہ تم سے دشمنی رکھتا ہے میں اسے کیسے بھول جاؤں۔“

”میرا اور گنجال کا معاملہ کچھ اور ہے پتا جی!“

”کچھ بھی ہو، میں اسے شام نہیں کروں گا۔“

میں نے ان سے تکرار مناسب نہ سمجھی، وہ کہنے لگے۔ ”میں ابھی دادا سے بات کرتا ہوں تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

میں ان کے کمرے سے نکلا اور راہداری سے گزرتا صحن میں آیا تو تارا نے پرنام کیا اور گھونگھٹ کا تکلف کرتی قریب آ گئی۔ ”آپ اچھے تو ہیں مالک۔“

”اچھا ہوں تارا۔ مگر تمہیں رات گئے اتنے آدمیوں کا بھوجن تیار کرنے میں ضرور تکلیف ہوئی ہوگی۔“

”تکلیف کیسی۔ آپ کے آنے سے اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی۔ آپ کی پرارتھنا سے بڑے مالک بھی اچھے ہو گئے۔ شاسترو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”بھگوان کی دیا ہو تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جاتا ہے۔“

”میں نے آپ کا بستر لگا دیا ہے۔“

پھر اس نے کمرے کی طرف رہنمائی کی اور میرے ساتھ خود بھی اندر آ گئی۔ میں اوور کوٹ اتار رہا تھا تو اس نے مدد کی اور کوٹ کھوٹی سے ٹانگ دیا۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی رہی۔ گھونگھٹ ہٹا کر جھانک بھی لیتی تھی، میں بستر پر لیٹا تو بولی۔

”آپ تھک گئے ہوں گے۔ پاؤں دبا دوں۔“

”نہیں تارا! یہ تکلیف تمہیں شو بھانہ نہیں دیتی۔“

داخل ہوا۔

میرے قارئین اندازہ نہیں لگا سکتے کہ زندہ مردے کو چلتے دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی۔ بڑھا چلنے پھرنے کی سکت کھو چکا تھا، نہ کھڑا ہو سکتا نہ سہارے کے بغیر بیٹھ سکتا تھا۔ جسم بدھ کی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا جس پر ایک سوکھی سی کھال منڈھی تھی۔ سر اور داڑھی کے بالوں سمیت بھنوسیں تک سفید ہو چکی تھیں بلکہ بازوؤں کی خشک کھال کے سفید بال تو عجیب منظر پیش کرتے تھے مگر وہ ساگر ساؤ جی جسے گونگے بھکشو مردے کی طرح پاکی میں بٹھا کر نیچے لے جاتے اور اوپر لے آتے تھے، اپنے پاؤں پر چلتا پیتل کی مورتی کے پیچھے پیچھے کمرے میں گھس آیا تھا، اسے دیکھ کر مارے دہشت کے میری چیخ نکل گئی اور عجیب بات یہ تھی کہ میں چیخا تو ضرور لیکن آواز میرے حلق سے باہر نہ نکل سکی۔

بڑھے ساگر ساؤ جی کو دیکھ کر مجھ پر دہشت اس لئے طاری ہوئی کہ اس کا سر اور چہرہ مہرہ تو وہی تھا جسے میں کئی بار دیکھ چکا تھا مگر گردن کے نیچے پورا جسم کھال کے بغیر نری ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا اور ایسا تھا وہ ڈھانچہ کہ پسلیوں کے بیچ سے نظر آ رہا ہو رہی تھی۔ گویا اس کے شریر کا ماس مٹی ہو چکا تھا یا جل کر راکھ ہو گیا، صرف ہڈیوں کا پنجر باقی رہ گیا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ ساگر ساؤ جی اپنے آبائی شمشان سے نکل کر سیدھا میرے کمرے میں آ گیا ہے کیونکہ بڑھے کی بجائے میں اس کا عجیب و غریب بھوت دیکھ رہا تھا جو گردن کے اوپر تو اپنے چہرے مہرے سے جوں کا توں تھا مگر گردن کے نیچے نہ کھال تھی نہ ماس، بس ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں، میں اس بھوت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہڈیوں کے کڑکڑانے کی آواز سن رہا تھا۔

خوف اور دہشت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے کمرے میں بیک وقت دو ڈھانچے آ گئے تھے ایک بھگوان بدھ کی مورتی کی شکل میں پیتل کا ڈھانچہ، دوسرا ساگر ساؤ جی کے روپ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ، مورتی حرکت کرتی، پاؤں گھسیٹتی تو دھات کے گھسنے اور پیتل کے کھڑکھڑانے کی آواز نکلتی ساگر ساؤ جی چلتا تو ہڈیوں کے کڑکڑانے کی لرزہ خیز آواز سنائی دیتی۔ اس طرح دونوں آوازیں مل جل کر موت کی آہٹ میں بدل گئی تھیں اور بڑی بھیانک، بڑی مہیب تھی وہ آہٹ جسے سن کر بنصوں میں لہور کئے لگتا تھا۔

دونوں ڈھانچے پلنگ کے قریب آ کر رُک کے پھر پیتل کی مورتی میرے سر ہانے آ کر کھڑی ہو گئی اور ساگر ساؤ جی کا ڈھانچہ میری آنکھوں کے عین سامنے پائنتی کی طرف آ رہا۔ مجھ پر خوف کی کپکپی طاری تھی اور میں چاہتا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں مگر جسم حرکت نہ کر سکتا تھا۔ دونوں ڈھانچے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی بے پایاں دہشت نے میرے جسم سے جان کشید کر لی تھی اور میں مٹی کے ڈھیر کی طرح بستر پر پڑا تھا۔

میں جاگ رہا تھا، سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر مجبور و بے بس تھا اور اس بے بسی کی انتہا یہ تھی کہ میں نے بار بار سروپ جی کو تارا کو پکارا کہ وہ آ کر مجھے اس دہشت ناک عذاب سے بچالیں مگر میری آواز ان کے کانوں تک کیا پہنچتی کیونکہ وہ میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

اس سے پیشتر بھی کہیں بتا آیا ہوں کہ پہلی بار جب میں نے پیتل کی مورتی کو اپنے سر ہانے کھڑے پایا تو یوں محسوس کیا تھا، جیسے وہ جھک کر اپنا سایہ مجھ پر ڈال رہی ہو۔ جس سے سانس کی آمد و شد رکتی، اگلی معلوم ہوتی تھی۔ آج بھی وہ اسی طرح میرے سر ہانے کھڑی تھی۔ اس کا پیتل کا سر بتدریج ہولے ہولے میرے چہرے پر جھک رہا تھا اور میں اپنے سینے پر بڑا دباؤ محسوس کرنے لگا تھا، پہلی بار تو میں اپنی زبردست قوت ارادی سے ہاتھ اٹھا کر اسے پرے ہٹا دیا تھا لیکن اس بار میری قوت ارادی بھی مفلوج ہو گئی، میں ہاتھ تک ہلانے کے قابل نہیں تھا۔

اسی لمحے مورتی نے اشارہ کیا اور پائنتی کی طرف کھڑے ساگر ساؤ جی کے بھوت نے ہڈیوں کے ہاتھوں سے میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے۔ میں نے اپنے پاؤں پر اس کی ہڈیوں کا لمس محسوس کیا اور سارے شریر میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ ان استخوانی ہاتھوں کی گرفت بڑی مضبوط تھی، ساتھ ہی پیتل کے دو ہاتھوں نے میرے بازو جہاں پڑے تھے وہیں دبا دیئے، میں سوچنے لگا، شاید دونوں ڈھانچے مجھے اٹھا کر کہیں لے جانا چاہتے ہیں یا میری جان نکالنے آئے ہیں۔

ہندوؤں اور بودھوں سے سنا تھا۔ مرتے سے آدمی کو ان دیکھی شکلیں نظر آتی ہیں۔ مسلمان کہتے ہیں ملک الموت روح قبض کرنے آتا ہے، پھر قبر میں دو فرشتے مردے کا حساب کتاب لیتے ہیں۔ ایک سر ہانے کی طرف اور دوسرا پائنتی کی طرف کھڑا ہو کر باری باری سوال کرتا ہے۔ معلوم نہیں دونوں ڈھانچے میری روح قبض کرنے آئے تھے یا منکر نکیر کی طرح سوال کرنے میرے پیران کی گرفت میں تھے اور سینے پر شدید دباؤ محسوس ہونے لگا تھا، اچانک ساگر ساؤ جی کا ڈھانچہ بولنے لگا۔

تھارو کیشپ! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

”میں نے ڈرتے ڈرتے اثبات میں سر ہلایا کیونکہ میں سن تو رہا تھا مگر جواب نہیں دے سکتا تھا دیکھ رہا تھا لیکن بول نہیں سکتا تھا۔ بڑھا بھوت پھر گویا ہوا۔ ”ذرا دھیان سے سنو! بھگوان کی مورتی تم سے کچھ کہنے، کچھ پوچھنے آئی ہے۔“

اس پر میں نے اپنی تارہ سی آنکھیں ماتھے کی سیدھ میں اوپر اٹھائیں اور اپنے چہرے پر مورتی کا جھکا ہوا سر دیکھا۔ اس کی پیتل کی بے جان آنکھیں دیکھیں۔ زرد دھات کا سپاٹ چہرہ دیکھا پھر پیتل کے ہونٹ ہلتے، حرکت کرتے دیکھے اور مورتی کو بولتے دیکھا۔ اس کا کلام اپنے کانوں سے سنا اور یہ تھے اس کے الفاظ، یہ تھا اس کا کلام۔

کسی قدر جرأت کر کے کہا۔

ہاں، میں آئندہ بھکشو والی مورتی کو ڈھونڈ رہا ہوں، اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو اس مورتی کو اس کے جیون بھید کو حاصل کرے گا مگر ایک شرط پر۔“

”کیا ہے وہ شرط؟“ میں نے بڑے اشتیاق، بڑے تجسس سے پوچھا۔

وہ شرط جاننے کے لئے تجھے میرے پاس پاٹلی پتر میں آنا ہوگا۔“

”پاٹلی پتر میں کیوں؟“ میری حیرت ہی میرے سوال کی وضاحت کر رہی تھی پھر بھی میں

نے بتایا۔ ”تم تو بوڑھے دادا ساگر ساؤ جی کے کٹیا کو مز میں رہتی ہو۔“

اس پر مورتی نے ساگر ساؤ جی کو، ساگر ساؤ جی نے مورتی کو دیکھا اور دونوں ڈھانچے کسی

ناقابل فہم بھاشا میں باتیں کرنے لگے جسے میں بالکل نہ سمجھتا تھا، البتہ آپ سے آپ میرے من

میں یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ تو پاٹلی پتر کی قدیم بھاشا پالی میں بات چیت کر رہے ہیں، چند لہجوں

کے بعد جب ان کی گفتگو ختم ہوئی، ساگر ساؤ جی کا ڈھانچہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”تھارو کیشپ! امورنی کہتی ہے تمہیں پاٹلی پتر جانا ہوگا کیونکہ وہ شرط جسے پورا کرنے کا

وجہ دے کر تم مقدس مورتی حاصل کر سکتے ہو پاٹلی پتر ہی میں بتائی جائے گی۔“

”پاٹلی پتر میں کہاں؟“

”گنگا کنارے۔“ میرے سوال کا جواب مورتی نے دیا۔

اس کے بعد دونوں ڈھانچوں نے میرے بازو اور پیر چھوڑ دیئے۔ جنہیں اپنی گرفت میں

جکڑ رکھا تھا اور میرے جسم میں جیون کی شکتی پھر دوڑنے لگی، ساگر ساؤ جی کے ڈھانچے نے

دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں جھنجھوڑ دیئے۔

”سن لیا؟ تمہیں پاٹلی پتر جانا ہے۔“

اچانک یاد آیا کہ اس شہر کو تباہ و برباد ہوئے صدیاں بیت گئیں اب تو شاید اس کے کھنڈر بھی

باقی نہ رہے ہوں گے۔

”پاٹلی پتر تو اب دنیا میں موجود نہیں، وہاں سب کچھ بدل گیا تم مجھے کہاں بلا رہی ہو۔“

مورتی نے شمشکین لہجے میں جواب دیا۔ ”نام بدلتے ہیں مقام نہیں بدلتے۔“

یہ کہہ کر وہ مڑی اور میں نے محسوس کیا کہ واپس جانا چاہتی ہے لیکن آئندہ بھکشو والی مورتی کا

ذکر چھیڑ کر اس نے میرے اندر ایک نیا تجسس، ایک نیا شوق پیدا کر دیا تھا اور میں اس سے

بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا، ابھی اس نے واپسی کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ میں نے جلدی سے

اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”مقدس مورتی حاصل کرنے کی شرط مجھے یہیں بتا دو۔ میں

وجہ دیتا ہوں کہ شرط پوری کروں گا۔“

”تھارو کیشپ! تو حیران ہوگا کہ دھات کی ایک مورتی تجھ سے ہم کلام ہے کیونکہ تیرا گیان

کہتا ہے کہ بے جان پتھر نہیں بولتے، آدمی کا من بولتا ہے بدری ساکھا سے یہی کہا تھا نہ تو نے۔“

میں نے ایک بار پھر سر کو اثبات میں جنبش دی کیونکہ میرے حلق سے آواز تو نکل ہی نہیں رہی

تھی، یک لخت مورتی کا سیاہ چہرہ کروڑھ اور غصے کے جذبات کا اظہار کرنے لگا۔ میں اس کے

چہرے پر زندہ آدمی کی طرح تاثرات کو رنگ بدلتے دیکھ کر کچھ اور ہراساں ہو گیا اور مورتی بولی۔

”تیرا گیان غلط ہے مورکھ! پتھر کی طرح دھات بھی بے جان ہے اور تیرے نزدیک میں

بے جان دھات کی ایک مورتی ہوں مگر تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اپنے کانوں سے سن رہا

ہے کہ میں بول رہی ہوں اور تجھے یہ بتانے آئی کہ تم لوگوں کو غلط گیان دیتا ہے، اپنے کان کھول

کر سن لے اس الازوال طاقت کے حکم سے جسے لوگ ایشور بھگوان اور خدا مانتے ہیں درخت بھی

سننے اور بولنے میں یونکہ لکھا ہے کہ چاند سورج کی منزلیں مقرر ہیں اور ستارے اور درخت اس

کے آگے جھک جاتے اور زلزلے بجالاتے ہیں اور آکاش اور دھرتی پر جو کچھ ہے خواہ وہ

دھات ہے یا پتھر ایشور کی بھکتی یا حمد میں لگن ہے۔“

یہ حیرت انگیز کلام سن کر میں دنگ رہ گیا کہ درخت سننے اور پتھر جھکتے اور سجدہ بجالاتے ہیں

ستاروں سے مورتی کا اشارہ پتھر کی طرف تھا کیونکہ جو ستارے ہمیں خلا میں گھومتے اور گردش

کرتے نظر آتے ہیں دراصل مادے کے مرکب ہیں جن میں پتھر اور دھات اور دیگر اجزاء شامل

ہیں، میں فرط حیرت سے چلایا ”کہاں لکھا ہے یہ سب کچھ؟“

میری آپ بیتی پڑھنے والے حیران ہوں گے کہ اس سوال کو زبان مل گئی میری آواز کمرے

میں گونج گئی اور اس کی گونج میں نے بھی سنی۔ مورتی نے بھی سنی اور وہ جواب میں بولی۔

”اپنے گورو صوفی عبدالبجار سے پوچھنا وہ تجھے بتائے گا یہ سب کچھ کہاں لکھا ہے اور کیا شجر و

جگر جھکتے اور ایشور کی بھکتی کرتے ہیں یا نہیں؟“

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ مورتی صوفی عبدالبجار کے بارے میں بھی جانتی ہے جو یہاں

سے سینکڑوں میل دور رنگامتی میں رہتے ہیں۔ مورتی پھر ہم کلام ہوئی۔ ”تو کہتا ہے آج سے

بائیس صدیاں پہلے ایک مورتی سارگیان کے سے بولی تھی پھر نہیں بولی۔“

”ہاں۔۔ میں نے یہی سنا ہے۔“

”مگر تو دیکھ رہا اور سن رہا ہے کہ ایک مورتی آج پھر بول رہی ہے اور اس لئے بولی ہے کہ تو

اس جیون بھید کے لئے پریشان ہے جسے آئندہ بھکشو نے پیتل کی ایک مورتی میں رکھ دیا تھا تو اس

مورتی کے کھوج میں ہے۔“

اب میری دلچسپی بڑھی۔ اگرچہ شریر کے اندر خوف کی لہر بدستور چل رہی تھی پھر بھی میں نے

”جو کہہ دیا وہی ہوگا، شرط پائی پتر میں آ کے پوچھنا۔“

مورتی پاؤں گھسٹی چل دی مگر میں نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ اس کی کلائی پر میری گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی وہ جا رہی تھی میں اسے روک رہا تھا، اسی کشمکش میں اس کی کلائی کو زور سے اپنی طرف کھینچا کہ اسے زبردستی روک لوں مگر اچانک ایک تڑاقا ہوا اور پیتل کی کلائی کہنی کے جوڑ سے ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گئی۔ ساتھ ہی ایک کراہ، ایک سسکی، میری سماعت سے ٹکرائی اتنی عجیب تھی وہ سسکی اور اتنا بھیاں تک تھا وہ تڑاقا کہ میں اس کی ہیبت سے کانپ اٹھا اور جب ٹوٹی کلائی کو اپنے ہاتھ میں لٹکتے دیکھا تو مارے خوف کے جیسے ”گونگا بھرا“ ہو گیا۔ میرا خیال تھا، اب مورتی کا کروڑھ مجھ پر ٹوٹے گا مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ نہ وہ پلٹی، نہ رکی، نہ برسی بلکہ عجیب سی آواز میں کراہتی گھسٹی، کھڑکھڑاتی دروازے سے نکل گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ساگر ساؤجی کا ڈھانچہ بھی لڑکھڑاتا، ڈلگاتا باہر نکلا اور اس کے نکلتے ہی دونوں کواڑ آپ سے آپ بند ہو گئے۔

دونوں ڈھانچے کمرے سے چلے گئے، میں اندھیرے میں کچھ دیر پیتل کے پاؤں گھسنے، ہڈیوں کے کڑکڑانے کی خوف انگیز آوازیں سنتا رہا۔ یہ آوازیں صحن سے آرہی تھیں، جو بتدریج مدہم اور مدہم ہوتی رات کے گہرے سکوت میں ڈوب گئیں اور میں اپنے بستر پر بیٹھا دہشت زدہ نظروں سے پیتل کی اس کلائی کو دیکھنے لگا جو مورتی کے بازو سے ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ یقیناً یہ کوئی بدشگون اور نامبارک بات ہو گئی تھی کیونکہ مورتی کی عجیب سی غم ناک کراہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور کسی انجانے خوف سے میرا من گھبرا رہا تھا۔

نہیں معلوم پھر کیا ہوا، خوف کے مارے میری نظروں میں اندھیرا اچھانے لگا اور وہ اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا اور میں اس اندھیرے میں گم ہو گیا مگر سویرے جب آنکھ کھلی تو رات کے دہشتناک سپنے پر بڑا حیران تھا یہ دیکھ کر میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی کہ پیتل کی ٹوٹی ہوئی کلائی میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا مطلب تھا رات ضرور کچھ ہوا تھا اور جسے میں سپنا سمجھا وہ سپنا نہیں کچھ اور تھا۔

میں عجیب بوکھلاہٹ کی حالت میں بستر سے اٹھا اور خوف کی نگاہوں سے پیتل کی کلائی کو دیکھنے لگا جو ٹھیک کہنی کے جوڑ سے ٹوٹی تھی، یوں لگا جیسے وہ کسی جاندار، جیسے جاگتے جسم کی مردہ کلائی تھی، ابھی میں اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا اور رات کے انوکھے سپنے یا واقعے پر یا جو کچھ بھی تھا پریشان ہو رہا تھا کہ تارا ہاتھ میں ڈوئی پکڑے، ننگے پاؤں، ننگے سر گھبرائی گھبرائی کمرے میں داخل ہوئی اور دہشت زدہ سی بولی۔

”کیا ہوا مالک! آپ چلائے کیوں تھے؟“

اس نے اپنی دھوتی کا پلو کمر سے لپیٹ رکھا تھا اور غالباً کچھ پکار رہی تھی کہ میری چیخ سن کر اسی حالت میں بھگ آ گئی مگر جب میرے ہاتھ میں پیتل کی کلائی دیکھی تو حیران رہ گئی۔

”کیا آپ پیتل کی اس کلائی سے ڈر گئے تھے؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ غالباً اس لاج کے مارے کچھ سمٹ گئی کہ بے حجاب میرے سامنے چلی آئی ہے مگر اس نے دھوتی کا پلو کمر سے کھول کر سر ڈھانپنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اسی حالت میں کچھ شرمائے کچھ گھبرا کے کہنے لگی۔

”یہ پیتل کی کلائی تو شاید اس مورتی کی ہے جو دادا کے کمرے میں رکھی ہے آپ کے پاس کہاں سے آ گئی؟“

میں حیران ہوا کہ تارا نے کلائی پہچان لی ہے، پھر خیال آیا، اسے تو کوئی بھی پہچان سکتا ہے کیونکہ بوڑھے ساگر ساؤجی کے کمرے کی مورتی بھگوان بدھ کے ان آخری دنوں کی عکاسی کرتی ہے جب وہ تپسیا کرتے کرتے سوکھ کر کاٹا ہو گئے یا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے اور پیتل کی یہ کلائی بھی اسی دھان پان شریک کا حصہ تھی جس میں سوکھی کھال کے اندر ہڈیاں ہی نمایاں تھیں مگر یہ سوال یقیناً بڑا اہم تھا کہ پیتل کی ٹوٹی کلائی میرے پاس کہاں سے آ گئی؟ اب یا تو میں اپنا سپنا سنا کرتا رہا کو مزید حیران کر دیتا یا اسے اعتماد میں لے کر معاملے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا۔ میں نے دوسری صورت بہتر سمجھی اور کہا۔ ”تارا! مورتی کی یہ کلائی میرے پاس کیسے آ گئی؟ سنو گی تو دنگ رہ جاؤ گی مگر میں چاہتا ہوں تم کسی سے بھی اس کا ذکر نہ کرو۔“

”آپ کہتے ہیں تو نہیں کروں گی سرکار!“

”یوں سمجھو تم نے یہ کلائی دیکھی ہی نہیں۔“

اس نے کچھ سوچ کے، کچھ مسکرا کے منہ ایک طرف پھیر لیا اور دھیرے سے بولی۔ ”بس میں نے یہ کلائی نہیں دیکھی۔“ تارا کے اس تعاون سے مجھے اطمینان ہوا۔ ”تم پوچھو گی تو پھر کبھی بتا دوں گا کہ مورتی کی کلائی یہاں کیسے آئی مگر اس سے کچھ نہ پوچھو۔“

”نہیں پوچھوں گی، سرکار! آپ کا من چاہے تو پھر کبھی بتا دینا، من نہ چاہے نہ بتانا میں تو آپ کی باندی ہوں جو کہہ دیں گے پورا کروں گی۔“

”تم کتنی اچھی ہو تارا! اب یہ بتاؤ سروپ جی کہاں ہیں۔“

”شاستر واور مدایا کے ساتھ مہمانوں کے لئے بھوجن لے کر گئے ہیں۔“

”کیا سروپ جی نے بھوجن کر لیا؟“

”ابھی تو کہاں بجے ہیں اور آپ جانتے ہیں، وہ صبح کا بھوجن نو بجے کرتے ہیں۔“ پھر مسکرا

کر کہنے لگی۔ ”میں نے پانی گرم کر دیا ہے آپ جلدی سے نہا دھولیں بھوجن تیار ہے۔ مالک

ہو جائے۔“ ناشتہ شروع ہوا تو میرا ذہن پھر رات کے سنے میں بھٹکنے لگا اور اب کے ایک بات میری توجہ کا مرکز بن گئی، دونوں ڈھانچوں نے رات کسی ایسی بھاشا میں گفتگو کی جواب کہیں بولی نہ جاتی تھی اور میں نے سوچا تھا شاید وہ پاٹلی پتر کی قدیم زبان پالی ہوگی۔ ناشتہ کرتے کرتے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرنے لگا۔ کیا بوڑھا ساگر ساؤجی پالی بھاشا پڑھ سکتا ہے، بول سکتا ہے؟ پٹاما پجاری کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ ساؤگاری میں پالی بھاشا پڑھنے والا کوئی آدمی موجود ہے اور رات کا سپنا دیکھنے کے بعد میرا فیصلہ تھا کہ وہ آدمی ساگر ساؤجی ہے، ناشتہ ختم ہوتے ہی شاستر و برتن سیٹنے لگا تو میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

”وہ تھیلا جو پہاڑی خانقاہ کی طرف جانے سے پہلے میں نے تجھے دیا تھا، اپنے کمرے کے آتش دان سے نکال کر لے آ۔“

ابھی چاہیے پر بھو؟“ شاستر نے آنکھیں پینا کیں۔

”ہاں ابھی، اسی وقت“

”تو پھر ابھی لائے دیتا ہوں۔“

وہ برتن سمیٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ سروپ جی ہاتھ دھو کر پلٹے تو بولے۔ ”وشال رائے اور کایا کو تمہارا انتظار ہوگا۔ نیچے نہیں چلو گے؟“

”نہیں پتا جی! ابھی تو مجھے دادا سے ملنا ہے، آپ بھی چلیے نا میرے ساتھ۔“

”وہ تمہی سے ملنا، تمہی سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں، میں وصال اور کایا کے پاس نیچے جاتا ہوں، تم دادا سے مل کر آ جانا۔“

یہ کہہ کر وہ زینے کی طرف ہو لیے اور میں شاستر کا انتظار کرنے لگا۔ تھیلا ایک خاص مقصد کے تحت منگوایا تھا۔ شاسترو نے واپسی میں دیر نہیں لگائی۔ میں اس سے تھیلا لے کر پھر اپنے کمرے میں آیا۔ اوور کوٹ پہنا اور تھیلا اٹھا کر نکل رہا تھا کہ تارا سے مڈھ بھٹک ہو گئی اور وہ ابھی تک اسی طرح دھوتی کا پلو کمر کے گرد لپیٹے کام کاج میں لگی تھی، مجھے اوور کوٹ پہنے، تھیلا اٹھائے نکلتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

”آپ کہیں باہر جا رہے ہیں صاحب۔“

”دادا سے ملنے جا رہا ہوں تارا! پرارتھنا کرنا جو آشا لے کر جا رہا ہوں وہ پوری ہو۔“

”بھگوان آپ کی آشا پوری کرے سرکار۔“

وہ آنگن میں کھڑی مجھے جاتے دیکھتے رہی اور اس وقت تک کھڑی رہی جب تک میں اس راہداری میں نہیں گھوم گیا جو بوڑھے کے کنیا کو مہر کی طرف جاتی تھی۔

نہ جانے بوڑھا مجھ سے کیوں ملنا چاہتا تھا مگر اب میرا اس سے ملنا ضروری تھا۔ طویل

بھی آنے والے ہیں۔“

گھڑی دیکھی تو پونے نو ہو رہے تھے۔ تارا نے بھی ایک نظر مجھے دیکھا، میرے چہرے پر کچھ تلاش کیا مگر اب میں مطمئن تھا۔ وہ یہ جانے بغیر کہ مورتی کی کلائی میرے پاس کیسے آگئی اپنی آنکھوں میں حجاب کا پردہ لئے رسوئی گھر کی طرف لوٹ گئی۔ میں نے پیتل کی کلائی کھوئی پر لٹکتے اوور کوٹ کی اندرونی جیب میں چھپا دی اور خود غسل خانے کی طرف ہولیا مگر نہاتے سے بھی ذہن رات کے عجیب و غریب سنے میں الجھا رہا۔

مورتی کی کلائی ٹوٹ جانے سے جو بدشگونی ہوئی اس نے پریشان کر رکھا تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کلائی تو رات سنے میں ٹوٹی پھر بھی نیند سے جاگا تو ٹوٹی کلائی میرے ہاتھ میں کیوں تھی۔

نہ جانے وہ سپنا تھا، کشف تھا، سچ مچ کا واقعہ تھا یا کیا تھا؟ مگر خواب اور حقیقت، اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہ گیا تھا، اگر تقدیر ان ہی واقعات کا نام ہے جو آدمی کے ارد گرد چکر لگاتے اور اسے حال سے مستقبل کی طرف منتقل کرتے رہتے ہیں تو رات جو کچھ مجھے پیش آیا شاید وہ میری کتاب تقدیر کا کوئی واقعہ تھا، ندی اور طوفانی سمندر کے جوار کی طرح چڑھتا ابھرتا جودن کی روشنی میں دھند کی مانند اڑتا اور بھاٹے کی طرح اترتا معلوم ہوتا تھا۔

نہ جانے تقدیر مجھے کدھر منتقل کرنے، کس طرف دھکیلنے والی تھی۔

نہا دھو کر فوراً کھانے کے کمرے میں پہنچ گیا۔ سروپ جی ابھی آ کر بیٹھے ہی تھے اور شاستر ناشتہ لگا رہا تھا کہ میں نے پرنام کیا اور ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے پتا جی۔“

دراصل انہوں نے جو بیماری بھوگی اور انت کال کی جس حالت سے لوٹے تھے، اس کے بعد انہیں آرام کی ضرورت تھی، مگر واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ وہ رات بھی بارہ ایک بجے تک جاگتے رہے اور صبح بھی جلد بیدار ہو گئے تھے، اسی لئے چہرے پر زردی کی جھلک تھی، لیکن میرے حال پوچھنے اور ”پتا جی“ کہہ کر خطاب کرنے سے چہرے کی رنگت یک لخت بدل گئی اور گلاب کی طرح گل کر بولے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں کیشپ بیٹے! مہمانوں کو ناشتہ کرا دیا ہے۔“

”تارا نے بتایا تھا مجھے کہ مہمانوں کے لئے ناشتہ چلا گیا ہے مگر آپ نے تکلیف کیوں کی۔“

مجھے جگا دیا ہوتا۔“

”وشال رائے اور کایا پتھا کی سیوا مجھی کو کرنی ہے تاکہ میری طرف سے ان کا من صاف

راہداری سے گزر کر جب میں اس کے تابوت نما، نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا وہ کائی کے بستر پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا شاید میرا انتظار کر رہا تھا۔ معلوم نہیں رات سے اسی حالت میں بیٹھا تھا یا سویرے سروپ جی کمرے میں آئے اور اسے سہارا دے کر بٹھا گئے تھے۔ آلہ سماعت بھی قریب ہی رکھا تھا، مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں روشنی سی چمکی۔ میں پرنام کر کے سامنے بیٹھ گیا اور آلہ سماعت کی نالیاں اس کے کانوں میں فٹ کر دیں مگر جب نالیاں فٹ کر کے بیٹھ رہا تھا، ناگاہ میری نظر بھگوان بدھ کی اس مورتی پر پڑی جو کونے میں ایستادہ تھی اور یہ دیکھ کر مجھے سکتہ سا ہو گیا کہ اس کے دائیں بازو کی کلائی ندرتھی۔ کلائی ٹھیک کہنی کے جوڑ سے ٹوٹی تھی اور بازو کے ٹنڈ نے مورتی کو بدہیت، بد صورت بنا دیا تھا، اس منظر کو دیکھتے ہی مجھے وہ کراہ، وہ سسکی یاد آگئی جو کلائی کے تڑاتے کے ساتھ ہی مورتی کے ہونٹوں سے نکلتی تھی۔

رات اسی مورتی نے میرے بازوؤں کو دبائے رکھا تھا، مجھ سے باتیں کی تھیں مگر اس وقت بے جان بت کی طرح کونے میں ساکت و جامد کھڑی تھی۔ کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ پیتل کی یہی مورتی کالی راتوں کے سنائے میں کبھی کبھی اپنے پاؤں گھسٹتی چلتی پھرتی ہے۔ مجھے مورتی کی طرف گھورتے دیکھ کر بڑھا سا گرساؤ جی ”فف فف..... سس سس.....“ کی آواز میں بولنے لگا۔

”رات کوئی آدمی مورتی کی کلائی توڑ کر لے گیا، میں نے سروپ جی سے کہا ہے وہ اس آدمی کا پتہ کرے۔“ میں بوڑھے کی بات سن کر دنگ رہ گیا۔ ”دادا! تم رات کو کہاں تھے؟“ ساگر ساؤ جی نے حیرت کی نظروں سے مجھے دیکھا پھر جواب دیا۔ ”میں مندر سے لوٹ کر آیا تو پھر میں نہیں گیا، رات بھر یہیں رہا ہوں۔“

”پھر تمہاری موجودگی میں کون آیا تھا؟“

”کوئی نہیں مگر مورتی کی ایک کلائی نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے رات مورتی خود کہیں چلی گئی ہو؟“

بڑھے نے یوں دیکھا جیسے میری دماغی صحت پر شبہ کر رہا ہو۔ ”مورتی آپ سے آپ کہاں جائے گی۔“

”مگر میں نے اسی مورتی کو چلتے پھرتے دیکھا ہے۔“

بڑھے کو میری بات پر یقین نہ آیا۔ ”تم نے مورتی کو چلتے پھرتے دیکھا ہے؟“

”ایک بار نہیں کئی بار دیکھا ہے۔ مورتی راتوں کو کبھی کبھی میرے پاس آیا کرتی ہے۔“

”کوئی سپنا دیکھا ہو گا تم نے؟“

”ہاں سپنے ہی دیکھتا ہوں۔ رات بھی سپنا دیکھا تھا اور اس سپنے میں یہی مورتی اپنے پیتل

کے پاؤں گھسٹتی میرے کمرے میں آئی تھی، پہلے اکیلی آیا کرتی تھی مگر رات تم بھی اس کے ساتھ تھے اور مورتی مجھے یہ بتانے آئی تھی کہ درخت سنتے اور پتھر بولتے ہیں، اس نے کہا ہے کہ میں ایک شرط پر آئند بھکشو والی مورتی ڈھونڈ لوں گا مگر جب شرط پوچھی تو کہنے لگی۔ شرط پانچ پتر میں آ کے پوچھنا اور پانچ پتر کو تباہ و برباد ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔“

بوڑھا تصویر حیرت بنا میری باتیں سن رہا تھا۔ دیوانوں کی سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا، میں نے اس کی حیرت میں مزید اضافہ کر دیا۔

رات جب مورتی میرے کمرے سے نکلنے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اصرار کیا کہ شرط مجھے یہیں بتاتی جائے مگر یہ رکی نہیں، چل پڑی اور میں نے ہاتھ کھینچ کر روکنے کی کوشش کی تو ایک تڑا تھا ہوا اور مورتی کی کلائی کہنی کے جوڑ سے ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آگئی، مگر یہ تب بھی نہیں رکی اور کراہتی، پاؤں گھسٹتی کمرے سے نکل گئی تم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے اور میں اس کی ٹوٹی کلائی ہاتھ میں لئے حیران ہوتا رہا کہ یہ کیا ہو گیا۔ سویرے جب آنکھ کھلی تو پیتل کی ٹوٹی کلائی میرے ہاتھ میں تھی۔“

میں نے کوٹ کی جیب سے پیتل کی کلائی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ”یہ دیکھو اور اب بولو یہ سپنا ہے یا کچھ اور؟“

بوڑھے کی یہ حالت کہ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ لہو تو خیر اس کے شریر میں پہلے ہی نہ ہونے کے برابر تھا مگر میری کہانی سن کر مورتی کی کلائی دیکھ کر اس پر بوکھلاہٹ اور دہشت کا ایسا دورہ پڑا کہ میں الفاظ میں اس کی صحیح کیفیت بیان ہی نہیں کر سکتا۔ اس کا استخوانی شریر یوں کانپا جیسے بھونچال آگیا ہو۔ گھٹنے بجنے لگے، ہونٹ لرزتے، کپکپاتے رہے مگر کچھ بولا نہیں، لگتا تھا فرط حیرت سے گویائی جواب دے گئی ہے، میں نے ایک اور انکشاف کر دیا۔

”دادا، رات تم مورتی کے ساتھ کسی پرانی بھاشا میں بات کر رہے تھے شاید وہ پالی بھاشا تھی۔ کیا تم پالی بھاشا جانتے ہو؟“

اس پر حیرت کا ایک اور دورہ پڑا اور تھرتھراتی آواز میں بولا۔

”تھوڑی بہت جانتا ہوں۔“

”جو باتیں تم نے سنی ہیں، ان سے کیا اندازہ لگاتے ہو، کیا رات میں نے سپنا ہی دیکھا تھا یا وہ ساری باتیں سچ مچ اسی طرح پیش آئی تھیں جس طرح میں نے بیان کی ہیں۔“

یہ سنتے ہی بڑھے نے دونوں ہاتھ فرش پر ٹیک کر میرے چرنوں میں سر رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا کہ ساؤ پر یوار کی کئی نسلوں نے مجھے سجدہ کیا ہے۔ پریشان ہو کر میں نے اسے نندھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ ”یہ تم نے کیا کیا دادا! کیا کوئی بڑا کسی چھوٹے کے آگے سیس جھکاتا ہے؟ اس

”میں اس جیون بھید کو جانتا ہوں۔ ساؤ گاری کا ہر وارث جانتا ہے کیونکہ ساؤ پر یوار نسل در نسل اتی جیون بھید کا عذاب بھوگ رہا ہے، اس لئے میں نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا پر یوار اس عذاب میں مبتلا ہو۔ ساؤ گاری کے ہونے والے وارث تم ہو، جیہی تمہیں علیحدگی میں پایا ہے تاکہ بتا سکوں، جب تک تم آنند بھکشو والی مورتی ڈھونڈ نہیں لیتے، یا جب تک سروپ پران تیاگنے سے پہلے تمہیں ساؤ پر یوار کے بھید سے آگاہ نہیں کر دیتا تمہارے لئے اس راز سر بستہ کا جاننا اچھا نہیں جس کی کنجی سار گلیان نے اپنی ڈبیا میں بند کر دی تھی۔“

”دادا تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے، مورتی کا جیون بھید اور ساؤ پر یوار کا راز سر بستہ ایک ہی ہے۔“

”تم ٹھیک سمجھے۔“

”اور تم کہتے ہو کہ وہ جیون بھید ایک کڑا عذاب ہے اور دنیا کے ہر آدمی اور ہر پر یوار کو اس

عذاب سے بچنا چاہیے۔“

”ہاں، میں یہی چاہتا ہوں۔“

یہ کہتے کہتے بڑھے کی سفید پلکیں بھگ گئیں اور میلی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے قطرے چہرے کی جھریوں بھری خنک کھال پر لڑھک گئے۔ وہ بھگی بھگی، بھاری آواز میں کہنے لگا۔

”صرف آنند بھکشو والی مورتی ہی ساؤ پر یوار کو اس کڑے عذاب سے نجات دلا سکتی ہے۔ اسی لئے میں نے تم سے ناتا جوڑا اور اپنی سندرمی تمہیں بھیٹ کر دی، کیشپ بیٹے! اگر دکش کی بیٹیوں کی طرح ساؤ پر یوار میں کچھ اور سندرمی لڑکیاں ہوتیں تو میں سب کی سب تمہیں بھیٹ کر دیتا کیونکہ میرا من کہتا ہے تمہی وہ دیوتا ہو جو آنند بھکشو والی مورتی ڈھونڈو گے، ساؤ پر یوار کو اس عذاب سے نجات دلاؤ گے جسے وہ تین صدیوں سے بھوگ رہا ہے اور اس بھلائی یا دیا کا صلہ سندرتا ہے مگر میرے پاس تمہارے لئے ایک اور صلہ بھی ہے۔“

شاید میرے پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ بوڑھا ساگر ساؤ جی مجھے سندرتا کا لوبھ دے رہا تھا اور اسی لوبھ کی خاطر اس نے سندرمی مجھے بھیٹ کر دی تھی مگر اصل بات یہ ہے کہ پرانے گیگ کے لوگ جنہیں دیوتا سمجھا جاتا ہے، عورت کی سندرتا اور اس کی جوانی کو سنسار کی سب سے بڑی سوغات سب سے عمدہ چیز سمجھتے تھے جو بھگوان نے انہیں عطا کی۔ اس لئے وہ سندرمی عورت ہی کو کسی بڑے کام کا صلہ یا انعام قرار دیتے تھے۔ ساؤ پر یوار، ہندو شاستروں اور پورانوں کی کئی باتوں کو مانتا تھا۔ جیہی ساگر ساؤ جی نے سندرتا کو اس کام کا صلہ ٹھہرایا جو مجھے کرنا تھا اور یہ بات اس نے کسی لوبھ کے لئے نہیں بلکہ اپنے عقیدے اور وشواس کے طور پر کہی تھی، میں خود کائنات

کے چرنوں میں سر رکھتا ہے۔“

”تم عمر میں مجھ سے کئی نسلیں چھوٹے ہو مگر گیان اور بھگتی میں کئی درجے بڑے ہو، کل تم نے سروپ کے چھوٹے پران لوٹائے تو تمہیں اس گیگ کارشی مانا آج تمہارا ایک نیاروپ دیکھا ہے اور تمہیں بھگوان کا روپ مانتا ہوں، مورتی تمہارے سپنے میں آ سکتی ہے مگر اس کی کلائی کا لوٹ کر تمہارے ہاتھ میں آ جانا پسنا نہیں ہو سکتا۔ ایسی باتیں بھگوان کے اوتار ہی دیکھتے ہیں۔“

”دادا! مجھے آدمی ہی رہنے دو، بھگوان کیوں بناتے ہو؟“ بوڑھا کہنے لگا۔ ”تمہیں دیکھتے ہی میں نے اپنی سندرمی پوتی جو کسی دیوتا کی ناری بننے کے لائق تھی تمہارے ساتھ اس لئے بیاہ دی تھی کہ تم مجھے دیوتا ہی نظر آئے۔ ایسی سندرمی کی پر جیسی سندرمی ہے، صرف تم جیسے دیوتا کا ادھیکار تھا۔ آج مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں جو کچھ سوچا وہ بالکل ٹھیک تھا بلکہ تم میری سوچ سے بھی اونچے ہو، بڑے ہو۔“

میں اس ذکر سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے اسے ایک نئے موڑ پر لے آیا۔ ”ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں دادا بتاؤ گے؟“

”کیوں نہیں بتاؤں گا، پوچھو کیا پوچھتے ہو؟“

”پروہت گنجال کہتا ہے جب کایا پنتھا نے سار گلیان کی ڈبیا دینے سے انکار کر دیا، تب اسے تمہاری آگیا پر بندی بنا کر پہاڑی خانقاہ کی کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔ کیا یہ سچ ہے؟“ بوڑھا اس سوال پر کہیں گم ہو گیا، وہ یہ خبر تو ضرور سن چکا تھا کہ گنجال کہیں بھاگ گیا یا چھپ گیا ہے لیکن شاید سروپ جی نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ گنجال نے اسی کو روپ تارا کے قتل اور کایا پنتھا کی قید کا دوشی ٹھہرایا تھا۔ کچھ دیر چپ رہنے اور سوچنے کے بعد اس نے اعتراف کیا۔

”ہاں، یہ سچ ہے۔“

”مگر تم نے یہ اتنا چار کیوں کیا؟“

”کئی جیون بچانے کے لئے۔“

بوڑھے کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ اپنی مخصوص زبان، مخصوص لہجے میں کہنے لگا۔ ”سار گلیان نے اس ڈبیا میں جیون کا ایک ایسا بھید بند کر دیا تھا جو اگر کھل جائے تو ہزاروں لوگ پاگل ہو جائیں، اس لئے میں نے گنجال کو آگیا دی تھی کہ اگر کایا وہ ڈبیا نہیں دیتا تو کوئی ایسا چار کرے جس سے ڈبیا کسی دوسرے کے ہاتھ بھی نہ لگے۔“

”اگر ڈبیا تمہیں مل جاتی تو تم کیا کرتے۔“

”میں اسے آگ میں پھینک دیتا، ضائع کر دیتا۔“ یہ جواب حیران کر دینے والا تھا۔

”مگر اس میں تو آنند بھکشو والی مورتی کے جیون کی کنجی بند ہے۔“

”اس لئے کہ جیون بھید جاننے کے بعد تم بھی اسی عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے جس میں میں مبتلا ہوں۔“

”اگر مقدس مورتی نہ ملی تب ایک نہ ایک دن ساؤ گاری کے وارث کی حیثیت سے مجھے بھی اسی عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا پھر میں آج ہی کیوں نہ.....“

ساگر ساؤ جی کے ہونٹوں سے ایک بھیا نک چیخ نکل گئی۔ ساتھ ہی اس نے کپکپاتی استخوانی ہاتھ میری طرف لہرایا، جیسے منع کر رہا ہو کہ میں کچھ نہ کہوں، پھر وہ ہانسی آواز میں کہنے لگے۔

”تھارو کیشپ! تم میری آخری امید ہو میں نہیں چاہتا یہ آخری دیا بھی بجھ جائے اور تم ساؤ گاری کے عذاب میں مبتلا ہو کر میری طرح، سروپ ساؤ کی طرح ایک دھندلا سایہ بن جاؤ، تم وہ دیوتا ہو جو ہر میدان میں وجے حاصل کرتا ہے۔ لاؤ یہ تحریر مجھے دے دو، تمہیں اس کا بھید جاننے کی ضرورت نہیں۔“

”میں تو اس تحریر کو پڑھوانے کی بڑی آشا لے کر آیا تھا۔“

”اگر تم حکم دے کر کہو تو میں اسے پڑھ کر سناؤں گا کیونکہ تم رشی ہو۔ دیوتا ہو اور میں تمہارا حکم پورا کروں گا خواہ مجھے کتنا دکھ کیوں نہ سہتا پڑے۔“

”نہیں میں تمہیں حکم نہیں دے سکتا۔ دادا! اس تحریر کو پڑھوانے کا ارادہ ترک کرتا ہوں۔“

”پھر مجھے دے دو تا کہ میں اسے ضائع کر دوں۔“

”یہ تحریر اور سارگلیان کی ڈیبا میرے پاس امانت ہے میں اس امانت کو اپنے ہی پاس رکھوں گا۔“

یہ کہہ میں نے چرمی تحریر کو تہہ کر کے سونے کی ڈیبا میں بند کر دیا اور ڈیبا اپنی جیب میں ڈال لی۔ ساگر ساؤ جی کے چہرے پر مایوسی نے سایہ ڈال دیا اور میرے من میں ایک نئے شے نے سر اُبھارا کہ بڑھے نے کسی خاص مقصد کے تحت مجھے اس تحریر کا بھید جاننے سے منع کر دیا اس نے کہا تھا اگر وہ تحریر میں نے سن لی اور اس کا مقصد سمجھ لیا تو اسے دکھ ہو گا تو کیا اس پر اسرار جیون بھید کا واسطہ صرف ساگر ساؤ جی کی ذات سے ہے، مگر میں نے فوراً ہی اس خیال کو مسترد کر دیا کیونکہ بڑھے سے پہلے بھی ساؤ پر یوار کے پرکھوں نے وہ عذاب بھوگا تھا جو اسی جیون بھید کے کارن ان کا مقدر بن گیا تھا۔

اب میں اپنی ملاقات کے آخری مرحلے کی طرف بڑھا۔

”دادا! تم کہتے ہو کہ آئندہ بھکشو والی مورتی ہی ساؤ پر یوار کو عذاب سے نجات دلا سکتی ہے اگر وہ مورتی مل جائے تو اسے پہچان لو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ بوڑھا قدیم آسامی لہجے میں بولا ”اس سنسار میں اب صرف ایک ہی

کی بر سندر چیز پر خواہ وہ کسی شکل اور کسی روپ میں ہو۔ اپنا ادھیکار سمجھتا ہوں مگر میں نے سروپ جی کو یا سندر متی کو آئندہ بھکشو والی مورتی ڈھونڈنے کا وچن اس لئے نہیں دیا تھا کہ ساؤ خاندان کی کچھ اور سندر لڑکیاں مجھے صلے میں مل جائیں۔ اس خاندان میں سندر متی کے علاوہ کوئی اور لڑکی تھی بھی نہیں اور سندر متی کو میں پہلے ہی حاصل کر چکا تھا، میں تو اپنے سو رگ ہاشی چاچا چکرورتی سہائے کا آدرش پورا کرنے کے لئے مقدس مورتی کے کھوج میں تھا۔ پر اسرار قدرت نے ساؤ خاندان سے میرا ناتا کر دیا تھا۔ اب میں سندر متی کو ساؤ گاری کے اسرار سے نکالنے اور تین صدیاں پرانی اس عمارت کے باسیوں کو نروان عطا کرنے کے لئے مورتی کی تلاش میں تھا۔

ساگر ساؤ جی نے جس کلپنا کے ساتھ مورتی کے جیون بھید اور ساؤ پر یوار کے راز سر بستہ کا ذکر کیا اور مقدس مورتی ڈھونڈنے کے سلسلے میں جس دشواس اور سندر صلے کی بات کی اس سے بوڑھے کے اس عظیم دکھ کا پتہ چلتا تھا، جسے وہ اپنے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا۔ اگرچہ کا یا پتھا کی ہولناک قید اور روپ تارا کا قتل اسی کے نام منسوب ہوا تھا، پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا کوئی ایسی عجیب و غریب بات ضرور ہے جو ساگر ساؤ جی کو نردوش قرار دیتی ہے اس کی بے کلی نے مجھے بھی بے چین کر دیا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

”دادا! اگر تمہارا دشواس ہے کہ میں وہ مورتی ڈھونڈ لوں گا تو ضرور ڈھونڈ لوں گا اور ساؤ گاری کو نروان عطا کروں گا مگر مجھے کسی صلے یا انعام کا لو بھ نہیں۔ تم نے سندر متی کے روپ میں ساؤ خاندان کی جو سندر سوغات مجھے بھیجتی ہیں، میرے لئے وہی بہت ہے، اب میں سندر متی کے سکھ چین کے لئے اپنا فرض پورا کروں گا۔“

بوڑھے نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے خشک ہونٹوں سے لگایا اور کہا۔

”دھن باد تھارو کیشپ! تم سچ سچ مہان آدمی ہو۔“

سارگلیان کی کلید اسرار کے بارے میں اس نے جس وچار کا اظہار کیا تھا، اس نے میری ساری دلچسپی ختم کر دی تھی حالانکہ میں اس چرمی تحریر کا مطلب جاننے کیلئے بڑا بے چین تھا، مگر اب یہ بات مجھے پریشان کرنے لگی تھی کہ جیون بھید ساؤ پر یوار کے لئے عذاب کیوں بن گیا؟

میں نے سارگلیان کی ڈیبا نکال کر دادا کے سامنے رکھ دی پھر اپنے بازو سے بندھی چرمی تحریر کھول کر اسے دکھائی۔ ”دادا! سارگلیان کی ڈیبا سے پالی بھاشا کی یہی تحریر نکلی ہے، میں یہ تحریر تم سے پڑھوانا اور اس کا بھید جاننا چاہتا تھا مگر تم کہتے ہو مقدس مورتی ڈھونڈنے سے پہلے میرے لئے اس تحریر کا بھید جان لینا اچھا نہیں ہو گا۔“

”ہاں بیٹے! میں یہی کہتا ہوں۔“

”مگر کیوں؟“

مورتی ہے جس پر بھگوان بدھ کے چار شبد اور چار شبد نام کندہ ہیں۔“
پھر وہ شبد اور نام دہرانے لگا۔

”جیون بھید چار انائے، شاکیہ منی۔ تنھا گت۔ امی تابھ، آتماروپ۔“ اب میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا کروہ نقلی مورتی نکالی، جسے چکرورتی چاچا کلکتہ سے لے کر آئے اور جسے بڑھے کے بیٹے منگل ساؤ نے ہتھیا نے کی کوشش کی تھی، میں مورتی کے اوپر لیٹے ہوئے کاغذات اتار رہا تھا اور ساگر ساؤ جی کی نگاہیں یہ دیکھنے یہ جاننے کے لئے بے چین اور مضطرب تھیں کہ کاغذوں کے غلاف میں لپٹی چیز کیا ہے۔ کیسی ہے جوں ہی میں نے اس کا کاغذی پیرا ہن اتارا اور بڑھے نے مورتی کی ایک جھلک دیکھی وہ بیٹھے بیٹھے اس طرح اچھلا جیسے فرش نے اسے اچھال دیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں، چہرے پر۔۔۔ پورے شریر میں بجلیاں کوند نے لگیں، سر سے پاؤں تک رگ و پے میں مسرت کی بے پایاں لہر دوڑنے لگی، میں نے مورتی پر کندہ شبدوں اور ناموں والا حصہ اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

”دادا! فرایہ شبد، یہ نام پڑھو، کہیں یہ مورتی وہی تو نہیں؟“
”وہی ہے۔۔۔ وہی ہے۔“

بوڑھا فرط مسرت سے چلایا اور مورتی پر یوں جھپٹا جیسے بھوکے چیل گوشت پر جھپٹتی ہے۔ اس نے مورتی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا۔ اسے بار بار چوما۔ آنکھوں سے لگایا میں اس کی بچوں جیسی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا خوش تھا۔ جیسے دھرتی اور آکاش کی ساری خوشیاں مل گئی ہوں۔ دونوں ہاتھوں سے مورتی کو اپنے سینے سے لگا کر بولا۔

”اب میں مسکوں گا۔ چین سے مسکوں گا اور سو رگ میں اپنے ان بچوں سے مل سکوں گا جو اس مورتی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پر لوک سدھار گئے۔“ مجھے اس کے الفاظ بڑے عجیب معلوم ہوئے، جیسے بوڑھے کی جان اسی مورتی میں اٹکی ہوئی تھی اور وہ اس سے تک مر نہیں سکتا تھا، جب تک مورتی مل نہ جاتی پھر اس نے مجھے مخاطب کیا، بڑا عجیب تھا اس کا لہجہ اور بڑے شستہ و رفتہ تھے، اس کے الفاظ۔

”تھارو کیشپ! میرا جیون دکھ بھو گتے بیتا ہے تم نہیں جانتے میں کتنا دکھی ہوں، اگر میں اپنے بیٹے موسموں اور گزرے دنوں کو آواز دوں تو غم پہاڑوں کا بوجھ بن کر مجھ پر آگریں مگر میں سنسار سے اپنے وہ دن نہیں مانگتا جو غموں کے اجالے میں بسر ہوئے۔ ان راتوں کا حساب طلب نہیں کرتا۔ جو دکھوں کے اندھیرے میں کٹ گئیں کیونکہ میں نے اپنا دیا اس تیل سے جلایا تھا جس پر میرا کوئی ادھیکار نہیں، اس لئے جیون مجھ سے انتقام لیتا رہا اور میں دکھوں میں گھل گھل کر اپنے شاکسایہ بن گیا۔ میرے غم نہ بچھنے والے الاؤ کی طرح بھڑکتے رہے مگر اب یہ شے

کانت ہونے والا ہے، میری عمر کی سوکھتی ندی اپنے سمندر میں جا گرے گی اور میرے مرتے ہی ساؤ پر یوار کے سارے دکھ ختم ہو جائیں گے۔ میں اس دن پر پھنکار بھیجتا ہوا جب میرا جنم ہوا تھا اور اس دن کو مبارک اور بھگوان کہتا ہوں۔ جب میں مروں گا۔

تم نے مورتی ڈھونڈ کر میری مکتی کا راستہ کھول دیا اور میری اڑھی اٹھنے کا سامان کر دیا ہے۔ یہ اتنی بڑی دیا ہے کہ اگر میرے گھرانے میں ایک ہزار ایک سندرتیاں بھی ہوتیں اور میں سب کی سب تمہیں بھیٹ کر دیتا پھر بھی اس دیا کا بدلہ نہیں چکا سکتا تھا مگر میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ ابھی میرے پاس تمہارے لئے ایک اور صلہ ہے اور میں وہ صلہ تمہیں دے جاؤں گا۔ تم وہ جیون بھید جانتے تھے جو تین صدیوں سے ساؤ پر یوار کے پرکھوں کو چاٹتا رہا ہے۔

الاؤ سار گلیان کی وہ تحریر میں اب اسے پڑھ کر سناؤں گا اور تم ساؤ گاری کے اسرار جان لو گے۔“
میں سمجھ گیا کہ ساگر ساؤ جی کا مورتی سے گہرا ناتا ہے۔ شاید گوچی ساؤ کے بعد وہی اس پر یوار کی سب سے اہم شخصیت ہو۔ اس کی عمر پر بھی ڈیڑھ صدی پورے ہونے والی تھی۔ ممکن ہے اس نے پر تلیا کی ہو کہ جب تک مقدس مورتی نہ مل جائے جس کے لئے گوچی ساؤ کی آتما کو شانتی مل سکتی ہے۔ وہ مرے گا نہیں اور اب مورتی کو دیکھ کر وہ از خود رفتہ ہوا جا رہا تھا۔ اس خود رفتگی پر مجھے ترس آنے لگا کیونکہ یہ وہ مورتی نہ تھی۔

میں اسے زیادہ دیر خوش فہمی میں نہ رکھنا چاہتا تھا، اس لئے کہا۔

”دادا! تم بھول رہے ہو۔ ابھی تمہارے مرنے کا سہ نہیں آیا، یہ وہ مورتی نہیں جس کی ساؤ پر یوار کو ضرورت ہے۔“

بوڑھا ہکا بکا سا مجھے دیکھنے لگا۔ ”تو کیا۔۔۔“ وہ آگے کچھ نہ بول سکا اور میں نے اس کا ادھورہ فقرہ پورا کر دیا۔

”نقلی مورتی ہے۔“

”نقلی۔۔۔ مورتی۔۔۔ جیسے ان لفظوں نے سانپ بن کر اسے ڈس لیا ہو۔ چہرہ لٹک گیا۔ کوندتی بجلیاں پھر بالوں میں چھپ کر بیٹھ گئیں۔ بوڑھا شریر کسی بھنور میں ڈوبنے لگا۔ ہونٹ کاپٹنے لگے۔“ وہ نقلی مورتی جو کمپنی سرکار کے گورنر جنرل نے شاہ آوا کو بھیٹ کی تھی۔“
بوڑھے نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا، میں نے اس کی تائید کی۔

”ہاں دادا! یہ وہی مورتی ہے جو شاہ آوا نے کمپنی سرکار کو لوٹا دی تھی۔ جسے چھونے کے بعد کوئی روٹی اچھا نہیں ہوا تھا کیونکہ اس میں تنھا گت بدھ کے سر کی مقدس راکھ نہیں تھی۔“

ساگر ساؤ جی پر ایک بجلی سی گری، مورتی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ہاتھ پاؤں لرزنے، کانپنے لگے اور وہ جسم سے اونڈھ منہ کائی کے بستر پر گرا۔ میں نے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو

جسم کسی مردے کی طرح اکڑ گیا تھا، میں سمجھ گیا کہ اسے دورہ پڑا ہے، پھر اسی حالت میں دروازے کی طرف بھاگا کہ سروپ جی کو اطلاع کروں۔

○

میں بوڑھے کے تابوت نما کمرے سے گولے کی طرح نکلا اور طویل راہداری سے آندھی کی طرح گزرتا زینے کی طرف بھاگنے لگا، شاید تارانا نے میرے بھاگتے قدموں کی آواز سن لی تھی، لپکتی جھپکتی آئی اور راہداری کے موڑ پر مجھ سے ٹکرائی اگر میں جلدی سے تھام نہ لیتا تو فرش پر گرتی یا دیوار سے ٹکراتی اور چوٹ لگتی، میری افرا تفری نے اسے بتا دیا تھا کہ کچھ ہو گیا ہے پھر میرے چہرے کی بدحواسی اسی کے چہرے پر ہوا یاں بن کے اڑنے لگی اور میری بانہوں میں جھوٹی، سنبھلتی گھبراہٹ پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا صاحب۔“

”دادا کو دورہ پڑ گیا۔“

اور میں اسے پرے بناتا زینے کی جانب بھاگا۔ دھڑ دھڑ کرتا میٹر حسیاں اتر اور گوجی ساؤ کی مورتی کے پاس سے گزرتا جوزینے کے سامنے نصب تھی، پوربی راہداری میں لائبریری کی طرف لپکا، مدایا جھٹو اور شاسترو وہیں، راہداری میں نظر آئے جو مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ سروپ جی وصال رائے اور کایا پنتھ کے کمرے میں تھے میں کمرے میں داخل ہوا تو سب گھبرا کے کھڑے ہو گئے، وہ یہی سمجھے شاید میری مذہبیٹ گنجال سے ہو گئی ہے۔ سروپ جی کچھ زیادہ پریشان نظر آتے تھے، میں نے کہا۔

”پتا جی! اوپر چلیے، دادا کو دورہ پڑا ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ گھبرائے گھبرائے باہر نکلے۔ شاسترو نے میری بات سنی اور معاملے کی صورت سمجھ لی تھی، وہ ہمارے پیچھے پیچھے زینے تک آیا اور وہیں رک گیا کیونکہ جب کبھی ساگر ساؤ جی کو دورہ پڑتا چند خاص آدمیوں کے سوا کوئی شخص اس کے کمرے میں تو کیا اوپر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ شاسترو زینے کے دروازے پر اس لئے رک گیا تھا کہ شاید کسی کام کے لئے اس کی ضرورت پڑ جائے۔ لہذا اس کو قریب ہی موجود رہنا چاہیے۔

زینے کی گیلری سے گزر کر سروپ جی پل دوپل کے لئے اپنے کمرے میں گئے اور دوا کی ایک چھوٹی سی شیشی اٹھا کر لوٹ آئے۔ پھر میرے ساتھ ہی کچھ ہی سمت کی لمبی راہداری پار کر کے بوڑھے کے کتیا کو مہز میں داخل ہو گئے۔

بڈھا اس حالت میں جس حالت میں میں اسے چھوڑ گیا، کائی کے بستر پر پڑا تھا۔ اس کی بنیت کدائی سے یوں لگتا تھا جیسے پران چھوڑ چکا اور آتما کا تپھی بوڑھا پنجر اچھوڑ کے اڑ گیا ہے

ہم دونوں نے مل کر اس اکڑی ”اش“ کو سیدھا کیا جسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ سروپ جی نے، میں نے نبض مٹانے کی کوشش کی مگر کہیں نہ ملی نہ جانے وہ کہاں رک کر چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ سروپ جی نے دادا کا ہاتھ پکڑ کر بازو اوپر اٹھایا پھر چھوڑ دیا اور وہ ہاتھ کسی مردے کی طرح ”دھپ“ کی آواز سے فرش پر آگرا گویا قصہ ختم ہو چکا تھا مگر نہیں، قصہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کیونکہ بے جان بازو کے فرش پر گرتے ہی پاؤں میں معمولی سی حرکت ہوئی جیسے کچھ اچلتا ہے پھر وہ کچھ ابھی کہیں رک گیا جب میں نے پہلی بار بڈھے کو دورے کی حالت میں دیکھا اس کی بے جان تارو سی آنکھیں چھت پر لگی تھیں اور ایک باریک سی جھری سے پتلیوں کی چربی نظر آتی تھی۔ ان آدھی بند، آدھی کھلی آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی۔ بڈھے کا منہ سختی سے بند تھا اور دونوں جبڑے ایک دوسرے میں پیوت ہو کے رہ گئے تھے۔ جسم بڈیوں کا ایک ایسا ڈھانچہ تھا جس پر صرف کھال منڈھی تھی۔ بڈھا کسی مردے کی طرح بے جان، بے سدھ پڑا تھا اور اس کا آتما انی شری لکڑی کی مانند سخت ہو گیا تھا، مگر سروپ جی جانتے تھے وہ ابھی مرا نہیں کیونکہ اس کی بوڑھی آتما نے جیسے بڈیوں کے اس پنجرے سے نہ نکلنے کی سوند کھا رکھی ہے وہ میری طرف دلیہ لڑ بولے۔

”کیشپ! کیا تم دادا کا منہ کھول سکتے ہو؟“

منہ اتنی سختی سے بند تھا کہ اسے کھولنا ممکن نہ تھا میں نے ایک دوبار کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ دیکھ کر سروپ جی اٹھے اور طاقت سے فواد کی ایک پتلی سلاخ اٹھا لے۔ ”او اس سے کوشش کرو۔“

میں نے سلاخ پکڑ لی۔ انہوں نے ایک گھٹنا ٹیک کر دادا کی گردن اٹھا کر اپنے کھنٹے پر رکھ لی اور مجھے اشارہ کیا میں فواد کی سلاخ کا نوک دار سر امانہ کے ایک کونے میں ڈال کر جب کھولنے کی کوشش کرنے لگا، مجھے دانتوں پسینہ آ گیا، جبڑا کھٹکے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا، میں ذرا کہیں زور آزمائی سے بڈھے کا جبڑا ہی نہ ٹوٹ جائے آخر تین چار منٹ کی محنت کے بعد میں اتنی جھری پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا جس میں دوا کے قطرے ٹپکائے جاسکتے تھے، سروپ جی نے اس حالت میں شیشی اٹھائی اور زرد سیال کے دس قطرے گن کر اس جھری میں ٹپکا دیئے پھر گردن کے نیچے سے گھٹنا ہلاتے رہے تاکہ دوا حلق سے نیچے اتر جائے پھر میں نے منہ سے سلاخ نکال لی۔ سروپ جی نے گردن کے نیچے سے گھٹنا بنالیا اور ہم دونوں اس ”مردے“ کے پاس بیٹھ کر دوا کے نیچے اترنے کا انتظار کرنے لگے۔ پہلی بار جب میں نے پروہت گنجال کو فواد کی سلاخ سے بڈھے کا منہ کھولتے دیکھا مجھے اس حرکت پر سنگدلی کا احساس ہوا تھا، دوا اس کے حلق میں اس طرح ٹپکائی گئی تھی جیسے کسی جانور کو ذبح کیا جا رہا ہو مگر اب معلوم ہوا، یہ فواد کی

سلاخ ایک فطری ضرورت تھی کیونکہ دورے کی حالت میں بڑھے کے جڑے اتنی مضبوطی سے بند ہو جاتے تھے جیسے قلعے کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔

”بیٹھے بیٹھے سروپ جی کونہ جانے کا خیال آیا کہنے لگے۔“

”کیٹشپ! تمہاری پرارتھنا سے میں موت کے ساحل سے لوٹ آیا تھا، کیا تم کوئی ایسی پرارتھنا نہیں جانتے کہ دادا پران چھوڑ دیں اور موت کے ساحل پر جا لگیں۔“

سروپ جی کی اس خواہش میں ایک گہرا دکھ پھپھاتا تھا۔ بڑھے کا جیون موت سے بدتر تھا، ساؤ گاری کے سب باسی اس کے مرنے کی دعائیں مانگتے تھے۔ خود بڑھا موت کے لئے تڑپ رہا تھا، مگر موت اس تابوت نما کمرے کا راستہ بھول گئی اور ساؤ گاری میں چکر لگا کر لوٹ جاتی تھی، میں جانتا تھا۔ سروپ جی نے دادا کے مرنے کی جو آرزو کی اس میں سب کی اور خود بڑھے کی بھلائی تھی، مگر ان کے الفاظ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا، میں نے جواب دیا۔

”پتا جی میں کسی کے جیون کی پرارتھنا تو کر سکتا ہوں، موت کی نہیں۔“

وہ چپ ہو گئے کہیں کھو گئے۔ پھر بڑی بے بسی سے بولے۔

”بھئی بھئی سوچتا ہوں، دادا کو جیون کے عذاب سے چھٹکارا دلانے کے لئے کچھ کروں، موت کے درجنوں طریقے، سینکڑوں حربے ہیں مگر قدم اٹھانے سے ڈرتا ہوں۔“

میں نے ان کی بات سنی، ان کا دکھ سمجھا اور خود پر جبر کر کے کہا۔

”ایسی دوائیں تو ہیں جن کی ایک ہی خوراک آدمی کو موت کی گہری نیند سلا سکتی ہے اور مرنے والے کو تکلیف بھی نہیں ہوتی۔“

”بات تکلیف کی نہیں، دادا سالوں سے زندہ رہنے کی جو تکلیف اٹھا رہے ہیں، وہ موت کی تکلیف سے کہیں سخت اور کڑی ہے۔“

”پھر“ میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”دادا صرف طبعی موت مرنا چاہتے ہیں، غیر طبعی موت نہیں۔“

”مگر جب خود جیون کے عذاب سے چھٹکارا چاہتے، مرنے کی حسرت میں تڑپتے ہیں پھر طبعی موت کیا اور غیر طبعی موت کیا؟“

یہ الفاظ کہتے کہتے میرے من میں ایک عجیب سا خوف ریٹنے لگا میں سروپ جی کو دادا کے قتل کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اس سنگین خیال سے میں نے ایک جھرجھری سی لی اور ادھر سروپ جی کے ہونٹوں پر سسکی تڑپ گئی۔

کہنے لگے۔ ”ایک بار دادا کو بڑا سخت دورہ پڑا اور خیال تھا کہ وہ دورہ ان کی جان لے کر نئے گا، ہم سب خوش تھے کہ جینے کے عذاب سے چھوٹ جائیں گے مگر موت انہیں چھو کر، ہاتھ

لگا کر نکل گئی اور پھر جی اٹھے۔ ان دنوں میرے پتا منگل ساؤ زندہ تھے، دادا انہیں دیکھ کر رو پڑے اور بڑی حسرت بھری آواز میں بولے۔

”منگل! مجھے موت کیوں نہیں آتی؟“

تب میرے پتا نے جو ذرا سخت دل آدمی تھے۔ زہر کی شیشی سامنے رکھ دی اور کہا۔ ”یہ زہر بی لوار مر جاؤ۔“

دادا تڑپ گئے اور کہنے لگے۔ ”منگل! زہر بے شک میرے لئے امرت ہے، میرے اور تمہارے دکھوں کا علاج ہے مگر میں نے جیون ہتھیا کر لی یا کسی دوسرے نے میری جان مار دی تو جانتے ہو کیا ہوگا؟“

”ہوگا کیا۔ تم دنیا کے عذاب سے چھوٹ جاؤ گے۔“

”مگر دنیا کے عذاب سے چھوٹ کرنت کے عذاب میں پھنس جاؤں گا، مرنے کے بعد

سیدھا نرک میں جاؤں گا اور وہاں نت کا عذاب بھوگنا پڑے گا۔“

”کوئی دوسرا تمہاری جان لے لے تب بھی؟“

”ہاں۔۔۔ تب بھی۔ اس لئے میں پرلوک کے عذاب سے بچنے کے لئے اسی لوک میں

اپنے جیون کا عذاب بھوگ لینا چاہتا ہوں۔ پرارتھنا کرو۔ مجھے میری آئی آجائے۔“

تب سے ہم ان کے مرنے کی پرارتھنا ہی کرتے اور اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر ان کی

موت غیر طبعی طور سے واقع ہوئی تو وہ نرک میں جائیں گے مگر طبعی موت نہ جانے کہاں چھپ گئی

ہے کہ موسم پر موسم بدلتے اور برس پر برس گزرتے جا رہے ہیں اور وہ نہیں آتی۔ تم سے موت کی

پرارتھنا کرنے کو اس لئے کہا تھا کہ شاید بھگوان تمہاری سن لے اور دادا کو جیون سے چھٹکارا مل

جائے۔“

میرے قارئین سمجھ سکتے ہیں۔ اس حالت میں جب کہ بڑھا خود موت کے لئے تڑپ رہا

تھا، موت کی بد دعا اس کے لئے دعائے خیر تھی، مرنے کی پرارتھنا کرنا، اس پر دیا کرنا تھا مگر نہ

جانے کیوں یہ سب سمجھ جانتے ہوئے بھی میرا من اس کے لئے موت کی پرارتھنا کرنے سے

گھبراتا تھا۔ اچانک میں نے پوچھا۔ ”دادا کی عمر کیا ہوگی؟“

شاستر و مجھے بتا چکا تھا بڑھا ایک سو چالیس کی عمر کو پہنچ چکا ہے، مگر سروپ جی یہ سوال سنتے

ہی گھبرا گئے۔ پریشان ہو گئے، برا ان گئے، جیسے میں نے انہیں گھونسا مار دیا ہو، جواب دینے

سے پہلے کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔

”تم عمر پوچھ کے کیا کرو گے۔ دادا کی ٹھیک عمر شاید کوئی نہ بتا سکے، اگلے وقتوں میں لوگ جنم

دن کو کہاں یاد رکھتے تھے۔ بس اندازے کے مطابق وہ اس وقت دنیا میں سب سے لمبی عمر کے

آدمی ہیں۔“

سروپ جی کا جواب گول مول سا تھا۔ اگر جنم دن ٹھیک سے یاد نہ تھا تو بھی بڑھے کی عمر میں تین چار برس کا آگے پیچھے ہو سکتا تھا، ایک سو چالیس برس سے تین چار برس کم یا زیادہ مگر اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے صدیوں سے جی رہا ہو اور کسی نے اس کے نہ مرنے کا پتہ لکھ دیا ہو۔ اس سے سروپ جی کو کچھ اور سو جھی۔

”دادا کو آج دورہ کیسے پڑا۔ سویرے تو اچھے بھلے تھے۔“

”مورتی دیکھ کر۔“

میں نے تھیلے سے مورتی نکال کر دکھائی کیونکہ بڑھے کے بے ہوش ہونے پر جب میں اطلاع دینے بھاگا تو پیتل کی کلائی کے ساتھ نقلی مورتی بھی تھیلے میں سنبھال گیا تھا۔ انہوں نے مورتی دیکھی تو فرط خیر سے اچھل کر کھڑے ہو گئے پھر خوشی میں ہکلاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔۔ آنند بھکشوالی۔۔۔۔۔ مورتی ہے نا۔“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پہلے دادا بھی اسے آنند بھکشوالی مورتی سمجھے اور بڑے خوش ہوئے تھے کہ اب وہ مر سکیں گے مگر جب پتہ چلا یہ نقلی مورتی ہے جو کمپنی سرکار کے گورنر جنرل ارڈ ڈلبوزی نے 1848ء میں شاہ آوا کو بھینٹ کی اور اس نے کمپنی سرکار کو لوٹا دی تھی کیونکہ اس میں شاکہ منی بدھ کی مقدس راکھ نہیں تھی تو دادا بڑے زراش اور اداس ہو گئے۔ غالباً انہوں نے مورتی کی آنکھوں میں جڑے ہوئے نقلی پنے بھی پہچان لئے تھے، تبھی ان کی حالت یکایک بگڑ گئی، پھر صدمے سے بے سدھ ہو کر فرش پر گرے اور میں آپ کو اطلاع دینے کے لیے بھاگا۔“

یہ سن کر سروپ جی مجھ سے گئے۔ ”تمہیں یہ نقلی مورتی کہاں سے مل گئی؟“

”یہ قصہ پھر کبھی سناؤ گا آپ کو۔“

”میں نے اس لئے پوچھا ہے کہ آٹھ برس پہلے میرے پتا منگل ساؤ بھی نقلی مورتی کے لیے کسی آدمی کے پیچھے چٹا گانگ گئے تھے۔“

”مگر یہ بات تو صرف دادا کو معلوم تھی۔“

سروپ جی بھونچکے سے رہ گئے کہ میں اس بارے میں بھی کچھ جانتا ہوں، بولے۔

”دادا ہی نے بتایا تھا مجھے کہ۔۔۔۔۔“

ان کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی لمحے بوڑھے ساگر ساؤ جی کے مردہ شریر میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ ماتھے کی ابھری رگوں میں کوئی شے سرسرائی اور ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

کچھ عرصہ قبل جب میرے سامنے پہلی بار مردہ سان بڑھے کے منہ میں زرد سیال کے قطرے پکائے گئے، اسے دو تین منٹ کے اندر ہوش آ گیا تھا لیکن آج اسی دوائے پانچ منٹ

کے بعد اثر دکھایا جس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ دورہ پہلے دورے سے کچھ زیادہ سخت تھا۔ ماتھے کی رگوں میں سرسراہٹ والی لہر کچھوے کی طرح آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ روئی کی مانند سفید بھنویں بلیں، پلکیں تھر تھرائیں اور ادھ کھلی آنکھیں جن سے خوف آتا تھا، پوری کھل گئیں۔ آنکھیں کھول کر اس نے چھت کی کڑیوں کو یوں دیکھا جیسے صدیوں کی نیند سے جاگا ہو۔

آنکھوں کے ساتھ ہی بازوؤں اور ہاتھوں میں بھی حرکت ہوئی۔ زندگی اس کے شریر میں لوٹ آئی تھی، وہ پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔ نظر چھت کی کڑیوں سے نیچے اتری تو سب سے پہلے سروپ جی کو پھر مجھے دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اچانک اشارے سے مجھے قریب بلایا مگر سروپ جی فوراً بولے۔

”دادا! تمہارا من ٹھیک نہیں۔ ابھی بات چیت رہنے دو۔“

معلوم نہیں بڑھے نے سنایا نہیں اگر سنا تو کچھ سمجھایا نہیں مگر اشارہ کیا کہ اسے اٹھا کر بٹھا دیا جائے، میں نے اور سروپ جی نے اسے مل کر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دیا تو اس نے فرش پر پڑے آلہ سماعت کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلایا مطلب یہ تھا، آلہ سماعت اس کے کانوں سے لگا دیا جائے۔ گویا وہ بات چیت کرنا چاہتا تھا، میں نے خواہش کے مطابق آلہ سماعت کی دونوں نالیاں اس کے کانوں میں فٹ کر دیں اور کہا

”دادا! پتا جی ٹھیک کہتے ہیں تمہیں آرام چاہیے۔“

دادا نے بڑی نجیف، بڑی کمزور آواز میں جواب دیا۔

”میں آرام نہیں صرف موت چاہتا ہوں۔ لا دو گے میری موت؟“

یہ ایک عجیب و غریب مطالبہ تھا میں سمجھ گیا وہ مجھ سے آنند بھکشوالی مورتی طلب کرتا ہے، میں نہیں جانتا تھا، کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ مارچ 1848ء میں کمپنی سرکار کے گورنر جنرل نے وہ مورتی کہاں بھیج دی، کہاں چھپا دی تھی کیونکہ تلاش کے باوجود آج تک اس کا کھوج نہ مل سکا تھا مگر کسی نامعلوم لاشعوری کیفیت میں میرے منہ سے نکل گیا۔

”لا دوں گا۔“

بڑھے کے زرد منیا لے چہرے پر ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے موت مانگی تھی، میرے ذہن میں آنند بھکشوالی مورتی تھی جسے کھونے، ڈھونڈنے کا میں نے عہد کر رکھا تھا اور وہی اس نے کا وعدہ کیا تھا، یہ دو مختلف باتیں تھیں مگر اس وقت ان کے معنی ایک ہو گئے تھے، میں نے سوچا تو خود حیران رہ گیا کہ کیا ہم دونوں کا ایک ہی مطلب ہے اور کیا ”اپنی موت“ سے بڑھے کی مراد مقدس مورتی ہے؟ میری یہ ذہنی الجھن اس نے خود ہی دور کر دی اور مسرت انگیز لہجے میں بولا۔

”اب مجھے مرنے، جینے کی کوئی چتا نہیں۔ جب تم نے کہہ دیا کہ مورتی ادا دو گے تو ضرور ادا دو گے مجھے تمہاری بات پر وشواس ہے، مگر ایک آشا ہے کہ نقلی مورتی میرے پاس رہنے دو۔“

”نقلی مورتی کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”کیونکہ جوتش ودیا کہتی ہے جہاں نقلی مورتی ہے، وہاں اصلی مورتی ضرور آئے گی۔“

بڈھے نے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ موت سے اس کی مراد مقدس مورتی ہے اور وہ بات جو میں نے پہلے سوچی تھی، ایک بار پھر ذہن میں سپنولے کی طرح پیچ اور بل کھانے لگی کر کیا اس کی موت مورتی میں بند ہے۔ گویا مورتی مل گئی تو جیون کے عذاب سے چھوٹ جائے گا اور یہ موت غیر طبعی نہیں ہوگی۔ خیر کچھ بھی ہو مجھے آئندہ بھکشو والی مورتی ڈھونڈنا ہے۔

چاچا چکرورتی کے لیے تاکہ ان کے ادھورے کام کو پورا کر سکوں۔

سندرمتی کے لئے جسے میں ساؤ گاری سے نکال کر اپنی دنیا میں لے جانا چاہتا تھا۔

سروپ جی کے لئے جن کے دکھ بانٹنے کا میں نے وچن دیا تھا۔

اپنے لئے کیونکہ میں ساؤ گاری کا وارث بن کر وہ پراسرار پارٹ ادا نہ کرنا چاہتا تھا جو ساؤ گاری پر یوار کے پرکھوں نے کیا تھا۔

بڈھے ساگر ساؤ جی کے لیے جسے میں جیون کے عذاب سے بچانا چاہتا تھا۔

اس طرح مقدس مورتی کی تلاش سے میرے کتنے ہی وعدے اور ناتے بندھے تھے اور اسے تلاش کرنا میرے جیون کا سب سے بڑا آدرش بن گیا تھا، میں نے نقلی مورتی بڈھے کی طرف بڑھا دی۔

”دادا! یہ مورتی تمہارے روگ کا پائے نہیں پھر بھی تمہیں اس سے شانتی ملتی ہے تو اپنے پاس رکھ لو۔“

بڈھے نے پتھریلی آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر قریب آنے کو کہا، میں قریب گیا تو اس نے اپنے استخوانی ہاتھوں سے مجھے تھام لیا اور بڑے حسرت ناک لہجے میں بولا۔

”بہت سے بیت گیا مجھے جیتے ہوئے۔ میرے سامنے میرے بیٹوں کی ارتھیاں اٹھیں مگر میری ارتھی نہیں اٹھی، میں نے اپنی اولاد کو مرتے دیکھا پر میں نہیں مرا۔“

”گھبراؤ نہیں دادا! جس نے جنم لیا اسے مرنا ہے۔“ میں جینے مرنے کا فلسفہ بیان کرنے لگا۔ جیون بھی ایک ارتھی ہے جسے ہر کوئی اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے، جیون کی ہر کہانی کا انت موت ہے مگر تنہا گت کہتا ہے ہم نہیں مرتے صرف ہمارا اثر برماتا ہے۔“

”کیٹشپ بیٹے میں بھی اپنے شریر کی موت چاہتا ہوں۔“

”موت تمہاری ہڈیوں میں اتر چکی ہے دادا! تم بہت جلد مرد گے اور میں تمہاری ارتھی اپنے

ہاتھوں سے چتا پر رکھوں گا۔“

یہ کہہ کر میں اٹھا کیونکہ جو کچھ میں نے کہا وہ میں نے نہیں جیسے کسی اور نے کہا تھا میرے اٹھتے ہی دادا نے میرے چرتوں کو پکڑ لیا۔ میں اچھل کر پرے ہٹا اور پوچھا۔

”دادا، پروہت گنجال ساؤ گاری سے بھاگ گیا ہے، جانتے ہو کہاں گیا؟“

بڈھے نے جیسے کچھ سنا نہ ہو، حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ سروپ جی نے میرا سوال آلہ سماعت میں دہرایا تو اس نے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔

”میں نہیں جانتا وہ کہاں گیا مگر جہاں بھی گیا ہے اسے ڈھونڈ کر ساؤ گاری میں واپس لاؤ۔“

اس کے ساتھ ہی بڈھے سے ملاقات ختم ہو گئی، مگر جب میں رخصت ہو کر دروازے کی طرف بڑھا، اس نے سروپ جی سے میرے بارے میں کچھ کہا جسے سن کر وہ دنگ رہ گئے میں بھی چونک گیا جو الفاظ میرے کانوں میں پڑے وہ حیرت انگیز تھے اور یہ تھے وہ الفاظ۔

”کیٹشپ کا پختہ چندر ماں ہے، سوم دیوتا کی طرح سندرمتا اور اندر دیوتا کی طرح کالا پر اس کا ادھیکار ہے۔“

میں نہیں جانتا سروپ جی سے یہ بات کہنے کا مطلب کیا تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے بڈھا جوتش ودیا کو اچھی طرح جانتا اور میرے من میں جھانک رہا تھا۔

ہم بوڑھے کے تابوت نما کمرے سے باہر آئے تو سروپ جی نے مجھے طویل راہداری میں روک لیا۔ ”خاتم نے دادا گنجال کو ساؤ گاری میں واپس لانا چاہتے ہیں۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے اگر وہ مل گیا تو اسے دادا ہی کے سامنے لائیں گے۔“

”جانتے بھی ہو وہ اس کی واپسی کیوں چاہتے ہیں؟“

”کوئی کارن ہو گا۔“

میرا خیال تھا، سروپ جی خود ہی کچھ بتائیں گے مگر وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے اور بات بدل دی۔ ”اب تو گنجال کو ڈھونڈنا ضروری ہو گیا ہے۔“

اور زینے کی طرف ہو لیے۔ شاستر و دروازے پر ہی مل گیا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے تو سروپ جی نے اسے گونا کھیا کو بانے بھیج دیا۔ وشال رائے اور کایا موسا بوڑھے ساگر ساؤ کے لیے پریشان تھے، سروپ جی نے انہیں بتایا۔

”دادا کی طبیعت سبھل گئی ہے مگر وہ چاہتے ہیں گنجال کو ڈھونڈ کر واپس ساؤ گاری میں لایا جائے۔ میں نے گونا کو بھی بلایا ہے۔“

کایا موسا اور وشال رائے کو تو بہر حال اسے ڈھونڈنا تھا، انہوں نے بھی گنجال کی واپسی پر اعتراض نہ کیا میں نے دیکھا کہ اب مدایا بھکشو ہاں نہیں تھا۔

میں ابھی تک مدایا سے مل کر یہ دریافت نہیں کر سکا تھا کہ وہ ساؤ گاری میں کیسے لوٹ آیا، اس پر کیا بتی؟ وہ شاید خود بھی مجھے کچھ بتانا چاہتا تھا مگر رات بھاگ دوڑ کی وجہ سے کچھ پوچھنے کا موقع ہی نہ مل سکا، اب سے تھا کہ میں مدایا سے کچھ معلوم کرتا۔ اس لیے چپ چاپ مندر کی طرف ہولیا، وہاں گونگے بھکشو تھے نہ مدایا۔ البتہ وہ دونوں ساؤ ضرور موجود تھے جنہیں رات گنجال کے ساتھ دیکھا تھا، انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پر نام کیا اور بتایا مدایا ابھی ابھی اپنے حجرے میں گیا ہے میں نے ایک ساؤ کو بھیجا کہ اسے بلا لائے، میرا سن کر مدایا بھاگا آیا اور آتے ہی میرے سامنے دوڑا نو ہو گیا۔

”مدایا! میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، میرے ساتھ آؤ۔“

وہ میرے پیچھے پیچھے مندر سے باہر آ گیا۔ اب میں اسے اپنی بات سمجھا سکتا، اس کے اشاروں کا مطلب سمجھ سکتا تھا، جب پوچھا کہ ساؤ گاری میں اس کی واپسی کا کارن کیا ہے تو اپنے مخصوص انداز میں بتانے لگا۔

”خانقاہ کی کوٹھڑی میں سیندھ لگنے کے بعد جب پروہت گنجال وہاں پہنچا، تھا پابہادر نے مجھے اس کے سامنے پیش کیا، اس نے پوچھا۔

کیا تم جانتے ہو تھارو کیشپ نے کوٹھڑی میں سیندھ کیسے لگائی؟ کون کون اس کے ساتھ ملا ہوا تھا؟ اسے کدال کس نے پہنچائی تھی؟“

میرے پاس ہر سوال کا جواب نفی میں تھا کیونکہ میں کچھ جانتا ہی نہیں تھا پھر گنجال نے مجھے دو میں سے ایک بات کا ادھیہ کار دیا۔ ساؤ گاری میں چپ چاپ واپسی یا پھر موت، یہ سوچ کر کہا گر مرنا ہی ہے تو پھر ساؤ گاری میں کیوں نہ مروں۔ میں گنجال کے ساتھ لوٹ آیا۔ اس کا خیال تھا، اب آپ بھی ساؤ گاری میں نہیں آئیں گے۔ اس لئے گنجال نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ خانقاہ میں جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا کسی سے اس کا ذکر نہ کروں، یہ بھی نہ بتاؤں کہ آپ خانقاہ میں گئے تھے۔

واپسی پر جب ہم رتناگری کے انا تھ بن سے گزر رہے تھے گنجال مجھے پہاڑی پر لے گیا جس کی کھوہ میں سانپ کا بسیرا ہے اور عین اس کے دہانے پر پہنچ گیا، میں نے سوچا شاید مجھے اسی کھوہ میں دھکا دے دے مگر ایسا نہ ہوا، اس نے حلق سے آواز نکالی۔ بوڑھا سانپ کھوہ کی گہرائی سے نکل کر دہانے پر آ گیا اور اس کے سامنے پھن اٹھا کر جھومنے لگا گنجال نے میری طرف اشارہ کیا پھر کسی عجیب و غریب بولی میں سانپ سے کچھ کہتا رہا، جب کہہ چکا تو ہاتھ اٹھایا اور سانپ کھوہ میں واپس اتر گیا، میرا ابو محمد ہور ہاتھ اس نے بتایا۔

”مدایا! یہ سانپ میرے حکم کا پابند ہے، اگر تم نے زبان کھولی اور میرے بارے میں کسی کو

کچھ بتایا تو سانپ ساؤ گاری میں داخل ہو جائے گا اور تم خود سمجھتے ہو کہ وہاں اس کے داخلے کا مطلب کیا ہوگا۔“ اب میں ڈرتا ہوں کہیں انا تھ بن کا سانپ ساؤ گاری میں نہ آ جائے کیونکہ میں نے گنجال کا حکم نہیں مانا اور اسے روپ تارا کی موت کا دوشی ٹھہرایا ہے۔

”مدایا واقعی خوف زدہ تھا اور جب اس نے اشاروں کنایوں کی زبان میں اپنی بات ختم کی۔ بڑا ہراساں نظر آ رہا تھا مگر اس کی کہانی سن کر میں خود حیران ششدر رہ گیا، یہ ایک لرزہ خیز انکشاف تھا کہ انا تھ بن کا بوڑھا سانپ پروہت گنجال کے حکم کا پابند ہے اور اس کے اشارے پر ساؤ گاری میں داخل ہو سکتا ہے۔ رات میں نے اسی سانپ کو باؤلی کی سرنگ میں دیکھا اور اب اس بات پر پریشان ہو رہا تھا کیا وہ مدایا بھکشو کے لیے ساؤ گاری میں آیا ہے۔

میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ انا تھ بن کا سانپ باؤلی کی سرنگ میں پہنچ چکا اور وہاں سے بھی کہیں غائب ہو گیا ہے مگر اسے ساتھ لے کر وصال رائے کے کمرے میں لوٹ آیا۔ اس اثناء میں سروپ جی نے گونا دادا، وصال رائے اور کیا کے ساتھ ملکر گنجال کو ڈھونڈنے کا پروگرام بنالیا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق انہیں سب سے پہلے ساؤ گاری کی وسیع چار دیواری کے اندر اسے ڈھونڈنا تھا، یہاں بے شمار حجرے، دو منزلہ، سہ منزلہ کمرے اور رہداریاں تھیں۔ فوراً ہی سب لوگ گنجال کی تلاش میں نکل پڑے۔ سروپ جی کا خیال تھا کہ یہ کام مندر اور اس کے عقی جیروں سے شروع کیا جائے۔ وہ لوگ مندر کی طرف جارہے تھے مگر میں نے گونگے مدایا کو ساتھ لیا اور چپکے سے بیرونی پھاٹک کو ہولیا چوکیدار کو بتا دیا اگر کوئی پوچھے تو بتا دینا ہم انا تھ بن میں جارہے ہیں۔

مدایا کی کہانی سن کر میرے من میں ایک شبہ پیدا ہوا تھا اور اسی شبے کی تصدیق یا تردید کے لئے انا تھ بن کا رخ کیا تھا۔ سہ پہر سے پہلے ہم اس پہاڑی کے پاس پہنچ گئے جس کے گہرے کھڈ میں سانپ بسیرا لیتا تھا، میں نے مدایا کو اشارے سے کہا کہ مجھے اسی رستے کھوہ کے دہانے تک لے چلو جس رستے گنجال اوپر گیا تھا۔ وہ آگے آگے پہاڑی راستے پر ہولیا۔ اسے راستہ کہنا غلط ہوگا کیونکہ وہاں کوئی راستہ تھا ہی نہیں، بس پتھروں کے حاشیے پر چلتے جنہیں جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا، گرتے سنبھلتے کھڈ کے دہانے تک پہنچ گئے، میں نے اندر جھانکا کچھ دکھائی نہ دیا۔ ایک دو پتھر اٹھا کر گہری تاریک کھوہ کے اندر پھینکے مگر کوئی باہر نہ نکلا۔ وہاں سانپ بھی نہیں تھا۔ گنجال بھی نہیں تھا جس کی تلاش میں میں یہاں تک آیا تھا، میں نے کھوہ میں اترنے کا ارادہ کیا کہ اسے اندر سے اچھی طرح دیکھ لوں مگر مدایا نے ہاتھ پکڑ لیا اور غوں غاں کی آواز بنا پوچھا۔

”اندر کیا دیکھنا ہے؟“

میں نے گنجال کا نام لیا اور کہا۔ ”میرے اندازے کے مطابق وہ ساؤ گاری سے دور نہیں گیا

اور کہیں آس پاس چھپ گیا ہے۔“

گوگے مدایا نے بتایا۔ شمالی پر بت کی قدرتی سیڑھیوں میں بھی ایک غار ہے اور دو تین کھدیں پورنی پر بت پر بھی ہیں۔ انہیں کیوں نہ دیکھ لیا جائے، ہم پہاڑی سے اترے اور شمالی پر بت کے قدرتی اسٹیڈیم کی طرف ہو لیے۔ مگر ہماری تلاش بے نتیجہ ثابت ہوئی، ہم شام کے قریب تھکے ہارے اور ناکام ساؤ گاری میں لوٹ آئے۔ آکاش پر بادلوں کے جھگڑے گہرے ہو گئے تھے۔

یہاں آتے ہی سب سے پہلی خبر یہ سنی کہ ساؤ گاری میں بھی گنجال کا کوئی کھوج نہیں مل سکا اور سروپ جی شاستر اور دو سائیکسوں کے ہمراہ اچانک رپا چلے گئے ہیں، میرے لئے سندیس چھوڑ گئے تھے کہ کل تک لوٹ آؤں گا۔ رپا کی طرف اچانک روانگی خالی از علت نہ تھی سوچا کہیں سروپ جی کو یہ اندیشہ تو نہیں کہ گنجال رپا کی طرف نکل گیا ہے اور سندرمی کور سے ہی میں روکنے کی کوشش کرے گا مگر بعد میں پتہ چلا وہ خود نہیں گئے بلکہ بڑھے ساگر ساؤ جی نے انہیں ایک خاص کام سے بھیجا ہے۔

کایا موسا اور وشال رائے جہاں گنجال کا کوئی کھوج نہ ملنے سے بڑے مایوس نظر آتے تھے، وہاں ساؤ گاری کی پوری عمارت کا چپہ چپہ چھان چکے اور اس کی دو منزلہ، سہ منزلہ عمارتوں راہداریوں، بھول بھلیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے، انہوں نے کسی شہر میں بھی ایسی عظیم الشان عمارت نہ دیکھی تھی اور اسی سوچ میں گم تھے کہ آخر گوچی ساؤ کو مہذب دنیا سے کوسوں دور ایسی قلعہ نما عمارت بنانے کی کیا سوچھی تھی؟

شام کو کھانا گونا نے تیار کرایا تھا ہم سب نے اس کے محلے میں جا کر بھوجن کیا اور رات گئے وہاں سے لوٹے۔ مدایا بھکشو بھی ہمارے ساتھ تھا، رات جب ہم انیسری والی راہداری میں واپس آئے۔ اس نے جانے کی آگیا طلب کی مگر میں نے اسے وشال رائے کے سپرد کر دیا۔

”وشال جی! مدایا آپ کے ساتھ یہیں رہے گا اور اپنے حجرے میں نہیں جائے گا۔“ میں کسی کو بھی یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ انا تھ بن کا سانپ ساؤ گاری میں داخل ہو چکا ہے مگر میری اس احتیاط سے دونوں سمجھ گئے کہ کوئی پراسرار خطرہ ہے ضرور۔ وشال نے مدایا کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

”کیشپ بابو! تم نے جس واسطے مدایا کو یہاں رہنے کا بولا ہے، وہ میرے کو معلوم ہے مگر میرے ہوتے کوئی مالی کالال اس کا بال بیک نہیں کر سکتا۔“

”وشال جی! آدمی ہی آدمی کا دشمن نہیں۔ سانپ بھی سدا کا بیری ہے۔ بس خیال رکھنا۔“ یہ سنتے ہی مدایا کا چہرہ فق ہو گیا اور میں کمرے سے نکل آیا۔ راہداری کا وسطی دروازہ بند کر

کے زینے کی طرف مڑا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور جب ہو لے ہو لے سیڑھیاں چڑھتا اوپر پہنچا تو کواڑ کھلے تھے اور تارا ایک کواڑ کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ میرے قدموں کی آواز سن کر انھی، میں اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”دروازے میں کیوں بیٹھی تھیں تارا؟“

”آپ کی راہ دیکھ رہی تھی سرکار!“

اچانک خیال آیا۔ پیلو ابھی تک نہیں لوٹا۔ آج سروپ جی بھی اچانک رپا چلے گئے، بیچاری تنہائی سے گھبرا گئی ہوگی میں نے کہا۔

”بھوجن تو آج گونا کھیا کے ہاں کر لیا تھا، تم سو جاتیں۔“

اس نے جواب نہ دیا اور دروازہ بند کر کے میرے پیچھے پیچھے ہو لی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر کوٹ اتارنے لگا اس نے کوٹ اتارنے میں مدد دی پھر بوٹوں کے تسمے کھولنے بیٹھ گئی۔

”اری تم یہ تکلیف کیوں کرتی ہو۔“ میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔

”سیوا میں تکلیف کیسی صاحب!“

اس نے بوٹ اتارے، جرابیں اتاریں اور گرم گرم گیلے تولیے سے میرے پاؤں پونچھے تو تھکے پاؤں کو بڑا سکون ملا اور ہونٹوں سے بے اختیار ایک راحت بخش ”ہا“ کی آواز نکلی اس نے گردن اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

”میں سو جاتی تو آپ کی سیوا کون کرتا؟“

دھوتی کا پلو اس کے سر سے ڈھلک گیا تھا، مگر اس نے سر ڈھانپنے کی پروا نہ کی اور تولیے سے پاؤں اور پنڈلیاں رگڑتی رہی جس سے میں نے تھکے بدن میں بڑی راحت محسوس کی۔ اس اثناء میں دھوتی کا پلو آندھے سے بھی سرک گیا، میں نے پاؤں کھینچ لیے اور اسے پلو سنبھالنے کا موقع دیا مگر تارا کو پلو کا ہوش نہیں تھا۔ اسی حالت میں فرش پر بیٹھی بیٹھی پوچھنے لگی۔

”پاؤں دبا دوں سرکار!“

”نہیں اب جا کے آرام کرو۔“

”مگر دادا نے آپ کی سیوا کرنے کو کہا ہے۔“

”میں چونکا۔“ کب کہا تھا دادا نے؟“

”آج جب انہیں رات کا بھوجن دینے گئی تو بولے آپ کی سیوا میرا دھرم ہے۔“

”صرف پتی سیوا استری کا دھرم ہے۔“

”مگر آپ تو دیوتا ہیں اور دادا کہتے ہیں دیوتا کا سب پر ادھیکار ہوتا ہے۔“

مجھے یاد آیا، آج ہی دادا نے سروپ جی سے میرے پختہ کے بارے میں بات کی تھی۔

سندرتا اور کلا پر میرا ادھیکار مانا تھا۔ نہ جانے بوڑھے نے تارا سے کیا کچھ کہا ہو گا کہ سیوا کی چٹا میں اپنا پلو سنبھالنا بھی بھول گئی اور جیسے کسی سندرسپنے میں کھو گئی تھی، اس کے پرکشش نیپالی شریر کو دیکھ کر میرا ذہن الجھنے لگا اور میں نے اسی الجھے ذہن کے ساتھ پوچھا۔

”تارا آج قبوہ نہیں پلاؤ گی؟“

”ابھی بنا کے لاتی ہوں سرکار!“

باہر بادل گرج رہے تھے۔ رتناگری کے جنگلوں اور پربتوں پر گھنے گھور اندھیرے چھا رہے تھے اور میں اپنے کمرے کے زرد اجالے میں تنہائی چاہتا تھا۔ تارا انھی اور اپنی دھونی کا پلو سنبھالتی کمرے سے نکل گئی، میں سوچنے لگا، اگلے وقتوں میں سندردا سیواں پر بھی دیوتا کا ادھیکار مانا جاتا تھا مگر دادا کے بقول میں تو نئے یگ کا دیوتا ہوں۔

اسی اثناء میں تارا قبوہ لے کر آگئی اب دھونی کا پلو کمرے کے گرد لپٹا تھا۔ سر کے بال میرے ذہن کی طرح بکھرے بکھرے سے تھے اور پہلے سے زیادہ پرکشش لگ رہی تھی، میں نے قبوے کی نیپالی اس کے ہاتھ سے پکڑ لی وہ بدستور کھڑی رہی پھر بولی۔

”آپ کے چرنوں میں بیٹھ جاؤں صاحب!“

”کیا یہ دادا نے کہا تھا؟“

تارا نے اثبات میں سر کو جنبش دی، میں نے پوچھا۔

”تمہارا من کیا چاہتا ہے؟“

”آپ کی سیوا کرنا۔“

”تم نے بہت سیوا کی ہے میری، اب جا کے سو جاؤ۔“

وہ پل دوپل کھڑی مجھے دیکھتی رہی پھر ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا، میرے پاؤں چھوئے اور چلی گئی، دروازہ کل رات کی طرح کھلا رہ گیا سو چاقوہ پینے کے بعد بند کراؤں گا مگر قبوہ پی کر نہ دروازہ بند کرنے کا ہوش رہا نہ لائین مدھم کرنے کا۔ میرے ذہن میں بڑھے ساگر ساؤجی کا بیوا تھا۔ اس کے ساتھ پروہت گنجال تھا اور کل رات کا وہ عجیب و غریب سپنا تھا جس میں مورتی کی ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ نیند کا جھونکا اتنا تیز تھا کہ تکیے پر سر رکھتے ہی سو گیا اور سوئے سوئے بھی گنجال اور بوڑھے کی شکلیں ذہن کی کوٹھریوں میں ناچتی رہیں۔

ایک دو بار ایسا ہوا تھا کہ حالت بیداری میں میرے ذہن نے دیواروں کے اس پار کچھ دیکھ لیا تھا اب میں سویا سویا سوچ رہا تھا کہ گنجال مجھے کیوں نظر نہیں آتا، وہ کہاں چلا گیا ہے؟ اسی لمحے اچانک میرے ذہن میں ایک گپھا کی تصویر ابھر آئی اور میں نے اس گپھا میں گنجال کو دیکھا پھر میں نیند کی حالت میں بستر سے اٹھا اور ننگے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا، میں یقین کے

ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ سپنا تھا یا کیا تھا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ نیند کی حالت میں چل پھر رہا ہوں اور کوئی پراسرار طاقت مجھے کہیں لیے جاتی ہے، میں دروازے سے نکل کر صحن میں آیا اور اس راہداری کی طرف ہولیا جو زینے کی بالکونی کی طرف نکلتی تھی، نہ جانے تارا کدھر سے لپک کے آئی اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی میری آنکھیں بند تھیں مگر میں اسے دیکھ رہا تھا وہ نیم عریاں سی حالت میں بستر سے اٹھ کے بھاگی اور مجھے باہر جانے سے روکنا چاہتی ہے میں نے مشی فی النوم کی حالت میں اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا اور یہ دیکھ کر کہ میں سویا ہوا چل رہا ہوں وہ خوفزدہ ہوئی۔

زینے کا دروازہ کھول کر میں ننگے پاؤں سیڑھیاں اترنے لگا اور بدحواس تارا بالکونی میں کھڑی مجھے جاتا دیکھتی رہی، گوچی ساؤ کی مورتی کے پاس سے گزر کر میں وسطی راہداری کا دروازہ کھول کر اس راہداری میں آگیا جہاں سروپ جی کا اور آگے میرا کمرہ تھا، جہاں میں نے ساؤ گاری میں آتے ہی قیام کیا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ چان نے جولا بیری کے قریب ہی بندوق سنبھالے بیٹھا تھا، نہ تو مجھے راہداری سے گزرتے دیکھا اور نہ دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔

مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کہاں کہاں سے گزرا، کتنے دروازے کھولے، کتنی تاریک راہداریاں عبور کیں۔ بس کوئی طاقت مجھے لیے جا رہی تھی اور میں چلا جا رہا تھا۔ اچانک یوں لگا میں اندھیری طویل سرنگ سے گزر کر ایک ایسے دروازے پر پہنچ گیا ہوں جو صندل کی لکڑی کا بنا ہوا ہے اور نیند کی حالت میں سوچتا ہوں کہ یہ صندلیں کواڑ تو میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں کیونکہ یہ دروازہ اس غار نما کمرے کا تھا۔ جہاں مجھے ایک بار پہلے بھی بلایا یا لایا گیا تھا اور جہاں میں نے بھگوان کی مورتی کے پیچھے ایک پاؤں اور اس پاؤں میں پیتل کا کڑا دیکھا تھا، گویا پراسرار طاقت مجھے پروہت گنجال کے بھٹ میں لے آئی تھی۔

ٹھیک اس لمے جب میں صندلیں دروازے سے گزر کر اس غار یا گپھا میں داخل ہو رہا تھا۔ کہیں بجلی کا زبردست کڑا کا ہوا جس سے صندل کے پٹ کھڑکھڑائے گپھا کی دیواریں ہل گئیں اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ نیند ٹوٹ گئی، سپنا ختم ہو گیا۔ مشی فی النوم کی کیفیت جاتی رہی، اب میں پورے ہوش و حواس میں تھا، مگر عالم ہوش میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں فی الواقع صندل کی ایک دہلیز کے آر پار کھڑا ہوں یعنی ایک پاؤں اندر، دوسرا باہر ہے۔ سامنے نیم تاریک سی گپھا ہے جس میں صندل کی بھینی بھینی خوشبو اڑ رہی ہے اور دور جہاں سرنگ لگا گپھا ختم ہوتی ہے ایک محراب میں بھگوان گوتم بدھ کی مرمرین مورتی نظر آئی جو ان کے جوانی کے دنوں کی یاد تازہ کرتی تھی۔

میں صندلی دروازہ عبور کر کے غار میں داخل ہوا اور ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ

مرمریں مورتی کے عقب سے پروہت گنجال اڑے اڑے اوسان اور گھبرائی گھبرائی صورت کے ساتھ نمودار ہوا اور مجھے دیکھ کر انہی قدموں پر یوں ٹھٹک گیا گویا زمین نے اس کے پیر پکڑ لئے ہوں، وہ اس قدر بدحواس تھا جیسے سکتہ ہو گیا ہو، پھر اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولا۔

”کیشپ جی! آپ..... یہاں.....“

”تم نے خود ہی کہا تھا، اب میری آپ کی ملاقات ایک نئے راستے پر ہوگی۔“

”مگر اس گھبراہٹ کا راستہ آپ کو کس نے بتایا؟“

”پروہت گنجال! میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے اس سنسار میں بہت سے ادھیکار دیئے گئے ہیں۔ قدرت میری خود رہنمائی کرتی ہے۔“ پھر میں نے کھڑے کھڑے الزام کی انگلی اس کی طرف اٹھائی ”میں تمہاری شکتی کا بھید سمجھ چکا ہوں، اب تم کسی مورتی کو میرے سپنے میں نہیں بھیج سکو گے۔ اس قسم کے سپنے جو تم مجھے دکھاتے ہو، پیناٹرم کا ہر ماہر دکھا سکتا ہے، یہ دھرم کا یا نہیں سفلی و دیا ہے کل رات تم نے مورتی کے ساتھ بوڑھے سا گر ساؤ جی کے بھوت کو بھی میرے سپنے میں بھیج دیا تھا مگر تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا کہ رات مورتی کی ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی۔“

گنجال حیرت و استعجاب کے عالم میں گم صم کھڑا میری باتیں سنتا رہا، پھر اس نے مرمریں مورتی کی طرف ہاتھ لہرا دیا۔ ”میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں کہ رات میں نے کسی مورتی کو آپ کے پاس نہیں بھیجا تھا۔“

”پھر مورتی میرے سپنے میں کیسے آگئی۔“

”میں نہیں جانتا کیشپ جی! بالکل نہیں جانتا۔“ وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

”کچھ بھی ہو، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”کہاں۔۔۔؟“ آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

”جہاں میں لے جاؤں۔“

”نہیں، میں صرف اپنی مرضی کا مالک ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں یک لخت چنگاریاں سی سلگ اٹھیں اور میری طرف ہاتھ لہرا کے بولا۔

”کیشپ جی! آپ یہاں سے چلے جائیں اور گھبراہٹ کا راستہ بھول جائیں یہ میں کہتا ہوں۔“

میرے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا مگر میری قوت ارادی نے اس کا حربہ ناکام بنا دیا اور میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

”پروہت گنجال! تیری آنکھوں کی شکتی میرے من کی شکتی کو زیر نہیں کر سکتی۔“

ہم دونوں تین چار منٹ تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے پھر میں اچانک لڑکھڑایا اور ایک پل کے اندر نہ جانے اس نے کیا کیا میں کچھ دیکھ نہ سکا مگر جب

سنجلا وہ میرے قریب سے گزر کر صندوق دروازہ سے نکل رہا تھا، میں تیزی سے پلٹا کہ اسے دروازے ہی میں دبوچ لوں مگر اس نے صندوق کے کواڑ اس زور سے بند کیے کہ میرا ماتھا ان سے ٹکرایا اور سر چکرا گیا۔ اب میں اندھیری سرنگ میں اس کے بھاگتے قدموں کی آواز سن رہا تھا، وہ کسی چھلاوے کی طرح میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور سرنگ میں دور ہوتے قدموں کی آواز کے پیچھے بھاگنے لگا۔ قریب ایک فرلانگ بھاگنے کے بعد وہ آواز غائب ہو گئی، اچانک مجھے ایک کھلے دہانہ کے پاس رکنا پڑا اور جب جھک کر اس دہانے سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اب میں باؤلی کی سرنگ میں کھڑا تھا اور دور پروہت گنجال کا سایہ سرنگ کا زینہ عبور کر کے اس کے کھلے شکاف سے باہر نکل رہا تھا۔

میں تیزی سے زینے کی طرف لپکا کہ اسے ساؤ گاری سے نکلتے ہی پکڑ لوں مگر ناگہاں اندھیرے میں ایک زبردست پھنکار سن کر مجھے انہی قدموں رک جانا پڑا، اور سرنگ کے زینے سے چند قدم پر دو آنکھیں سبز پنوں کی طرح چمکنے لگیں، وہ آنکھیں رتنا گری کے چستکبرے سانپ کی تھیں جو سرنگ کے فرش سے چار پانچ فٹ اونچا پھن پھیلائے کھڑا میرے اور گنجال کے درمیان موت بن کر حائل ہو گیا تھا۔

گنجال میری آنکھوں کے سامنے سرنگ کے شکاف سے باہر نکل گیا، مگر اس کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا، میں سمجھ گیا کہ بوڑھا سانپ مجھے اس کے پیچھے نہ جانے دے گا۔ میں ہولے ہولے اگلے پاؤں باؤلی کی طرف ہٹنے لگا مگر سانپ وہیں پھن پھیلائے کھڑا رہا۔

سے بالا تھا کہ مشی فی النوم میں جن راستوں سے گزرا وہ میری یادداشت سے محو ہو گئے اور میں نہیں جانتا کیسے اور کس طرح اس گپھا تک جا پہنچا جہاں ایک بار گنجال نے میری آتما کو بلایا تھا میں سمجھتا ہوں پراسرار قدرت ہی مجھے وہاں لے گئی تھی تاکہ گنجال کی شعبدے بازی کا جادو توڑ دوں۔

میں ایک عجیب و غریب نیند کی حالت میں وہاں پہنچ تو گیا لیکن بجلی کی لرزہ خیز کڑک سے میری نیند نہ ٹوٹی، نہ کھلتی تو شاید میں نے اسی حالت میں پروہت گنجال کو پکڑ لیا ہوتا۔ بجلی کے ہیا نک کڑا کے نے میری پراسرار نیند کا جادو توڑ دیا تھا، دوسرا ستم یہ ٹوٹا کہ گنجال اپنی آنکھوں کی شکتی سے مجھے غچا دے کر نکل گیا، شاید میں تعاقب کر کے اسے پکڑ ہی لیتا، لیکن تیسری مصیبت انا تھ بن کے سانپ نے کھڑی کردی جواب بھی سرنگ میں میرا راستہ رو کے کھڑا تھا میں نے سوچا خفیہ گپھا ساؤ گاری میں گنجال کی آخری پنا گاہ تھی جسے وہ خالی کر گیا ہے اور اب کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا یہی سوچتا باؤلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا مگر جس وقت میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا سانپ سرنگ میں رینگتا گپھا کے دہانے میں گھس رہا تھا گویا اب وہ گپھا کے اندر بیٹھنا چاہتا تھا۔ سوچا، دن کی روشنی میں گونا گپھا کے آدمیوں کو لے کر آؤں گا اور اس کا سر کچل دوں گا۔

آکاش پر گھنے گھور بادل چھائے تھے، لگتا تھا، اب بر سے کہ اب بر سے۔ ان کے حاشیوں پر لپکتے کوندوں کی چمک دمک اور کڑک دھڑک رات کے کالے شریر میں تھر تھراہٹیں پیدا کر رہی تھی گھڑی دیکھی تو اڑھائی بجے تھے اور ابھی کافی رات باقی تھی، میں باؤلی سے نکل کر کوندوں کی لپکتی جھپکتی روشنی میں ساؤ گاری کے اندر گوٹ کی طرح پھیلی غلام گردش میں آ گیا اور وسطی ڈیوڑھی سے گزر کر انگریزی کے حروف ”ٹی“ جیسی راہداری میں پہنچا، یہ بھی عرض کرتا چلوں نیند کی حالت میں ننگے پاؤں ہی چلتا رہا تھا اور جب شمالاً جنوباً پھیلی راہداری سے گزر کر شرقاً غرباً راہداری میں بے آواز داخل ہوا تو چان نے اس بار بھی نہ دروازہ کھلنے کی آواز سنی نہ مجھے دیکھا غالباً وہ اونگھ گیا تھا۔

میں دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا تارا اسی طرح اپنے کھلے بدن کو دھوتی میں لپیٹے دروازے میں بیٹھی تھی، میرے پیروں کی ہلکی سی چاپ سن کر خوفزدہ سہمی سہمی سی کھڑی ہو گئی، غالباً سمجھتی تھی میں اب بھی نیند میں چل رہا ہوں، میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”اری تارا، تم یہاں بیٹھی ہو کیا سوئیں نہیں؟“

میری آواز سن کر، مجھے ہوش میں دیکھ کر اس کی وحشت کچھ دور ہوئی اور ڈرتے ڈرتے بولی۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے سرکار! مارے ڈر کے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔“

”تمہارا دل کیوں بیٹھا جا رہا تھا؟“

(33)

گرہن زدہ کنواری

باؤلی میں کھڑا میں سرنگ کے اندھیرے میں دیکھتا رہا، جہاں دو سبز آنکھیں پنوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اس بات کا منتظر رہا کہ سانپ میرا پیچھا کرتا ہے یا پروہت گنجال کے پیچھے پیچھے سرنگ کا چکر دارنگی زینہ عبور کر کے باہر نکل جاتا ہے مگر وہ میری طرف آیا نہ پروہت گنجال کے پیچھے گیا بلکہ وہیں پھن پھیلائے جھومتا رہا۔ میں سمجھ گیا، وہ گپھا کے اس خفیہ راستے کا چوکیدار ہے جو سرنگ کی پچھمی دیوار کی ایک سل ہٹانے سے پیدا ہوتا تھا اور جسے پروہت گنجال میرے تعاقب کے ڈر سے افراتفری میں بند کرنا بھول گیا۔

مجھ پر گپھا کا بھید کھل گیا اور میں یہ بھی جان گیا تھا کہ پروہت گنجال اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اچانک کیسے غائب ہو جاتا ہوگا، یقیناً اس کے کمرے میں بھی کوئی ایس خفیہ دہانہ ہوگا جو پتھر کی ایک سل ہٹانے سے نمودار ہوتا ہوگا، گنجال اس سے گزر کر گپھا میں پہنچ جاتا اور آنا فانا روپوش ہو جاتا ہوگا، مگر اس کے چیلے یہ سمجھتے تھے اس نے بیٹھے بیٹھے غائب ہونے کی شکتی پراپت کر لی ہے۔

پروہت گنجال گپھا سے اس لئے بھاگا کہ میں اس کے دروازے تک پہنچ گیا تھا، میں ہرگز نہیں جانتا کہ وہاں کیسے پہنچ گیا وہ تو بس مشی فی النوم کی کیفیت تھی جو مجھے اس گپھا کی طرف دھکیلتی رہی اور میرا اشعور اندھیرے میں میری رہنمائی کرتا رہا۔ اچانک خیال آیا مشی فی النوم میں انسان کا شعور کام نہیں کرتا اور وہ اس حالت میں کسی کو دیکھتا نہیں، پہچانتا نہیں مگر میں نے کچھ دیکھا بھی، کچھ محسوس بھی کیا کیونکہ نیند کی حالت میں چلتے چلتے جب میں زینے کی بالکونی کی طرف بڑھ رہا تھا، میں نے تارا کو دیکھا تھا جو اپنے کھلے بدن پر صرف دھوتی لپیٹے نیم عریاں سی اپنے بستر سے اٹھ کر بھاگی آئی اور مجھے روکنا چاہتی تھی مگر اسے رستے سے ہٹا کر زینے کی طرف بولیا تھا، پھر سیڑھیاں اتر کر گوچی ساؤ کے جسم کے قریب سے گزرتے اور سیدھی راہداری کا دروازہ کھولتے سے چان کو بھی دیکھا تھا جو ابھری کی سمت پور بی راہداری میں پہرہ دے رہا تھا۔ مشی فی النوم کی وہ کیفیت جس سے میں گزرا، فی الواقع بڑی عجیب تھی کیونکہ میں سو بھی رہا تھا، جاگ بھی رہا تھا۔ تارا نے مجھے روکا میں نہیں رکا بلکہ اسے حیران و خوفزدہ چھوڑ کر چلا آیا۔ میں نے چان کو دیکھا مگر اسے نظر نہ آ سکا تو ایسی تھی وہ سوتے جاگتے کی حالت البتہ یہ معما میری سمجھ

”جب آپ گئے تو سوئے ہوئے تھے۔ نیند میں چل رہے تھے اور میں ڈر رہی تھی کہیں گرنے جائیں کہیں چوٹ نہ لگ جائے کہیں کچھ ہونہ جائے۔“

”دیکھ لو کچھ بھی نہیں ہوا اور میں بھلا چنگا لوٹ آیا ہوں۔“
وہ اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”آپ کو نیند میں چلنے کی عادت ہے کیا؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور راہداری سے گزر کر صحن میں آ گیا۔ وہ بھی دروازے کی کنڈی چڑھا کر میرے پیچھے پیچھے ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوا تو تارا بھی پیچھے تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور وہ گھبرا کے بولی۔ ”آپ کے پاؤں صاف کردوں، صاحب!“

میں نے پاؤں کی طرف دیکھا تو میلے ہو رہے تھے۔ ”میں خود صاف کر لوں گا تم جا کے آرام کرو۔“

ٹھیک اسی لمحے دھن کی طرف کالے پہاڑ پر بجلی گری اور اس زور کا کڑا کا ہوا کہ دروازے بج اٹھے، دیواریں ہل گئیں اور تارا خوف سے تڑپ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ جیسے بجلی کی کڑک اس کی موت کا سندیس لے کر آئی تھی۔ وہ اس فاختہ کی طرح کانپ رہی تھی، جس پر کسی بلی نے حملہ کر دیا ہو اور اسے جھپٹ کر لے جانا چاہتی ہو۔ کڑا کے کی لرزش تھی تو میں نے ہاتھوں سے اس کی کلائیوں کی زنجیر توڑ دی جس میں اس نے مجھے جکڑ لیا تھا اور پرے ہٹا دیا۔
”یہ کیا پاگل پن ہے تارا!“

میری جھڑکی سن کر اس نے سہی سہی نظروں سے مجھے دیکھا پھر آنکھیں جھکا لیں مگر وہ ابھی تک کانپے جا رہی تھی اور دھوتی کے اندر اس کا بدن ملیریا کے کسی بیمار کی طرح تھر تھرا کانپ رہا تھا۔

”بجلی سے ڈرتی ہو کیا؟“

ڈری ڈری بولی۔ ”ہاں“ بہت ڈرتی ہوں۔“

”مگر تم پر تھوڑی گرے گی بجلی، وہ تو صرف کالے پہاڑ پر گرتی ہے۔“

سہے سہے لہجے میں کہنے لگی۔

”مجھ پر بھی گر چکی ہے ایک بار۔“

”تم پر؟“ میں حیران ہوا۔

”ہاں سرکار!“

”کب گری تھی تم پر بجلی؟“

”چار برس پہلے، جب میں نئی نئی یہاں آئی تھی۔“

”مگر میں نے تو سنا ہے کہ کالے پہاڑ کے علاوہ بجلی اور کہیں نہیں گرتی۔“

”گری تو وہ بھی کالے پہاڑ پر تھی پر میرے جیون کا ناش کر گئی۔“ پھر غمزہ سی آواز میں بتانے لگی۔

”میرے بیاہ کو صرف چار مہینے ہوئے تھے، اسی طرح بادل گرنے رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی تب میں اس کی کڑک سے اتنا نہیں ڈرتی تھی اور اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی برکھا کا سماں دیکھ رہی تھی کہ اچانک کالے پہاڑ پر بجلی گری اور اتنا ہولناک کڑا کا ہوا کہ میں وہیں ڈھیر ہو گئی، ابھی مجھے دوسرا مہینہ لگا تھا مگر بجلی کا وہ کڑا کا اتنا بھیاں تک تھا کہ میرا.....“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

وہ ذرا ہچکچائی۔ ”میرا گر بھ پات (استقاط حمل) ہو گیا سرکار! جان بڑی مشکل سے بچی، وہ بجلی میری کوکھ پر گری تھی کیونکہ جس دید نے دیکھا یہی کہا کہ گر بھ پات کے بعد میں ماں بننے کے لائق نہیں رہی، تب سے بجلی کڑکتی ہے تو میری جان پر بن جاتی ہے۔“

یہ بڑا المناک اور تکلیف دہ انکشاف تھا، میرے دل میں تارا کے لیے ہمدردی کی لہر اٹھی اور میں بجلی کے ڈر سے اس کے لرزے، کانپنے اور بے اختیار ہو کر لپٹ جانے کا کارن سمجھ گیا۔ پرکھوں نے ناری کو اس درخت کی مانند قرار دیا ہے جو گھر کے آنکھن میں پھلتا، پھولتا اور پھل دیتا ہے مگر درخت بانجھ اور پھل دینے کے لائق نہ ہو تو اس کی قدر نہیں ہوتی اور کبھی کبھار آنکھن سے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ناری بھی ماں پاتی ہے جب ماں بن جائے۔ اس لیے ہر عورت فطری طور پر تخلیق اور سرشتی خواہش مند ہوتی ہے اپنی گود کو آباد و سرسبز دیکھنا چاہتی ہے۔

ساؤ گاری میں بجلی کی کڑک نے بے چاری تارا کی کوکھ پھونک ڈالی تھی، یہ غم ایک جوان عورت کے لئے کچھ کم نہ تھا، مجھے اس کی کہانی سن کر بڑا دکھ ہوا۔ اس سے ہمدردی بڑھ گئی، ممکن ہے، اس محرومی کا کوئی اور کارن بھی ہو مگر بجلی کی چمک کڑک سے ڈرنا، کانپنا، نفسیاتی خوف کا نتیجہ تھا، گویا وہ اس ناگہانی خوف کی حالت میں جو اسے تباہ کر چکا تھا کسی کا سہارا ڈھونڈتی تھی۔

اچانک باہر بارش ہونے لگی۔ پانی چھما چھم برسنے لگا۔ بارش کے ساتھ کوندوں کے لپکنے، بادلوں کے گرجنے کی آواز بھی تیز ہو گئیں جن کا اثر میں تارا کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈری ڈری، سہی سہی یوں کھڑی تھی جیسے لیروں کے گروہ کی چاپ سن رہی ہو پھر نہ جانے کیا سوچ کر پوچھنے لگی۔ مجھ سے گستاخی ہوئی تھی سرکار! آپ کو برا تو نہیں لگا؟“

میں حیران تھا اس کے سوال کا کیا جواب دوں۔ پاؤں فرش پر ٹیک کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

”برا تو نہیں عجیب ضرور لگا۔“

”عجیب کیوں لگا؟“

”وہ اس لئے کہ یہاں تو گرمیوں، سردیوں کی برساتوں میں اکثر بادل چھائے رہتے ہیں، پھر بادل گرجتے اور بجلیاں کڑکتی ہیں، میں حیران ہوں جب ان دنوں میں پیگو ساؤ گاری سے چلا جاتا ہے اور بجلی کڑکتی ہے تب کیا کرتی ہو، میرا مطلب ہے تمہیں کون سنبھالتا ہے۔“

”ایسا تو کبھی کبھار ہوتا ہے، دیوار، دروازہ، آدمی جو بھی سامنے ہوا سے پکڑ لیتی ہوں۔ ایک بار بڑے مالک سے چٹ گئی تھی مگر انہوں نے برا نہیں منایا جب کڑکا تھا تو میری حالت پر دکھی ہو گئے تھے۔“

”تمہاری کہانی سن کر دکھی تو میں بھی ہو گیا ہوں۔“

یہ سن کر تارا میرے قریب ہی فرش پر بیٹھ گئی اور سر جھکا کر بولی۔ ”پیگو کو، بڑے مالک کو میری کوکھ اجڑنے کا بڑا دکھ ہے، مگر دادا نے کہا ہے میں آپ کی سیوا کروں گی تو میرا گرجھ کشت دور ہو جائے گا۔“

میں چونکا۔ ”وہ کیسے؟“

”دادا کہتے ہیں کہ آپ بھگوان کا روپ ہیں۔ دیوتا ہیں، میرے لیے پرارتھنا کریں گے تو میری کوکھ پھر سے ہری ہو جائے گی۔“

نہ جانے بڑھے ساگر ساؤ جی کو کیسی کیسی باتیں سوچ رہی تھیں اور اس کا ذہن میرے بارے میں کیا کیا سوچ رہا تھا، میں نے پوچھا۔

”تارا! کیا تم بھی ایسا سمجھتی ہو؟“

”میں تو بس آپ کی دیا چاہتی ہوں مالک!“

”اچھا اپنے کمرے میں جاؤ، میں پرارتھنا کروں گا کہ بھگوان تمہاری کوکھ ہری کر دے۔“

اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے، اپنی موٹی موٹی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور رس بھرے لہجے میں بولی۔ ”آپ تو بھگوان ہیں ابھی مجھ پر دیا کریں۔“

تارا کے اس فقرے نے مجھے پریشان کر دیا۔ اس نے تو دیا کرنے کو یوں کہا تھا جیسے وہ گھول کر پلانے والی کوئی شے تھی۔ نہ جانے دادا نے اسے دیا اور پرارتھنا کے بارے میں کیا اپدیش دیا تھا، میرے پختہ میں سوم اور اندر دیوتا کے اوصاف کا پتہ بھی اسی نے لگایا تھا۔ میں کچھ سمجھ رہا تھا، کچھ نہیں سمجھ رہا تھا تارا میرے جواب کی منتظر تھی، اس کی بے چین نظریں میرے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ باہر مینہ بڑے زور سے برس رہا تھا، کوندے لپک جھپک رہے تھے اور میری سوچ کے کواڑ کبھی کھلتے، کبھی بند ہوتے تھے۔ اچانک باہر بڑے زور کا کڑا کا ہوا، کالے پہاڑ پر پھر بجلی ٹوٹی اور اتنی زبردست اور مہیب تھی وہ آواز کہ اس کی دہشت سے میرا دل بھی لرز اٹھا۔ ادھر تارا فرش سے یوں اچھلی جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے اسے اچھال دیا اور

درخت کی طرح ٹوٹ کر مجھ پر گری ساتھ ہی اس کے حلق سے چیخ بھی نکل گئی۔

اب کے میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی، وہ میرے ساتھ لپٹی کسی گھائل پنچھی کی طرح تھر تھر کانپتی رہی، میں نے اسے تسلی دی۔

”ڈرو نہیں تارا! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس کا رُواں رُواں لرز رہا تھا، انگ انگ کپکپا رہا تھا جیسے روئی دھنکی جا رہی ہو۔ اس کی یہ لرزشیں مجھے پریشان کیے دیے رہی تھیں۔ اس بار میں نے کی کلائیوں کی زنجیر نہیں توڑی۔

دو تین منٹ کے بعد جب شریہ کارزہ تھا، کپکپاہٹ کم ہوئی تو اس نے آپ سے آپ مجھے چھوڑ دیا مگر اس طرح سہمی اور گھبراہٹ ہوئی تھی مجھے گمان گزرا اگر اس کے نفسیاتی مرض کا علاج نہ ہوا تو کسی دن بجلی کی کڑک کے ساتھ ہی مر جائے گی۔

اب میں اسے اپنے کمرے میں جانے کا مشورہ نہیں دے سکتا تھا وہ خود بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ برسات رات میں جب کوندے لپک رہے تھے، بجلی کڑک رہی تھی اسے تنہا چھوڑ دینا بے حد خطرناک تھا، میں نے تجویز پیش کی۔

”تارا! تم اپنے کمرے سے کبل لے آؤ اور یہیں کاؤچ پر سو جاؤ۔“

اسے یہ تجویز پسند آئی، لپک کے گئی اور اپنا کبل اٹھا لائی پھر وہ کاؤچ پر، میں پلنگ پر لیٹ گیا اور من ہی من میں پرارتھنا کرنے لگا۔ اب کوئی بجلی نہ گرے۔ بھگوان نے میری پرارتھنا سن لی تھی کیونکہ باہر پانی کے فرائے کم ہو گئے اور بجلی کا کوئی ایسا کڑکا بھی سنائی نہ دیا جو تارا کو کاؤچ سے اچھال دیتا۔ اس کے لیے میرا من دھبی ہو گیا تھا۔ میں بے چاری تارا ہی کے بارے میں سوچتا گہری نیند سو گیا مگر دن چڑھے آنکھ کھلی تو بادل برس کے کھل گئے تھے سورج نکل آیا تھا اور سربانے کی طرف تارا مجھ پر یوں جھکی ہوئی تھی جیسے میرے چہرے کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی ہو۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے اسے، اس نے مجھے دیکھا اور میں حیران سا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ”سرکار! میں آپ ہی کو جگانے آئی تھی۔“

اس نے اپنی دھونی کا پلو کمر سے لپیٹ رکھا تھا بالوں کی ایک دوئیں چہرے پر پریشان تھیں، میں نے ذرا غور سے دیکھا تو کہنے لگی۔

”میں نے مہمانوں کے لئے بھوجن تیار کر لیا ہے۔ آپ ذرا نیچے جا کر مدایا کو بلا لائیں تاکہ وہ بھوجن لے جائے۔“

میں اس کی مستعدی پر حیران رہ گیا۔ نہ جانے وہ کب بیدار ہوئی اور کب بھوجن تیار کر لیا۔ مدایا کو بلا کر مہمانوں کیلئے بھوجن بھجوا دیا گیا تو وہ میرے لیے ناشتہ لگانے لگی، ہر چیز جو اس نے تیار کی تھی اٹھا اٹھا کے میرے سامنے رکھتی گئی، میں نے ذرا بے تکلفی کا مظاہرہ کیا

اور ہاتھ پکڑ کے پوچھا۔

”کیا تم نے بھی کچھ کھایا کہ نہیں؟“

”ابھی کہاں سرکار؟“

”تو بیٹھ جاؤ یہیں اور میرے ساتھ ناشتہ کرو۔“

وہ حیران سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی میں اٹھا اسے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر من ہی من میں ڈر رہی تھی کہ اس اثناء میں اگر مدایا بھکشو خالی برتن لے کر آگیا اور اس نے ہم دونوں کو ایک ہی میز پر آٹھانے سامنے بھوجن کرتے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا، میں نے اس کے من کی بھاشا پڑھ لی اور کہا۔ ”ڈرو نہیں، بودھ دھرم میں ذات پات، چھوٹے بڑے کی کوئی پرکھ پہچان نہیں۔ سب ایک ہیں جو اپنے کو بڑا سمجھ کے ہنکار کرتا ہے اس کا گھر سو رگ میں نہیں ترک میں ہے۔ تنہا گت کہتا ہے کہ سب کے ساتھ خواہ وہ بڑے ہوں خواہ چھوٹے ہوں، پریم بھاؤ رکھو۔ سب کے ساتھ دیا کرو۔“

وہ بڑے دھیان سے میری باتیں سنتی رہی، پھر بے چین آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ ”آپ دیا کریں گے نا مجھ پر۔“

”کیوں نہیں، بھگوان نے چاہا تو تمہاری کوکھ پھر ہری ہو جائے گی۔“

یہ سنتے ہی تارا کے انگ انگ میں بجلیاں سی دوڑ گئیں، آنکھیں چمک اٹھیں اسی خوشی میں

انھ کر میرے چرن چھو لیے اور کہا۔

”آپ بڑے دیا لو ہیں صاحب۔“

اس دن بھی دوپہر اور شام کا بھوجن گونا کھیا کے ذمے تھا، میں نیچے آیا تو کایا موبسا، وشال رائے، چان، کالی ناتھ اور کریم، مدایا بھکشو کے ساتھ رتنا گری کے پر بتوں اور جنگلوں کی سیر کا پروگرام بنا رہے تھے، میں نے کسی کو نہ بتایا کہ رات پر وہت گنجال سے جا ٹکرایا تھا اور اب اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ کایا اور وشال رائے کو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا جو ساؤ گاری میں بیٹھے سروپ جی کا اس لئے انتظار کر رہے تھے کہ ان کی واپسی پر گنجال کو تلاش کرنے نکلیں گے، ان کے جیون کا ایک ہی آدرش تھا، گنجال سے انتقام۔

میں کچھ تھکاؤ محسوس کر رہا تھا۔ سر میں بھی درد تھا اور شریر ہلکی ہلکی آنچ میں جلنے لگا تھا، اس لیے ان کے ساتھ نہ تو دوپہر کے بھوجن میں شریک ہو سکا، نہ سیر کو جا سکا اور یہ سوچ کر شاید کچھ دیر آرام کر لینے سے طبیعت ٹھیک ہو جائے اوپر آگیا، تارا صبح کے جھوٹے برتن مانجھ رہی تھی مجھے اونٹے دیکھ کر اس حالت میں بھاگی آئی، میں صحن میں رک گیا۔ ”وہ بولی۔“ کچھ چاہیے صاحب۔“

”ہاں تھوڑا سا پانی دے دو۔ گولی کھاؤں گا۔“

”گولی کیوں؟“

”من ٹھیک نہیں۔ شریر جل رہا ہے۔“

یہ کہہ کر میں تو کمرے میں آگیا اور تارا پانی لینے چلی گئی۔ بڑی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ میں آتے ہی بوٹوں سمیت بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ تارا پانی لے کر آئی تو اسپرین کی دو گولیاں کھا کر پھر لیٹ گیا۔

”بوٹ اتار دوں سرکار!“

”اتار دو۔“

اس نے بوٹ اتارے تو پریشان سی ہو گئی۔ ”آپ کو تو بخار ہے۔“

”گولی کھائی ہے ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

مگر گولی نے الٹا اثر کیا اور بخار تیز ہوتا چلا گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر شریر بھٹی کی طرح جلنے، دھکنے لگا اور تپ کی شدت سے نیم بے ہوشی، نیم غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اسی حالت میں سندر متی کو پکارا۔ میری آواز سن کر تارا بھاگی آئی۔ ”کیا ہے مالک۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم تارا ہو۔“

”ہاں سرکار! میں آپ کی داسی تارا ہوں۔“ بے چاری میری حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔

”تارا۔۔۔ پانی دے دو۔“

وہ بدحواسی کے عالم میں پانی لے کر آئی۔ میں بڑی مشکل سے اٹھا۔ اٹھا کہاں تارا نے سہارا دے کر اٹھایا۔ پانی پینے لگا تو گلاس میرے ہاتھوں میں کانپ کانپ گیا اور پانی پیتے ہی بستر پر ڈھے گیا تارا نے میرے شریر کو ہاتھ لگا کر دیکھا، شریر آگ ہو رہا تھا، وہ بھونچکی سی رہ گئی، مدایا مہمانوں کے ساتھ جنگل کی طرف چلا گیا تھا اور یہاں تارا کے سوا کوئی بھی میری دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ گھبرائی گھبرائی دادا کی طرف بھاگ گئی، ہم دونوں کے بعد گھر میں وہی تھا، تارا نے بڑھے کو میری بیماری کا حال سنایا اپنی پریشانی بتائی۔ بڑھے نے کسی جڑی بوٹی کا نام لیا جو گھر میں تھی اور تارا سے کہا کہ بوٹی قبوے کی طرح ابال کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے پلائی رہے من ٹھیک ہوگا۔

وہ بوٹی کا عرق نکال کر لائی اور بتانے لگی۔ ”دادا نے کہا ہے آپ یہ پی لیں۔“

یہ بات اس وقت میری سمجھ آئی۔ جب اس نے مجھے اٹھایا، سہارا دے کر بٹھایا اور جوشاندہ نما کاڑھے کی پیالی میرے ہونٹوں سے لگا دی، میں نے نیم بے ہوشی کی حالت میں دو یا تین گھونٹ بھرے تو تارا نے میرا سر پھر تکیے پر رکھ دیا۔ مجھے لٹا دیا میں نے لیٹے لیٹے اس کا ہاتھ پکڑ

”سانپ کا کھڈ بھی دیکھا؟“
جواب پھر اثبات میں تھا۔
”سانپ تھا؟“

اب کے جواب نفی میں ملا۔ انا تھ بن کا بوڑھا شیش ناگ اپنے ٹھکانے پر نہیں تھا اور میں جانتا تھا وہ کہاں ہے اگر اچانک بیمار نہ پڑ جاتا تو آج ہی اس کا خاتمہ کر دیتا مگر اب سوچ رہا تھا، نہ جانے سانپ گپھا کے اندر ہو گا یا باہر نکل گیا ہے کیونکہ سرنگ میں گپھا کا خفیہ دہانہ کھلا رہ گیا تھا اور جب چتکبرا اس کے اندر رینگ گیا، میں بھی اس دہانے کو بند نہ کر سکا تھا۔ اچانک تارا بھاگی بھاگی آئی کہ شام کے اندھیرے میں اس نے خچروں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز سنی تھی۔ بولی ”بزے مالک آگئے۔“

تارا نے ٹھیک کہا۔ سچ سچ وہ سروپ جی کا قافلہ تھا جو تھوڑی دیر بعد ساؤ گاری کے پھانک پر رکا، سندرمستی بھی ان کے ساتھ آئی تھی۔

تارا نے زینے کی بالکونی پر اپنی نو جوان مالکن کا سواگت کیا اور میری بیماری کی اطلاع دی۔ وہ بڑی تیزی سے میرے کمرے میں آئی، ساتھ سروپ جی بھی تھے سندرمستی نے مجھے پر نام کیا، میری حالت دیکھی، شریر کو ہاتھ لگایا تو تڑپ اٹھی۔ ”یتا جی! انہیں تو بڑا تیز بخار ہے۔“

سروپ جی نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا، نبض دیکھی تو پریشان ہو گئے۔ تارا نے بتایا ”دادا نے بولی اباال کے دینے کو کہا تھا۔“

”بولی کاڑھا دل کی گھبراہٹ کو روکتا ہے۔ بخار تو نہیں توڑتا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹے اور کمرے سے دوا لینے چلے گئے۔ سندرمستی میرے پاس بیٹھ کر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ سروپ جی دوا لے کر جلد لوٹ آئے۔ شاسترو اور پیگو بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے ایک گولی مجھے کھلائی۔ غالباً ہاورڈ کو نین تھی اور تارا سے کہا۔

”کاڑھے کے دو تین گھونٹ دے دو۔ شاید گولی سے جی گھبرائے۔“

تارا نے پیالی سندرمستی کی طرف بڑھا دی اور اس نے اپنے ہاتھ سے کاڑھا مجھے پلایا، تارا کھڑی دیکھتی رہی۔ اس سے سندرمستی، سروپ جی، پیگو، شاسترو، گوٹکا مدایا سب کمرے میں موجود تھے، ان کے سامنے میں نے تارا کا شکریہ ادا کیا اسے مان دیا اور پیگو سے کہا۔

”تارا نے میری بڑی سیوا کی ہے کیونکہ دادا نے اسے سیوا کرنے کا ادھیکار دیا تھا۔ کل رات جب کالے پہاڑ پر بجلی ٹوٹی اور اس کے بھیا نک کڑا کے سے ڈر کے یہ بے اختیار مجھ سے چمٹ گئی تب معلوم ہوا، تارا بجلی سے کیوں ڈرتی ہے اور ڈرنے کا کارن جان کر میں دکھی ہو گیا۔ اس نے مجھ سے اپنے لئے پرا تھنا کرنے کو کہا تھا اور اس سے سب لوگوں کے سامنے بیماری

کے گرم، تپتے ماتھے پر رکھا، میرا سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ میرا عندیہ سمجھ گئی اور بیٹھ کر سردبانے لگی۔ مجھے کچھ سکون محسوس ہوا نہ جانے کاڑھے کا اثر تھا یا تارا کے ہاتھوں کا اعجاز کہ ہولے ہولے سر کا درد کم ہو گیا۔ بے چینی کم ہوئی مگر بخار نہ ٹوٹا، تپ نہیں گھٹی، میں نے پانی مانگا تو اس نے کاڑھے کے دو گھونٹ پلا دیے۔ ساتھ ہی وضاحت کر دی۔ ”دادا نے کہا ہے اس سے آپ کا من ٹھیک ہو گا۔“

من تو کچھ ٹھیک ہو گیا تھا مگر شریر ابھی تپ رہا تھا، پاؤں میں آگ لگی تھی۔ وہ انھی، ہاتھ پانی میں بھگو کے آئی اور اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھوں سے پیردبانے لگی، مجھے کچھ راحت ملی مگر اس کے ہاتھ جل گئے کیونکہ میرے پیر تو انگارے بنے ہوئے تھے۔ اس نے دو تین بار ہاتھ بھگو بھگو کے پاؤں دبائے تو جلن کچھ کم ہوئی بے چاری سارا دن دن پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگی پھری اور میری سیوا میں جتی رہی۔ اگر وہ نہ سنبھالتی تو میری حالت زیادہ بگڑ جاتی اور اب کب سے بیٹھی پاؤں دبا رہی تھی، میں نے کہا۔

”بس کرو تارا! تھک جاؤ گی۔“

”سیوا کرتے کون تھکتا ہے پھر میں تو داسی ہوں آپ کی۔“

مجھے پیاس لگ رہی تھی، میں نے پانی مانگا، اب کے اس نے پانی ہی دیا اور بولی۔ ”ذرا آپ کے بارے میں دادا کو بتاؤں وہ پریشان ہوں گے۔“

یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی اور چند لمحوں میں لوٹ بھی آئی، میں نے پوچھا۔
”دادا نے کوئی اپدیش بھی دیا؟“

”بس آپ کی سیوا کرنے کو کہا ہے۔“

”اور کچھ نہیں کہا؟“ وہ بولی نہیں، کھڑی دیکھتی رہی۔ غالباً بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اسی اثناء میں مدایا بھٹو مجھے اطلاع دینے آیا کہ مہمان سیر سے لوٹ آئے ہیں مگر میں بستر پر نڈھال پڑا تھا وہ سوالیہ نظروں سے تارا کو دیکھنے لگا، اس نے اشاروں سے بتایا کہ دو پہر سے بخار میں پھنک رہا ہوں، تارا کی جگہ اب مدایا میرے پاؤں دبائے بیٹھ گیا اور وہ رسوئی میں چلی گئی، مدایا میرے جسم کی گرمی سے جلا جاتا اور بے چینی سے بار بار پہلو بدلتا تھا۔ میں نے اپنا اور اس کا دھیان کسی دوسری طرف موڑ دیا اور پوچھا۔

”مہمانوں کو کہاں کہاں لے گئے تھے؟“

اس نے پوربی ترائی کے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا انا تھ بن میں نہیں گئے؟“

مدایا نے ”ہاں“ میں گردن ہلائی۔

کے بستر پر اپنے دکھی من کے ساتھ پرارتھنا کرتا ہوں کہ بھگوان تارا کا گر بھ کشت دور کرے۔ اس کی گود ہری ہو، یہ سدا خوش رہے۔“

تارا نے بھاگ کر میرے پیر پکڑ لیے، پھر کسی پجارن کی طرح ہاتھ جوڑ کر بھرائی آواز میں بولی۔ ”آپ نے داسی کے لیے پرارتھنا کی ہے مالک! میں جیون بھر آپ کی سیوا کروں گی۔“ میری پرارتھنا بالکل غیر متوقع تھی مگر سروپ جی، سندرمی اور پیگو کے چہروں پر ایک دھنک سی لہرائی، آنکھوں میں آشا کے دیپ جل اٹھے اور ان کی روشنی سے میرے من کا اندھیرا بھی دور ہونے لگا جو تارا کی کوکھ اُجڑنے کے دھوکے سے میرے اندر چھا گیا تھا۔ اسی لمحے پیگو آگے بڑھا، اس نے بھی تارا کی طرح میرے چرن چھوئے اور سپاس گزار لہجے میں کہنے لگا۔

”تارا کی طرح میں بھی سدا آپ کا داس رہوں گا صاحب!“ میں نے اس کی طرف انگلی اٹھا دی۔ ”پیگو تارا کو ساؤ گاری سے، رتنا گری سے ان پر بتوں سے دور لے جاؤ، اتنی دور کہ بجلیوں کے کڑا کے اس کا پیچھا نہ کر سکیں۔“ وہ حیران و ششدر سا کبھی مجھے، کبھی سروپ جی کو دیکھنے لگا۔

”جب تک مالک ساؤ گاری میں ہیں، میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔ تارا بھی نہیں جا سکتی۔“ ”تم دونوں جاؤ گے، سب جائیں گے۔“

بخار کی شدت اور حدت سے میری آواز اونچی اور لہجہ تیز ہو گیا اور میں یوں بولنے لگا، جیسے کوئی ہندیانی کیفیت میں بے سرو پاتیاں کرتا ہے، میری زبان پر جو کچھ آیا میں کہتا چلا گیا۔ ”ساؤ گاری ساؤ پر یوار کے دکھوں کی چتا ہے جس پر نہ جانے کتنی نسلیں جل کر اٹھ ہو گئیں مگر اب اس دیرانے میں دادا کے علاوہ اور کسی کی چتا نہیں جلے گی۔ سروپ جی جائیں گے، سندرمی جائے گی، میں جاؤں گا، تم سب جاؤ گے، یہاں کوئی نہیں رہ سکتا کیونکہ ساؤ گاری کا انت ہونے والا ہے، یہ میں نہیں کہتا، آکاش کا کیا کہتی ہے کہ سب کچھ راکھ ہو جائے گا، سب کچھ ڈھیر ہو جائے گا۔“

میں نہیں جانتا یہ میرا ہندیان تھا یا کوئی دوسرا میری زبان سے بولا تھا یہ باتیں سن کر سب دنگ رہ گئے اور خود میں یہ سب کچھ کہنے کے بعد نڈھال سا بستر پر گر گیا۔ مجھے چکر یا غش آ گیا تھا کیونکہ جب بے سدھ سا بستر پر گر رہا تھا میں گرتے گرتے سندرمی اور سروپ جی کا رنگ فق ہوتے، انہیں اپنی طرف لپکتے اپنے اوپر جھکتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں کہ انہوں نے کیا کیا، کیا نہیں کیا۔

غالباً میں بے ہوش ہو گیا اور اسی بے ہوشی یا بخار کی غنودگی میں سو گیا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں میری نیند خراب نہ ہو کہیں کھٹکے سے میرے آرام میں خلل نہ آجائے، سب لوگ کمرے

سے چلے گئے تھے اور میں تنہا رہ گیا تھا جیسے آدمی دنیا میں تنہا آتا اور تنہا ہی جاتا ہے مگر رات کے تیسرے پہر بے ہوشی یا نیند ٹوٹی آنکھ کھلی تو سندرمی میرے ساتھ ہی بستر پر ایک طرف لیٹی کروٹ بدلے سو رہی تھی، میں نے اسے دیکھا، دل میں اس کے پریم کی لہرائی اور سوچا۔ رات سب چلے گئے مگر سندرمی مجھے چھوڑ کر کیسے جاتی، کہاں جاتی، اب وہ میرے جسم کا ایک حصہ تھی پھر یہ کمرہ بھی اسی کا تھا، بستر بھی اسی کا تھا میں بھی اسی کا تھا۔ تب خیال آیا میں تنہا نہیں، ایک عورت میرے پاس ہے جس طرح آغاز دنیا میں آدم یا برہما کے ساتھ تھی کیونکہ لکھا ہے۔

”اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور خداوند خدا، اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکال تھی، ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا یہ تو اب میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس لئے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی بیوی (جورو) سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔“

سو جس طرح آدم گہری نیند سے جاگا اور عورت اس کے پسلیوں میں تھی تاکہ وہ دنیا میں تنہائی محسوس نہ کرے اسی طرح جب میری نیند ٹوٹی تو میں نے عورت کو اپنے قریب پایا اور ایک اطمینان سا محسوس کیا کہ میں تنہا نہیں، میری جورو میرے ساتھ ہے جو مجھ سے بلا کا پریم کرتی، بلا کی رغبت رکھتی ہے۔

میں چند لمحوں لیمپ کی مدھم روشنی میں اسے دیکھتا رہا پھر ہاتھ بڑھا کے اس کا کول سا ہاتھ پکڑ لیا اور میرے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے وہ فوراً بیدار ہو گئی، میرے قریب کھسک آئی اور بولی۔ ”اب کیسا ہے آپ کا من؟“ اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کا ہاتھ میری گردن، چہرے سر، ماتھے پر لپکتا چلا گیا اور مسرت انگیز لہجے میں پکاری۔ ”ارے۔۔۔۔۔ اب تو نہیں ہے تپ، آپ کا شریر نارمل ہے۔“

”تیرے آتے ہی تپ اتر گئی، بخار ٹوٹ گیا۔“

”رات میں نے پرارتھنا کی تھی، آپ کی تپ مجھے چڑھ جائے۔“

”مگر تجھے تو تپ نہیں چڑھ۔“ میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ پھیرا۔ نبض بھی دیکھی۔ ”ہاں

تیری پرارتھنا سے میری تپ اتر گئی۔“

”تپ صرف بخار کی نہیں پریم کی بھی تو ہوتی ہے۔“

اور پریم کی تپ نے اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے پیدا کر دیئے تھے۔ عارضوں پر

گلابیاں چھلکا دی تھیں۔ شریر کوئی گرمی بخشی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ سندر لگ رہی تھی، میں نے شرارت سے پوچھا۔

”اب بھی تجھے ابکائی آتی ہے؟“

یہ سن کر وہ عجیب سی مستی میں کھو گئی جیسے میں نے کائنات کا سب سے حسین، سب سے مدھر گیت چھیڑ دیا تھا۔

”ہاں کیشی! آتی ہے ابکائی، من اچھلتا ہے، پہلا مہینہ تو پورا ہو چکا ہے۔“

”جب من اچھلتا ہے، مجھے کوسٹی تو نہیں۔“

”ارے واہ! آپ کو کیوں کوسوں گی، آپ نے مجھے عورت کا مان دیا ہے۔ یہی تو ناری کا سب سے بڑا بھاگ ہوتا ہے کہ اسے ابکائی آئے، اس کا من اچھلے، اس کی گود بھرے۔“

اس کے ان الفاظ سے میرا دھیان تارا کی طرف پلٹ گیا جس کی کوکھ ہری ہونے کی پرا تھنا کر چکا تھا۔ ”بے چاری تارا کو اپنے گربھ پات کا بڑا دکھ ہے۔“

”آپ نے پرا تھنا کر کے مجھے شو بھادی ہے کیشی! میں تارا کے لئے بہت دکھی ہوں۔ پتا جی بھی دکھی ہیں۔ رات جب آپ نے پرا تھنا کی تارا بے حد خوش ہوئی اور اسی وقت دادا کو

بتانے بھاگ گئی کہ آپ نے پرا تھنا کی ہے۔“

”مجھے تو یوں لگتا ہے، ہر بات دادا سے پوچھ کے کرتی ہے۔“

”میرے بعد وہی تو ان کی دیکھ بھال کرنی اور کھانے پینے کا خیال رکھتی ہے۔ دادا بھی اسے بہت چاہتے ہیں۔“

”بھئی دادا کا ہر کہا مانتی ہے۔“

اچانک اس نے بات کا رخ بدل دیا اور پوچھنے لگی۔

”پہاڑی خانقاہ سے نکل کر آپ رنگامتی جاتے ہوئے بائی پارہ سے گزرے تو گھر کیوں نہیں آئے تھے؟“

”میرے ساتھ جل پنا تھی، کایا موسا تھے۔“

”میں کیا جل پنا کو آپ سے چھین لیتی؟“

سروپ جی سندر متی کو وہ تمام واقعات بتا چکے تھے۔ انہوں نے پہاڑی خانقاہ میں میری قید اور گنجال کے وحشیانہ مظالم کا بطور خاص ذکر کیا تھا۔ وہ سن چکی تھی، جب سروپ جی، شاسترو اور پیگو کے ہمراہ میری تلاش میں خانقاہ گئے تو گنجال نے ان سے جھوٹ بولا تھا،

سروپ جی میرے ہی دکھ سے بیمار پڑ گئے اور گنجال کے درمیان ہونے والی سب باتیں سن چکی اور جانتی تھی کہ گنجال کس طرح کالی ناتھ اور کریم کی کلہاڑیوں کو بیکار اور چان کی بندوق کو

خاموش کر کے فرار ہو گیا۔

سروپ جی اسے بتا چکے تھے کہ جل پنا اور منجوری کے ساتھ میرا کیا نانا ہے اور اس بارے میں ان کے اپنے وچار کیا ہیں کیونکہ وہ مجھے ان دونوں سے ملاپ کی آگیا دے چکے تھے بلکہ

انہوں نے تو دادا کی یہ بات بھی اسے بتادی تھی کہ میرا پختہ چندر ماں ہے اور میں سوم اور اندر دیوتا کی طرح سندر تا پرا دھیکار رکھتا ہوں، وہ خود بھی کہہ چکے تھے اگر سندر متی کے علاوہ ان کی

کوئی اور بیٹی ہوتی تو اس کا لگن بھی میرے ہی ساتھ کر دیتے (جبکہ ساگر ساؤ جی خود بھی کہہ چکا تھا کہ تمام سندر لڑکیاں مجھے بھینٹ کرنے پر تیار تھا۔)

سندر متی یہ سب باتیں سن چکی تھی اور اب بستر پر لیٹے لیٹے یہ سب باتیں مجھے سنار ہی تھی۔ مگر میرے بارے میں نہ تو اس کی رائے تبدیل ہوئی نہ اس کے پریم میں کوئی کمی آئی بلکہ وہ

پہلے سے بھی بڑھ کر مجھے چاہنے اور پیار کرنے لگی تھی۔ اس نے ایک عجیب انکشاف کر کے مجھے حیران کر دیا۔

”کیشی! میں نے ابھی تک آپ کو یہ نہیں بتایا کہ دادا مجھے لڑکپن ہی میں دیوی بننے کی سکھشا دیا کرتے تھے آنکھیں بند کر کے اور سینے کے درمیان دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک خاص انداز میں

کھڑے ہونے کی ترکیب بھی انہوں نے مجھے بتائی کیونکہ ان کے وچار میں جب عورت اس روپ میں کھڑی ہوتی ہے تو اس میں دیوی کی سی شان پیدا ہو جاتی ہے اور دیوتا بھی اس سے

پریم کرنے لگتے ہیں۔ دادا نے کئی بار مجھے کہا تھا، تیرا بیاہ ایک دیوتا سے ہوگا۔ جس کے بڑے ادھیکار ہوں گے مگر تو اس کے من کو سب سے زیادہ بھائے گی اور اب مجھے پتہ چلا ہے وہ دیوتا

آپ ہیں۔ دوسری ناریوں پر آپ کے کتنے ہی ادھیکار کیوں نہ ہوں لیکن آپ کے من کو سب سے زیادہ میں ہی بھاؤں گی کیونکہ آپ نے ناری کا پہلا ادھیکار مجھے دیا ہے۔“

”تو بھاتاو گئی ہے میرے من کو کیونکہ تو میری سرسوتی، میرا علم، میرا گیان، میرا نروان ہے۔“

یہ بات میں نے صرف زبان سے نہیں بلکہ من کی پوری شکتی کے ساتھ کہی تھی، جسے سن کر سندر متی خوش ہو گئی اور پریم کے سپنوں میں کھو گئی مگر میرا ذہن ساگر ساؤ جی کی عجیب و غریب اور

حیرت انگیز افتاد طبع کی طرف منتقل ہو گیا، بڑھا کیسی کیسی انوکھی باتیں سوچتا تھا۔ یہ باتیں کم از کم اس صدی کی نہیں تھیں، صدیوں پہلے شاید لوگ اسی طرح سوچتے ہوں اور سندر لڑکیوں کو

دیوتاؤں کا صلہ ٹھہراتے ہوں۔ خود سندر نارایاں راجوں، مہاراجوں یا دیوتاؤں کی سوغات بننا فخر سمجھتی تھیں۔ ساگر ساؤ جی

کا ذہن بھی پرانے یگ کی باتیں سوچتا اور سندر عورت کے بارے میں خواہ وہ بیاہتا ہو یا کنواری ایک ہی سوچ رکھتا تھا کہ وہ دیوتا کی ”سوغات“ ہے۔ اس نے اپنی پڑپوتی کو دیوی بننے کی سکھشا

اس لئے دی تھی کہ اس کا بیاہ ایک دیوتا سے ہوگا، جس کا دوسری سند لڑکیوں پر بھی ادھیکار ہوگا مگر وہ چاہتا تھا کہ سند متی اس کے من کو زیادہ بھائے۔

اسی لمحے میرے ذہن میں ایک عجیب و غریب خیال ابھرا جس نے ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کی شکل میں ذہن کے ساتھ میرے جسم کو بھی گھیر لیا کہ ساؤ گاری کے مندر میں ناچ پوجا کی خاطر صرف کنواری اور گرہن زدہ لڑکیوں کو کیوں لایا جاتا رہا، اور ان سے سدا کنواری رہنے کا وجہ لینے پر اصرار کس لئے کیا جاتا ہے؟

یہ سوال اگرچہ مختلف شکلوں میں پہلے بھی کئی بار پیدا ہو چکا تھا مگر اس بار اس کی صورت بہت مختلف بہت اہم تھی کیونکہ یہ سوال ساؤ گاری کے دوسرے اسرار کی بہ نسبت کچھ زیادہ سنہنی خیز تھا۔

میں پٹاما پجاری سے سوم دیوتا کی ایک دیومالائی کہانی سن چکا اور چتر بھی اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا، جس کے ذریعے بھگوان کی زندگیوں سے کنواری رہنے کا وجہ لیا جاتا تھا۔

پٹاما پجاری کی ایک بات سانپ کی طرح میرے ذہن میں ریختی پھرتی تھی، اس نے کہا تھا نرتکی سے سدا کنواری رہنے کا وجہ اس لیے لیا جاتا ہے کہ وہ بھگوان کی شرن میں آ کر سوم دیوتا کے انتقام سے بچ جائے یا پھر اندر دیوتا اس کی ناچ بھگتی کو سوزیکار کرے تو وہ ان کے سورگ کی اپرا بن سکتی ہے اور یہ بات تو بڑی مشہور ہے کہ اندر دیوتا کنواری اپسراؤں کو سوزیکار کرتا اور ان کے کوار چھل کو اپنی امانت سمجھتا ہے۔

میں نے سوچا کوئی پر اسرار وجہ ہے ضرور جس کے لئے ہر نرتکی کو کنواری رہنے اور اندر کے سورگ کی اپسرا بننے کا پسند دکھایا جاتا ہے۔ اندر کا سورگ دیومالائی کہانیوں میں کتنا سندرتنا راحت بخش کتنا لذت آفرین بیان کیا جاتا ہے، جہاں کیف و مستی اور راگ رنگ کے سوا اور کچھ نہیں، بعض نرتکیاں ضرور اس سورگ کے سپنے دیکھتی ہوں گی۔ اپنا کوار چھل اندر کو بھیجتے کر کے اس کے حسین سورگ میں جانا اور اس کی اپسرا بننا قبول کر لیتی ہوں مگر سوال تو یہ تھا اندر کے سورگ کا ساؤ گاری کے اسرار سے کیا سمبندھ اور کیوں یہاں ناچ پوجا کرنے والی ہر نرتکی کو اس کے سورگ میں بھیجنے کا پسند دکھایا جاتا ہے۔

اس سوال کے ساتھ ہی ذہن فوراً جل بدوش بڑھے ساگر ساؤجی کی طرف بھاگا، جو اس عمر میں بھی ناچ میں دلچسپی رکھتا تھا اور جب سندرتی کی آمد پر ساؤ گاری میں ناچ کی خاص منڈلی لگتی تو گونگے بھکشو بڑھے کی پاکی اٹھا کر نیچے لاتے کہ وہ نرتکی کا ناچ دیکھ کر اپنا من بہلا سکے۔ اس کے ذہن میں سوم دیوتا اور اندر دیوتا اپنی مخصوص صورتوں اور روایتوں کے ساتھ گھسے ہوئے تھے، ہی سندرتی کیوں کو دیوتاؤں کی ”سوغات“ سمجھتا تھا اور اسی نے میرے پختہ کو بھی سوم اور

اندر سے ملا دیا بلکہ میرے بارے میں رائے دی تھی کہ سندرتی کیوں پر میرا ادھیکار ہے یا وہ میری سوغات ہیں اور کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

اچانک میرا ذہن پکارا اٹھا۔ ”ارے یہ بڑھا تو گنوں کی پوٹلی ہے۔“ اور اس کے ساتھ ہی میں اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا کیونکہ یہ بات میرے ذہن میں کسی کوندے کی طرح لپکتی چلی گئی تھی کہ ساؤ گاری میں ناچ پوجا اور گرہن زدہ سندرتیوں سے سدا کنواری رہنے کا کھیل اس بڑھے کا رچایا ہوا لگتا ہے، میرے اس طرح ایک ایک اٹھنے سے سندرتی حیران سی رہ گئی اور گھبرا کر بولی۔ ”کیا ہوا کیشی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

وہ سمجھ رہی تھی غالباً رات کی طرح مجھ پر ہڈیاں کا دورہ پڑنے والا ہے یا پھر نہ جانے میں ناگہاں کیا کر بیٹھوں۔ گھبرا کے میرے ساتھ ہی اٹھی میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور بولا۔ ”ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، بتائے گی؟“

وہ پریشان ہو گئی۔ ”اگر میں کچھ جانتی ہوں تو ضرور بتاؤں گی، کیا پوچھنا ہے آپ کو؟“

”دادا دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں، تجھے بھی دیوی بننے کی سکھشا دیتے رہے، کیا انہوں نے کبھی اندر دیوتا کے بارے میں تجھ سے کوئی بات کی؟“

”انہوں نے اندر دیوتا کے بارے میں مجھ سے بہت سی باتیں کی ہیں، نہ جانے آپ کو کسی بات پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”داوانے کبھی یہ بھی بتایا کہ اندر دیوتا صرف کنواری اپسراؤں کو کیوں سوزیکار کرتا ہے۔“

”آپ نہیں جانتے کیا؟“ اس نے دلچسپ حیرت کے ساتھ پوچھا۔

”ارے جب مرد کنواری لڑکیوں سے بیاہ رچاتے ہیں تو دیوتا کنواری اپسراؤں کو کیوں پسند نہیں کرے گا کوار چھل تو لڑکی کا وہ سندرتی گہنا ہوتا ہے جسے وہ لگن کی رات اپنے پتی کے حوالے کرتی ہے۔“

”تو میری بات نہیں سمجھی سندرتی!“

”آپ سمجھائیں گے تو کیوں نہیں سمجھوں گی۔“

”میں اصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کبھی داوانے تجھ سے اس سنسار کی لڑکی کو اندر دیوتا کے سورگ میں بھیجنے کا بھی ذکر کیا تھا۔“

وہ اپنے حافظہ پر زور دے کر کہنے لگی۔

”داوانے ایک بار کہا تھا جو لڑکی اندر دیوتا کے سورگ میں چلی جائے وہ بڑی بھاگوان ہوتی ہے مگر یہ نہیں بتایا تھا وہ اندر کے سورگ میں کیسے جاسکتی ہے جو آکاش پر ہے۔ ایک دن مجھ سے

بھی پوچھا۔

”کیا تو اندر کی دلہن بننا چاہتی ہے؟“ مگر میں نے کہہ دیا۔ ”دادا! میں تو دھرتی کے کسی دیوتا کی دلہن بنوں گی۔“ تبھی انہوں نے کہا تھا کہ تیرا بیاہ ایک دیوتا سے ہوگا تو اس کے من کو سب سے زیادہ بھائے گی کیونکہ تو بھی دیوی سمان ہے، بس یہی کہا تھا دادا نے۔“

میں سوچنے لگا۔ دادا کو اندر دیوتا، اس کے سؤرگ اور کنواری اپسراؤں سے خاص دلچسپی ہے تو ضرور اس کا کوئی کارن ہوگا جو ساؤ گاری میں گرہن زدہ لڑکیوں کی ضرورت اور ساؤ پر یوار کے دھرم کی گرہ کھول سکتا ہے مگر سندر متی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ورنہ سب کچھ بتا دیتی۔ میری طرح وہ بھی ساؤ گاری کے سربستہ رازوں سے ناواقف تھی اور اس سے کچھ معلوم کرنا بے کار تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ کچھ اور سوچنے لگی۔ ”یہ اچانک آپ کو اندر دیوتا اور اس کی اپسراؤں کے بارے میں جاننے کی کیا سوچھی؟“

”بس یونہی ایک خیال آگیا تھا۔“ میں نے اب بات ٹالنا چاہی۔

”کیشی میں کچھ سمجھ رہی ہوں مگر آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

اور اس نے جو بات کھولی، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ کہنے لگی۔ ”اگر آپ اندر دیوتا کا نام لے کر مجھے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس کی طرح کئی لڑکیوں پر ادھیکار رکھتے ہیں اور میں جل پنا اور منجوری یا کسی لڑکی اور ناری کے بارے میں بات نہ کروں تو میں نے کب بات کی ہے میں بھی پتاجی اور دادا کی طرح آپ کے سب ادھیکار مانتی ہوں۔ جل پنا کے ساتھ تو پہلے سے میرا پریم ہے، اب آپ کے ناطے وہ مجھے اور بھی پیاری ہو گئی ہے اور میں اسے کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی، منجوری سے میں ابھی نہیں ملی، ملی تو کھلے دل سے ملوں گی میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں، دل کو سوتن کے جلاپے میں نہیں جلاؤں گی، جب پتاجی نے کہہ دیا کہ ان کی دوسری بیٹی ہوتی تو اسے بھی آپ ہی سے بیاہ دیتے تو جل پنا اور منجوری کو ان کی دوسری بیٹیاں سمجھ لوں گی، میں خود آپ کو دیوتا مانتی ہوں اور دیوتا کے بڑے رشتے، بڑے ناتے، بڑے ادھیکار ہوتے ہیں مگر میرے ساتھ آپ کا ناتا سب سے گہرا ہے کیونکہ میں آپ کی پہلی ناری ہوں۔“

وہ کہتی رہی، میں سنتا رہا۔ اسے روکا یا ٹوکا نہیں بلکہ سب کچھ کہنے دیا۔ کیونکہ یہ باتیں ایک نہ ایک دن اسے یا مجھے کہنا ہی تھیں اور جب سب کچھ کہہ دیا جائے تو من دھل کر صاف ہو جاتا ہے۔ وہ بھی کہہ چکی تو میں نے بات مختصر کر دی۔ ”جو کچھ ہوا، میں پتاجی سے کہہ چکا ہوں اور دہرانا اس لئے نہیں چاہتا کہ ان پر، تجھ پر، خود پر دشواں رکھتا ہوں، بعض باتیں قدرت کی طرف سے ظہور میں آئی ہیں اور ان میں آدمی کی اپنی مرضی کا دخل نہیں ہوتا۔“

”میں نے سنا ہے، آپ کے گورو صوفی عبدالجبار نے بتایا تھا کہ آپ کے ہاتھ پر تین ریکھائیں ہیں۔“

”ریکھائیں تو ہیں مگر اس سے مجھے اپنے ہاتھ کی ریکھاؤں کی بجائے ان لکیروں سے زیادہ دلچسپی ہے جو قدرت کے زبردست ہاتھ نے ساؤ گاری کے ارد گرد کھینچ رکھی ہیں، میں نے اندر کے سؤرگ کی بات اس لئے نہیں کی تھی کہ اپنی محبتوں کا جواز نکالوں۔“

وہ میری بات سن کر حیران ہوئی۔ ”پھر؟“

”میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ساؤ گاری میں بھگوان کی ہر نرنگی کنواری کیوں ہوتی ہے؟“

”یہ بھی کوئی معلوم کرنے کی بات ہے۔“ اس نے ایک خوبصورت فلسفہ پیش کیا۔ ”کنوار پن پوترتا کا روپ ہے کیشی! اور بھگوان کی ہر نرنگی کو پوتر ہی ہونا چاہیے۔“

”مگر ہر نرنگی کو اندر کے سؤرگ کا سپنا کیوں دکھایا جاتا ہے اور اس سے یہ وچن لیا جاتا ہے کہ وہ سدا کنواری رہے گی تو اندر دیوتا اسے سویکار کر لے گا۔ کیا دھرتی کی کنواریاں بھی اندر سجا میں جاتی ہیں۔“

اس نے میرے سوال کو بڑے غور سے سنا اور لا جواب سی ہو کر بولی۔ ”آپ نے پتاجی سے پوچھ لیا ہوتا۔“

”وہ نہیں بتائیں گے، جس طرح ساؤ گاری میں جینے مرنے کا بھید صرف موت کے بستر پر کھیل جاتا ہے اسی طرح نرنگی کے کوار چھل کی بات بھی ایک راز سربستہ ہے جسے وہ کبھی فاش نہیں کریں گے، مگر میں نے یہ راز جاننے کا تہیہ کر لیا ہے اور جان کر رہوں گا کیونکہ ساؤ گاری کے اسرار کو فاش کرنا اور تجھے یہاں سے نکال کر لے جانا میرا آدرش ہے۔“

سندر متی نے حیرت اور شوق کی نظروں سے مجھے دیکھا، سمجھ گئی میں نے اس سے، سروپ جی سے جو وعدہ کر رکھا ہے اسے بھولا نہیں بلکہ اسی کو پورا کرنے میں کوشاں ہوں، رات میرے ہڈیاں یا اندر کے آدمی نے سب کو بتا دیا تھا کہ ساؤ گاری کا انت ہونے والا ہے اور آج میرا ذہن اس کھوج میں تھا کہ دھرتی کی کوئی نرنگی اندر کے سؤرگ میں کیسے جاسکتی ہے؟ وہ کچھ شرمساری ہو کر کہنے لگی۔

”میں شنا چاہتی ہوں کیشی! آپ کچھ اور پوچھ رہے تھے میں کچھ اور سمجھ بیٹھی اور بات جل پنا اور منجوری تک پہنچا دی۔“

میں اسے مزید شرمسار نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے بات بدل دی۔

”تو پیگو کے ساتھ آ رہی تھی پھر پتاجی رپا کیا لے گئے تھے۔“

”انہیں تو دادا نے کسی زمیندار سے ملنے بھیجا تھا۔“

”کیوں؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”تو جو آگئی ہے۔“

اس کے چہرے پر بہاریں کھل گئیں اور رتناگری کی ہوا کا جھونکا اس کے بکھرے بالوں کو چھوٹا گزرنے لگا۔



ٹھیک نو بجے کھانے کے کمرے میں پہنچا تو سردپ جی مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”ارے کیشپ بیٹے! میں تو سوچ رہا تھا تم ابھی سو رہے ہو گے اور ناشتہ کر کے تمہیں دیکھنے جاؤں گا۔“

”میری طبیعت رات ہی ٹھیک ہو گئی تھی، پتا جی! جب طبیعت ٹھیک ہو آدمی بستر پر کیوں پڑا رہے۔“

”رات کا یا پلتھا اور وشال رائے بڑے پریشان تھے تمہارے لئے۔“ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ ”تم سو گئے تھے ورنہ انہیں بلا لیتا۔“

”ناشتہ کے بعد خود ان سے مل لوں گا۔“

اسی اثناء میں سندرمی داخل ہوئی اور شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ ”پتا جی! کل تو اتنا بخار تھا کہ اپنا ہوش نہ رہا، یہ ایک دن اور آرام نہیں کر سکتے؟ میں نے کہا تھا ناشتہ اپنے کمرے ہی میں کر لیں مگر کہنے لگے ناشتہ تو پتا جی کے ساتھ کروں گا۔“

”اری مرد کی طبیعت ٹھیک ہو تو کمرے میں بند نہیں رہتا پھر میرا بیٹا تو شیر مرد ہے۔“ سندرمی نے کن اکھیوں سے مجھے دیکھا غالباً شیر مرد کی ترکیب پر خوش ہوئی تھی، پیگو مہمانوں کے لئے بھوجن لے کر نیچے گیا تھا، ناشتہ تارا ہی لے کر آئی، اس نے ایک پلیٹ میرے آگے رکھ دی اور بولی۔ ”دلیہ ہے صاحب! مالکن نے بنایا ہے آپ کے لئے۔“

”تارا! تم سب کچھ خود بناتی اور نام مالکن کا لگا دیتی ہو۔“

”دیکھا پتا جی! سندرمی تڑپ اٹھی، یہ سمجھتے ہیں جیسے مجھے کھانا بنانا آتا ہی نہیں۔“

”آتا کیوں نہیں؟“ میں نے جواب دیا۔ ”بائی پارہ میں تیرے ہی ہاتھ کا پکا کھانا تارا رہا ہوں۔“

”تو پھر یہ دلیہ بھی میں نے بنایا ہے، تارا نے نہیں۔“

”جی بیٹھا زیادہ ہے۔“

”آپ کے جیون میں مٹھاس گھول دینا چاہتی ہوں۔“

تارا ایک طرف کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھیں، میں نے کہا۔ ”اری تارا! تم بھی بیٹھو نا، ہمارے ساتھ مل کر کھاؤ۔“

تارا گھبرا گئی، سردپ جی نے میری تائید کی۔ ”ہاں، ٹھیک تو کہا ہے کیشپ نے۔“

”کون ہے وہ زمیندار جس سے دادا کو اس عمر میں بھی دلچسپی ہے۔“

”آپ سن کر حیران ہوں گے کیشی! وہ زمیندار اس پر یوار کا وارث ہے، جسے تین صدیاں پہلے ہمارے جلد اعلیٰ گوچی ساؤ نے اپنی آدمی زمینیں دان کر دی تھیں۔“

یہ انکشاف واقعی حیران کر دینے والا تھا، میں فرط تعجب سے بستر پر اچھل سا گیا اور پوچھا۔ ”مگر گوچی ساؤ نے جو زمینیں دان کی وہ تو بائی پارہ میں تھیں، رپا میں نہیں۔“

”زمینیں تو آج بھی بائی پارہ میں ہیں مگر ایک صدی پہلے وہ پر یوار رپا میں آ بسا تھا اور اب وہیں رہتا ہے۔“

سندرمی نے ایک عجیب اور حیرت انگیز بات سنائی تھی جس نے سوچ کے نئے دوار کھول دیے۔ چند صدیاں پہلے گوچی ساؤ نے اسی پر یوار کی ایک کنواری لڑکی کی عزت لوٹنا چاہی جو چند دنوں میں دلہن بننے والی تھی، اس نے لڑکی کے باپ کو مار ڈالا جس پر نردوش لڑکی نے گوچی ساؤ کو شراب دے کر خودکشی کر لی اور اپنی عزت بچا کر لے گئی۔ میں نے سوچا ممکن ہے گوچی ساؤ کے مرنے یا ایک نسل گزر جانے کے بعد دونوں خاندانوں میں میل ملاپ ہو گیا ہو۔ ان کے آپس کے تعلقات بڑھ گئے ہوں، اس بارے میں سندرمی سے پوچھا تو بولی۔

”مرنے والی لڑکی کے پر یوار اور ساؤ خاندان میں کوئی سمبندھ کوئی واسطہ نہیں۔ ایک نسل آتی اور دوسری جاتی رہی مگر دونوں خاندانوں کا کوئی لگاؤ نہیں ہو سکا بلکہ اس پر یوار کی ہر آنے والی نسل ساؤ خاندان سے نفرت کرتی ہے اور نفرت کی یہ دیوار آج بھی کھڑی ہے۔“

یہ ایک اور چونکا دینے والا انکشاف تھا، میری حیرت بڑھنے لگی۔

”پھر دادا نے پتا جی کو اس پر یوار کے وارث سے ملنے کیوں بھیجا؟“

”یہ میں نہیں جانتی کہ پتا جی وہاں کیوں گئے تھے مگر سنا ہے پہلے بھی کئی بار جا چکے ہیں۔“

”کیا اس پر یوار کا وارث یا کوئی آدمی کبھی ساؤ گاری میں آیا؟“

”میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے کسی کو آتے نہیں دیکھا۔“

یہ بات مزید حیرت انگیز تھی کہ وہ پر یوار تو ساؤ خاندان سے میل جول پسند نہیں کرتا مگر سردپ جی اس پر یوار کے چکر کاٹتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ پرانی نفرت کو ختم کرنے اور میل جول رکھنے کی کوشش کرتے ہوں اور اب بھی دادا نے سردپ جی کو اس لئے بھیجا ہو کہ نفرت ختم ہو سکے تاہم یہ معاملہ کافی عجیب اور پراسرار لگتا تھا، اب میں اس پر بھی غور کرنے لگا تو سندرمی نے کہا۔

”کیشی! ان سب باتوں کو بھلا کر آپ کچھ دیر اور آرام کر لیں نہیں تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

”اب میری طبیعت خراب نہیں ہوگی۔“

”نہیں مالک میں بعد میں کھالوں گا۔“

”کل بھی نہیں مانتی تھی پتا جی! میں نے زبردستی بٹھایا تھا۔“

سندرمتی جانتی تھی میں نوکر اور مالک میں تمیز نہیں کرتا، کہنے لگی۔ ”تارا! صاحب جو کچھ کہتے ہیں مان لے۔“

وہ چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ہمارے ساتھ مل کر کھانے لگی میرے من کو بڑا آئند ملا۔ کھاتے کھاتے اچانک سندرمتی کا جی خراب ہوا، ابکائی سی آئی اور وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف بھاگی۔ سروپ جی پریشان ہو گئے۔ مجھے کہنے لگے۔

”تم ٹھیک ہوئے تو اب اسے ابکائی آنے لگی۔ شاید بخار بھی ہو جائے۔“

تارا فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”گھبراؤ نہیں مالک! بیاہ کے بعد عورت کو ابکائی آیا کرتی ہے“ اور یہ سنسنی خیز انکشاف کر کے اپنی مالکن کے پیچھے بھاگ گئی۔

سروپ جی معاملے کی نوعیت سمجھ کر چپ ہو گئے، مگر ان کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا، ان کے لئے یہ ایک بہت بڑا مژدہ تھا، یک لخت وہ کھڑے ہو گئے اور جھولی پھیلا کر آکاش کی طرف دیکھنے لگے پھر میں نے ان کی کپکپاتی، تھر تھراتی آواز سنی۔

”بھگوان میرے یہ بچے تیری امانت ہیں۔ انہیں خوشیاں دینا، ان کی ہر آشاپوری کرنا، میری طرح انہیں دکھوں اور غموں کے زنگ میں نہ جھونک دینا۔“

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور چپ چاپ سے باہر نکل گئے، میں نے انہیں جاتے دیکھا۔ وہ زینے کی بالکونی کی طرف جانے کی بجائے اندرونی راہداری کی طرف مڑ گئے اور میں سمجھ گیا۔ دادا کو خوشخبری دینے گئے ہیں کہ سندرمتی امید سے ہے۔ ساؤ پر یوار کی آئندہ نسل کا انحصار اسی پر تھا، وہی اس خاندان کی ساری تمناؤں کا مرکز تھی، سروپ جی کی کوئی زینہ اولاد نہیں تھی، بس لے دے کے ایک سندرمتی تھی اور ان کے بعد اسی کو اپنے پرکھوں کی رسیں اور رواج پورے کرنا تھے۔

بڈھا سا گر ساؤ بھی سروپ جی کی بجائے سندرمتی پر زیادہ توجہ دیتا تھا، اس نے اپنی پڑپوتی کو ایک دیوی کی سی تربیت دی تھی، اس کے من میں اولاد کا شدید جذبہ اور لگن بھی پیدا کی تھی، میں پیچھے کہیں بتا آیا ہوں کہ ماں بننے کی خواہش تو ہر عورت میں ہوتی ہے مگر سندرمتی میں یہ خواہش عام عورتوں سے کہیں زیادہ بلکہ بے پناہ تھی، بچے کی یہ بے پناہ خواہش دادا ہی کی تربیت کا نتیجہ تھی۔ بڈھا اپنی پڑپوتی کو پھلتا، پھولتا اور ماں بننے دیکھنا چاہتا تھا تا کہ ساؤ خاندان سروپ جی کے نام پر ختم نہ ہو جائے، اسی مقصد کی خاطر اس نے سندرمتی کو ایک مکمل عورت کے سانچے میں ڈھالا تھا اور اب اس کی تربیت کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔

اجل بدوش بڈھا ساؤ خاندان کا بھیا نک ماضی تھا، سندرمتی ایک حسین مستقبل تھی، پھلنے پھولنے والی شاخ، جسے پہلا پھل لگا تھا، میں سوچنے لگا، دادا یہ خبر سن کر خوشی سے جھوم اٹھے گا کہ ساؤ خاندان کا نیا وارث اس کی پڑپوتی کے پیٹ میں پرورش پا رہا ہے۔

یہی سوچتا میں بھی اٹھا اور باہر کی جانب ہولیا۔ زینہ اترتے سے ٹانگوں میں نقاہت محسوس ہوئی، کل کے بخار نے واقعی مجھے کمزور کر دیا تھا پھر بھی بڑے حوصلے سے چلتا کایا موسا اور وشال رائے کے کمرے میں پہنچا، انہوں نے مجھے دروازے سے داخل ہوتے دیکھا تو حیران سے کھڑے ہو گئے۔ میرا چہرہ اتر اتر اتر تھا، وشال رائے بولا۔

”کیشپ بابو! تم کیوں آئے، اپنے کو اوپر بلا لیتے۔“

”میرے آنے سے کیا ہو گیا؟“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا من ٹھیک نہیں۔ مدایا بھکشو نے ہمارے کو بتایا تھا، کل تمہارے کو بخار میں غش آ گیا میں نے اور کایا پٹھانے اوپر جانے کو بولا مگر سروپ جی نے آپ آ کر ہمارے کو بول دیا کہ کیشپ کو نیند آ گئی ہے، اب جگنا ٹھیک نہیں۔ کایا سے پوچھ لو رات اپنے کو کیسی چلتا لگی رہی۔“

”وشال جی! میری چنتا تم لوگ نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا مگر بیماری بیٹھی نہیں رہتی، اپنی بھیک لے کر چلی جاتی ہے، اب میں ٹھیک ہوں۔“

”پراپنے کو ابھی ٹھیک نہیں لگتے، کیشپ بابو!“

کایا موسا نے بھی اس کی تائید کی۔ ”کیشپ بیٹے! تمہیں ایک دودن آرام کرنا چاہیے۔“

”آرام کا شہد سنتے سنتے تو نیچے آ گیا ہوں کایا موسا! کام کی بات کرو۔“

”سروپ جی رات ہی لوٹے ہیں، آج ان سے بات کر لیں گے، وہ گنجال کو ڈھونڈنے میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں۔“

ٹھیک اسی لمحے سروپ جی بھی آ گئے۔ انہوں نے کایا پٹھانے کی بات سن لی تھی، کہنے لگے۔

”دادا نے پھر کہا ہے گنجال جہاں بھی ملے اسے ڈھونڈ کر ساؤ گاری میں لاؤ، اب میں اسے ڈھونڈنے تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

وشال رائے نے ایک بات کی وضاحت چاہی۔ ”سروپ جی! وہ پاپی روپ تارا کا قاتل ہے، کایا پٹھانے کا دوستی ہے، دادا بولتا ہے اسے ساؤ گاری میں لاؤ، پراپنے کو اتنا بول دو کیا دادا ہمارا نیائے کرے گا؟“

”نیائے تو تبھی ہو گا جب گنجال واپس آ جائے۔“

اب مجھے انکشاف کرنا پڑا۔ ”پر وہت گنجال کبھی واپس نہیں آئے گا۔“

وہ سب لوگ حیران رہ گئے، میں نے بتایا۔ ”کل رات وہ ساؤ گاری کی گھا میں تھا، میں

وہاں پہنچا تو بھاگ گیا۔“

سروپ جی حیران ہوئے۔ ”ساؤ گاری میں تو کوئی گپھا نہیں۔“

”بتا جی! میں خود گیا ہوں وہاں، صندل کا دروازہ ہے گپھا کا اور اس کا راستہ باؤلی کی سرنگ میں کھلتا ہے، گنجال اسی راستے بھاگا تھا، میں پیچھا اس لئے نہ کر سکا کہ انا تھ بن کا بوڑھا شیش ناگ سرنگ میں اس کی چوکیداری کر رہا تھا۔“

اس انکشاف نے سروپ جی کو اور پریشان کر دیا، میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”کیشپ بیٹے کہیں تم نے کوئی سنا تو نہیں دیکھا۔ تارا کہتی تھی، کل رات تم نیند میں چلتے رہے ہو۔“

”آئیے میرے ساتھ، میں دکھاتا ہوں آپ کو گپھا۔“

ہم سب اٹھ کر باہر آ گئے، دوسرے کمرے سے چان، کالی ناتھ، کریم اور مدایا بھکشو بھی نکل آئے۔ وشال رائے نے اپنی دو نالی بندوق اٹھالی تھی، سب میرے پیچھے پیچھے عمارت کے رہائشی حصے سے نکل کر باؤلی تک آئے۔ سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں پہنچے تو اس کی پیچھی دیوار میں وہ شکاف ابھی کھلا تھا جو دراصل گپھا کا خفیہ دہانہ تھا، اس کی سل شکاف کی دوسری جانب پڑی تھی، سروپ جی شکاف دیکھ کر ہکا بکا سے رہ گئے، وہ ایک تنگ وتار یک سرنگ کا دہانہ تھا، وشال رائے نے نارنج کی روشنی میں نئی سرنگ کا جائزہ لیا، میں نے بتایا۔

”یہی گپھا کا راستہ ہے میں نے شیش ناگ کو اسی شکاف سے اندر جاتے دیکھا تھا، ہو سکتا ہے وہ باہر نکل گیا ہو، ہو سکتا ہے اندر ہو۔“

نارنج کی روشنی میں چان اپنی بندوق لے کر اندر گھس گیا، پیچھے پیچھے کالی ناتھ اور کریم اپنی کلہاڑیوں سمیت داخل ہوئے پھر ہم نے سرنگ میں قدم رکھا اور آگے بڑھے، سرنگ کالی طویل تھی اس کا خاتمہ صندل کے دروازے پر ہوا جو کھلا ہوا تھا آگے وہ گپھا تھی جس میں پردہت گنجال غائب رہتا تھا، وشال نے گپھا میں روشنی ڈالی، سب نے اسے دیکھا بھالا مگر سانپ کہیں نظر نہ آیا، سامنے ایک محراب میں بھگوان بدھ کی جوانی کے ایام کی مرمریں مورتی رکھی تھی، اس کے پیچھے گپھا تھوڑا سا خم کھا کر پورب کو مڑ گئی تھی، وہاں ایک چوبی تخت نظر آیا غالباً گنجال اسی پر بیٹھ کر گیان دھیان لگاتا اور تپسیا کرتا تھا اس تخت کے پیچھے گپھا کی دیوار کے ساتھ ساؤ پر یوار کے بانی گوچی ساؤ کی قد آدم مورتی نصب تھی اور سامنے کی دیوار پر سوم دیوتا کا دینا ہی چتر لٹک رہا تھا جیسا پٹاما پجاری نے مجھے دیا تھا کہ میں پردہت گنجال کو لوٹا دوں، اس چتر کے اوپر اندر دیوتا کی مورتی بھی دکھائی دی۔

یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا، ہمارے ساتھ سروپ جی بھی دم بخود رہ گئے، گپھا اسرار کا حیرت کدہ تھی، دوسری جانب صندل کا ایک اور دروازہ تھا جو بند تھا، اسے کھولا تو سرنگ نما راستہ دکھائی

دیا۔ ہم گپھا سے نکل کر اس سرنگ میں ہوئے جو زیادہ طویل نہیں تھی جہاں راستہ ختم ہوا وہاں ایک بڑی سل کسی شکاف کی نشان دہی کر رہی تھی کالی ناتھ نے وہ سل ہٹا دی تو ایک موکھا سا نکل گیا، ہم اس موکھے میں گھسے تو سامنے ایک گول زینہ تھا، زینہ ایک دیوار پر ختم ہوا جس کی چوڑی سل ہٹانے سے آتش دان کا شکاف کھل گیا، اس سے گزر کر ہم ایک کمرے میں پہنچ گئے اور وہ کمرہ پردہت گنجال کا تھا۔

سروپ جی پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، یوں لگتا تھا کسی طلسم کدہ حیرت کی سیر کر رہے ہوں، ہم اس کمرے سے نکل کر راہداری میں آ گئے جو مندر کے عقب میں واقع تھی اور پچھلے دروازے سے مندر میں داخل ہوئے جہاں صرف دو سادھو بھگوان بدھ کے دیو ہیکل مجسمے کے سامنے پوجا پاٹ میں مگن تھے اور یہ وہی سادھو تھے جو سروپ جی کے انت کال کی گھڑی میں آخری رسومات کی ادائیگی کے لئے پردہت گنجال کے ساتھ تھے، کواڑ کے کھٹکے اور ہمارے پیروں کی آہٹ سے ان کی پوجا میں کھنڈت پڑ گئی، میں نے سروپ جی سے سرگوشی کی۔

”صرف یہی دو سادھو بتا سکتے ہیں کہ گنجال بھاگ کر کہاں گیا ہوگا۔“

سادھو نے پرنام کیا اور سروپ جی نے بڑے سادھو سے پوچھا۔

”رنگا! پردہت گنجال کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو۔“

”نہیں مالک! بڑھے سادھو نے جواب دیا۔“ پردہت جی تو اسی رات سے دکھائی نہیں

دئے، جس رات مندر میں جھگڑا ہوا اور وہ اپنی شکتی کے بل بوتے جان بچا کر نکل گئے تھے۔“

”ہولہ! اب انہوں نے چھوٹے سادھو کو مخاطب کیا۔“ کیا تم جانتے ہو؟“ اس نے زبان ہلانے کی تکلیف بھی نہ کی صرف انکار میں سر ہلا دیا۔

”اچھا پوجا پاٹ کرو۔ میں تم سے پھر مل لوں گا۔“

یہ کہہ کر سروپ جی مندر کے بڑے دروازے کی طرف ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے ہم بھی مندر سے باہر آ گئے، انہوں نے کایا پتھا، وشال رائے، چان، کالی ناتھ، کریم، مدایا اور میری موجودگی میں گنجال کے بارے میں پوچھ کر اچھا نہیں کیا، وہ تو ہمیں گنجال کا دشمن سمجھتے تھے پھر اس کا ٹھکانہ کیسے بتاتے میں نے چلتے چلتے سروپ جی سے کہا۔

”آپ کو سادھوؤں سے کچھ پوچھنا تھا تو علیحدگی میں پوچھتے۔“ انہوں نے بھی بھانپ لیا

تھا کہ بات بگڑ گئی ہے مگر کہنے لگے۔ ”کل اکیلا ہی ملوں گا۔“

وہ پردہت گنجال کی وجہ سے خاصے پریشان تھے اور اب کچھ سوچ نہیں رہا تھا کہ کیا کریں، کیا نہ کریں، ہم کایا پتھا اور وشال رائے کے کمرے میں لوٹ آئے۔ زیر زمین گپھا کی دریافت ان کے لئے ایک طرفہ تماشا تھا، وشال رائے بولا۔ ”سروپ جی! میرے کو اس بات پر حیرانی

ہے کہ تم ساؤ گاری کے مالک ہو اور تمہارے کو یہ بھی پتہ نہیں یہاں کوئی گکھا ہے، پر گنجال سب کچھ جانتا ہے۔

وہ چپ رہے اور میں نے خیال ظاہر کیا۔

”گنجال کو گکھا کا پتہ دادا نے دیا ہوگا۔“

یہ سنتے ہی سرورپ جی کھڑے ہو گئے اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔ ”دادا سے پوچھتا ہوں جا کر۔“

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر وشال رائے بولا۔

”میرے کو تو یوں لگتا ہے اب وہ ادھر نہیں آئے گا اور اپنے کو اس کا شکار کھیلنے کے لئے ساؤ گاری سے نکلنا ہوگا۔ آگے تم بول دو کیشپ بابو! تمہارا من کیا بولتا ہے۔“

”ہم تو یہاں گنجال کے پیچھے آئے تھے وہ نکل گیا تو ہمارا ٹھہرنا بے کار ہے۔“

”بالکل ٹھیک بولا ہے تم،، ہمارے کو بھی نکلنا چاہیے۔“

اچانک مجھے خیال آیا، آج سویرے سے شاستر کی شکل تک نظر نہیں آئی، ہم زیر زمین سرنگوں اور گکھا سے بھی ہو آئے مگر وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا، اس خیال سے کہیں بیمار نہ پڑ گیا ہو، میں اس کے کمرے کی طرف ہولیا۔

شاستر کا حجرہ نما کمرہ چھمی غلام گردش میں مندر کے پاس ہی تھا، میں وہاں پہنچا تو دروازہ اندر سے بند تھا، دوسری دستک پر کواڑ کھلے اور وہ آنکھیں ملتا، میرے سامنے کھڑا تھا، کچھ تھکا تھکا، بجھا بجھا، ٹوٹا ٹوٹا نظر آیا۔ ”ارے تو اب تک سو رہا تھا۔“

”آؤ پر بھو! اندر آ جاؤ۔“

اچانک ایک کونے سے باریک سی آواز سنائی دی۔

”آؤ پر بھو..... آؤ پر بھو!..... اندر آ جاؤ.....“ یہ بنگالی مینا تھی، میں اندر داخل ہوا تو پناک سے بولی۔

”گڈ مارننگ سر!“

گڈ مارننگ مینا! اچھی ہو!

”اچھی ہو..... اچھی ہو..... اچھی ہوں۔“

میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، یہ مینا کئی بھاشائیں بولتی، بات پکڑنے اور بات کرنے میں بڑی ہوشیار تھی، میں نے بولنے والے پرندوں میں ایسی صلاحیت بہت کم دیکھی ہے وہ تو رٹے رٹائے جملے بولتے اور انہی کو دہراتے رہتے ہیں، مگر بنگالی مینا جو الفاظ سنتی انہیں فوراً دہراتی اور انہی سے

جواب بھی پیدا کر لیتی تھی، اس کی حاضر جوابی پر میں حیران رہ جاتا تھا، شاستر سے پوچھا۔

”جب تو سرورپ جی کے ساتھ رہا گیا، مینا کو کہاں چھوڑ گیا تھا؟“

”اسے کہاں چھوڑتا، میرے ساتھ ہی گئی تھی پر بھو!“

مینا نے فوراً تائید کر دی۔

”ساتھ ہی گئی تھی پر بھو!“

مینا کے پنجرے کو ہلکا سا جھولا دیتا میں آگے بڑھا اور کھاٹ پر بیٹھ گیا تو شاستر نے پاس پڑی چوکی سنبھال لی۔ ”ارے شاستر! میں اتنا بیمار تھا اور تو سویرے میرا حال تک پوچھنے نہیں آیا، پریشان ہو کر میں خود چلا آیا تجھے دیکھنے۔“

وہ اپنی منطق بگھارنے لگا۔

”شما کرنا پر بھو! آپ کا حال پوچھنے نہ جاسکا مگر آپ مجھے دیکھنے آ گئے ہو تو اس کا مطلب

ہے، آپ ٹھیک ہو اور ٹھیک ہونے کا مطلب یہ ہے تپ اتر گئی، بخار ٹوٹ گیا، بیماری جاتی رہی،

جی تو مجھے دیکھنے آئے ہو۔“

”ہاں میں تو اچھا ہو گیا مگر لگتا ہے تو بیمار پڑ گیا، آدھے دن تک سوتے رہنا بھی بیماری ہے۔“

”دور اتوں کا جاگا ہوا تھا، بڑی مشکل سے آج سویرے آنکھ لگی اور اب آپ نے آ کر

جگایا ہے۔“

میں چونکا۔ ”دور اتیں کیوں نہیں سوئے، کیا نائٹ دیکھتے رہے ہو کوئی۔“

”پر بھو! یہ جیون بھی تو نائٹ ہی ہے، آنکھ چھلکی تو کھیل ختم۔“

”ارے سیدھی طرح بتا، نیند کیوں نہیں آئی تھی؟“

”یہ جو کھوپڑی ہے نا پر بھو!“ اس نے اپنے سر پر انگلی ماری۔ ”اس کے اندر کئی کوٹھریاں ہیں

ان کوٹھریوں کی کواڑ کے بند ہوں تو نیند آتی ہے۔ کواڑ کھلے رہ جائیں تو نیند نہیں آتی۔“

”اس کا مطلب یہ ہے تو دور اتیں کچھ سوچتا رہا ہے، جی تیری کوٹھریوں کے کواڑ کھلے رہے

ان دور اتوں میں سے ایک رات تو نے رہا میں، دوسری ساؤ گاری میں جا گئے کاٹی، بول تیری

پریشانی کا کارن کیا ہے؟“

کبھی کبھی آدمی کسی کارن، کسی وجہ کے بغیر بھی تو پریشان ہو سکتا ہے۔“

”تو وجہ کے بغیر بھوجن بھی نہیں کرتا، بھوک لگتی ہے تو بھوجن کرتا ہے، پھر کسی وجہ کے بغیر

پریشان کیسے ہو سکتا ہے۔ آج الٹی منطق کیوں چلا رہا ہے شاستر!“

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”یہ منطق کیا ہوتی ہے پر بھو!“

ارے سنسار میں ہر بات کا کوئی کارن ہوتا ہے، ایک واقعہ دوسرے واقعے کو جنم دیتا ہے۔“

میں سروپ جی کی بات سن کر من ہی من میں کٹ کر رہ گیا کہ اپنا گھر بسانے کے لئے سندر متی سے بھی انیائے کر رہے ہیں جو ساؤ خاندان کی زمینوں اور جائیداد کی وارث ہے، میں انہیں ایسا آدمی نہیں سمجھتا تھا مگر وہ اس بات کو بھی بھول رہے تھے کہ جو بوڑھا جوان عورت کی دنیا میں

”دادا کا حکم ملتے ہی ہم نے رپا کی طرف بڑا تیز سفر کیا تھا، شام سے پہلے وہاں پہنچ گئے، مالک نے سائیسوں کو تو بودھ سرائے میں بھیج دیا اور مجھے لے کر میگھا کے گھر پہنچے۔ میگھا ہی نام ہے، اس زمیندار کا۔ وہ بڑے اوپرے من سے ملا، مالک مجھے گیٹ پر چھوڑ کر اس کے ساتھ صحن

جاتا ہے سدا کے لئے اس کا داس بن جاتا ہے کیونکہ جوانی بڑھاپے کے پیروں میں بیڑی ڈال دیتی ہے مگر میں نے جو کچھ سنا، جو کچھ سمجھا، معاملہ اس سے کہیں زیادہ بگڑا ہوا اور شرمناک تھا کیونکہ میگھانے جواب میں جو بات کہی وہ میرے کانوں نے تو کیا آج تک دھرتی کے کانوں نے بھی نہیں سنی ہوگی، میں تو سر سے لے کر پاؤں تک کانپ اٹھا اور دھرتی میرے پاؤں تلے کانپ گئی اور ایسا لگا کہ آکاش سے پاتال میں گر گیا ہوں، میگھا کا ہر شبد موت کی ٹھنڈی لہر بن کر میرے شریر میں اتر گیا اور یہ کہا تھا میگھانے۔

”تم اپنی زمینوں اور حویلی اور روپے پیسے کا لو بھدے کر ایک سو چالیس برس کے بڈھے کھوسٹ کے لیے بر مانگ رہے ہو تمہیں بے وقوف سمجھوں یا پاگل؟“

یہ الفاظ میرے ذہن میں بارود کے دھماکے کی طرح پھٹے، ان کا کڑا کا کالے پہاڑ پر گرنے والی بجلیوں کی کڑک سے کہیں زیادہ بھیاںک اور ہولناک تھا، میں اچھل کر اٹھا، معلوم ہوتا تھا میرا ذہن بھی کہیں اڑ گیا یا گر گیا ہے۔ چند گھڑیاں حوصلے باختہ کھڑا شاستر و گود دیکھتا رہا پھر کہا۔

”سروپ جی نے دادا کے لئے چندا کا بر مانگا ہو، مجھے دشواں نہیں آتا۔“

”پہلے مجھے بھی دشواں نہیں آیا، پر بھو! مگر آپ بیٹھو تو کچھ آگے کہوں۔“

میں ہکا بکا سا پھر کھاٹ پر بیٹھ گیا اور شاستر و بتانے لگا۔

”سروپ جی نے صاف صاف کہہ دیا۔“ دادا تو موت کے دروازے پر کھڑے ہیں، ان کے جیون کی ڈور ٹوٹے ہی چندا آزاد ہوگی اور تم اس کا دوسرا بیاہ کر سکتے ہو۔“

یہ سن کر میگھا بھڑک اٹھا۔ ”سروپ ساؤ! مجھے سنتے شرم آگئی تمہیں کہتے شرم نہیں آئی، اگر بھگوان کا ڈر نہیں تو سنسا رہی سے ڈرو۔“

سروپ جی نے بے چارگی سے کہا۔ ”یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں، تم بھی سمجھتے ہو کہ بر ایک دکھاوا ہے، ہمارے تمہارے پر یواروں میں دشمنی ایک لڑکی سے چلی تھی کیوں نہ اس دشمنی کا انت بھی ایک لڑکی پر ہو۔ میں چندا کے روپ میں تم سے بلیدان مانگتا ہوں اور اپنی ساری جائیداد کا بلیدان دیتا ہوں۔“

میں نے محسوس کیا کہ کمرے کے اندر میگھا بڑے غصے سے کھڑا ہو گیا کیونکہ وہ کہہ رہا تھا۔ ”سروپ ساؤ! اس سے پہلے میں کسی نوکر کو بلاؤں یہاں سے چلے جاؤ اور پھر کبھی ایسی نیچ بات سوچنا بھی نہیں۔“

میں سمجھ گیا کہ نائک ختم ہو رہا ہے دے پاؤں بھاگ کر گیٹ پر چلا آیا، جہاں مالک مجھے چھوڑ گئے تھے، ایک دو پل میں وہ بھی کمرے سے نکل کر آگئے اور ان کے پیچھے دروازے کے پٹ دھماکے سے بند ہوئے جیسے بادل آپس میں ٹکرائے ہوں۔ ہم بودھ سرائے کی طرف چل

پڑے، مالک بڑے بچھے بچھے تھے۔ راستے میں نہ انہوں نے کوئی بات کی نہ میں نے کچھ پوچھا، البتہ من ہی من میں ان باتوں پر حیران ہو رہا تھا جو میں نے اتفاق سے سن لی تھیں۔

بودھ سرائے میں پہنچے تو سندرمستی اور پیگو جو بائی پارہ سے آئے ہماری راہ دیکھ رہے تھے کیونکہ سائیسوں نے مالک کے آنے کی خبر دے دی تھی، وہ دونوں سروپ جی کو بھلا چنگا دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ پیگو ان کی خطرناک بیماری کی خبر لے کر گیا تھا اور سندرمستی اپنے پتا کے آخری درشتوں کے لیے ساؤ گاری جا رہی تھی مگر سروپ جی کو دیکھا تو ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ پھر وہ تو بیٹی کو اپنی بیماری، انت کال، آپ کے آنے اور پرارتھنا کرنے کے حالات سناتے رہے اور میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر ڈھیر ہو گیا اور ساری رات نیند نہ آئی، ذہن کی کوٹھڑیوں میں ساگر ساؤ جی کا بھوت بوڑھا بلا بن کر ناچتا گھومتا رہا، تو پر بھو! ایک نائک تو یہ تھا جو میں نے رپا میں دیکھا اور سنا مگر دوسرا نائک ساؤ گاری میں آ کر دیکھا، کیونکہ جب ہم رات ہوتے ہی یہاں پہنچے، آپ بستر پر بیمار پڑے تھے اور بخار کی گرمی میں چیتاؤنی دے رہے تھے کہ ساؤ گاری راکھ کا ڈھیر ہو جائے گی۔

یہ کہتے ہی آپ بے سدھ ہو کر بستر پر گر پڑے اور سروپ جی نے ہم سب کو باہر نکال دیا، میں اپنے کمرے میں آ کر سب باتیں بھلا دینا اور سو جانا چاہتا تھا مگر نہ کوئی بات بھلا سکا نہ سو سکا، ساری رات سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا، آپ کہتے ہو میں نائک دیکھتا رہا ہوں، تبھی سو نہیں سکا جو نائک ہوا، میں نے آپ کو سنا دیا اب مانویا نہ مانویہ آپ کی مرضی۔“

شاسترو کی کہانی حیرت انگیز ہی نہیں، ناقابل یقین بھی تھی، اگر رات سندرمستی سے یہ نہ سن چکا ہوتا کہ سروپ جی رپاکس سے ملنے گئے تھے تو شاستر و کو فائر العقل سمجھتا مگر اس نے جو کچھ بتایا جو کچھ سنایا وہ غلط نہ تھا اور اب میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جاتا تھا اگر سروپ جی دو خاندانوں کی پرانی دشمنی ہی ختم کرنے گئے تھے تو بھی 140 برس کے بڈھے بھوت کے لیے 16 برس کی سندرمستی کی کا بر مانگنا کتنا گھناؤنا فعل ہے، اس سے تو یہی بہتر تھا کہ انہوں نے اپنے لئے بر مانگا ہوتا۔

ایک لخت خیال آیا، چندا بھی ایک گرہن زدہ لڑکی ہے جس کا بر جان بوجھ کر بڈھے ساگر ساؤ جی کے لئے مانگا گیا۔ بھگوان کی نرنکی کے لیے بھی گرہن زدہ کنواری ہونا ضروری ہے اور سروپ جی نے بتایا تھا، گرہن زدہ نرنکی ساؤ گاری کی ضرورت ہے تو کیا ان کنواریوں کا کوئی سمبندھ بڈھے سے ہے۔

کئی دن سے اس کی ذات اور خیالات کے بارے میں عجیب عجیب سی باتیں ذہن میں اڑتی پھر رہی تھیں، جنہیں میں کوئی واضح شکل نہ دے پایا تھا اور اب میگھا کی کنواری اور چاند

خیال کرے گی؟“

وہ مدھم آواز میں بولے۔ ”تمہیں اس بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے، یہ دادا کا ذاتی معاملہ ہے اور ساؤ خاندان کی لڑکیاں ہوں یا داسیاں، دادا کی آگیا کا پالن کرنا اپنا دھرم سمجھتی ہیں۔“
ان کا جواب بڑا حیران کر دینے والا تھا، یعنی بڑھا جو کہہ دے، وہ پتھر پر لکیر ہے اور ساؤ خاندان کی کوئی لڑکی، کوئی داسی اس سے انکار نہیں کر سکتی، میں دم بخود سارہ گیا اور بڑھے ساگر ساؤ جی کی طرف دیکھا تو اس کا جھریوں بھرا سفید بھوؤں اور سفید پلکوں والا چہرہ بھی دھوؤں سا ہوا ہوتا تھا، اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے پلٹ کر سروپ جی سے پوچھا۔ ”دادا کے لئے آپ نے چندا کا براس لئے مانگا کہ اس کے شریر پر چاند گرہن کا نشان ہے، آخر کیا خصوصیت ہے اس نشان کی؟“

اس اثناء میں وہ کچھ سنبھل گئے تھے، بڑھا ہماری باتوں کو سن پایا تھا یا نہیں مگر اس نے سروپ جی کو اشارے سے کچھ سمجھایا تھا اور وہ کہنے لگے۔

”چندا کا براس لئے مانگا کہ وہ اس پر یوار کی دوسری لڑکی ہے جس کے شریر پر چاند گرہن کا نشان لگا ہے۔“

”اور پہلی لڑکی کون تھی؟“

سنوری۔۔ جس نے تین صدیاں پہلے کنار بھونک کر جیو ہتیا کر لی۔“

میرے ذہن میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور جسم کسی درخت کی طرح کانپ کانپ گیا، جیسے یہ انکشاف بھی آندھی کا ایک جھونکا تھا۔ تو سنوری تھا اس کنواری لڑکی کا نام جسے گوچی ساؤ نے اپنی جنسی درندگی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی اور اس کے شریر پر چاند گرہن کا نشان تھا اور اس نے مرتے سے گوچی ساؤ کو شراب دیا تھا۔

اب میں ساؤ گاری سے گرہن زدہ لڑکیوں کا سنبندھ سمجھنے لگا، شاید یہاں ناچ پوجا کا سلسلہ گوچی ساؤ کی آتما کو شراب کی لعنت اور دھتکار سے بچانے کے لئے جاری کیا گیا تھا مگر میں حیران تھا، جب کنواری لڑکیوں کو زبردستی زنتکی بننے پر مجبور کیا جاتا ہے تو گوچی ساؤ کی آتما کو ان کی ناچ پوجا سے کیا سکھ پہنچتا ہو گا تاہم اس سوال کو چھوڑ کر میں نے سروپ جی سے کچھ اور پوچھا۔

”کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ چندا کا ساؤ پر یوار سے ناتا ہو جائے تو دونوں خاندانوں کی پرانی دشمنی جانی رہے گی اور سنوری کا شراب بھی نمٹ جائے گا؟“

”ہاں، یہی سمجھتا ہوں، تین صدیوں کے بعد اس پر یوار کی دوسری لڑکی چاند کے اثر میں آئی ہے، اگر یہ ناتا ہو جائے تو گوچی ساؤ کی آتما سے شراب کا سایہ ٹل جائے گا۔“

گرہن کے نشان والی بیٹی چندا! میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور شاستر کو حیرت زدہ چھوڑ کر بگولے کی طرح باہر نکل آیا، اس کی آواز مجھے غلام گردش میں سنائی دی۔
”کہاں جا رہے ہو پر بھو!“

پھر وہ بھی کمرے سے نکل کر اچھلتا، پھدکتا میرے پیچھے ہولیا، مگر میں رکنا نہیں ٹھہرا نہیں، چتر رہا۔

○

سروپ جی اپنے اجل بدوش دادا سے گھما کے بارے میں پوچھنے گئے اور ابھی تک اس کے تابوت نما کمرے میں موجود تھے کہ میں اس تابوت کا دروازہ کھٹاک سے کھول کر اندر داخل ہوا، وہ مجھے اس طرح ایک ایک کی آتے دیکھ کر پریشان ہو گئے، غالباً بڑھے سے ان کی بات چیت ختم ہو چکی تھی کیونکہ آلہ سماعت ایک طرف پڑا تھا مگر اب میری اور سروپ جی کی بات چیت شروع ہوئی، میں نے جاتے ہی پوچھا۔ ”بتا جی! آپ رپا کسی زمیندار سے ملنے گئے تھے نا۔“

ان پر حیرت کا دورہ پڑا۔ ”ہاں“

”اس زمیندار کا نام میگھا ہے اور اس پر یوار کا وارث ہے جس کی تین صدیوں سے ساؤ خاندان کے ساتھ دشمنی ہے؟“

سروپ جی پر حیرت کا دورہ پڑا۔ ”ہاں، میگھا اسی پر یوار کا وارث ہے۔“

”اور آپ نے میگھا کی لڑکی چندا کا براس مانگا؟“

اب کے ان پر دورہ نہیں پڑا حیرت کی بجائے گری اور کراہتی سی آواز میں بولے۔
”تم سے کس نے کہا؟“

”کسی نے کہا یا نہیں کہا۔ میں نے پوچھا ہے تو جواب دیجئے۔ آپ نے میگھا سے چندا کا بر کیوں مانگا۔“

وہ چپ چاپ، حیران و پریشان سے میرا منہ تنکے لگے۔ بولے کچھ نہیں۔

”خاموشی میرے سوال کا جواب نہیں۔“

مگر وہ پھر بھی نہیں بولے، میں نے بڑھے کی طرف انگلی اٹھائی۔

”نہیں بولتے تو مجھ سے سنے، آپ نے دادا کے لیے بر مانگا۔“

سروپ جی پر دوسری بجلی گری اور اب کے انہوں نے ہاتھ سے اپنا دل بھی پکڑ لیا، معلوم ہوتا تھا، اس انکشاف نے انہیں لرزادیا ہے میں نے کہا۔

”یہ کتنی شرمناک بات ہے، اگر سندرمی کو پتہ چلے کہ آپ اس کے پڑدادا کے لئے سولہ برس کی کنواری لڑکی کا بر مانگتے پھر میں تو کہہ دوں گا۔“

سے گری ہوئی بات ہے۔“

”کیا تم نہیں جانتے ہو ہندوستانی سماج میں ستر ستر، اسی اسی برس کے بوڑھے پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال کی لڑکیوں سے بیاہ رہا لیتے ہیں۔“

”جانتا ہوں، یہ سماج کی ایک کمزوری اور مجبوری ہے، امیری اور غریبی کا کھیل ہے پھر بھی ستر اسی اور ایک سو چالیس برس میں بڑا فرق ہے۔“

”دادا کے لئے چندا کا بر نہیں بلیدان مانگا تھا۔“

”مگر یہ بلیدان آپ اپنے لئے بھی مانگ سکتے تھے، دادا کے لئے کیوں؟“

یہ بات سن کر سروپ جی دم بخود رہ گئے، کوئی جواب نہ دے سکے کیونکہ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب تھا ہی نہیں تاہم انہوں نے جواب تو دیا اور کہا۔

”چاند گرہن سے دادا ہی کا سمبندھ ہے اسی لئے ان کے لئے چندا کا بلیدان مانگا۔ یہ بلیدان کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتا؟“

”کسی اور کے لئے کیوں نہیں ہو سکتا؟“

”اس کے جواب کا سے ابھی نہیں آیا۔“

میں حیران رہ گیا۔ ”آخر وہ سے کب آئے گا۔“

”جب آنند بھکشو والی مورتی ڈھونڈ لو گے۔“

سروپ جی کا یہ جواب قطعی اور فیصلہ کن تھا، میرے ذہن پر ایک ضرب پڑی اور میں سوچنے لگا، کیا ساؤ گاری کے تمام اسرار اسی مورتی میں بند ہیں اور ہر سوال کا جواب اسے ڈھونڈ کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے؟ کتنی عجیب اور حیرت انگیز بات تھی کہ گوچی ساؤ کی آتما سے سنوری کے دیئے ہوئے شراب کی دھتکار دور کرنے کے لئے اسی پر یوار کی لڑکی چندا کا بلیدان مانگا جا رہا تھا اور وہ بلیدان ساؤ خاندان کے کسی اور فرد کے لئے نہیں صرف اجل بدوش بڑھے ساگر ساؤ جی کے واسطے تھا تو پتہ چلا کہ اس سوال کا جواب بھی مقدس مورتی کی تلاش پر مل سکتا ہے۔

میری حیرت و پریشانی کو بھانپ کر سروپ جی، دادا کی طرف پلٹے اور اس کے کانوں میں آلہ سماعت فٹ کر کے بولے۔

”دادا! کیشپ نے کچھ باتیں پوچھی ہیں میں نے کچھ جواب دیئے ہیں مگر اس کا من شانت نہیں ہوا، کیونکہ ساؤ گاری کے سارے بھیدوں کی کجی تو آنند بھکشو والی مورتی ہے، کیشپ کو چندا کے بلیدان والی بات بھی اچھی نہیں لگی۔ اب میں چاہتا ہوں جو بات چیت ہو وہ تم بھی سنو اور اگر میں کچھ جھوٹ کہوں یا مجھ سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو تم مجھے ٹوک دو۔“

دادا نے سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا اور میں بھی سروپ جی کے ساتھ بڑھے کے سامنے

بیٹھ گیا، سروپ نے آلہ سماعت کا مائیک میرے اور اپنے بیچ رکھ لیا تاکہ دادا ہم دونوں کی باتیں سن سکے پھر کہنے لگے۔

”کیشپ بیٹے! سندرمی کے ناتے اب تم ہمارے لہو اور شریہ کا حصہ ہو، سنسار میں دو ہی ناتے سب سے بڑے ہیں۔ ایک بیٹے کا ماں ہے، دوسرا پتی کا پتی سے جس کے لئے وہ دنیا کے سارے دکھ بھوگتا ہے، اسے خوش رکھتا اور نئی نسل کا باپ بنتا ہے، اس لئے جو کچھ میں کہتا ہوں، اسے دھیان سے سنو۔“

میں پہلے ہی بتا چکا ہوں جس مقدس مورتی کی تلاش کا کام میں نے تمہیں سوچا تھا، وہی ہمارے سارے دکھوں کا علاج ہے، تم سندرمی کو، مجھے دادا کو اسے ڈھونڈنے کا وچن دے چکے ہو مگر جب تک مورتی ملتی تم قدم قدم پر کسی نئے اچنبھے سے دوچار ہوتے اور اس کا کارن جاننے کے لئے ضد کرتے ہو مگر جو کچھ جاننا چاہتے ہو وہ گزشتہ تین صدیوں سے اسی طرح سر بمبر چلا آتا ہے اور صرف موت کے بستر پر دوسری نسل کو منتقل کیا جاتا ہے، ساؤ گاری کا کوئی وارث اس بھید کو کھولنے اور بیان کرنے کا ادھیکار نہیں رکھتا، میں اپنے پرکھوں کی طرح اس سے تک اپنے خاندانی بھید اور ساؤ گاری کے اسرار کا رکھوالا اور یہاں جینے مرنے کا پابند ہوں، جب تک مورتی نہیں مل جاتی۔

دادا کے لئے چندا کا بر مانگنا تمہیں اچنبھا لگا اور یہ اچنبھا ہے بھی مگر تم نہیں جانتے یہ اچنبھا ہمارے لیکھوں کی سیاہی مٹا سکتا ہے، میں نے بتایا ہے یہ بر نہیں، ناتا نہیں، بلیدان تھا، جس سے میگھانے انکار کر دیا ہے مگر اس بلیدان میں جو بھید چھپا ہے میں اسے کھول نہیں سکتا، تم مورتی ڈھونڈ لاؤ گے تو یہ بھید بھی جان لو گے کیونکہ کبھی کبھی آدمی چپ رہتے اور مورتیاں بولتی ہیں، ہمارے دکھوں کا حال آنند بھکشو والی مورتی تمہیں بتائے گی۔

شاید تم کہو، میں ایک ہی بات بار بار دہرائے جاتا ہوں، مگر جب سے سنسار بنا ہے، بہت سی باتیں بار بار دہرائی جا رہی ہیں۔ سورج اور چاند ستاروں کے پھیر کی طرح دن رات، اندھیرے اجالے کا چکر بھی شروع دن سے جاری ہے، آدمی پشت در پشت موت کا غم بھوگ رہا ہے، لوگ نسل در نسل دکھوں سے چھٹکارا پانے میں لگے ہیں، مگر کسی پر یوار نے ہماری طرح لگا تار تین صدیوں تک اس ویرانے میں جینے مرنے کا عذاب نہیں بھوگا کیونکہ ہمارا دکھ ایسا ہے جو ایک نسل کے بعد دوسری نسل کو ورثے میں دیا جاتا ہے میں تو اپنے جیون کا بڑا حصہ اسی عذاب میں گزار چکا ہوں، میری عمر کی جھیل میں بہت تھوڑا پانی رہ گیا ہے مگر اس سے پہلے کہ یہ جھیل بالکل خشک ہو، پانی بالکل سوکھ جائے میں چاہتا ہوں ساؤ گاری کے بھیدوں کا انت ہو جائے اور میں اپنے دکھ، اپنے غم تمہیں اور سندرمی کو ورثے میں دے کر نہ مروں۔

کی آواز اور لہجہ دونوں بدل گئے تھے۔ فف۔ فف۔ سس۔ سس۔ کرتے کہنے لگے۔

”تھارو کیشپ! جو باتیں سروپ تم سے کہہ چکا ہے میں انہیں دہراؤں گا نہیں ہاں اتنا ضرور بتاؤں گا کہ آدمی کے ایک ہاتھ میں دکھ، دوسرے ہاتھ میں سکھ ہوتا ہے، پر میں ایسا آدمی ہوں کہ جس کے دونوں ہاتھوں میں دکھ ہی دکھ ہیں اور میں اپنے پر یوار کو ان کے سوا اور کچھ نہ دے سکا۔ ہاں تمہیں اور سندرمی کو اپنے دکھوں کا زہر نہیں پلانا چاہتا، میں تو اپنے دکھوں کا انت چاہتا ہوں اور بن مورتی کھو جے ان کا انت نہیں ہو سکتا، مجھے وشواس ہے تم وہ مورتی کھوج لاؤ گے۔“

کیونکہ تم بھگوان کا روپ ہو اور دیوتاؤں کی طرح تمہارے ادھیکار، ان گنت ہیں، کیشپ بیٹے مورتی ڈھونڈ کے لاؤ تا کہ میں مرجاؤں اور مجھے میگھا کی بیٹی چندا کا بر مانگنے کی ضرورت نہ رہے۔“

میں حیران ہوا کہ کیا چندا کا بر اس لئے مانگا ہے کہ دادا مر جائے؟ مگر اس سے میں نے کچھ پوچھنا یا جرح کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دادا نے آنند بھکشوالی مورتی مانگی، پہلے بھی مانگی تھی، مگر اب کے طلب کا رنگ کچھ اور تھا جس نے میرے من میں بالچل سی مچادی اور میں نے کہا۔

”دادا! جس طرح بتا جی نے، تم نے مجھے اپنا کہا ہے، اسی طرح میں بھی تم دونوں کو اپنا سمجھتا ہوں اور ایک بار پھر وچن دیتا ہوں، وشواس دلاتا ہوں کہ مورتی ڈھونڈ لاؤں گا اور ساؤ گاری کے شمشان میں تمہاری ارٹھی اپنے ہاتھ سے چتا پر رکھوں گا۔“

یہ کہہ کر میں اٹھنا چاہتا تھا کہ دادا نے اپنے استخوانی ہاتھوں سے مجھے پکڑ لیا اور اس کے ٹھنڈے ہونٹ جن میں جیون کی کوئی گرمی نہیں تھی، میرے ماتھے پر یوں ثبت ہو گئے جیسے کوئی مہر داغی جاتی ہے، بڑا طویل اور گھمبیر تھا وہ بوسہ جس نے میرے لبو میں موت کی سرد لہر دوڑا دی۔ بڑھا مورتی کی صورت میں اپنی موت ہی تو مانگتا تھا اور میں نے اس کی موت فراہم کرنے کا وچن دیا تھا۔

چند لمحوں بعد جب اس نے میرے کندھے چھوڑے، میری پیشانی سے ہونٹوں کی مہر ہٹائی تو میں چپ چاپ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

بڑھے ساگر ساؤ جی کے کنیا کو مہر کی راہداری میں چلتے سے میرے ذہن میں آنند بھکشوالی مورتی کے سوا اور کچھ نہ تھا، جسے ڈھونڈ کر میں ساؤ پر یوار کے دکھوں کا خاتمہ کر سکتا تھا۔

میں نے چلتے چلتے سوچا، دوسرا کوئی کام تو رہ بھی نہیں گیا، سندرمی کے ساتھ میرا پیہا ہو چکا

جب سے تم ساؤ گاری میں آئے ہو، ہمارے من میں آشاؤں کے نئے دیپ جلے ہیں اور یوں لگتا ہے، ایشور نے تمہیں ہماری مکتی کے لیے بھیجا ہے اور تم مورتی ڈھونڈ لاؤ گے میں اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں کیونکہ وہ دن ساؤ پر یوار اور ساؤ گاری کی نجات کا دن ہو گا اور تم سندرمی کو ہمیشہ کے لئے اپنی دنیا میں لے جاؤ گے۔

میں بھی، دادا بھی تم سے بہت پیار کرتے ہیں اور تمہیں اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر سمجھتے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ تم اندر کی طرح اپنی سب ناریوں میں خوش رہو اور اپنی دنیا کو سُرگ بنا دو میں نے دادا کو بتا دیا ہے کہ سندرمی کے علاوہ بھی تمہاری کچھ ناریاں ہوں گی اور وہ کہتے ہیں کہ یہ بات کیشپ کے پختہ میں لکھی ہے اور میں پہلے سے جانتا ہوں، میں نے سندرمی کو کہہ دیا ہے، وہ تمہیں کسی ناری کے پاس جانے سے روکے گی نہیں۔ صرف اپنا مان، اپنا ادھیکار مانگے گی جو ہم نے، تم نے پر ماتما نے اسے دیا ہے، ہم تمہیں پھلتے پھولتے اور ہنسی خوشی جیون بتاتے دیکھنا چاہتے ہیں آج ہی جب میں نے دادا کو بتایا کہ سندرمی امید سے ہے تو دادا خوشی کے مارے رو دیئے اور پرارتھنا کرنے لگے کہ:-

”اے بھگوان! آنے والی نسل کو ہمارے دکھوں سے حصہ نہ دینا اور تھارو کیشپ پر اور سندرمی پر اور ان کی اولاد پر اپنی دیا کا سایہ رکھنا۔“

یہ کہتے کہتے سروپ جی کی آواز بھرا گئی اور وہ گلو لیر لہجے میں بولے۔
”بس کیشپ بیٹے! یہی مجھے کہنا تھا، اسے صفائی کا بیان سمجھو یا ہمارے برے لیکھوں کی کتھا، یہ بات میں تم پر چھوڑتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے بڑھے ساگر ساؤ جی کی آنکھوں سے بھی آنسو ڈھلکتے اور چہرے کی جھریوں بھری خشک کھال پر اٹکتے دیکھتے، میں جانتا ہوں کسی کے رونے اور آنسو بہانے سے دنیا کا نظام بدل نہیں جاتا۔ دن رات کی گردش رک نہیں جاتی، پھر بھی اگر کسی کے دل کی حالت آنسوؤں کے پیمانے سے ناپی جاسکتی ہے تو میں کہہ سکتا ہوں دادا بھی میرے لئے وہی جذبات رکھتا تھا جن کا اظہار ان کے پوتے نے کیا۔

سروپ جی کی بھرائی آواز سن کر اور ساگر ساؤ جی کے آنسو دیکھ کر میں سب کچھ بھول گیا، اب مجھے دادا کے لیے بریابلیدان مانگنا بھی اچھا نہ لگا کیونکہ جب آدمی کسی مشکل میں گرفتار ہو، اس سے چھٹکارا پانے کے لیے کبھی کبھی بڑی عجیب باتیں سوچتا ہے میں اس پر اسرار بلیدان کی حقیقت تو نہ جان سکا، پھر بھی اتنا ضرور سمجھ گیا کہ دشمن پر یوار سے سمبندھ پیدا کر کے وہ من کی شانتی چاہتے ہیں کوئی اور مقصد میری سمجھ میں نہ آ سکا۔

اس اثنا میں بڑھے نے آستین سے آنسو بونچھے پھر عجیب سا آواز میں کہنا شروع کیا:-

تحریر کے مطابق آج تک نکلی سمجھتا رہا ہوں؟

انہیں سوچوں اور وچاروں میں غم میں زینے کی بالکونی کے قریب پہنچ گیا، شاید میرے لاشعور نے نیچے جانے کا فیصلہ کیا جس میں میرے اراوے کا کوئی دخل نہ تھا۔ میں تو بس بے دھیانی میں زینے کی طرف چلا آیا تھا حالانکہ اس سے مجھے تہائی کی ضرورت تھی تاکہ کچھ سوچ سکوں، کوئی فیصلہ کر سکوں کہ میں ساؤ خاندان کے خوابوں کی تعبیر کیسے حاصل کر سکتا ہوں مگر اپنے آپ سے بے خبر سا ابھی زینے کی بالکونی میں پہنچا تھا کہ تارا پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آ گئی اور مجھے پکڑ کے بولی۔

”صاحب! کیا آپ دن کو بھی نیند میں چلتے ہیں۔“

اس کی بات سن کر میں چونکا، بے خبری جانی رہی، غالباً وہ بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آئی کیونکہ اس کے شریر میں ابھی تک وہ ہلکی سی لرزش دوڑ رہی تھی جو بھاگنے سے پیدا ہوتی ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیوں تارا! تمہیں نیند میں چلتا دکھائی دیتا ہوں؟“

اس نے اپنے ہاتھ پرے ہٹا لیے اور بولی۔

”آپ راہداری میں چل رہے تھے تو میں نے کئی بار پکارا مگر آپ نے ایک بار بھی نہیں سنا۔“

تب بھاگ کے آئی اور آگے بڑھ کے روکا۔ میں تو یہی سمجھی آپ دن کو بھی نیند میں چلتے ہیں۔“

”میں اپنے دھیان میں تھا، اس لئے تمہاری آواز نہ سن سکا، مگر کیوں بلا رہی تھیں مجھے؟“

”مالکن نے کہا تھا بلانے کو۔“

”کیوں؟“

”کہتی ہیں، آپ زیادہ چلیں پھریں نہیں۔ آرام کر لیں کہیں پھر بخار نہ ہو جائے۔“ اور

ایک پل ٹھہر کے اس نے اپنی نظریں میرے چہرے پر اٹھائیں ”صرف مالکن نہیں داسی بھی آپ سے یہی کہنا چاہتی ہے۔“

مجھے شرارت سوچھی۔ ”تمہارا کہا ماتوں یا تمہاری مالکان کا؟“

”دونوں کا۔“

”بھلا ایک ساتھ دونوں کا کہا کیسے مان سکتا ہوں۔“

وہ دھیرے سے مسکرائی ہوئے سے بولی۔ ”آپ تو تین تین کا کہنا مان لیتے ہیں۔“

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا، تین والی بات اسے سندھوتی ہے، نے بتائی ہوگی کیونکہ تارا صرف

داسی نہیں، اس کی راز دار سہیلی بھی تھی، میں بھی مسکرا دیا۔ ”اب تو تم دونوں کا کہنا مانتا پڑے گا۔“

مگر ایک شرط ہے میری۔“

سندھوتی کو اس تار شکبوت سے نکالنا باقی ہے میں دیوتا ہوں یا آدمی مگر دادا، سروپ جی، کیا موسما، ویشال دلالے میرے سارے ادھیکار مانتے ہیں، میں نے پروہت گنجال کے دست و بازو توڑ دیئے ہیں جو کسی دہیت یا تھیوت روح کی طرح ساؤ گاری پر قابض تھا، شکر اور بھولا بری پولیس کی حراست میں تھے۔ تھاپا بہادر اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا، خود گنجال اپنا آخری ٹھکانہ بھی چھوڑ گیا تھا۔ اور مجھے دیشواں تھا کہ اب وہ ساؤ گاری میں لوٹ کے نہیں آئے گا، وہ نکلی مورتی جس کے لئے آٹھ برس پہلے کشمکش ہوئی، اور جس کے کارن میرے چاچا چکرورتی سہائے پر لوک سدھار گئے تھے، میں ساگر ساؤ جی کو بھینٹ کر چکا تھا اور مہاپرش سار گلیان کی وہ ڈیمیا بھی جو مقدس مورتی کے اسرار کی کلید سمجھی جاتی تھی، میں حاصل کر چکا اور اس کی پر اسرار چرئی تحریر میرے پاس محفوظ تھی جس کی خاطر کایا پتھیا پانچ برس تک پہاڑی خانقاہ کی زیر زمین اور بھیا نک ترین گونھڑی میں قید رہا میں نے اسے بھی نیا جیون دیا تھا، اس طرح سارے کام ہو چکے تھے اور اب صرف مقدس مورتی کو ڈھونڈنا ہی باقی رہ گیا تھا۔

ساؤ گاری کے سارے بھیدوں کی طرح بڑھے ساگر ساؤ جی کی جان بھی اسی مورتی میں بند تھی، اب مجھے طلسمی کہانیوں کے کسی ہیرو کی طرح اس مورتی کو ڈھونڈنا اور بڑھے کی جیو آتما کو اس کے شریر کے پیچھے سے آزاد کرنا تھا، سروپ جی کو ان غموں اور دکھوں سے نجات دلانا تھی جو انہیں ورثے میں ملے تھے کیونکہ وہ اپنے غم اور دکھ مجھے اور سندھوتی کو وراثت میں دے کر مرنا نہیں چاہتے تھے۔

وہ مورتی کو کھوجنے اور ڈھونڈنے پر اس لئے زور دے رہے تھے کہ اپنے جیتے جی مجھے اور سندھوتی کو قید اسرار سے آزاد کر جائیں۔ ان کی یہ بڑب فطری تھی کیونکہ کوئی باپ اپنی اولاد کو دکھوں کی بھٹی میں جھونکنا پسند نہیں کرتا۔ ان کی باتیں سن کر، بڑھے کے آنسو دیکھ کر میرے دل میں یہ عزم نئے سرے سے جوان ہو گیا کہ مجھے مقدس مورتی کو ڈھونڈنا ہے، اپنے لئے، سندھوتی کے لئے، سروپ جی کے لئے، بڑھے ساگر ساؤ جی کے لئے تاکہ ہم ساؤ گاری کی قید اسرار سے اور بڑھا قید استی سے رہائی پاسکے اور جب میں ہولے ہولے چلتا اس راہداری کی طرف مڑا جو زینے کی بالکونی کی طرف جاتی تھی، ذہن میں ایک ہی خیال پرواز کر رہا تھا، ایک ہی لفظ سنتا رہا تھا۔

”مورتی..... مورتی..... اور مورتی“

اس کے علاوہ دل میں، دماغ میں اور کچھ نہ تھا، مقدس مورتی میری سوچوں کے ساتھ میری نگاہوں میں بھی گھومنے لگی تھی جس کی نقل مطابق اصل دادا کو بھینٹ کر چکا تھا، چلتے چلتے یہ خیال بجلی کے گوندے کی طرح ذہن کے حاشیے پر لپکا کہ کہیں وہ مورتی اصل نہ ہو جس کو میں چاچا کی

میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو یوں لگا تاں صرف آنکھوں میں نہیں اپنے دل میں بھی میری تصویر اتار چکی ہے۔ ”کیا مجھے دیوتا سمجھتی ہو؟“

”ہاں۔۔۔“ اور بڑے سرگوشیانہ سے لہجے میں بولی۔۔۔ ”دادا کہتے ہیں دیوتا کا سب پر ادھیکار ہوتا ہے۔“

”کیا تم پر بھی؟“

”ہاں سرکار مجھ پر بھی، میں داسی ہوں آپ کی۔“

”میں عورت کو داسی نہیں مانتا، یہ شبد میں نے اپنی بھاشا سے نکال دیا ہے۔“

”داسی کو نہ سہی پجاری کو تو مانتے ہیں نا؟“

یہ کہہ کر دھیرے سے مسکرا دی۔ یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر، موٹی موٹی آنکھوں میں بلکہ پورے نیپالی شریر میں اس لہر کی طرح حرکت کر رہی تھی جو جھیل میں کنکر پھینک دینے سے پیدا ہوتی ہے اور اس کیفیت میں بولی۔

”آپ دیا کریں گے نا مجھ پر؟“

میں نے ہاتھ بڑھا کے اس کی ٹھوڑی پکڑ لی اور مسکرا کے کہا۔

تارا! شرط کی خلاف ورزی نہ کرو اور جاؤ تمہاری مالکن انتظار کر رہی ہوگی۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے ہونٹوں سے لگا لیا، دو تین بار چوما اور بطخ کی طرح چلتی کمرے سے نکل گئی، جاتے جاتے کمرے کا دروازہ بھی بند کر گئی، میرا دل کچھ لمحے تارا کی آنکھوں میں دوبارہ جو کسی جھیل کی طرح گہری تھیں پھر ناگہاں یوں لگا جیسے کسی نے مجھے اس جھیل سے باہر کھینچ لیا ہو، ساتھ ہی ذہن کو ایک عجیب سا جھٹکا لگا اور میرے اندر سے آواز آئی۔

”تھارو کیشپ! بھگوان نے تم کو سوشیل بنایا اور سندرتا پر ادھیکار بھی دیا ہے خوبصورتی جہاں، جس روپ میں بھی ہو تمہیں اچھی لگتی ہے مگر اپنے آدرش کو نہ بھولو، مقدس مورتی تمہارا آدرش ہے اسے ڈھونڈ لو گے تو دھرتی کی ساری سندرتا تمہیں بھیٹ کر دی جائے گی۔“

میں چوڑکا۔ ”دھرتی کی ساری سندرتا؟“

”ہاں جس روپ میں چاہو گے کیونکہ ایشور خود سندر ہے اور سندرتا سے پیار کرتا ہے جیہی اس نے نیچر کو، سنسار کو، کائنات کو سندر بنایا اور من موہ لینے والی صورتیں پیدا کی ہیں۔“

”میں سندرتا کا پجاری ہوں مگر اپنے آدرش کو نہیں بھولا۔“

”تو پھر نکلو یہاں سے اور مورتی کی تلاش میں جاؤ۔“

”مورتی کہاں تلاش کروں، کدھر جاؤں؟“

”پانڈی پتر جاؤ۔“

”کیا شرط ہے صاحب؟“ وہ حیران ہوئی۔

”میں تنہائی چاہتا ہوں، نہ مالکن کمرے میں آئے نہ داسی۔“

”مالکن تو آپ کے لئے پرہیزی بھوجن بنا رہی ہیں، داسی بھی ان کے ساتھ رسوئی میں کام کرے گی، کمرے میں کوئی نہیں آئے گا، آپ کی شرط منظور ہے، چلیے میرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر اس نے بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کیا ہاتھ سے پکڑ کر لے جاؤ گی؟“

”ہاتھ ہے صاحب ہتھکڑی نہیں۔“

میں اس کے خوبصورت فقرے پر غور کرتا ساتھ ہولیا۔ راہداری سے گزر کر آنگن میں آئے تو تارا نے میرا ہاتھ چھوڑ کر شرط کا اعلان کیا۔

”صاحب کہتے ہیں، انہیں تنہائی کی ضرورت ہے کمرے میں کوئی نہ آئے۔“

سندرمتی رسوئی میں تھی وہیں سے اس کی آواز سنائی دی۔

”تیرے صاحب جو کہتے ہیں وہی کرتا رہا! بس یہ چلیں پھر میں نہیں۔“

تارا نے میرا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا، مجھے لے کر کمرے میں آئی اور پلنگ کے پاس کھڑا کر کے کہنے لگی۔ ”آپ لیٹ جائیں میں بوٹ اتار دوں گی۔“

میں بستر پر لیٹ گیا تو بوٹ اتارنے لگی مگر آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں، میں نے پوچھا ”کیا دیکھ رہی ہو۔“

”آپ کی تصویر آنکھوں میں اتار رہی ہوں۔“

”وہ کس لئے؟“

”آپ دیوتا جو ہیں۔“ وہ بوٹ اتار کے سیدھی کھڑی ہو گئی۔

”کیا اتاری تصویر؟“

”ہاں۔۔۔ دکھاؤں آپ کو؟“

”دکھاؤ تو بھلا کیسی تصویر اتاری ہے تم نے میری؟“

وہ پانڈی سے ہٹ کر سرہانے کی طرف آئی، پلنگ کے ساتھ لگ کے فرش پر بیٹھ گئی پھر چہرہ اوپر اٹھایا اپنی موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں میری آنکھوں کے قریب کر کے بولی۔

”دیکھ لیں۔ میری آنکھوں میں آپ کی تصویر اتری ہے یا نہیں؟“

میں نے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں اپنی تصویر دیکھی۔ ”تارا تمہاری ان سندر آنکھوں میں تو پیگو کی تصویر ہونی چاہیے۔“

”وہ پتی ہے میرا۔ آپ دیوتا ہیں۔“

”پاٹلی پتر کا نام سن کر میں بھونچکا رہ گیا، یہ باتیں میرے اپنے درمیان ہو رہی تھیں، ادھر میں تھا ادھر میرے اندر کا تھار و کیشپ تھا۔ ہم دونوں بھی ایک تھے، دوسرا کوئی نہیں تھا مگر میرے اندر کے آدمی نے پاٹلی پتر جانے کا مشورہ دیا تو ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا اور سارے شریر میں موج حیرت سن سن کرتی گزرنے لگی۔“

بوڑھے ساگر ساؤجی کے تابوت نما کمرے میں رکھی مورتی نے بھی جب وہ میرے سینے میں آئی تھی مجھے پاٹلی پتر میں بلایا تھا، نجانے وہ سپنا تھا یا کیا تھا، اب میرے اندر کا تھار و کیشپ بھی مجھے پاٹلی پتر جانے کا مشورہ دے رہا تھا، میں اس بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہا۔

”بھلے آدمی! پاٹلی پتر کو تباہ و برباد ہوئے صدیاں بیت چکیں، میں کہاں جاؤں؟“

مگر میں حیران رہ گیا کہ اندر سے کوئی جواب نہ آیا، میرے اندر کا آدمی جا چکا اور میرے لاشعور کی کوٹھڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا تھا، کئی بار ایسا ہوا تھا، وہ کبھی کبھی اچانک آتا اور ناگہاں چلا جاتا تھا، پھر میرے بلانے پر بھی لاشعور کی کوٹھڑیوں سے نہیں نکلتا تھا، اب بھی یہی ہوا، وہ پاٹلی پتر کا پتہ دے کر جادو کے پتلے کی طرح غائب ہو گیا۔

ابھی میں اس کے اچانک چلے جانے پر حیران ہو رہا تھا کہ فوراً ذہن میں مورتی کا وہ فقرہ ایک گونج کے ساتھ ابھرا جو اس نے سینے میں رویا میں یا کشف میں مجھ سے کہا تھا کہ:-

”نام بدلتے ہیں، مقام نہیں بدلتے۔“

اور ساتھ ہی یہ گمان ہوا کہ پاٹلی پتر کا نام بدل دیا گیا ہے اور اس کا نیا نام پٹنہ ہے اور مجھے پٹنہ ہی جانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

اس خیال یا گمان کے ساتھ ہی میں تیزی سے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا میں بھی کتنا بدھو ہوں۔ سینے میں مجھے پٹنہ جانے اور مقدس مورتی ڈھونڈنے کا بلاوا دیا گیا اور میں سمجھ ہی نہ سکا۔ اب میرے اندر کے آدمی نے جھنجھوڑا تو ہوش میں آیا کہ پٹنہ پاٹلی پتر کا بدلا ہوا نام ہے۔

میرے ذہن کے ڈرے میں تاریخ کے اوراق کبوتروں کی طرح پھڑپھڑانے لگے، انہیں الٹا پلٹا 1848ء کے دور میں پہنچا تو ایک ورق پر کمپنی سرکار کے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کی تصویر بھی دیکھی اور ہندوستان کا وہ نقشہ بھی نظر آیا جس میں کمپنی سرکار کا مقبوضہ علاقہ دکھایا گیا تھا اس نقشے کے مطابق 1848 میں کمپنی سرکار ہندوستان میں اڑیسہ، بنگال اور بہار پر قابض تھی، اسی کے حکم سے 1815 میں پٹنہ کے ٹیلوں کی کھدائی ہوئی تھی اور بہت سے تاریخی نوادرات کے ساتھ آنند بھکشو والی مورتی بھی برآمد ہوئی تھی جسے کلکتہ کے فورٹ ولیم میوزیم میں نمائش کے لئے رکھا گیا اور جس کی نمائش پر بودھوں میں مورتی کو حاصل کرنے کی زبردست تحریک چلی، ہنگامے ہوئے اور گورنر جنرل نے اسے کہیں غائب کر دیا۔

ہنگامے کلکتہ میں ہوئے تھے، کلکتہ ہی میں کمپنی سرکار کا ہیڈ کوارٹر تھا، اس لیے بودھ گیانی اور بھکشو یہی سمجھتے رہے کہ مورتی کلکتہ ہی میں کہیں چھپا دی گئی یا لندن کے برٹش میوزیم کو بھیج دی گئی ہے۔ تلاش کا سارا زور کلکتہ اور لندن پر دیا جاتا رہا اور کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ وہ پٹنہ میں کہیں چھپا دی گئی ہوگی۔ پاٹلی پتر سے پٹنہ کا گمان ہونے کے بعد میں لارڈ ڈلہوزی کی فراست پر دنگ رہ گیا جس نے بدھ کی مقدس مورتی کو اس کے اصل مقام پٹنہ میں منتقل کر دیا تھا اور یقیناً اب وہ پٹنہ ہی کے کسی سرکاری دفتر میں محفوظ ہوگی ورنہ مجھے سینے میں پاٹلی پتر کا پتہ نہ دیا جاتا۔

پراسرار اور سندر قدرت خود میری رہنمائی کر رہی تھی۔

میں خوشی کے مارے اچھل گیا، بستر سے اتر کر بھاگا صحن سے گزرا اور رسوئی میں گھس کر سندر متی سے لپٹ گیا نہ صرف سندر متی سے بلکہ تارکانیپالی شریر بھی میرے ایک بازو کی لپیٹ میں آ گیا کیونکہ مالکن اور واسی پاس پاس کھڑی تھیں دونوں میری اس وحشت پر حیران رہ گئیں، تارا سمجھی شاید میری کوئی ذہنی کل ذہیلی ہو گئی ہے۔ سندر متی کو خیال آیا غالباً مجھے کوئی دورہ پڑا ہے۔

”یہ کیا پاگل پن ہے کیشی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”آج ہی تو طبیعت ٹھیک ہوئی ہے۔“

میں نے ان دونوں کو جھنجھوڑ کر، ہلا کر چھوڑ دیا۔ وہ میرے چہرے کا بدلا ہوا رنگ اور آنکھوں میں بے پناہ مسرت کی چمک دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

”تم دونوں مجھے دیکھ کر حیران کیوں ہو، میں بالکل اچھا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنا چہرہ سندر متی کے چہرے کے سامنے کر دیا اور پوچھا۔

”تجھے میری آنکھوں میں کچھ نظر آیا؟“

”اپنی تصویر نظر آئی ہے۔“

پھر میں تارا کی طرف گھوم گیا۔ ”تارا تم جھانک کر دیکھو، تمہیں میری آنکھوں میں کیا دکھائی دیتا ہے۔“

”مجھے آپ کی آنکھوں میں اپنی تصویر دکھائی دیتی ہے۔“

”جب دوسروں کی آنکھوں میں جھانکو تو اپنی ہی صورت نظر آتی ہے، مجھے تمہاری آنکھوں میں تمہیں میری آنکھوں میں۔ کیوں تارا! میں نے کچھ غلط کہا؟“

”نہیں صاحب۔“

”جب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں پھر تمہاری مالکن مجھے پاگل کیوں کہتی ہے۔“

اس پر کچھ دیر ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ پھر ہم تینوں ہنس دیے اور میں نے اپنا نکل اعلان کر دیا۔ ”سندر متی! میں کل جا رہا ہوں۔“

(34)

گر بھ جشن

882

وہ تھبتی۔ ”میں آئی اور آپ چل دیئے کہاں جائیں گے؟“
 ”پٹنہ جائیں نا۔“

”مگر میں آپ کو کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔“ اس نے جھگڑے کے انداز میں کہا۔
 ان لمبے سروپ جی صحن میں دکھائی دیئے پھر اندر آ گئے اور سندرمتی شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

”دیکھئے پتا جی، ابھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی اور پٹنہ جانے کو کہہ رہے ہیں۔“

سروپ جی نے نیچے حیرت کی نظروں سے دیکھا۔ ”پٹنہ کیوں؟“

”پٹنہ ہی جانے کا گمان ہوا ہے پتا جی!“

انہوں نے میری آنکھوں میں میری نظروں میں میری آتما کی شکتی دیکھی، کچھ سمجھے، پتہ حیران ہوئے اور بولے۔

”پٹنہ پاٹل پتر کا نیا نام ہے، چلے جاؤ پٹنہ۔“

اور ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سندرمتی دنگ رہ گئی۔ مجھے بازو سے پکڑ کے رسوں سے نکلی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

○○○

سندرمتی کو میرے پٹنہ جانے کا فیصلہ اچھا نہیں لگا، معلوم ہوتا تھا، کمرے میں آتے ہی لڑ پڑے گی، جھگڑا کرے گی کوئی جھت نکالے گی اور سچ مچ اس نے یہی کیا۔

”ذرا یہاں بیٹھے نا۔“ وہ مجھے کاؤچ پر دکھیل کر خود میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

آپ کو پٹنہ جانے کا گمان تو ہو گیا ہے مگر یہ گمان کیوں نہیں ہوا کہ میں کیا چاہتی ہوں؟“

میں نے اس کی بات بڑے غور سے سنی اور بڑے گل سے جواب دیا۔

”تیرے بارے میں گمان اس لئے نہیں ہوا کہ تیرے من کی بات جانتا ہوں۔“

”کیا جانتے ہیں آپ“

”جو کچھ تو چاہتی ہے۔“

”کیا چاہتی ہوں میں؟“

”اب تجھے کیسے بتاؤں۔ تیری خواہش اتنی سندر ہے کہ اس کے اظہار کیسے نہیں سندر

الفاظ نہیں مل رہے۔“

یہ کہہ کر میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا کہ شاید جو بات ہونٹوں سے ادا نہیں ہو سکتی اسے

آنکھیں سمجھ لیں، وہ پل دوپل مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

”میں کچھ نہیں جانتی کیشی! صرف پریم کی گناہگار ہوں۔“

اس کے الفاظ نے مجھے بے چین کر دیا اور وہ بات خود بخود میرے ہونٹوں پر آ گئی جسے بیان

کرتے ہوئے بچکچا رہا تھا۔

”عورت صرف پریم کے لئے پیدا کی گئی ہے اور پریم کہتا ہے، سنسار میں یہی اور بتی کے

سوا اور کچھ نہیں۔“

میری زبان سے یہ الفاظ سن کر اس کا رویہ اچانک تبدیل ہو گیا۔ لڑنے جھگڑنے کا مہر جا،

رہا اور مجھ پر جھکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”اور پریم کیا ہے؟“

”پریم ہمارے من کی بے چینی، ہمارے لبو کا جوار بھانا، ہمارے جسم کی راحت ہے۔“

وہ حیران سی بولی۔

”یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ مجھے چھوڑ کر پٹنہ جا رہے ہیں؟“

”تو نہیں جانتی، میرا پٹنہ جانا ضروری ہے۔“

”اور جو کچھ میں چاہتی ہوں، وہ ضروری نہیں؟“

”بول تو کیا چاہتی ہے؟“

”آپ کل پٹنہ نہیں جائیں گے اور جب تک میں آگیا نہ دوں، ساؤ گاری سے باہر پاؤں بھی نہیں رکھیں گے۔“

مجھے اس کی بات عجیب سی لگی۔ ”کیا ساؤ گاری میں بندی بنا کے رکھے گی مجھے؟“

”دیوتا کو بندی کون بنا سکتا ہے؟“ اس نے اپنی گوری گوری کلاہیاں میرے گلے میں پرو دیں۔

”پریم کے بندھن میں باندھوں گی آپ کو؟“

”وہ تو کب کی باندھ چکی ہے تو۔“

”اب دیئے جلاؤں گی مندر میں۔“

”کاہے کے دیئے جلائے گی؟“

”اپنے بیاہ کے۔“

”مگر پتا جی تو ابھی.....“

اس نے میری بات کاٹ دی اور بولی۔

”جس رات آپ نے مندر میں پتا جی کے لئے پرارتھنا کی وہ اٹ کال سے لوٹ آئے،

اسی رات میرے، آپ کے ناتے کی بات کھل گئی اور ساؤ گاری کے باسی جان گئے تھے کہ میں آپ کی کیا ہوں۔“

”وہ تو ایک دن سب کو جانا ہی تھا۔“

”مگر دادا کہتے ہیں، اب بیاہ کا منزل رچانا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ میں پیٹ سے ہوں۔“

بے شک دادا نے، سروپ جی نے، ماں نے ہمارے لگن کی آگیا دے دی اور ہم بنی مومن

بھی بنا چکے تھے۔ مانت کی رسموں، ریتوں کے مطابق ہمارا بیاہ نہیں ہوا تھا، اب جبکہ سندرمی

امید سے تھیں وہ بڑھاپہ پر لوگوں کے سامنے بیاہ کا اعلان ضروری تھا اور بڑھے ساگر ساؤ جی نے

واقعی بڑے سے بڑے سوچی تھی، میرے نزدیک سروپ جی ساؤ گاری کے باسیوں کو مندر میں

اکٹھا کر کے یہ سب کر سکتے اور رسم پوری کرنے کی خاطر انہیں اپنی طرف سے بھوجن دے سکتے

تھے، مگر مندر نے بتایا۔

”ساؤ گاری میں دو جشن منائے جائیں گے ایک کل، دوسرا پرسوں۔“

”دو جشن“

”ایک بیاہ کا، دوسرا میرے گربھ کا“

میں اس کی بات سن کر دنگ رہ گیا۔ ”تیرے گربھ کا جشن؟“

”ہاں یہ جشن ساؤ گاری کے لیے بہت ضروری ہے، ساؤ پر یوار کی نئی نسل کو میں جنم دوں

گی۔ اس لئے میرے دادا میرے گربھ کا جشن دھوم دھام سے منانا چاہتے ہیں، وہ لوگوں کے

سامنے اعلان کریں گے کہ میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

میں حیرت سے سنتا رہا، وہ کہتی رہی۔

”آپ نہیں جانتے کیشی! پتا جی کو، دادا کو یہ بات سن کر خوشی ہوئی ہے کہ میں پیٹ سے ہوں۔

آج ناشتے کے بعد جب دادا سے ملنے گئی تو بولے، سروپ نے بتایا ہے کہ تجھے دن لگے ہیں۔“

”ہاں دادا“ میں نے جواب دیا۔ ”پہلا مہینہ پورا ہو گیا۔“

تب دادا نے میرا ماتھا چوما، بیاہ اور گربھ کا جشن منانے کا حکم دیا اور یہ خوشخبری سنائی کہ تو بیٹا

جنے گی۔“

یہ کہتے کہتے سندرمی کے چہرے پر، آنکھوں میں احساس فخر کی کرن چمک اٹھی، میں پہلے

ہی بیان کر چکا ہوں کہ سروپ جی کی کوئی نرینہ اولاد نہ ہونے کے کارن سندرمی ہی ساری

امیدوں کا مرکز تھی اور دادا کی زبردست خواہش تھی وہ اولاد نرینہ پیدا کرے، جیہی اس نے اپنی

پڑپوتی کو ایک مکمل عورت بنانے کی کوشش کی، اس کے من میں جنسی طلب اور اولاد کی تڑپ پیدا

کر دی۔ بے شک اولاد نرینہ ساؤ گاری کی ضرورت تھی مگر میں حیران تھا، کوئی آدمی پورے

وشواس کے ساتھ یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے کہ ناری کے گربھ میں کیا ہے، میں نے کہا۔

”کیا معلوم تو بیٹا جنے گی یا بیٹی۔“

”بیٹا ہی جنوں گی کیشی!“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”اور ایک نہیں اوپر تلے پورے سات

بیٹے جنوں گی تب ایک بیٹی ہوگی۔“

”ارے..... اس کے اعتماد نے مجھے پریشان کر دیا۔“ ”کیا یہ بھی دادا نے کہا ہے؟“

”ہاں، ان کی جوتش و دیا کہتی ہے کہ میرے سات بیٹے ہوں گے۔“

”دادا کی جوتش و دیا۔“

میں ہڑبڑا کے رہ گیا اور سوچنے لگا، یہ بڑھا تو بڑا عجیب و غریب اور ناقابل فہم آدمی ہے،

کبھی میرے پچھتر میں سوم اور اندر دیوتا کے گنوں کا کھوج لگاتا اور سندرناریوں پر میرا ادھیکار

مانتا ہے، کبھی کہتا ہے کہ اگر ساؤ پر یوار میں کچھ اور سندر لڑکیاں ہوتیں تو سب کی سب مجھے

بھینٹ کر دیتا، کبھی تارا کے کانوں میں یہ منتر پھونکتا ہے کہ صرف میری دیا سے اس کا گربھ کشت

دور ہو سکتا ہے اور سروپ جی بتاتے ہیں کہ ساؤ پر یوار کی ہڑبڑا کی اور ہر داسی دادا کی آگیا کا پالن

کرنا اپنا دھرم سمجھتی ہے، جیسی تارا مجھ سے کئی بار کہہ چکی تھی میں اس پر دیا کروں اور بڑھے کی بھاشا میں ”دیا“ کا مطلب غالباً کچھ اور ہی تھا، یہ خیال بھی گزرا کہ ساؤ پر یوار تین صدیوں سے ایک خاص مورتی کی تلاش میں ہے اور بڑھے نے جوتش ودیا یا ایک سو چالیس سالہ تجربے کی دہائی سے یہ بات معلوم کر لی ہے کہ میں یہ دیرینہ خواہش پوری کر سکتا ہوں، اس لیے وہ میری خوشنودی کا طالب اور اپنے مقصد کی خاطر مجھے سندر متی بھینٹ کرنا چاہتا ہے مگر نہیں معاملہ اس سے کچھ آگے تھا کیونکہ ایک بار وہ اپنی پڑپوتی کو بھی اندر کی محبوبہ بننے کی دعوت دے چکا تھا، اور سندر متی نے آکاش کی بجائے دھرتی کے کسی دیوتا کی خواہش کی تھی، اس نے سندر متی، مجھے دیوتا ہی سمجھ کر بھینٹ کی تھی، اب وہ اس کے پہلے گر بھ کا جشن منانے کے ساتھ ساتھ اوپر تلے سات بیٹوں اور ایک بیٹی کو جنم دینے کی خوشخبری یا چیتاؤنی دے رہا تھا۔

مجھے بڑھے ساؤ گری جی کی ذات انتہائی پراسرار معلوم ہونے لگی، اس کا چاند گرہن سے بھی کوئی خاص سمبندھ تھا، جیسی ایک سو چالیس برس کے اس بڑھے بھوت کے لئے میگھا کی گرہن زدہ کنواری لڑکی کا بر مانگا گیا۔ یوں لگا وہ اس سنسار کی بجائے کسی دوسرے پر لوک کی مخلوق ہے جو بھٹک کر ساؤ گری میں آ گئی ہے۔

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ سندر متی نے مجھے چونکا دیا، ”کیا سوچنے لگے کیشی!“

”دادا کے بارے میں سوچ رہا ہوں، بڑھا کسی دوسری دنیا کا باسی لگتا ہے۔“

”ساؤ گری بھی تو دوسری دنیا ہے، سنسار سے الگ تھلگ۔“

”اور اس دنیا میں دادا کا راج ہے؟“

”ہاں۔۔۔ مردوں پر بھی، عورتوں پر بھی۔ ساؤ گری کی کوئی ناری، کوئی کنواری، مائلن ہو یا داسی ان کا کہا نہیں ٹال سکتی۔“

پھر وہ ایک پل ٹھہر کے کہنے لگی۔

”میرے ناتے سے آپ بھی دادا کی ہر بات ماننے کے پابند ہیں۔ انہوں نے جگ منانے کو کہا ہے تو اب آپ پٹنہ نہیں جاسکتے، کل بیاہ کی خوشی ہوگی۔ دیئے جلیں گے، پرسوں میرے گر بھ کا جشن اور ناچ رنگ ہوگا۔“

میں حیران ہوا۔ ”یہاں کوئی نزتگی تو ہے نہیں، کیا تو ناچے گی۔“

”میں نہیں، تارا ناچے گی۔ صرف آپ کے سامنے۔“

”میرے سامنے کیوں؟“

”تا کہ آپ کا من مگن ہو اور آپ اس پر دیا کریں۔“

میں جب اٹھا کہ پوتی بھی دادا کی بھاشا بول رہی ہے، وہ میرے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی،

میں نے پوچھا۔

”کیا یہ بھی دادا کی بات ہے؟“

”اچھ کیسی؟“ وہ بتانے لگی۔ ”دادا نے کہا ہے، اندر کی طرح آپ بھی ناچ کلا کے پریمی ہیں۔“

جس طرح دیوتا کسی نئی اپسرا کا ناچ دیکھ کر گم ہوتا ہے، اسی طرح تارا کا ناچ آپ کے من

میں دیا کا بھاؤ پیدا کر دے گا۔“

ساؤ گری کے اسرار کی طرح بڑھا بھی ایک از سر بستہ تھا، جتنا بھی اسے کھولنے کی کوشش کرتا، اتنا وہ الجھتا جا رہا تھا، سوچا بھی اسے جوں کا توں بند رہنے دوں، مورتی مل گئی تو یہ بھید بھی کھل جائے گا اور مورتی کے لئے مجھے پٹنہ جانے کا گیان ہوا تھا، ساؤ گری سے نکلنے کی ہدایت کی گئی تھی، اس لئے میں نے سندر متی کو بتایا۔

”میں بیاہ کے منڈل میں بیٹھوں گا، تیرے گر بھ کا جشن پر تارا کا ناچ بھی دیکھوں گا اور کایا موسا اور وشال رائے کو بھی پرسوں تک رکھنے پر راضی کر لوں گا مگر اترسوں ہم لوگ ساؤ گری سے چلے جائیں گے۔“

اب سندر متی کو بھی خیال آیا کہ میں یہاں تنہا نہیں بلکہ میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو صرف پردہت گنجال کی تلاش میں آئے ہیں، بولی۔

”اترسوں میں آپ کو جانے کی آگیا دے دوں گی، مگر پٹنہ سے لوٹ کے کب آئیں گے آپ؟“

”پٹنہ سے اسی سے لوٹوں گا جب تجھے ساؤ گری سے نکال کر لے جانے کی شرط پوری کر دوں گا۔“

یہ سن کر ایک عجیب سے احساس مسرت میں میرے ساتھ لگ گئی اور کپکپاتی آواز میں بولی۔

”کیا سچ مجھے ساؤ گری سے نکال کر لے جائیں گے آپ۔“

”بھگوان نے چاہا تو ضرور لے جاؤں گا۔“

سندر متی خوش تھی کہ میں نے اس کی بات مان لی اور سفر ملتوی کر دیا۔ کایا موسا اور وشال رائے بھی دو دن مزید ٹھہرنے پر راضی ہو گئے بلکہ وہ میرے اور سندر متی کے بیاہ کا منڈل دیکھنا چاہتے تھے اور تارا کی آنکھیں اب بولنے لگی تھیں۔

ایک بات اور بتاتا چلوں، سروپ جی کو بیاہ کے منڈل اور گر بھ کا جشن کا کوئی علم نہ تھا، یہ تو دادا پوتی کی اسکیم تھی، میں بتا چکا ہوں، بڑھا کچھ عرصے سے سندر متی پر زیادہ توجہ دینے لگا اور کئی باتوں میں اسی پر بھروسہ کرتا تھا۔ سروپ جی کو جشن منڈل کی خبر رات کے کھانے پر ہوئی۔

انہوں نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا، جب پتہ چلا کہ اس کارن میں بھی دودن کے لیے رک گیا ہوں بڑے خوش ہوئے اور پیگو کو لے کر اسی وقت گونا کھیا کی طرف چلے گئے تاکہ جشن وغیرہ کا انتظام کر سکیں۔

کھانے کے بعد سندرمی چند لمحوں کے لئے ساگر ساؤجی کے کٹیا کومبز میں چلی گئی شاید بڑھے سے کوئی نئی ہدایت لینے یا اسے یہ بتانے گئی تھی کہ میں نے اس کا ہر کہا مان لیا ہے، میں اپنے کمرے میں تھا کہ تارا اگر بتی لے کر داخل ہوئی اور میرے پاس آ کے پوچھنے لگی۔

”اگر بتی جلاؤں مالک؟“

”کیا یہ بھی کوئی ریت ہے ساؤ گاری کی۔“

”نہیں.....“ اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ ”میں نے سوچا آپ کو مہک اچھی لگے گی۔“

”تیری مالکن اگر بتی سے زیادہ مہکتی ہے۔“

تارا ہنس دی۔ گالوں پر سرخی پھیل گئی۔ ”آپ کو مالکن کی مہک اچھی لگتی ہے تو اگر بتی نہیں جلاؤں گی۔“

وہ پلٹ رہی تھی کہ سندرمی آگئی۔ ”کیا بات ہے تارا؟“

”اگر بتی جلائے آئی تھی مالکن!“ تارا نے اپنی ٹنسی روک لی۔ ”مگر صاحب کو آپ کی مہک پسند ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی اور سندرمی دروازہ بند کر کے میرے پاس بستر پر آ بیٹھی۔

”کیا کہا تھا آپ نے تارا سے؟“

”کہا تھا تیری مالکن اگر سے زیادہ مہکتی ہے۔“

وہ جھوم اٹھی۔ ”کیشی! آپ میرے لیے کتنے خوبصورت لفظ استعمال کرتے ہیں۔“

سندرمی خود خوبصورت اور سراپا پریم تھی، بلکہ پریم کی ایک ایسی کتاب تھی وہ جس کا ہر شبہ سندرمی ہر سطر حسین تھی۔ بائی پارہ میں قیام کے دوران میں نے اس کتاب کو سطر بہ سطر، لفظ بہ لفظ پڑھا تھا اور ایسی دلکشی تھی اس کے ہر مضمون میں، کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا تھا، جب میں اس کی تعریف میں کوئی اچھا لفظ، کوئی اچھا فقرہ استعمال کرتا وہ پھول کی طرح کھل اٹھتی اور اس کا انگ انگ پریم کے نشے میں ڈوب جاتا۔ اسے اپنی سندرتا اور سندرمی کی تعریف سننے کا بڑا شوق تھا، یہ شوق ہر عورت کو ہوتا ہے مگر سندرمی کو اس تعریف سننے کا جنون سا تھا اور میں اس کے جنون میں خوبصورت جملوں کا رنگ بھرتا رہتا۔ میں جملوں کو میری ”کویتا“ کہتی اور انہیں اپنی ایک ڈائری میں لکھتی بھی رہتی تھی۔

اس نے اپنی ڈائری مجھے دکھائی تھی جس میں وہ تمام فقرے درج تھے جو میں نے وقتاً فوقتاً اس کے حسن و جمال اور جوانی کی تعریف میں استعمال کیے تھے۔ ڈائری کا ذکر میں نے اس لئے ضروری سمجھا ہے تاکہ میری آپ بتی پڑھنے والے سندرمی کی سرشت اور افتاد طبع کا اندازہ کر سکیں۔

اس رات وہ سندرمی کتاب میرے سامنے کھلی تھی اور میں اس کی پریم بھری عبارتیں پڑھ رہا تھا اور اس کے ہر ورق سے، ہر انگ سے وہی مہک پھوٹ رہی تھی جو رپا کی بودھ سرائے میں پھوٹی تھی، اچانک میں نے پوچھا۔

”؟ تو نے شکایت کیوں کی تھی کہ مجھے پٹنہ جانے کا گیان تو ہو گیا مگر تیرا گیان نہیں ہوا۔“

کسمسا کر بولی ”وہ میری بھول تھی کیشی!“

”بھول نہیں طلب تھی تیری۔“ میں نے کتاب کا ایک نیا ورق الٹا۔

”پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں آپ؟“

”تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ تیرا گیان کیوں نہیں ہوا تھا۔“

اس نے تکیے سے سر ذرا اوپر اٹھایا، اپنی گوری گوری کلاں میری گردن میں حائل کر دیں اور تجسس لہجے میں پوچھا۔

”کیوں نہیں ہوا تھا میرا گیان؟“

”اس لئے کہ تو خود میرا گیان، میرا علم، میری کتاب ہے۔“

”یہ سن کر اس کی آنکھوں میں مستی چھلکنے لگی۔“ ”کیا یہ سچ ہے کیشی؟“

”ہاں سچ ہے، کیونکہ جب تجھے کھول کر پڑھتا ہوں، ہر بار پریم کا نیا رنگ دیکھتا ہوں، تجھ میں۔“

”کیسا ہوتا ہے وہ رنگ؟“

”دھنک کی طرح دلکش، پھولوں کی مانند سندرمی اور مہکتا ہوا۔“

”بائے۔۔۔۔۔ اس کے ہونٹوں پر ایک لذت آفرین سسکی تڑپ گئی۔“ ”کتنی سندرمی کویتا کہتے ہیں آپ۔“

”میری کویتا اس لئے سندرمی ہے کہ تو سندرمی ہے، تیرا نام سندرمی ہے اور تو ایک سندرمی کتاب ہے۔“

”پھر مجھے بار بار پڑھا کریں کیشی! تاکہ آپ کو میرے پریم کا گیان ہوتا رہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے پریم کی لٹافوں کے نئے ورق کھول دیئے اور میں ایک نئے گیان میں ڈوبتا چلا گیا۔

سندرتا سے پیار میری طبعی لگن کے مطابق تھا، اس گیان یا شعور کے بعد بڑھے ساگر ساؤجی کی جو بات کل تک عجیب لگتی تھی کہ سندرتا پر میرا ادھیکار ہے، اب مجھے اپنی فطرت کا ایک حصہ معلوم ہونے لگی اور میں سوچنے لگا شاید میرا پختہ واقعی اندر دیوتا کے پختہ سے ملتا ہے جو آکاش کی سندراپسراؤں کا پریمی ہے، میں اگرچہ دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا مگر یہ وشواس ضرور رکھتا ہوں کہ اگلے یک کے لوگ ہی جن کی صحیح تاریخ ہم تک نہیں پہنچتی، دیوی دیوتا ہوں گے اور ان میں اندر دیوتا اپنی حسن پرستی کے لیے مشہور ہوگا۔

ساگر ساؤجی نے مجھے سندرتا پر ادھیکار میری بعض روحانی طاقتوں کے کارن دیا تھا۔ یا اس نے جوش و دیا سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ میرے اور سندرتا کے درمیان کوئی طبعی تعلق ہے کیونکہ اگر میں خوبصورتی کی طرف کھینچتا ہوں تو خوبصورتی بھی آپ میرے قریب آ جاتی ہے، بہر حال اس گیان کا فیصلہ یہ تھا کہ میں اپنا پریم بانٹتا ہوں گا۔

یہ سب کچھ سوچ کر میں نے سندرتی سے پوچھا۔

”کیا تو جانتی ہے کہ دادا نے سندرتا پر میرا ادھیکار مانا ہے؟“

”یہ تو پتا جی بھی جانتے ہیں، میں بھی جانتی ہوں۔“ پھر ایک پل ٹھہر کے بولی۔ ”دادا اور پتا جی کی آگیا ہے کہ میں آپ کے کسی ادھیکار پر اعتراض نہ کروں، صرف اپنا ادھیکار مانوں۔“ میں خاموش ہو گیا، دراصل تارا کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ نہیں رہا تھا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کروں، اچانک ذہن کے حاشیے پر ایک خیال بجلی کے گھجورے کی طرح لپکا۔

”تو یہ نہیں جانتی کہ تارا بھی اپنی آنکھوں میں میری تصویر اتارتی پھرتی ہے۔“

میرا خیال تھا، یہ انکشاف اسے پریشان کر دے گا مگر وہ بڑے سکون سے بولی۔

”تارا کو دادا نے آپ کی سیوا کا ادھیکار دیا ہے تاکہ اس کا کشت دور ہو۔“

میری آنکھوں میں حیرت کا کوندالپک گیا۔ ”میں تارا کے لئے پرارتھنا کر چکا ہوں۔“

”اس پر دیا بھی کریں۔“

اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی، ساؤ گاری کے دستور نرالے اور بڑھے ساگر ساؤجی کے وچار انوکھے تھے مگر میں سوچنے لگا۔ قدرت کے بھید بھی تو سمجھ میں نہیں آتے، وہ بعض شیوں کے ہاتھ میں شفا رکھ دیتی ہے جو کسی روگی کو ہاتھ لگا دیں تو اس کا روگ کٹ جاتا اور روہ بھلا چنگا ہو جاتا ہے حالانکہ وید، حکیم، ڈاکٹر اس روگ کو علاج قرار دے دیتے ہیں۔ دادا مجھے س گیک کارشی کہتا ہے تو کیا میں تارا کا کشت دور نہیں کر سکتا؟

اس کے ساتھ میرے من میں تارا کے لئے زبردست بھاؤ پیدا ہوا اور یوں لگا وہ اپنی موتی

یوں تو یہ پورا سنار بڑا سندر ہے مگر کائنات کے ہر انگ اور ہر رنگ کو الگ الگ دیکھا جائے تو سندرتا کا نیا جلوہ نظر آتا ہے، شفق کی سرخیوں، شام کے جھپٹوں، چاندنی راتوں، ستاروں کے بے ترتیب جھرمٹوں، آکاش کی نیلاہٹوں، اندنی گھٹاؤں، دھنک کے رنگوں، گہری جھیلوں، گھنے جنگلوں، چونکتی ہر نیوں، اڑتے پنچھیوں، گاتے جھرنوں، بستے چشموں، لہلہاتے پودوں، شبنم کے لرزے قطروں، سورج کی تڑپتی شعاعوں، بند کلیوں، چٹکتے غنچوں، مہکتے پھولوں میں حسن ہی حسن دکھائی دیتا ہے، صرف دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا دل ہونا چاہیے، نیچر اپنی سندرتا کا ہر پہلو آشکار کرتی اور دیکھنے والے کو دعوت مطالعہ دیتی ہے، میں نے نیچر کے انگ انگ کو بڑے دھیان سے دیکھا اور اس کے حسن و جمال کا ادراک کیا ہے، یہی وجہ ہے حسین قدرت کا مطالعہ اور مشاہدہ ہمیشہ میرے من کو ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے مگر نیچر کے مشاہدے اور اس کی سندرتا کا گیان حاصل کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس ساری سندرتا کی معراج عورت کی تخلیق ہے۔

قدرت نے جسے لوگ خدا اور ایشور بھی کہتے ہیں، کائنات کی تمام خوبصورتیاں، آکاش اور دھرتی کی ساری لطافتیں سندرتا، ناری کی ذات میں جمع کر دی ہیں، اس کے شریر کی قوسوں، علامتوں، صباحتوں کو حسن و خوبی کا سرچشمہ بنایا اور ان میں کائنات کا ہر رنگ بھرا ہے۔

اس نے سندر عورتوں کی زلفوں میں کالی راتوں کی سیاہی اندیل دی، آنکھوں کو جھیلوں کی گہرائی اور کشش عطا کی، عارضوں پر پھولوں کی صباحت اور چاندنی کی راحت نچھاور کی، غنچوں کی طرح نیم وا ہونٹوں کو شفق کی سرخی بخشی، بدن میں دھنک کی سی قوتیں اور رنگینیاں پیدا کیں، چال میں ہر نیوں کا رم دیا، بات میں گاتے جھرنوں کی موسیقی بکھیر دی، غرض کائنات کی ساری خوبیاں، تمام دلکشیاں عورت میں جمع کر دیں، اس لئے میں حسین عورت کو قدرت کا شاہکار سمجھتا اور جانتا ہوں کہ دنیا کے تمام بڑے آدمی ناری کی سندرتا کو حسن اعلیٰ کا نمونہ قرار دیتے ہیں، اس لئے میں بھی اس کتاب جمال کو پڑھتا اور اس کے مطالعے میں ڈوب جاتا ہوں۔

اس رات جب سندرتی ایک کتاب کی مانند میرے سامنے کھلی تھی اور اس کا پریم مجھے ایک نیا گیان دے رہا تھا، اچانک میرے ذہن میں ایک نیا دور کھلا اور مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میں صرف سندرتا کا پجاری نہیں کچھ اور بھی ہوں، قدرت نے اگر میرے من میں حسن کی کشش رکھی ہے تو خود مجھے بھی سوشل بنایا، مردانہ کشش سے نوازا اور وہ ساری صفات عطا کی ہیں، جن پر عورتیں مرتقی ہیں، اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ جس طرح اخلاق کی دولت خرچ کرنے سے بڑھتی ہے، اسی طرح پیار کی دولت بانٹنے سے دگنی، تگنی ہو جاتی ہے، مجھے بھی پیار کی دولت بانٹنے رہنا چاہیے۔

موٹی آنکھوں میں میری تصویر لیے میرے من میں اتر آئی ہے۔

دوسرا دن بیاہ کے جشن کا تھا مگر دیر تک سوتا رہا، تارا ہی جگانے آئی، میری آنکھ کھلی تو قریب ہی کھڑی تھی بولی۔

”اٹھیے صاحب! گیارہ بج گئے۔“

”ارے.....“ میں نے ہڑ بڑا کے گھڑی دیکھی واقعی گیارہ بج چکے تھے پھر تارا کی طرف دیکھا، ”آج اتنی دیر سویا رہا پہلے کیوں نہیں جگایا؟“

”مالکن نے کہا تھا آپ دیر سے سوئے ہیں دیر سے جاگیں گے۔“

”اور تمہاری مالکن کہاں ہے؟“

”رسوئی میں، آپ کے لیے ناشتہ بنا رہی ہیں۔“

ساتھ ہی اس نے میرے سلیپر سیدھے کر کے رکھے اور کہنے لگی۔

”آج آپ کے بیاہ کا منڈل رچے گا، اٹھ کر اٹھان کر لیں۔ میں نے پانی گرم کر دیا ہے۔“

”بیاہ رچے ڈیڑھ مہینے سے اوپر ہو گیا، بیاہ کا منڈل آج رچے گا۔“

”کچھ باتیں دکھاوے کی ہوتی ہیں، بیاہ بے شک پہلے ہو گیا تھا مگر اس کا دکھاوا آج ہو گا۔“

میں سلیپر پہنتا ہوا اٹھا اور تارا سے ٹکراتے ٹکراتے بچا، سنبھلا تو اس کی آنکھوں میں جھانکنے

لگا، حیران سی بولی۔

”میری آنکھوں میں کیا دیکھ رہے ہیں صاحب؟“

”اپنی تصویر۔“

وہ دھیرے سے مسکرا دی میں نے پوچھا۔

”کیا میری تصویر آنکھوں پہر آنکھوں میں لیے پھرتی ہو؟“

اس کے ہونٹ پٹکھڑیوں کی طرح ہلے۔ ”ہاں“

”جھوٹ، میں سامنے سے ہٹ جاؤں تو میری تصویر مٹ جائے گی۔“

تارا نے سرگوشی کی۔ ”جو تصویر من میں بس جائے وہ کبھی نہیں مٹتی۔“

میں پہلے ہی جانتا تھا، وہ میری تصویر اپنے من میں اتار چکی ہے یہ بات اچھی تھی یا بری مگر

میں چونکا ضرور۔ اسے حیرت سے دیکھا، میری نظریں اس کے سندول نیپالی جسم میں اترنے لگی

تو اس نے گھبرا کے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چلیے نا دیر ہو رہی ہے، پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

مگر اس کا ہاتھ گرم تھا، میں چپ چاپ ساتھ ہولیا، وہ مجھے صحن میں لے آئی اور غسل خانے

تین چھوڑ گئی، کھوئی پر ایک نیا قیمتی جوڑا لٹک رہا تھا یقیناً یہ جوڑا سندرمی لے کر آئی ہوگی، نہانے

کے بعد میں نے نئے کپڑے پہنے اپنے کمرے میں آیا اور بالوں میں کنگھا کر رہا تھا کہ سندرمی

داخل ہوئی، مجھے نئے جوڑے میں دیکھا تو اس کے چہرے پر دھنک سی بکھر گئی۔

”کتنے سمارٹ لگ رہے ہیں، اب چل کے ناشتہ کر لیں، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

میں حیران ہوا۔ ”پہلے پانی ٹھنڈا ہو رہا تھا، اب ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”پانی تارا نے گرم کیا تھا، ناشتہ میں نے بنایا ہے۔“

میں اس کے ساتھ کھانے کے کمرے میں آیا تو تارا میز پر ناشتہ لگا رہی تھی، گرم گرم پوریاں

بھاجی اور حلوہ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ تارا نے بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھایا، ناشتے سے فارغ ہو

کر میں نیچے جانے کیلئے اٹھا تو سندرمی نے روک دیا۔

”آج اس طرح تھوڑی جائیں گے نیچے۔“

”پھر کس طرح جاؤں گا؟“

”میرے ساتھ آئیے۔“

وہ مجھے پھر کمرے میں لے آئی۔ اپنے اٹیچی کیس سے زربقت کی ایک اعلیٰ اچکن نکالی جیسی

عام طور سے ریاستوں کے نواب اور راجے مہاراجے پہنتے ہیں اور بولی۔

”یہ اچکن پہن کر نیچے جائیے۔“

”میں حیران سا اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔“ ”کیا نواب اور راجہ بنادے گی مجھے۔“

”راجے اور نواب آپ سے مہان نہیں کیشی! میں نے شوق سے سلوائی ہے آپ کے لیے

پہن لیجئے نا۔“

پھر اس نے خود مجھے اچکن پہنائی، گلے کے بٹن بند کیے اور پکاری۔

”تارا! بھاگ کے آنا ذرا۔“

تارا بھاگی بھاگی آئی تو سندرمی نے پوچھا۔

”کیسے لگتے ہیں تیرے صاحب؟“

تارا نے مجھے زرق برق لباس میں دیکھا تو بھونچکی سی رہ گئی۔ اچکن کو دیکھنے کے بعد نظریں

میرے چہرے پر ٹک گئیں اور کپکپاتی آواز میں بولی۔

”سورگ کے راجہ اندر بھی اتنے سندرمی نہیں ہوں گے؟“

سندرمی مسکرانے لگی اور تارا نے آنکھیں بند کر لیں پھر انہیں دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ

لیا۔ ”وان پن کیجئے مالکن! کہیں نظر نہ لگ جائے صاحب کو۔“

سندرمی شاید مجھے راجہ اندر ہی کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ دیوتا کو نظر نہیں لگتی، میں ان

دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر پلٹا اور زینے کی طرف ہولیا۔

”مگر تم نے بولا تھا، تمہارے کو پٹنہ جانے کا گیان ہوا ہے۔“
 ”ہاں وشال جی! پٹنہ جانے کا گیان تو ہوا ہے پر گنجال کے بارے میں ابھی کوئی گیان نہیں ہوا۔“

ہم باتیں کرتے شامیانوں کے نیچے آگئے، کایا پٹنہ کا خیال تھا۔
 ”گنجال ہمارا دوستی ہے اور دوستی انتقام سے نہیں بچ سکتا۔“

اس کے ساتھ ہی گنجال کا ذکر ختم ہو گیا اور بیاہ منڈل کی بات چل نکلی، یہ بھی بتاتا چلوں آج دونوں سے (دوپہر اور شام) کا بھوجن سروپ جی کی طرف سے دیا جا رہا تھا اور کل دونوں سے کا بھوجن دادا نے اپنے ذمے لیا تھا۔

دوپہر کو چار گونگے بھکشو چوبارے سے دادا کی پاکی اتار لائے پاکی غلام گردش کی ڈیوڑھی سے نکل کر عین میں آئی تو میں نے دیکھا اس کے آگے آگے سندرمی سرخ رنگ کی بنارسی ساڑھی باندھے اور جوڑے پر سنہری مکٹ سجائے کسی راج کماری کی شان سے چلی آرہی ہے، اس کے ساتھ تارا تھی اور اس نے بھی ایک خوبصورت ساڑھی پہن رکھی تھی، مالکن اور داسی کی بجائے ان پردو سہیلیوں کا گمان ہوتا تھا۔

انہیں دیکھتے ہی گونا پر یوار کی عورتیں جھگھٹا کر کے سواگت کے لیے دوڑیں اور ادھر ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیوں کے گیت کی لے بھی اونچی ہو گئی، عورتیں سندرمی کو اپنے حلقے میں لیے پنڈال کے قریب آئیں تو سروپ جی آگے بڑھے بیٹی کو لے کر کایا پٹنہ اور وشال رائے کے پاس آئے اور تعارف کرایا، سندرمی نے پر نام کیا۔ انہوں نے اشیر داد دی۔ دونوں نے پہلی بار ساڑ پر یوار کی وارث کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے وہ بنارسی ساڑھی میں بڑی سندرا اور انوپ اور بے مثال لگ رہی تھی۔

مجھے اور سندرمی کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ دادا ہمارے درمیان بیٹھے ڈھولک کی تھاپ تھم گئی اور گیت کی لے ٹوٹ چکی تھی، مہمان اور ساڑ گاری کے باسی مرد، عورتیں، کنواریاں، لڑکے بالے سبھی منڈل میں موجود تھے، میں نے پہلے کبھی ساڑ گاری میں اتنی تعداد اور ایسی رونق نہیں دیکھی تھی، ہمارے بعد سروپ جی اسٹیج پر آئے جسے ایک لمبی چوڑی مسند کہنا چاہیے، انہوں نے بتایا کہ کس طرح ڈیڑھ ماہ پہلے میرا اور سندرمی کا لگن کر دیا گیا تھا مگر لگن کا اعلان اس لئے نہ کیا گیا کہ ابھی رنگامتی سے میری چاچی ماں کی آگیا کا انتظار تھا اور چاچی ماں نے چونکہ سندرمی کو اپنی بہو سو بیکار کر لیا ہے، اس لئے لگن کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

دادا نے اپنی پرانی بھاشا اور مخصوص لہجے میں بتایا۔

”سندرمی اور تھارو کیشپ کا لگن میں نے کیا تھا اور بیاہ کے اشلوک پڑھے تھے۔“

نیچے آئے تو ساڑ گاری کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ اس کے وسیع و غرض صحن کے وسط میں دریاں چھٹی تھیں، اوپر شامیانے لگے تھے اور چاروں طرف رنگ رنگ کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں، یہ جھنڈیاں ساڑ گاری کے چوہیر پوری غلام گردش کے ساتھ ساتھ آراستہ کی گئی تھیں جنہیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا یہ قلعہ نما عمارت غالباً صدیوں کے بعد اس طرح سجائی گئی ہے مگر مجھے بعد میں پتہ چلا کہ برتیسرے سال یہاں ایک تہوار منایا جاتا ہے اور تہوار کے بعد جھنڈیاں سنبھال کر رکھ لی جاتی ہیں۔

ساڑ گاری کے صحن میں بڑی چہل پہل تھی، سروپ جی، گونا کھیا پیگو اور شاسترو کے ساتھ منڈل کے انتظامات میں مصروف اور کام کاج کی نگرانی کر رہے تھے، ساڑ گاری کے کبھی باسی کسی نہ کسی کام میں محو تھے، مدایا سمیت ساتوں گونگے بھکشو ایک جگہ بیچ تیار کر رہے تھے، کایا موسا، وشال رائے، چان، کالی ناتھ اور کریم بھی وہیں نظر آئے، شامیانوں کے پیچھے قناتوں کی چار دیواری کھڑی کر کے رسوئی گھر بنالیا گیا تھا۔ ساڑ گاری کا رسو بیاہ اور گونا پر یوار کی کچھ عورتیں اس چار دیواری کے اندر پکوان تیار کر رہی تھیں۔ اسی جانب چار پانچ جوان لڑکیاں بیٹھی ڈھولک کی تھاپ پر آسام کی قبائلی بھاشا میں گیت گارہی تھیں۔ پہاڑی ویرانے کی یکاوتہا عمارت میں جہاں کوسوں کوئی بستی، کوئی آبادی نہ تھی، یہ ڈھولک گیت اور بیاہ کا ہنگامہ بڑا حیرت انگیز اور جنگل میں منگل کا سماں پیش کر رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر سروپ جی، گونا کھیا، کایا پٹنہ اور وشال رائے ایک ساتھ میری طرف لپکے اور بقاعدہ میرا سواگت کیا۔ سروپ جی نے ایک نئی خبر سنائی۔

”مندر کے دونوں سادھورنگا اور ہولا غائب ہیں، تلاش کے باوجود ان کا کوئی کھوج نہیں ملا۔“
 ”انہیں غائب ہونا ہی تھا، آج نہ ہوتے، کل ہو جاتے، پروہت گنجال کے مہرے تھے اس کی بساط الٹی تو مہرے بھی غائب ہو گئے۔“

”مگر دادا ہٹ کر رہے ہیں کہ گنجال کو ڈھونڈ کر لایا جائے۔“
 ”سانپ نکل چکا اب لکیر پیٹنا باقی ہے۔“
 ”گنجال کے بغیر دادا بڑے بے کل ہیں۔“
 ”دادا سے کہہ دیں اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔“

وشال رائے میری باتیں سن کر پریشان ہو رہا تھا۔ ”کیشپ بابو! ہمارے کو صاف صاف بولو، وہ ملے گا یا نہیں؟“

”سانپ نے بل بدلا ہے، نیا بل ڈھونڈنا پڑے گا۔“

گونا پر یوار کی لڑکیوں، عورتوں نے مل کر ناچ کیا، گانے گائے۔
یہ بھی بیاہ منڈل کی سرگزشت۔

دوسرا دن سندرمستی کے گربھ جشن کا دن تھا اور اس جشن کا اصل میزبان بڑھا سا گرساؤ جی تھا۔ دونوں کھانے اس کی طرف سے دیئے گئے، اس نے منڈل میں بھاشن دیا کہ ساؤ پر یوار کی نسل اب سندرمستی سے چلے گی۔ اس کے سات بیٹے ہوں گے اور اسی خوشی میں پہلے گربھ کا جشن منایا جا رہا ہے۔ گربھ جشن کا سب سے خاص پروگرام تارا کا ناچ تھا جو صرف میرے سامنے کیا جانے والا تھا اس ناچ کے لیے مندر کے عقب میں ایک کمرہ مخصوص کیا گیا اور مجھ سے فرمائش کی گئی کہ جب سارے لوگ شام کے بھوجن میں مصروف ہوں میں تارا کا ناچ دیکھنے مندر کے عقبی کمرے میں پہنچ جاؤں تارا کو اپنے ناچ سے مجھے مگن کرنا تھا مگر میں نے اس پروگرام میں تبدیلی کر دی، رکھا۔

”بھوجن کے بعد تارا شامیانی کے نیچے سب کے سامنے ناچے گی اور یہیں اس کا ناچ دیکھوں گا۔“

یہ تبدیلی دادا، سندرمستی اور پیگو کے لیے اچھا تھا مگر یہی آکاش کا یا کا فیصلہ تھا، ساگر ساؤ جی کی پراسرار ودیا ہار گئی۔ شام کا بھوجن ختم ہونے کے بعد منڈل کو تارا کے ناچ کی خاطر پھر سے آراستہ کر دیا گیا اور دادا نے اعلان کیا۔

”اس گربھ جشن کے لئے میں نے تارا کو ناچ رنگ کی آگیا دی ہے تاکہ اس کا گربھ کشت دور ہو۔“ میری تین شادیوں کی طرح یہ اعلان بھی بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا اور سارے لوگ کیا عورتیں، کیا مرد مسند کے سامنے قوس نما دائرہ بنا کر بیٹھ گئے دادا کی پاکی مسند کی دائیں جانب رکھی تھی، جس کے ساتھ سروپ جی، سندرمستی، پیگو اور شاسترو تھے اور بائیں طرف کایا پنتھا، وشال رائے، چان، کالی ناتھ اور کریم تھے۔ ڈھولک طبلہ اور بانکیا بجانے والے چاندنی پرالگ تھلگ بیٹھے تھے جہاں تارا کو ناچنا تھا۔ یہ چاندنی تماشاویوں کے قوس نما دارے اور مسند کے درمیان پیچھے تھی، مسند پر میں تنہا تھا اور اس منڈل میں خود کو یا اپنے اندر کے دیوتا کو ڈھونڈ رہا تھا۔

جونہی باجے اور ڈھولک کی آواز ابھری نہ جانے تارا اچانک کہاں سے نکل کر ناچ منڈل میں نمودار ہوئی میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

اس نے اندر سبھا کی اپسراؤں کی طرح آسمانی رنگ کی ریشمی دھوتی کا پلو اپنی پشت پر اس طرح اڑس لیا تھا کہ دھوتی اس کے بھاری کولہوں اور سڈول ٹانگوں سے پیوست ہو کر رہ گئی تھی۔ بدن پر اسی رنگ کی چولی تھی، پاؤں میں گھنگر و ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے، کانوں میں سونے کے بالے جو جھل کر کبھی گردن سے کبھی گالوں سے ٹکراتے تھے، بالوں کا جوڑا پیچھے کی بجائے سر

بوز سے ساگر ساؤ جی کی گواہی گویا سرکاری تمسک اور وثیقے کی حیثیت رکھتی تھی، جس کے بعد کسی مزید وضاحت یا گواہی کی ضرورت نہ تھی، کایا پنتھا اور وشال رائے دونوں ایک ساتھ اٹھے۔ انہوں نے شگن اور سلامی کے روپے سندرمستی اور میرے قدموں میں ڈھیر کر دیئے، سروپ جی نے دونوں مہمانوں اور ان کے ساتھیوں کو پارچات تحفے میں دیئے اور ان سے میرا ناتا ظاہر کر کے ساؤ گاری کے باسیوں کو حیران و ششدر کر دیا۔ انہوں نے بتایا۔

”جل پنا جو ساؤ گاری کے مندر میں بھگوان کی زنتکی تھی، برما کے زمیندار کایا پنتھا اور تھارو کیشپ کی موسی چندر بالا کی بیٹی ہے جس کی منگنی بچپن ہی میں کیشپ سے ہو گئی تھی اور سندرمستی کی طرح وہ بھی دلہن بنے گی، وشال رائے نے بھی اپنی بیٹی منجوری کو تھارو کیشپ کے ساتھ بیاہنے کا فیصلہ کیا ہے اور دادا نے، میں نے، سندرمستی نے ان رشتوں کی آگیا دے دی ہے۔“

یہ اعلان بڑا سنسنی خیز تھا کہ سندرمستی کے بعد جل پنا اور منجوری کا بھی ہونے والا پتی ہوں، عورتیں مرد سب بھونچکے سے رہ گئے کیونکہ ایک ساتھ تین شادیاں ہندوستانی سانچے کے خلاف تھیں حالانکہ اگلے وقتوں میں ایسا ہوتا رہا تھا اور رام چندر جی مہاراج کے پتاراجہ دسرتھ کی تین رانیاں تھیں، رام چندر، کچھن، بھرت تینوں سوتیلے بھائی اور کوشلیا، ستر اور کیکیٹی کے بطن سے تھے۔ دادا نے اوگوں کی حیرت اور سنسنی کو بھانپ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور کہا۔

”تھارو کیشپ بھگوان کا روپ، اس یگ کارشی اور دیوتا ہے، اس کا پختہ سوم اور اندر دیوتا سے ملتا ہے۔ دیوتاؤں کی طرح اس کے بڑے ادھیکار ہیں۔ دکش کی ستائیں بیٹیوں کی طرح اگر ساؤ پر یوار میں ستائیں سندرمستیاں ہوتیں تو میں سب کی سب تھارو کیشپ کے ساتھ بیاہ دیتا کیونکہ کیشپ کے اندر بھگوان ہے اور یہ ساؤ گاری کو تین صدیوں کے بعد نروان دینے آیا ہے۔“

بڑھے ساگر ساؤ جی کے اس بھاشن نے حیرت اور سنسنی کے پریم بھاؤ میں بدل دیا، وہ لوگ بڑھے پراندھا وشواس رکھتے اور سن چکے تھے کہ میری پرارتھنا سے سروپ جی کی جان بچی اور پروہت گنجال جو اپنی تپسیا اور دھرم شکتی میں مہمان مانا جاتا تھا، میرے مقابلے سے بھاگ گیا ہے، وہ مجھے رشی اور دیوتا سمجھنے لگے۔

سروپ جی نے ساؤ گاری کے تمام باسیوں میں نئے کپڑے بانٹے، دادا کی طرف سے روپے تقسیم کیے گئے، گونا پیگو اور شاسترو کو نئے جوڑے دیئے گئے۔ تارا کو نئی ساڑی کے ساتھ سونے کی بڑی بڑی بالیاں ملیں، تب کہیں دو پہر کا بھوجن تقسیم ہوا۔

شام کی دعوت سے پہلے ساؤ گاری میں چراغاں ہوا۔ گوٹ کی مانند پھیلی غلام گردشوں پر بے جھلملانے لگے، سندرمستی نے مندر میں دیئے جلائے، شامیانوں کے نیچے چھ گیس ایمپ

وہ خوش بھی ہوئی، حیران بھی ہوئی۔ میری بات کا مطلب نہیں بھی ٹرموئی موئی آنکھوں میں پیار کا نشہ ضرور تیر گیا۔ میں نے اسے اٹھایا اور مسند پر اپنی دائیں جانب بٹھالیا، پھر پیگو کو آواز دی کہ وہ بھی آجائے۔ پیگو آیا اور میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا، میں نے کہا۔
”پیگو اوپر آؤ اور میرے پاس بیٹھو۔“

وہ پریشان ہو گیا۔ ”میں داس ہوں مالک؟ آپ کے برابر کیسے بیٹھ جاؤں۔“
”بودھ دھرم میں کوئی اونچ نیچ نہیں، دیکھو تارا ابھی تو میرے ساتھ بیٹھی ہے۔“

وہ بدستور ہچکچا رہا تھا مگر دادا نے اشارہ کیا تو مسند پر آ گیا، میں نے اسے بائیں جانب جگہ دی، سب لوگ چپ چاپ، حیران و ششدر سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، اچانک میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں تارا کا ہاتھ اور بائیں ہاتھ میں پیگو کا ہاتھ پکڑا اور دونوں کے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیے۔ اس سے میرا من دیا اور پریم سے بھرا ہوا تھا اور مجھ پر ایک ایسی عجیب سی کیفیت طاری تھی جیسے میں پکھل رہا یا نیند میں اڑ رہا تھا پھر اس کیفیت میں بولنے لگا اور سب نے کان میری آواز پر لگا دیے، یوں کہا تھا میں نے۔

”اے ساؤ گاری کی بوڑھی دیوارو! اے ساؤ گاری کے باسیو! تم جانتے ہو جب چار برس پہلے کالے پہاڑ پر بجلی گری اس کی ہولناک کڑک سے تارا کا گر بھ پات ہو گیا اور یہ ماں بننے کا ٹن کھو بیٹھی تھی، میں نے بیماری کے بستر پر بھگوان سے پرارتھنا کی تارا کا کشت دور ہو، یہ ماں بنے مگر دادا کی ودیا کہتی ہے کہ میں تارا پر دیا کروں گا تو اس کا کشت دور ہو گا اور دادا نے یہ بھی کہا ہے میرا بچہ تارا اندر دیوتا کا بچہ ہے اور اندر کی طرح میرا سب پر ادھیکار ہے اگر میں دیوتا ہوں تو میرے اندر کا دیوتا کچھ اور کہتا ہے اور یہ ہے میرا گیان کہ جب ناری کسی کی پتی بن جاتی ہے اور سوتر منڈل پہن لیتی ہے تو اس پر پتی کے سوا کسی کا ادھیکار نہیں ہوتا، دیوتا کا بھی نہیں، بھگوان کا بھی نہیں کیونکہ ناری کا بھگوان اس کا سوامی ہے اور تنہا گت نے جہاں ناری جاتی کے لیے دھرم کا دوار کھولا، وہاں اسے گریہ کی سکھشا بھی دی اور کہا کہ اس کا چتر (چین) نزل اور ترشنا صرف اپنے پتی کے لئے ہو۔

تارا کا ناچ دیکھ کر میرے من میں اس کے لیے بڑا پریم بھاؤ پیدا ہوا ہے مگر ویسا ہی پریم بھاؤ جیسا کسی بھائی کی بیوی کے لئے ہوتا ہے اور آج سے پیگو داس نہیں میرا بھائی ہے کیونکہ تنہا گت کہتا ہے تم سب ایک دوسرے کے بھائی ہو، اس لئے اپنے من میں ایک دوسرے کا پریم بھاؤ رکھو اور ناریوں سے اچھا برتاؤ کرو۔ اس ناتے تارا مجھے پیاری ہے، میں اپنے من میں اس کے لیے دیا اور پریم کا کواڑ کھلا دیکھتا اور سب کے سامنے ایشور سے دیا مانگتا اور اس کی دہلیز پر اپنا سیس جھکا کر پرارتھنا کرتا ہوں کہ تارا کی گود ہری ہو اور پیگو کا گھر آباد ہو مجھے

کے عین اوپر باندھا تھا جس سے گردن کچھ اور سندر اور قامت کچھ پہلے سے بڑی لگتی تھی۔

ناچ منڈل میں آتے ہی تار نے دونوں ہاتھ جوڑ کے مجھے پر نام کیا پھر موسیقی کی دھن پر ہولے ہولے ناچنے لگی، اب مجھ پر دوسری حیرت طاری ہوئی، وہ تھاپ اور سم پر کسی مایہ نرنگی کی طرح توڑے لیتی، ناچ کے بھاؤ کا تکی اور ہر توڑے کا انت میرے قریب آ کے کرتی تھی، میں ناچ دیا کو جانتا اور اس کا کے سارے جادو بھید سمجھتا ہوں، مگر اس کے پیروں کی ہر جنبش مجھے بھی حیران کیے دیتی تھی، میں اس کے پہلے دو تین بھاؤ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ اس نے اندر سجا کا وہ ناچ شروع کیا ہے جس میں کوئی اپسرا اندر دیوتا کو اپنی سندر تار، جو بن اور ناچ رنگ سے مگن کرتی اور چاہتی ہے وہ اسے سویکار کرے مگر فرق صرف یہ تھا کہ اندر کے سکھاسن کی بجائے تارا کے سامنے مسند پر میں بیٹھا تھا اور سوزِ رگ کی اپسراؤں کی جگہ ساؤ گاری کے باسی اور مہمان اس کا ناچ دیکھ رہے تھے۔

تارا کے ناچ میں بڑی دلربائی، ناز، کرشمہ، لچک اور کشش تھی جس سے جذبات بھڑک اٹھتے تھے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ اتنا اچھا ناچ سکتی ہے۔ تارا ناچ مچ دلوں پر منتر پھونک رہی تھی، میں اس کے سندر، سڈول شری کے جھکاؤ، لہراؤ اور ناچ رنگ کے سحر آفرین بھاؤ دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ اس نے جذبات کے تار چھیڑ دیئے، میرے اندر سوئی ہوئی کلا کو جگا دیا۔ دل میں پریم ترنگ اٹھی اور میں سچ مچ مگن ہونے لگا۔

وہ آدھ گھنٹہ مسلسل ناچتی اور جادو جگاتی رہی مگر اس اثناء میں ایک بار بھی پاؤں غلط نہیں اٹھا جس سے میں اس کی مہارت کا قائل ہو گیا۔ ناچ کے آخری توڑوں میں لہرائی، اچھلتی میری جانب بڑھتی رہی حتیٰ کہ موج ہوا کی طرح گھومتی ہوئی مسند پر آ گئی اور میرے چرنوں میں ڈھیر ہو گئی، ساز تڑپ کر خاموش ہو گئے۔ لوگوں کی نظریں اس پر، مجھ پر جم گئیں دادا، سندر متی اور پیگو کے علاوہ کوئی بھی اس ناچ کی حقیقت نہیں جانتا تھا۔ جونہی تارا میرے چرنوں میں گری سندر متی کی نظروں نے دوڑ کر مجھے آلیا کہ اب میں دیا کا اظہار کس طرح کرتا ہوں کیونکہ دادا کی ودیا کے مطابق صرف میری دیا سے اس کا گر بھ کشت دور ہو سکتا تھا میں نے تارا کو جو اندر کی اپسرا ہی لگ رہی تھی دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور کہا۔

”تارا! اٹھ میں نے تیرا ناچ سویکار کیا۔“

اس نے گردن اٹھا کے مجھ سے آنکھیں چار کیں اور بڑی مدھم آواز میں جسے میں ہی سن سکتا تھا، پوچھا۔ ”اور مجھے.....“

میں نے سرگوشی کی۔

”تجھے بھی سویکار کیا مگر میرا پیار تجھے اپنے دوار سے ملے گا۔“

تھی، کہیں ناشتے میں دیر نہ ہو جائے کیونکہ رات ہی تاکید کردی تھی کہ سویرے جلدی ناشتہ کروں گا۔ مجھے دیکھ کر دروازے پر آئی اور کچھ سوچ کے بولی۔

”آج سے آپ کو ”تم“ کہوں یا ”آپ“؟“
میں حیران ہوا ”یہ تم“ اور ”آپ“ کی الجھن کیوں؟“
”دیور کا نانا تا جو نکالا ہے آپ نے۔“

پھر ”تم“ ہی کہا کرو۔“

”اچھا نہیں لگے گا۔“

”کیوں؟“

”آپ دیور بھی ہیں، دیوتا بھی ہیں۔“

”جو تمہیں اچھا لگے، وہی کہو۔“ اچانک مجھے کچھ یاد آیا تارا؟ رات میں نے کچھ کہا تھا تم سے۔“ وہ شرمائی پھر آہستہ سے بولی۔

”آپ کا کہا مان چکی ہوں۔“ ساتھ ہی بات بدل دی۔ ”میں نے پانی گرم کر دیا ہے، اشان کر لیں۔“

میں غسل خانے میں گھس گیا جب نہا کر باہر نکلا تو سروپ جی دکھائی دیے جو بڑے گھبرائے گھبرائے صحن میں داخل ہو رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی بولے۔

”غضب ہو گیا کیشپ!“

”کیا ہوا پتا جی، آپ بڑے پریشان ہیں؟“

”رات مدایا کو سانپ نے ڈس لیا۔“

میرے دل کو دھچکا لگا۔ ”کہاں ہے مدایا؟“

”اپنی کوٹھڑی میں مرچکا ہے بے چارے میں نے پیگو کو بھیجا ہے۔“

مجھ پر جیسے بجلی گری، مدایا کی موت کا سن کر دل رونے لگا، ہماری باتیں سن کر سندرمی اور تارا بھی صحن میں نکل آئی تھیں، دونوں دل تھام کے رہ گئیں، ساؤ گاری کے ساتھ گونگے بھکشوؤں میں مدایا ہی کو سب سے زیادہ پسند کیا جاتا تھا، ایک پل ٹھہر کے میں نے کہا۔

وہ تین راتوں سے کالی ناتھ اور کریم والے کمرے میں سویا کرتا تھا، کوٹھڑی میں کیسے چلا گیا؟“

”شاستر بتاتا ہے رات ناچ منڈل سے نکل کر اس نے کوٹھڑی کا رخ کیا تھا، سویرے اسی نے مدایا کی لاش دیکھی اور مجھے خبر کرنے دوڑا“ سروپ جی نے جو کچھ سنا تھا بتانے لگے۔ ”شاید سانپ پہلے سے اس کی کوٹھڑی میں بیٹھا تھا وہ اندر داخل ہوا تو اس نے ڈس لیا۔ شاستر کہتا ہے کہ مدایا آدھا دروازے کے اندر، آدھا دروازے کے باہر پڑا تھا۔“ اچانک سندرمی بولی۔

وہ اس ہے کہ ایسا ہو گا۔“

یہ کہہ کر میں نے تارا اور پیگو کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور ان دونوں نے میرے چرنوں پر اپنا اپنا سر رکھ دیا، میں نے تارا کو اٹھایا اور اس کے کان میں ایک بات کہی، اس نے موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

”کیا آج رات“

”ہاں، آج ہی رات“

وہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر پرے ہٹ گئی، میں اٹھا کیونکہ ناچ رنگ کے بعد میرا گیان اپدیش بھی ختم ہو گیا تھا، پیگو کے کندھے کا سہارا لے کر اسٹیج سے اترتا تو اسی لمحے پیگو سے بھی سرگوشی کی اور اسے تاکید کر کے آگے بڑھ گیا، جہاں سندرمی بے چینی کے ساتھ میری منتظر تھی۔

غالباً پڑھنے والے سمجھ گئے ہوں گے میں نے تارا کے کان میں کیا کہا، پیگو سے کیا سرگوشی کی کیونکہ بعض راتیں مردوں کے لئے بڑی مبارک ہوتی ہیں اور وہ رات بھی مبارک تھی۔

اس اثناء میں میرے آس پاس کچھ مردوں، کچھ عورتوں کا جھگھٹا ہو گیا جو میری اشیر واد چاہتے تھے، ان میں مدایا بھکشو بھی تھا۔ ہونا شاستر بھی تھا، میں نے محسوس کیا کہ مدایا کا شریر ہولے ہولے کانپ رہا ہے اور شاستر کی آنکھوں میں عقیدت کا سا گر لہریں لے رہا ہے، اسی سے چار گونگے بھکشوؤں نے دادا کی پاکی اٹھائی، سندرمی نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پاکی کے ساتھ ساتھ چل دی، میں نے پلٹ کر دیکھا، تارا اور پیگو بھی ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے مگر سروپ جی، کایا پتھا، وشال رائے، اور گونا کھیا شامیانوں کے نیچے گیس لیمپوں کی دودھیا روشنی میں کھڑے باتیں کر رہے تھے اور ساؤ گاری کے باسی ستاروں کی طرح ہولے ہولے بکھرنے لگے تھے۔

سندرمی مجھے لے کر اپنے کمرے میں آئی اور آتے ہی ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر کے اپنے مخصوص انداز میں کھڑی ہو گئی اور بولی۔

”دیوی کا نمسکار قبول ہو، آپ نے تارا کو بڑا مان دیا، سچ مچ دیوتا ہیں آپ۔ بڑے مہان، بڑے اونچے، میری سوچ سے بھی اونچے۔“

میں نے آگے بڑھ کے سندرمی کو بازوؤں میں بھر لیا، اس نے اپنی آنکھیں ہولے ہولے کھولیں جیسے دھیرے دھیرے پو پھٹتی اور روشنی ہوتی ہے، ان آنکھوں میں روشنیوں کا سیلاب تھا۔

میں روشنیوں کے اس سیلاب میں بہنے لگا۔

دوسرے دن ساؤ گاری سے روانگی تھی، میں سورج نکلتے ہی جاگ گیا تاکہ نہا دھو کر تیار ہو سکوں، سندرمی کو بستر پر چھوڑ کر صحن میں نکلا تو تارا سوئی میں بھوجن تیار کر رہی تھی، اسے چنتا

اس ناگہانی حادثے سے ہمارا سفر بھی کچھ دیر کے لیے ملتوی ہو گیا کیونکہ اپنے پیچھے ایک لاش کو چھوڑ کر سفر کرنا ٹھیک نہ تھا، تاہم مدایا کی ارٹھی فوراً ہی شمشان میں پہنچا دی گئی جو ساؤ گاری کی قلعہ نما فصیل سے صرف ایک فرلانک پر اتر کی جانب تھا، اس شمشان میں تین صدیوں سے ساؤ پر یوار کے پرکھوں اور ساؤ گاری میں رہنے والے دوسرے لوگوں کی ارٹھیاں جلی تھیں، لیکن نہیں جلی تھی تو اجل بدوش بڑھے ساگر ساؤ جی کی ارٹھی، میں نے سوچا تھوڑے دنوں میں پھر اس شمشان میں آؤں گا اور میرے کندھے پر بڈھے کی ارٹھی ہوگی۔

مدایا کی چتا کو آگ لگانے کے بعد ہم افسردہ و غمگین ساؤ گاری میں لوٹ آئے، گونا پر یوار کی عورتیں بین ڈال رہی تھیں۔ ماتم کر رہی تھیں، ان کی ماتمی آوازوں نے ماحول کو مزید غمناک کر دیا، سروپ جی کہنے لگے۔

”میرے خیال میں آج سفر ملتوی کر دیا جائے۔“

وشال رائے نے جواب دیا۔

”اب ہمارے کومت رو کو سروپ جی، گنجال نے مدایا کو سانپ سے ڈسوا یا ہے یا نہیں مگر میرے کو پتہ ہے وہ مدایا کا بیری تھا اور اپنے کو اسی پاپی کے کھوج میں جانا ہے۔“

وشال رائے کو مدایا بھکشو کے مرنے کا گہرا دکھ ہوا تھا، دونوں چند ہی دنوں میں ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے تھے، وشال رائے سن چکا تھا کہ مدایا نے روپ تارا سے پریم کیا اور اسے ساؤ گاری سے نکالنے کے جتن کر رہا تھا کہ گنجال نے زہریلی دوا پلا کر اس کی جان لے لی، مدایا نے سب کے سامنے گنجال کو روپ تارا کی موت کا دوشی ٹھہرایا تھا، اسی کارن وشال رائے مدایا کی موت پر ٹپ اٹھا کیونکہ گنجال نے اس افشائے راز کی سزا دی تھی۔

میرادل بھی بے حد اداس اور ساؤ گاری سے نکلنے کو بے چین ہو رہا تھا میں نے وشال رائے کی تائید کی اور بتایا کہ ہم آج ہی چلے جائیں گے۔

ابھی تک کسی نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا پیگو کھانا لے آیا تھا میں نے کایا موسا اور وشال کے ساتھ چند نوالے کھائے اور سندرمی سے رخصت ہونے اوپر پہنچا، وہ پروہت گنجال کے بارے میں اچھی رائے نہ رکھتی تھی مگر ذرتی تھی کہیں سفر کے دوران وہ مجھ پر وار نہ کرے، میں نے اسے تسلی دی کہ گنجال اور اس کے سانپ میرا راستہ نہیں روک سکتے، تارا بھی کچھ کھوئی کھوئی تھی، میں نے پیگو کو تاکید کہ وہ تارا کا پہلے سے زیادہ خیال رکھے، اس نے جواب دیا۔

”آپ لوٹ کر آئیں گے تو تارا کو پہلے سے زیادہ خوش پائیں گے۔“

پھر اس نے میرا پیچی کیس اٹھا لیا، میں سندرمی اور تارا سے رخصت ہو کر نیچے آیا تو سروپ جی مجھے گوجی ساؤ کے مجسمے کے قریب مل گئے، انہوں نے ایک بڑی رقم میرے حوالے کی اور بولے۔

”پتا جی ساؤ گاری میں تو کبھی سانپ نہیں دیکھا گیا۔“

”مگر کیشپ نے انا تھ بن کے شیش ناگ کو ساؤ گاری میں دیکھا تھا۔“

وہی بوڑھا چتکبرا سانپ میری نظروں میں لہرانے لگا جس سے باؤلی کی سرنگ میں دوبار میرا آنا سامنا ہو چکا تھا، میں بے اختیار چلایا۔

”مدایا کا خون گنجال نے کیا ہے۔“

سروپ جی، سندرمی، تارا کے چہروں پر حیرت کے سائے گزرنے لگے میں نے بتایا ”سانپ کو اسی نے مدایا کے پیچھے لگایا تھا۔“

”کیا کہہ رہے ہو۔“ سروپ جی بڑے پریشان تھے۔

”ٹھیک کہتا ہوں پتا جی! مدایا نے مجھے بتایا تھا کہ پہاڑی خانقاہ سے واپسی کے بعد گنجال نے اسے دھمکی دی تھی اگر میرے خلاف زبان کھولو گے تو سانپ تمہیں ڈس لے گا مدایا نے انا تھ بن کے پہاڑی کھڈ میں گنجال کو سانپ سے باتیں کرتے سنا تھا۔“

یہ ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا، جس نے انہیں ششدر کر دیا۔

”سانپ آدمی کا متر نہیں ہوتا تھا رو کیشپ!“

”مگر انا تھ بن کے شیش ناگ اور پروہت گنجال میں دوستی تھی۔ سانپ اس کی چوکیداری کرتا اور اس کا کہا مانتا تھا۔“

اس بات نے سندرمی اور تارا کو دم بخود کر دیا۔ سروپ جی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو، آؤ میرے ساتھ۔“

میں ان کے ساتھ زینے کی طرف ہولیا، ہم نیچے آئے تو کایا پتھا اور وشال رائے کو بھی یہ المناک خبر سنائی، دونوں سن سے ہو گئے اور ہمارے ساتھ چل دیے، مدایا کی کوٹھڑی مندر کی عقبی راہداری میں تھی۔ پیگو، شاسترو، چھ گونگے بھکشو وہاں پہلے سے موجود تھے۔ مدایا کی لاش کھاٹ پر ڈال کے چادر سے ڈھک دی گئی تھی، میں نے جاتے ہی چادر ہٹائی تو اس کا جسم پھول کے نیلا پڑ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا، سانپ کا زہر جسم کے ریشے ریشے میں سرایت کر چکا ہے کوٹھڑی کے گرد آلود فرش پر موٹی موٹی لکیریں بھی دیکھیں اور وہ انا تھ بن کے چتکبرے ہی کی ہو سکتی تھیں سروپ جی نے لکیریں دیکھیں، مدایا کے پھولے ہوئے مردہ شریر کو دیکھا اور بولے۔

”بڑا تیز زہر تھا، لگتا ہے شریر پھٹ جائے گا۔“

”پتا جی! لاش کو جلد شمشان میں پہنچا دینا چاہیے۔“

سروپ جی خود یہی سوچ رہے تھے، انہوں نے گونگے بھکشوؤں کو کرایا کرم کرنے کا حکم دیا۔

مدایا کی المناک موت کی خبر آنا ساؤ گاری میں پھیل گئی، جس نے سامندر کی طرف دوڑا

”بھگوان کرے تم اپنے سفر سے کامیاب لوٹو۔“

پھر میرے ساتھ ہی پلٹے، کایا پتھا، وشال رائے، چان، کالی ناتھ، کریم سفر کے لئے تیار تھے۔ سروپ جی نے ہمارے لیے رپا تک چار گھوڑوں اور سائیسوں کا بندوبست بھی کر دیا تھا، ہم ساؤ گاری کے واحد پھانک پر پہنچے، جہاں سائیس گھوڑے لیے کھڑے تھے، تو وشال رائے نے سروپ جی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”سروپ جی! تم اپنے پرکھوں کے کارن اس ویرانے میں رہتے ہو پر اپنے کو سندرمتی بیٹی کا یہاں رہنا اچھا نہیں لگا، کیشپ بابو کے ساتھ ساتھ اب کایا پتھا اور میرے کو بھی یہی چننا ہے کہ تمہارے کو یہاں سے نکال کر اپنی دنیا میں لے جائیں۔“

”وشال رائے میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

پھر سروپ جی نے ایک ایسی بات کہی جس نے ہمارے شریر میں سنسنی پیدا کر دی۔

”پٹنہ جا رہے ہو، بودھ گیا بھی جانا، شاید گنجال وہیں مل جائے۔“

یہ سنتے ہی وشال رائے اچھل گیا۔

شاستر اس بار میرے جدا ہونے پر بڑا بے چین تھا، مدایا بھکشو کی موت کے بعد اس کا یہ وہم کچھ اور پکا ہو گیا تھا کہ انا تھ بن کاشیش ناگ ہی گنجال ہے، میں نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔

”سانپ تمہاری کوٹھڑی میں نہیں آئے گا۔“

پھر پیگو نے مجھے گھوڑے پر سوار ہونے میں مدد دی اور میں تیسری بار ساؤ گاری سے روانہ ہوا۔

○○○

(35)

انیلا مورتی

سروپ جی نے گنجال کے بارے میں جو بات کہہ دی تھی اس نے ہمارے سفر میں ایک نئی کشش پیدا کر دی اور ہم چاہتے تھے اڑ کر پٹنہ اور بودھ گیا پہنچ جائیں مگر شام کو بمشکل رپا پہنچ سکے۔ بودھ سرائے کے منتظم نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ سفر طویل ہو تو آدمی رستے میں پڑاؤ بھی کرتا ہے، ٹھہرتا بھی ہے مگر دوسرے دن ہم رپا سے بائی پارہ پہنچے اور ریل میں بیٹھے تو کہیں ٹھہرے نہیں، رکے نہیں، دن بھی سفر میں کٹا، رات بھی گاڑی میں بیتی، کوچ بہار سے ہوتے ہوئے دوسرے دن ہم صوبہ بہار میں داخل ہوئے اور آخر پٹنہ کے تاریخی شہر میں پہنچ گئے۔

پٹنہ یا پائلی پتر کسی زمانے میں بودھوں کا سب سے بڑا شہر تھا اور اب بھی بودھ یادگاروں کے لیے مشہور ہے، یہ صوبہ بہار کی راجدھانی ہے، بہار کا جنوبی علاقہ آج بھی مگدھ یا مگھا کہلاتا ہے صوبہ بہار اور پٹنہ میں مگھا کی بولی ”مگدھ بھاشا“ بولی جاتی ہے۔ گیا جہاں شاکیہ منی گوتم سدھارتھ کو گیان اور نروان عطا ہوا، پٹنہ سے جنوب کی طرف واقع ہے جو بودھوں کا سب سے بڑا تیرتھ اور بودھ مندروں کا شہر ہے اسی رعایت سے اسے بودھ گیا بھی کہتے ہیں۔

یہ بھی بتاتا چلوں کہ پٹنہ گنگا کے جنوبی کنارے آباد ہے۔ گنگا ندی پچھم سے پورب کو بہتی ہے پٹنہ سے پچھم کی طرف آگے آباد میں گنگا اور جمنا کا سنگم ہوتا ہے اور دونوں ندیاں مل کر بہتی ہیں گھاپرا کے قریب گاگراندی بھی ان میں شامل ہو جاتی ہے اور پٹنہ میں گندک ندی اتر سے آ کر گنگا سے ملتی ہے، گویا پٹنہ سے چار ندیوں، چار دریاؤں کا پانی گزرتا ہے، اس لئے یہاں دریا کا پاٹ قدرتی طور پر چوڑا ہو گیا ہے۔

پٹنہ میں بودھ مندر، ہندو مندر، جین مندر بکثرت ہیں مگر اس شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بنارس کی طرح یہاں بھی کئی مندر، کئی عمارتیں دریا کنارے واقع ہیں۔ یا تری اشنان بھی کرتے ہیں اور پوجا پاٹ بھی، مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ رہتے ہیں، مثلاً ہندو، بودھ، جینی، مسلمان، عیسائی مگر اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ ہم نے ایک بودھ ہوٹل میں قیام کیا مگر یہ معلوم نہ تھا یہاں کیا کرنا اور کہاں جانا ہے؟ مجھے تو سپنے میں پائلی پتر (پٹنہ) بلایا گیا تھا۔ یہاں کسی سے واقفیت تھی نہ کسی سرکاری دفتر تک رسائی۔ نہ کوئی ایسا ذریعہ تھا کہ اس مورتی کا کھوج لگایا جاسکے جو 1848ء میں یہیں کہیں محفوظ کر دی گئی تھی۔ ویسے بھی بہاریوں کا مزاج ہم

بنگالیوں سے کچھ مختلف ہے۔ اور اب میں حیران تھا کہ کیا کروں؟

وٹال رائے اور کایا موسا نے پروگرام بنایا کہ جب تک میں مورتی کی تلاش کا کوئی راستہ نکالوں وہ گیا سے ہو آتے اور پروہت گنجال کا سراغ لگاتے ہیں۔ کالی ناتھ اور چان بھی اُن کے ساتھ جانے پر تیار تھے۔ صرف کریم نے میرے پاس ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک دن پٹنہ کی سیر کرنے کے بعد چاروں گیا کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اُنہیں تاکید کی تھی وہ گیا کے مندروں میں بڑی ہوشیاری سے گنجال کو کھوجنے کی کوشش کریں۔ اگر کہیں دکھائی دے جائے تو صرف چھپ کر اُس کی نگرانی کریں اور مجھے اطلاع دیں۔ قانون کی دنیا میں کسی شخص پر حملے کی کوشش خطرناک نتائج پیدا کر دیا کرتی ہے لہذا اس قسم کی کوئی بھی کوشش معاملے کو بگاڑ دے گی۔

اُن کی روانگی کے بعد میں نے بھی اپنی تلاش کا خاکہ تیار کیا۔ میرا میدان محکمہ آثار قدیمہ تھا۔ مجھے اس محکمے کے افسروں اور کلرکوں تک پہنچنے کے لئے سب سے پہلے اُنہی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں اور یہ معلومات کمشنر آفس کے ایک عیسائی کلرک پیٹر نے فراہم کیں جس سے اتفاقا ملاقات ہو گئی تھی۔

معلوم ہوا آثار قدیمہ اور اس کے ساتھ ہی ایک اور محکمے کی بیک وقت نگرانی کا کام آر لینڈ کا کوئی افسر کر رہا ہے جس کا نام بھول گیا ہوں۔ ویسے بھی اس مہم میں اس سے کوئی واسطہ نہیں پڑا لہذا اس کا ذکر اتنا ضروری نہیں۔ البتہ محکمہ آثار کا انچارج بھاگل پور کا ایک ہندو نوڈ تھا۔ پیٹر نے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق ونود کی پتی بنگال کے علاقے نواکھلی سے سمبندھ رکھتی تھی اور اُس کا خیال تھا شاید میرے بنگالی ہونے کے ناتے وہ مجھ سے اچھا برتاؤ کرے مگر اُسے ملنے دفتر پہنچا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ بھاؤ کا سخت اور انگریز قسم کا آدمی تھا۔ برٹش انڈیا میں انگریز کی ضرورتوں نے اس قسم کے بہت سے افسر پیدا کئے تھے۔

میں نے اپنی جان پہچان ایک بودھ اسکالر کی حیثیت سے کرائی۔ یہ بھی بتایا کہ پور بونگال کے شہر رنگامتی کا رہنے والا اور بودھ آثار کی ریسرچ کے لئے پٹنہ آیا ہوں۔ مگر اُس کے چہرے پر کسی قسم کے اچھے یا برے آثار دکھائی نہ دیئے۔ اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔

”آپ میرے ہیڈ کلرک کاشی رام سے ملیں۔“

کاشی رام دفتری کام کاج میں اپنے ”دیسی صاحب“ کی کاربن کاپی نکالا بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کے بولا۔ ”پہلے اپیلی کیشن دو۔“

میں حیران ہوا۔ ”کس بات کی اپیلی کیشن؟“

”ارے بابا! نوکری کرنا واسطہ کیا کیشن نہیں ہے؟“

مگر ٹھہرو.....“ اُسے کچھ یاد آیا۔ ”ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں تو کوئی ویکنسی نہیں ہے۔“ میں نے کاشی رام ہیڈ کلرک کو بتایا۔ ”میں نوکری کے لئے نہیں، پٹنہ میں بودھ آثار کی ریسرچ کرنے آیا ہوں۔“

”تو ایسا بولونا۔“

”آپ کوئی ہیلپ کر سکتے ہیں میری؟“

کاشی رام نے دانت نکال دیئے۔ ”بڑا کٹھن کام ہے۔ ریسرچ اپنے بس کا روگ نہیں۔ منشی دُرگا پرشاد سے ملو۔“

”منشی دُرگا پرشاد کون ہے؟“

”وہ بھی اسکالر ہے کاسٹھ گھرانے کا۔ گنڈک ندی کے گھاٹ پر چوڑیہ بازار میں رہتا ہے۔“ اس طرح کاشی رام نے مجھے گویا پٹنہ ہی سے نکال دینے کی سوچی۔ کیونکہ اُس نے جو پتہ دیا وہ گنڈک ندی کے اس پار کا تھا۔ میں نراش ہو کر دفتر سے نکلا اور چار بجے ہوٹل پہنچا تو کریم میرے چہرے کی پریشانی سے بھانپ گیا کہ نا کام لوٹا ہوں۔ بولا۔

”کیشپ بابو! اہمیت والا آدمی نراش نہیں ہوتا۔“

”کیا کروں یہاں تو کام بگڑتا دکھائی دیتا ہے۔“

”سیانے کہتے ہیں روپے پیسے سے بگڑا کام بھی سنور جاتا ہے۔“

کریم کی بات سن کر یاد آیا کہ چکروتی چاچا نے بھی روپیہ خرچ کر کے کام چلایا اور نقلی مورتی حاصل کی تھی۔ سوچا کیا کاشی رام کی منشی گرم کرنے سے کوئی راستہ نکل سکتا ہے؟ رات بھی کافی دیر تک یہی سوچتا رہا ناگاہ خیال آیا سپنے میں پیتل کی مورتی نے مجھے گنڈک کنارے آنے کو کہا تھا مگر آثار قدیمہ کا دفتر تو گنڈک ندی سے بہت دُور ہے۔ اور میں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ مسر نوڈیا کاشی رام سے ملنا ملنا بے کار ہے۔

دوسرے دن ناشتہ کر کے ہوٹل سے نکلا اور رکشہ کھینچنے والے ایک بہاری کو بلایا کہ گنڈک کنارے لے چلے۔ رکشہ میں بیٹھا تو پوچھا۔ ”ادھر سب سے بڑا مندر کون سا ہے؟“

”کیا بولے صاحب! بڑے مندر میں دھندا بھی بڑا ہوتا ہے۔“

”کیسا دھندا؟“

”مہنتو اور دیوداسیوں کا دھندا صاحب! لوگ بڑی شردھا سے مندر کی یا ترا کرنے آتے ہیں۔ مہنتو، پجاریوں کو بڑا دان دیتے ہیں۔ پروہ لوگ سارا دھن اپنے آئند منگل میں اڑا دیتے ہیں۔ یہ دیوداسیاں چکلوں میں بیٹھ جائیں تو اچھا ہے۔“

وہ کہتا رہا، میں سنتا رہا۔ مگر مہنتو، پروہتوں، پجاریوں اور دیوداسیوں کی ہوس ولذت کی

کہانی پہلی بار نہیں سنی تھی۔ میں بعض بودھ مندروں کے بارے میں ایسی کئی کہانیاں سن چکا تھا۔ گنگا پچھتم سے یورپ کو بہتی ہے۔ دوڑتے دوڑتے رکشے والے نے پوچھا۔

”کہاں جاؤ گے صاحب؟“

”بڑے مندر کے سامنے اُتار دو۔“

اُس نے مجھے ایک بڑے بودھ مندر کے پاس اُتار دیا جہاں یاत्री مردوں اور عورتوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ میں بھی اس بھیڑ میں مل گیا جو گنگا کنارے اپنے پاپ دھونے آئی تھی۔ سوچا بیکار پھرنے سے بہتر ہے کہ کسی پر دہت پجاری سے ملا جائے مگر وہ مجھے کیا بتاتے؟ میں تو صرف اپنے سپنے کے کارن گنگا کنارے آ گیا تھا۔ چلو سیر ہی سہی۔ اچانک مندر کے فرش صاف کرنے والا ایک لڑکا مل گیا۔ رامو تھا نام۔ میں نے رامو کو اپنے پاس بلایا اور چاندی کا ایک روپیہ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے پوچھا۔

”کام کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ میں آگے بڑھ گیا۔

رامو میرے پیچھے ہولیا۔ ”کام نہیں بولو گے بابو؟“

”کیا کام کرے گا؟“

وہ میرا ہاتھ پکڑ کے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ”شکنتلا سے ملاؤں؟“

”کون شکنتلا؟“

”بڑی سندریو داسی ہے۔ بنارس سے آئی ہے۔“

”کسی پر دہت پجاری نے دیکھ لیا تو؟“ میں نے اُسے کریدا۔

”کوئی نہیں دیکھے گا۔ میں مندر کی سیر کراتا ہوا لے چلوں گا۔“

”کیا تم یہی دھندا کرتے ہو؟“

رامو چپ ہو گیا۔ میں نے چاندی کا دوسرا روپیہ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ حیران سا بولا۔

”اب کیا ہے؟“

”میں صرف مندر کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ راضی ہو گیا اور مجھے مندر کی سیر کرانے لگا۔ میں نے باتوں باتوں میں اُس سے بہت کچھ پوچھ لیا۔ دیوداسیوں اور پردہتوں کی گناہ آلود کہانیاں بڑی بھیانک تھیں، اسی کارن چھوٹی عمر ہی میں رامو کا دھرم پر سے وشواس اُٹھ گیا تھا۔ رکشہ والے نے جو کہا تھا، مندر میں آکر اس کی تصدیق ہو گئی۔ مگر عام لوگ اور یاत्री اندرونی اسرار سے بے خبر اپنے دامن میں شردھا کے پبول لے کر آتے تھے اور پجاریوں میں دان پن کرتے تھے۔

میں مندر کی سیر کر کے لوٹ رہا تھا۔ میرے آگے پیچھے مرد، عورتیں، جوان، بوڑھے، ہر قسم کے لوگ آ جا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جاؤں کہ اچانک کانوں میں ”بھیا!“ کی آواز پڑی۔ کوئی بہن بھیڑ میں بھیا کو پکار رہی تھی۔ میں اپنے دھیان میں چلتا رہا کہ دوسری بار کسی نے ”کیٹپ بھیا!“ کہہ کر آواز دی۔ میں بری طرح چونکا۔ اُنہی قدموں رُک گیا۔ آواز پیچھے سے آئی تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک جوان سندریو کی مردوں، عورتوں سے بچتی بچاتی تیز تیز چلی آرہی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ چٹا گانگ کے سیٹھ لکشمی نرائن کی بیٹی سرلا تھی جس کے ساتھ میں نے بہن بھائی کا ناتا جوڑا تھا اور جو مجھے چٹا گانگ ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے آئی تھی۔

میں اُس کی طرف لپکا۔ اُس نے آتے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بھیڑ سے نکال کر ایک طرف لے گئی۔ ”بھیا! یہاں کہاں؟ تم تو آسام اور برما گئے تھے۔“ اُس کی آواز میں حیرانی اور خوشی گھل مل رہی تھی۔ میں نے جولا کٹ اُسے تحفے میں دیا تھا اس وقت بھی گلے میں لٹک رہا تھا۔

”میں برما سے پنہ کیسے آ گیا یہ پھر بتاؤں گا۔ مگر تم یہاں کس کے ساتھ آئی ہو؟“

”اکیلی آئی ہوں۔ میری سہیلی انیلا نے تار دے کے بلایا تھا۔ کالج میں چھٹیاں تھیں۔ پتا جی نے کہا، چلی جاؤ۔ آج انیلا کے ساتھ مندر یا ترا کو آئی کہ تم پر نظر پڑ گئی اور ”بھیا بھیا“ پکارتی آئی۔ مانتے ہونا کتنا پریم کرتی ہوں تم سے؟“

سرلا لکشمی کے اس طرح مل جانے کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ اور جو خوشی خلاف توقع مل جائے اسے بھگوان کی دین سمجھنا چاہیے۔ اسی کو قسمت کا لکھا کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

”کب تک رہو گی؟“

”جب تک جی چاہے گا۔ مگر تم بھی تو کچھ بتاؤ نا بھیا! کب آئے، کیسے آئے؟“

”میرے پاؤں پر تو سپنر سوار ہے۔ برما اور آسام سے گھومتا گھماتا پلٹنے پہنچ گیا اور تین دن سے سڑکیں ناپ رہا ہوں۔“

”ٹھہرو گے کب تک؟“

”کچھ پتہ نہیں۔ مگر تمہاری سہیلی کہاں رہ گئی؟“

اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”وہ کھڑی ہے۔ آؤ! اُس سے ملو اؤں۔“

لوگوں کی بھیڑ سے ہٹ کر پیلی ساڑھی پہنے ایک لڑکی مندر کی دیوار کے سائے میں کھڑی تھی۔ سرلا میرا ہاتھ پکڑے اُسی طرف بولی۔ وہ پہناوے اور دکھاوے سے کسی اونچے پریوار کی لگتی تھی۔ سرو قد، نکھرتا ہوا اجلا رنگ، سندریو، انیلی، سرلا نے جاتے ہی جان پہچان کرانی۔

”انیلا! یہی ہیں میرے بھیا تھارو کیٹپ جن کے بارے میں بتایا تھا تجھے۔ اور بھیا! یہ

میری سب سے پیاری گویاں انیلا بی۔ اے۔“

اُس نے مجھے، میں نے اُسے ”نمستے“ کہا اور ایک دوسرے کو تعارفی نظروں سے دیکھا۔
سرلا اپنی گویاں سے بولی۔

”اری یہ کیا پنڈتانیوں کی طرح ملی ہے تو“ ”نمستے..... نمستے.....“ بھیا سے ہاتھ ملا کے مل۔
کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔“

انیلا نے مسکرا کے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے وہ کوئل سا ہاتھ تھام لیا۔ اس طرح یہ پتہ بھی چل گیا کہ وہ کسی ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی اور سرلا ہی کی مانند بے تکلف بھی ہے۔ ہاتھ ملاتے ہی کھل گئی..... ”سرلا نے آپ کے بارے میں باتیں کیں تو دیکھنے کی خواہش ہوئی تھی۔ آج آپ اچانک مل گئے تو بڑی خوشی ہوئی۔“

”کبھی کبھی بھگوان بن مانگے خوشی دیتا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سرلا پنشن میں مل جائے گی اور آپ سے بھی ملاقات ہوگی۔“

”آپ کب آئے پنشن؟“ اُس نے بات بڑھائی۔

”تین چار دن ہوئے۔“

”ٹھہرے کہاں ہیں؟“

”ہوٹل میں۔“

اُس نے سرلا کی طرف دیکھا۔ ”تو ہمارے یہاں ٹھہری ہے اور تیرے بھیا ہوٹل میں۔ ان سے کہو نا یہ بھی وہیں آجائیں۔“

”مجھ سے کہلوائے گی، آپ کیوں نہیں کہتی؟“

اب انیلا مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ بھی ہمارے ہاں آجائیں نا۔ ہوٹل میں تو پرانے ٹھہرتے ہیں۔“ یوں اُس نے اپنائیت کا اظہار کیا۔

”مگر میں اکیلا نہیں۔ پلٹن ہے میرے ساتھ۔“

وہ مسکرائی۔ ”کہیں دھاوا کرنے آئے ہیں کیا؟“

مجھے شروع میں ہی اعتراف کر لینا چاہیے کہ انیلا کی مسکراہٹ دل میں اتر جانے اور من موہ لینے والی تھی۔ قدرت نے اُسے ایک خاص ادا سے مسکرانے کا ملکہ یا جادو بخشا تھا۔ مسکراتی تو ہونٹ شگوفوں کی طرح کھل جاتے جیسے منتر پھونک رہے ہوں۔ میں نے کسی ناری کے ہونٹوں پر ایسی دلاویز مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی جو دیکھنے والے کو مسحور کر دے۔ فوراً خود کو سنبھالا اور جواب دیا۔

”دھاوا کرنے نہیں، ایک کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈنے آیا ہوں۔“

”کیا کھو گیا ہے آپ کا؟“

”ایک زمانہ کھو گیا ہے..... ایک تاریخ گم ہو گئی ہے اس شہر میں۔“

اُس کی مسکراہٹ حیرت میں تبدیل ہو گئی۔ بعد میں پتہ چلا ہسٹری میں گہری لچپی رکھتی ہے۔ سرلا لکشمی اُسے بتا چکی تھی کہ میں ایک بودھ اسکالر ہوں۔ اُس نے اپنی تاریخ دانی کا اظہار کیا۔

”پنشن میں تو پاٹلی پتر گم ہے۔“

”اُسی کو کھوجنے آیا ہوں۔“

”پھر تو میرے ہاں ٹھہریے۔ مجھے بھی پاٹلی پتر کی تلاش ہے۔“

انیلا کی اس بات نے مجھے چونکا دیا۔ مگر یہ بھی سوچا میں بودھ ہوں شاید اس لئے پاٹلی پتر کی تلاش کا ذکر کرتی ہے اور مجھے اپنے ہاں ٹھہرانا چاہتی ہے۔ میں نے بتایا۔

”میرے ساتھی گیا کی یا ترا کرنے گئے ہیں۔ وہ آجائیں تو پوچھوں گا۔ اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو شاید جب تک سرلا یہاں ہے آپ کے ہاں آجاؤں۔“

اُس کے چہرے پر رنگ بکھر گیا۔ ”تو آپ ہوٹل میں اکیلے ہیں؟“

”نہیں ایک ساتھی بھی ہے۔“

”چلیے۔ اُسے میں اور سرلا راضی کر لیں گی کہ جب تک آپ کے ساتھی گیا سے نہیں لوٹے آپ ہمارے ہاں رہیں گے۔“

”انیلا دیوی! میں ایک ضروری کام میں الجھا ہوا ہوں۔ آپ مجھے اپنے گھر کا پتہ دے دیں۔ کل یا پرسوں فرصت مل گئی تو خود آجاؤں گا۔“

اب سرلا نے دخل دیا۔ ”بھیا! میری گویاں نے اتنی بار کہا، تم ایک بار نہیں مانے۔“

”صرف دو تین دن کی مہلت مانگی ہے۔“

”کس ہوٹل میں ٹھہرے ہو؟“

میں نے گیتا ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتایا تو سرلا نے فوجداری لگا دی۔ ”دیکھو بھیا! دو تین دن نہیں، صرف ایک دن کی مہلت ملے گی۔ تم میری گویاں کو ناراض نہیں کر سکتے۔“

میں نے انیلا سے معذرت ضروری سمجھی۔ ”انیلا دیوی! میں شام چاہتا ہوں اگر پیروں میں مجبوری کی زنجیر نہ ہوتی تو ابھی آپ کے ساتھ چلتا مگر اب تو سرلا بہن نے ایک دن کی مہلت

دے دی ہے آپ ناراض تو نہیں؟“

”نہیں کیشپ بابو!“

”اگر ناراض نہیں تو ایک بار مسکرا دیں۔“

وہ مسکرائی مگر طبعی اور فرمائی مسکراہٹ میں بڑا فرق تھا۔ وہ منتر تھا یہ صرف جنتر پھر بھی اس

نے میرا کہا پورا کر دیا جس سے اندازہ ہوا کہ دوسروں کے جذبات کا خیال رکھتی ہے۔ ہم تینوں باتیں کرتے مندر سے باہر آئے، چار پہیوں کی ایک فنٹ سڑک کی ایک جانب کھڑی تھی۔ وہ دونوں اسی فنٹ کی طرف بڑھیں اور کوچوان نے جھک کر سواگت کیا۔ رئیس بھی سے میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ انیلا کسی اونچے پر یوار کی لڑکی ہے، اس نے سوار ہونے سے پہلے ایک بار پھر مجھے مسکرا کر دیکھا اور یہ وہی جادو پھونکتی ہوئی مسکراہٹ تھی جو صرف اسی کے حصے میں آئی تھی، مسکراتی ہوئی بولی۔

”بھول نہ جائیے کیشپ بابو! ایک ہی دن کی مہلت ملی ہے آپ کو۔“
”کیسے بھول سکتا ہوں یہ۔۔۔۔۔ مہلت۔۔۔۔۔“

دراصل میں کہنا چاہتا تھا۔ ”یہ مسکراہٹ“ مگر زبان ساتھ نہ دے سکی اور میں نے کل کی ملاقات کے وعدے پر رخصت لی، انیلا اور سرلا فنٹ میں بیٹھ کر پچھم کو بولیں اور میں پاؤں پاؤں پورب کو چلا، سرلا لکشمی کا یوں اچانک مل جانا ایک اچنبھا اور انیلا کا مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دینا حیرت انگیز تھا، میرے ساتھی گیا چلے گئے تھے اور سرلا کی خاطر میں آج ہی انیلا کے ہاں جا سکتا تھا۔ حالات کی یہ تبدیلی میری ذہنی پریشانی کو دور کر سکتی تھی جو محکمہ آثار قدیمہ کے انچارج مسٹر ونود اور اس کے ہیڈ کلرک کاشی رام کے رویے سے ہوئی تھی مگر رات ہی میں نے ونود اور کاشی رام کو ذہن سے اتار پھینکا اور آج ہوٹل سے یہ ٹھان کر نکلا تھا کہ سارا دن گنگا کنارے پھروں گا، مندروں اور تیرتھوں میں جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے، دھرتی اور آکاش کے درمیان باطنی اسرار کی دنیا کون سا رنگ دکھاتی ہے۔

پاٹلی پتر پٹنہ میں مجھے گنگا کنارے آنے کو کہا گیا تھا۔ ساؤ گاری میں دیکھا ہوا سپنا کسی دھندلے واقعے کی طرح میرا پیچھا کر رہا تھا اور جب ہوٹل سے چلا تو ذہن اس خیال سے سننا رہا تھا کہ آج کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے گا جو مجھے آدرش اور مقصد کی راہ دکھائے گا میری منزل کی نشان دہی کرے گا اور مقدس مورتی کی تلاش کا کوئی اشارہ، کوئی سنگل دے گا کیونکہ میں سمجھ چکا تھا کہ مورتی کو کھوج لینے میں دوڑ دھوپ، کوشش اور محنت کے ساتھ اس پر اسرار تقدیر کا سب سے بڑا دخل ہے جس کا ہاتھ میری رہنمائی کر رہا تھا اور جس کے اشارہ غیبی پر میں یہاں آیا تھا، اسی خیال کے پیش نظر میں نے انیلا کی دعوت ایک دن کے لئے ٹال دی اور گنگا کے ساتھ ساتھ پورب کا رخ کیا۔

من کہتا تھا، کوئی انوکھی بات ضرور ہوگی، جیسا سارا دن گھومتا رہا۔ گنگا کنارے ایک دو تیرتھ اور بھی تھے، وہاں بھی گیا، وہی چیز جو بڑے مندر میں دیکھی ہر جگہ تھی۔ تیسرے پہر آبادی کو چھوڑ کر ساحل ساحل چلتا دور نکل گیا، کچھ سادھوا نگ بھوت رمائے، آسن جمائے اپنے جاپ

میں گمن دیکھے، کوئی کم گہرے پانی میں صرف ایک ٹانگ پر کھڑا تپتیا کر رہا تھا، کسی کا دھڑ پانی میں تھا، صرف گردن نظر آتی تھی، یہ سادھو، سنیاسی اسی طرح کئی کئی دن ریاضت کرتے اور اپنا من مارتے ہیں، میں کسی مخفی آواز، کسی اشارہ غیبی کی امید پر ان کے پاس سے گزرتا چلا گیا حتیٰ کہ سیاہی رات کے اندھیرے سے گلے ملنے لگی۔

سوچا ہو سکتا ہے پیتل کی مورتی جو ساؤ گاری میں بڑھے سا گر ساؤ جی کے کنیا کو مہر سے نکل کر راتوں کو سنے، رو یا یا کشف میں یا پھر نہ جانے کونسی پر اسرار قوت کے زیر اثر میرے پاس آتی رہی۔ اس اندھیرے میں کہیں نہ کہیں سے ناگہاں نمودار ہوگی اور بتائے گی مجھے کیا کرنا اور کہاں جانا ہے، اسی آس پر اندھیرے میں گنگا کنارے پھرتا اور کسی خارق عادت واقعے کا انتظار کرتا رہا، پھرتے پھرتے کافی سے بیت گیا لیکن نہ کسی طرف سے کوئی آواز آئی، نہ کوئی اشارہ ملا، نہ کسی نے روکا، نہ کوئی واقعہ ہوا، آخر زراش اور مایوس شہر کی طرف لوٹا۔

ایک گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد اتفاق سے ایک دستی رکشا مل گیا، اس میں بیٹھ کر کوئی گیارہ بجے رات گیتا ہوٹل پہنچا، کریم میرے انتظار میں جاگ رہا تھا، میں نے کھانا کھایا اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا، آج جس آس پر ہوٹل سے نکلا وہ پوری نہ ہوئی، من کی آواز نے جیون میں پہلی بار دھوکہ دیا تھا۔

ایک غیر معمولی اور خلاف توقع واقعہ ضرور پیش آیا، بڑے مندر میں سرلا لکشمی ناگہاں مل گئی اور سرلا کے ساتھ اس کی گویاں انیلا سے بھی جان پہچان ہو گئی، مگر میں جس غیر معمولی واقعہ کی آس لگائے بیٹھا تھا، وہ ظہور میں نہ آسکا اور پریشان ہوتا رہا کہ اب کیا کروں، کہیں میرے اندر کی جوت بھگتی تو نہیں جا رہی؟

اسی ادھیڑ پن میں نہ جانے کب نیند آ گئی اور کب سو گیا۔ سویرے جاگا تو کافی دن چڑھ آیا تھا اور شہر میں جیون کی بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ بستر سے اٹھتے ہی خیال آیا، آج پٹنہ کے دوسرے بودھ مندر میں جانا چاہیے۔ میں نہا کر، کپڑے بدل کر بیٹھا ہی تھا کہ کریم نے ناشتہ منگوا لیا، ناشتے کے دوران اچانک وہ بولا ”کیشپ بابو! آپ کی چٹا دور ہو جائے گی۔“
”وہ کیسے؟“

اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
”ہمارے قرآن میں لکھا ہے کہ آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔“
یہ دراصل فطرت کے ایک اصول کی ترجمانی تھی۔ الفاظ اگرچہ مختصر لیکن معنی بہت وسیع تھے۔ کریم نے جو کچھ کہا اس سے مجھے بڑا حوصلہ ہوا۔ ”حیٰ اور قیوم“ بھی قرآن کے ثبید ہیں،

”اب کوئی الجھن ہے؟“

”آج مجھے دوسرے بودھ مندر جانا ہے۔“

”اب مندروں کا پیچھا چھوڑنا بھیا! ہمارے ساتھ چلو۔“

انکار کی گنجائش نہ تھی۔ انیلا کی مسکراہٹ نے مجھے اپنے حسین جال میں باندھ لیا تھا، سوچا بودھ مندر کی یا ترا پھر کسی دن سہی، ذرا دیکھوں تو یہ جادوگر مسکراہٹ جو من میں جوار بھانا پیدا کر دیتی ہے مجھے کس گھاٹ اتارتی ہے۔

”میں تیار ہوں سرلا! تمہاری گونیاں کا کہا نہیں ٹال سکتا۔ چلو۔“

”کیا خالی ہاتھ چلو گے۔“

میں نے کریم کو اشارہ کیا، وہ میرا پیچی کیس اٹھالایا اور ہم کمرے سے نکلے۔ گپتا ہوٹل کے باہر وہی گھمبھی کھڑی تھی جو انیلا کی رئیس شان کا چلتا پھرتا اشتہار تھا۔ کریم میرا پیچی کیس گھمبھی میں رکھ کر پلٹا، میں نے کچھ روپے اس کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا۔

”میں سرلا بہن کے ساتھ جارہا ہوں شاید کچھ دن وہیں رہوں۔“

پھر سرلا اور انیلا کے ساتھ گھمبھی میں سوار ہوا اور کوچوان نے گھوڑے کو چابک دکھایا۔

گھمبھی مختلف راستے کا مٹی دریا کی جانب ہوئی اور گنگا کے دھنی گھاٹ پر ایک خوشنما بنگلے میں داخل ہوئی جس کے گیٹ پر پیتل کی ایک پلیٹ نصب تھی اور پلیٹ پر انگریزی حروف میں ”مورتی ہاؤس“ لکھا تھا، میں پیتل کی پلیٹ اور اس پر ”مورتی ہاؤس“ کے شبد دیکھ کر چونکا اور ذہن فوراً بڑھے ساگر ساؤجی کے کتیا کو مہز میں رکھی پیتل کی مورتی کی طرف منتقل ہو گیا جس نے مجھے پٹنہ بلایا اور گنگا کنارے آنے کا آدیش دیا تھا تو کیا اس بنگلے میں بھی کسی مورتی کا سامنا ہوگا؟ مگر جلد ہی ”مورتی ہاؤس“ کا بھید کھل گیا۔

انیلا کے پتا مورتی منڈل نے جو یہ بنگلہ اپنے نام سے بنوایا جسے مہمان خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، وہ شہر کے رئیس تھے مگر انیلا چھوٹی ہی تھی سو رگ باش ہو گئے وہ مورتی منڈل کی اکلوتی بیٹی اور ان کی تنہا وارث تھی کچھ عرصے بعد اس کی دھوا ماں نے دوسرا بیہ کر لیا مگر بیٹی کو اپنی بھرپور متادی اور اعلیٰ تعلیم دلائی۔ سوتیلا باپ بھی جسے وہ ”پاپا“ ہی کہتی تھی، اس سے بہت پیار کرتا تھا اور انیلا اپنی ممی اور پاپا کے ساتھ شہر کی نئی آبادی میں رہتی تھی، مگر جب سرلا لکشمی آئی اس کے ساتھ ”مورتی ہاؤس“ میں آگئی تھی جہاں ایک نوکرانی، ایک چوکیدار اور کوچوان ان کی دیکھ بھال کے لئے موجود تھے، اب اس نے سرلا کے ساتھ مجھے بھی ”مورتی ہاؤس“ کا مہمان بنالیا تھا۔

میں اس اتفاق پر دنگ رہ گیا کہ کل گنگا کنارے مجھے پیتل کی اس مورتی کے درشن تو نہ ہو

جن کی کرامت میں نے کئی بار دیکھی اور جب کسی کٹھن سے پورے دشواں اور سچی لگن کے ساتھ ان شبدوں کا جاپ کیا، میری مشکل حل ہوئی تھی، اب کریم نے میری تسکین کا سامان پیدا کر دیا، وہ صوفی عبد الجبار کی طرح اپنے مذہب کا پابند تو نہیں تھا نہ ان جیسا گیان رکھتا تھا، پھر بھی اس نے فطرت کے ایک اصول کا حوالہ دے کر میری ہمت بندھائی میں اسے بتانے لگا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ آدمی کی کوشش اور لگن کا پھل اسے ملتا ہے، پھر بھی کل میں ہوٹل سے نکلا تو کسی اور لگن سے تھا، مگر مجھے مل سچھ اور گیا۔“

کریم نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا مل گیا تھا؟“

”میری منہ بولی بہن سرلا لکشمی اور اس کی سہیلی انیلا۔“ میں نے کچھ اور وضاحت کر دی۔

”سرلا چٹا گانگ کے سیٹھ لکشمی نرائن کی بیٹی ہے۔“

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی، ناشتہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا پیرا خالی برتن لینے آ گیا ہوگا۔ کہا۔

”آ جاؤ۔“

دروازہ کھلا تو میں کرسی پر اچھل کر کھڑا ہو گیا، کھلے دروازے پر دو چاند دکھائی دیئے، سرلا اور انیلا ایک ساتھ اندر آئیں، انہیں دیکھ کر کریم بھی کھڑا ہو گیا۔ سرلا آتے ہی چھپانے لگی۔

”مانتے ہونا بھیا! ہم نے تمہارا ہوٹل اور کمرہ ڈھونڈ لیا۔“

گپتا ہوٹل شہر کی گنجان آبادی میں درمیانے درجے کا ہوٹل تھا، ہم نے اپنی ضروریات کے مطابق اس کا انتخاب کیا تھا، کمرے کا سامان واجبی سا تھا، انیلا میرے کمرے کو اور میں اسے دیکھ رہا تھا، غالباً سوچ رہی تھی کچھ کہے یا انتظار کرے کہ میں کیا کہتا ہوں۔

”آپ بیٹھے نا۔“ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم بھی بیٹھو سرلا۔“

سرلا میری طرف گھوم گئی۔ ”جانتے ہو بھیا! کل میں نے جاتے ہی پتا جی کو چٹھی لکھی کہ پٹنہ میں کیسٹپ بھیا مل گئے ہیں وہ بڑے خوش ہوں گے۔“

”میرا پرنام لکھ دیتیں۔“

”تم نے کہا تو نہیں تھا، پر میں نے لکھ دیا۔ جانتی تھی تمہارا پرنام نہیں لکھا تو برا لگے گا۔“

میں نے سرلا کا شکریہ ادا کیا اور انیلا کو توجہ دلائی۔

”آپ کھڑی ہیں ابھی تک بیٹھیں گی نہیں؟“

”میں بیٹھنے نہیں آپ کو لینے آئی ہوں، ایک دن کی مہلت ختم ہوگئی۔“ اور اس کے ساتھ ہی نیلا نے اپنی مسکراہٹ کا منتر پھونکا۔

”مہلت بے شک ختم ہوگئی مگر میری الجھن ابھی ختم نہیں ہوئی۔“

”ایسا خوبصورت کمرہ تو سَوَرگ میں بھی نہیں ہوگا۔ آپ کا ”مورتی ہاؤس“ بالکل سَوَرگ لگتا ہے۔“

اس نے میری بات پکڑ لی۔ آپ سَرلا کو ”تم“ کہتے ہیں، مجھے ”آپ“ کہہ کر شرمندہ کیوں کرتے ہیں۔“

”وہ بہن ہے میری، آپ میزبان ہیں۔“

”کیا میزبان کو پرانی سمجھتے ہیں آپ۔“

”نہیں تو۔“

”پھر تکلف کیوں، مجھے یہ لکھنؤ اور علی گڑھ والا تکلف اچھا نہیں لگتا، میں یوپی میں نہیں بہار میں رہتی ہوں۔“

”پھر کیا کہوں؟“

”وہی جو سَرلا کو کہتے ہو۔“

وہ ایک دم بے تکلف ہو گئی اور خود میرے اور اپنے درمیان ”آپ“ کی دیوار گرا دی۔ میں اس کی بے تکلفی پر حیران سا رہ گیا، وہ دھیرے سے مسکرائی، ہولے سے بولی۔

”میں نے تم“ کہنے میں پہل اس لئے کی ہے تم بھی مجھے اسی طرح پکارو۔“

میں اس کی آواز سن رہا تھا مگر نظریں مسکراتے، شگفتہ ہونٹوں پر جمی تھیں، ہونٹ کیا شگوفے تھے اور ان پر تیرتی مسکراہٹ جیسے نزل نزل ہوا ادھ کھلے گلابوں کو چھوتی، چومتی گزرتی ہے، مجھے حیران سا دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کیا میری بے تکلفی اچھی نہیں لگی۔“

”بہت اچھی لگی۔“

”پھر آئندہ مجھے تم کہو گے؟“

”کہوں گا۔“

”تو کہو نا۔“ اس نے اصرار کیا۔

”کیا کہوں؟“

”جو من میں آئے کہہ دو۔“

میرے من کی بات ہونٹوں پر آ گئی۔ ”تمہاری مسکراہٹ بڑی مٹنی، بڑی پیاری ہے، مسکراتی نہیں منتر پھونکتی ہو۔“

”مائی گڈنس۔“

وہ میرے کچھ اور قریب آ گئی اور آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔

سکے جس کے درشنوں کی اشارت کرتا تھا مگر بڑے مندر میں سَرلا کے ذریعے ایک جیتی جاگتی اور مسکراہٹ کا منتر پھونکتی مورتی ضرور مل گئی۔ نام بھی انیلا مورتی تھا، ایک ”مورتی ہاؤس“ کی وارث بھی تھی جس کے گیٹ پر پیتل کی نیم پلیٹ نصب تھی۔ اس طرح ساؤ گاری میں دیکھے ہوئے سپنے کے دو رنگ ”پیتل“ اور ”مورتی“ نے اس تعبیر کو ایک نیا رنگ دیا اور میں سوچنے لگا۔ کیا سپنے میں مجھے اسی ”مورتی ہاؤس“ میں آنے اور انیلا مورتی سے ملنے کے لئے کہا گیا تھا۔

قدرت کے سمجھ نہ آنے والے اسرار انیلا مورتی کی مسکراہٹ میں ڈھل گئے اور وہ جادوگر مسکراہٹ مجھے گنگا کنارے ایک ”مورتی ہاؤس“ میں کھینچ لائی تھی۔ انیلا سے مسکراہٹ کے حسین تصور کو الگ کرنا اتنا ہی مشکل تھا، جتنا نیلے آکاش کی دھنک سے رنگوں کا علیحدہ کر دینا، اس مسکراہٹ کے تصور ہی سے میرے دل میں ایک جوت سی جل اٹھی اور میں یہ بھید نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس مسکراہٹ میں میرے لئے اتنی کشش کیوں ہے؟ اس کا تبسم ایک جادو تھا اور یہ جادو اسے بھگوان نے عطا کیا تھا۔

بنگلہ میں آتے ہی اس نے تکلف کا وہ ہلکا سا پردہ بھی اتار پھینکا جو کل اس کی ذات پر پڑا تھا اور میری طرف اشارہ کر کے اپنی سہیلی سے بولی۔

”سَرلا کی بچی! تو نے اپنے جس کیشپ بھیا کی تعریف کی تھی یہ تو اس سے کہیں بڑھ کر سوشل اور سنڈر ہیں۔“

”میں نے یہی تو کہا تھا کہ تو بھیا کو ایک بار دیکھے گی تو بار بار دیکھنے کی آشا کرے گی۔“

انیلا مورتی نے مسکرا کے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”آئیے کیشپ بابو! آپ کو کمرہ دکھا دوں۔“ میں چپ چاپ ساتھ ہولیا، دونوں سہیلیوں کی باتوں سے میں نے اس ”حسین خطرے“ کا احساس کر لیا تھا جو مجھے ”مورتی ہاؤس“ میں پیش آنے والا تھا مگر نہ جانے کیوں، میں خود اس خطرے کی زد میں آ گیا تھا اور ”مورتی ہاؤس“ سے ایک عجیب سا لگاؤ محسوس ہو رہا تھا، جہاں قدرت میرا ہاتھ پکڑ کے لے آئی تھی۔

میں انیلا کے ساتھ ایک سجے سجائے کمرے میں داخل ہوا جس میں خوبصورت قالین بچھا تھا۔ یہ بیڈروم تھا مگر ایک کونے میں لکھنے کی میز اور کرسی بھی تھی۔ میز پر بڑا حسین ورنگین ٹیبل ایسپ، کاغذ، پیڈ، قلم، دوات ہر شے بڑے سلیقے سے رکھی تھی دروازوں اور کھڑکیوں پر بڑے بڑے پھول دار پردے لٹک رہے تھے، پلنگ کے پیچھے کپڑوں کی الماری تھی، میں نے تعریفی نظروں سے کمرے کو دیکھا، اس نے پوچھا۔

”کیا پسند آیا آپ کو؟“

”جیہی تم نے کل مجھے مسکرانے کو کہا تھا۔“

”ہاں، مونالیزا کی مسکراہٹ کے بارے میں سنا تھا، پڑھا تھا مگر تمہیں مسکراتے دیکھا تو مونالیزا کی مسکراہٹ بھول گئی۔“

”آج تک کسی نے میری مسکراہٹ کو اس طرح نہیں سراہا تھا، تم نے تو کویتا شروع کر دی۔“

”کویتا سندر تا کے لئے کی جاتی ہے اور مجھے سندر تا پر ادھیکار دیا گیا ہے۔“

”اس ادھیکار کے بارے میں سوچوں گی۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”آؤ چلیں۔“

ہم کمرے سے نکلے اور وہیں آگئے جہاں سرلا بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ انیلا آتے ہی سرلا سے لپٹ گئی اور مسکرا کر کہنے لگی۔

”تیرے بھیا کہتے ہیں، میں مونالیزا سے اچھا مسکراتی ہوں، منتر پھونکتی ہوں۔“

”وہ تو پھونکتی ہے تو۔۔۔“ پھر سرلا مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”بھیا! میری گویاں میں ایک خوبی

اور بھی ہے سنو گے تو پھڑک جاؤ گے۔ تمہاری طرح اسے بھی بودھ آثار سے لگن ہے۔“

اور واقعی اس انکشاف پر میں پھڑک گیا۔ ”کیا یہ سچ ہے انیلا دیوی۔“

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”میں انیلا ہوں، دیوی نہیں۔ اگر میرے نام کے

ساتھ کوئی ایڈجیکٹو لگانا چاہو تو مورتی لگالیا کرو، میرا نام انیلا مورتی ہے۔“

”مجھے دھیان نہیں رہا۔۔۔“ اور ذرا بے تکلفی سوچھی۔ ”اگر تمہیں صرف ”مورتی“ کہہ دیا

جائے؟“

”تو مجھے خوشی ہوگی۔ مورتیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔“

”تم نے بتایا نہیں، کیا سچ سچ بودھ آثار سے لگاؤ رکھتی ہو۔“

”لگاؤ نہیں INSANITY کہو۔“

”کس بارے میں؟“

”پائلی پتر کی ہسٹری اور بودھ کی پرانی مورتیوں پر کام کر رہی ہوں۔“

میں پہلے پھڑکا تھا اب تڑپ اٹھا، میرے پڑھنے والے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انیلا کی زبان

سے پائلی پتر اور بودھ کی پرانی مورتیوں پر کام کرنے کا سن کر میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ حیرت

کے ساتھ دلچسپی بھی بڑھ گئی۔

”کیا کام کیا ہے تم نے؟“

”دکھاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں گئی اور لوٹ کے آئی تو ہاتھوں میں ایک بہت بڑا البم اور ایک مینو اسکرپٹ اٹھا رکھا تھا پہلے اس نے مسودہ دکھایا جو پائلی پتر کے بارے میں تھا، پھر البم کھولا تو

مجھ پر حیرت کی ایک اور کیفیت گزر گئی اس میں تھا گت بدھ کی کم سے کم پانسو پرانی مورتیوں کے فوٹو اور اسکیچ تھے، یہ ساری مورتیاں اشوک اور کنشک کے درمیانی زمانے کی تھیں، جن میں بعض لاہور، پشاور اور کابل کے عجائب گھروں میں موجود تھیں، ان پر مقام اور سن درج تھا، زیادہ تر ان مورتیوں کے فوٹو تھے جو بہار، بنگال، آسام، برما، ہندوچینی کے بودھ مندروں، آشرموں اور پگوڈوں میں تھیں اس نے داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”اب تو مان گئے نا۔ میں نے کچھ کام کیا ہے۔“

”تمہارے لگاؤ کی داد دیتا ہوں، مگر البم میں بکری سمت کی پہلی اور دوسری صدی کی سی مورتی کا فوٹو اور اسکیچ نہیں۔“

”ان مورتیوں کی تلاش میں ہوں۔“

اب سرلانے ذرا کھل کر بات کی۔

”بھیا! انیلا تمہیں اسی لئے تو ائی ہے یہاں کہ اس کی کچھ ہلپ (Help) کرو گے۔“

میرا انیچی کیس ابھی تک وہیں پڑا تھا، میں نے اسے کھول کر ”جوتی پتر“ کا رسالہ نکالا جس میں بھگوان بدھ کی مورتیوں کا سن وار گوشوارہ چھپا ہوا تھا۔ انیلا مورتی نے وہ گوشوارہ دیکھا تو خود بھی تصویر بن گئی پھر لکھنے والے کا نام پڑھ کر اچھلی۔

”ارے یہ تو تمہارا ہی آرٹیکل ہے۔“

صرف پینل کی مورتیوں پر۔ پرانی بدھ مورتیوں کی تلاش تمہارا شوق مگر میرا آدرش ہے۔“

انیلا بودھ مورتیوں کے بارے میں میری اکٹھی کی ہوئی معلومات پر دنگ رہ گئی۔ انہی

معلومات کو پڑھ کر تو سروپ ساؤجی نے شیلانگ کی بودھ کانفرنس کے دوران مجھے بلایا اور اپنا

سیکرٹری بنالیا تھا۔ ”جوتی پتر“ میں ان مورتیوں کا بھی ذکر تھا جن کا کوئی فوٹو یا اسکیچ انیلا کے البم

میں نہیں تھا وہ میری ریسرچ سے بڑی متاثر ہوئی اور بولی۔

”تم تو سچ سچ بھٹا چار یہ (بڑے اسکالر) ہو مجھے اپنی شش بنا لو نا۔“

ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور جب آنکھیں چار ہوتی ہیں، روئیں ایک دوسرے سے ملتی اور

خاموشی کی زبان میں کچھ بھید کی باتیں کرتی ہیں جنہیں دنیا کے کان نہیں سن پاتے، انیلا مورتی

کی آنکھیں بھی کچھ کہہ رہی تھیں میں جواب تو انہی آنکھوں سے دینا چاہتا تھا مگر الفاظ ہونٹوں پر

آگئے۔

”مسکرا کے کہو گی تو شاید تمہیں اپنی شش بنا لوں۔“

ان الفاظ کو انیلا کے ساتھ سرلانے بھی سنا اور اس نے چٹکی لی۔

”میری گویاں کو شش بنا لو بھیا، کہو گے تو گلے بھی لگ جائے گی۔“

”پہلے مسکرائے تو سہی۔“

اور انیلا مورتی ہماری باتیں سن کر صرف مسکرائی نہیں، کھلکھلا کر ہنس دی اور ایسی قاتل تھی وہ ہنسی جس نے میرے ارادوں کی شکست کو گھائل کر دیا کیونکہ جب وہ ہنستی تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے اور آدمی اپنے گیان، نروان کی ودیا کے ساتھ ٹھوکریں کھا کر ان گڑھوں میں لڑھک جاتا، میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس نے ایک اور بان مارا۔

”اگر تمہیں میرا ہنسنا مسکرا کر نا بہت بھاتا ہے تو میرے چہرے پر، ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ دیکھو گے۔“

”پھر بنا لیا تمہیں اپنا شش۔“

اس نے ہاتھ بڑھایا، میں نے ہاتھ ملایا، یوں میرے اور انیلا مورتی کے درمیان ایک نیا نیا قائم ہوا اور سر لاکشمی نے ہاتھ بندھ کے پرارتھنا کی۔

”بھگوان! میری گویاں اور میرے بھیا کی رکھشا کرنا۔“

اب ساؤ گاری میں دیکھے ہوئے سپنے کی تعبیر کے دو نئے پہلو سامنے آئے۔ پاٹلی پتر اور بھگوان بدھ کی مورتیاں، یوں لگا جیسے یہ ”مورتی ہاؤس“ پاٹلی پتر کا سبیل ہے اور مجھے سپنے میں گنگا کنارے اسی ”پاٹلی پتر“ میں آنے اور انیلا مورتی سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی، کیوں؟ یہ آگے چل کر معلوم ہو جائے گا۔

○

دوسرا دن اتوار تھا اور پتہ چلا کہ انیلا اتوار کا دن اپنی می اور پاپا کے ساتھ گزارتی ہے، اس کے ساتھ سر لا بھی جانے کی تیاری کر رہی تھی، میں ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ گیا اور اخبار دیکھ رہا تھا کہ انیلا جار جٹ کی گلابی ساڑھی میں بالکل ”مورتی“ سی بنی کمرے میں داخل ہوئی اور حیرت سے بولی۔

”ارے تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔“

”کیا مجھے بھی جانا ہے تمہارے ساتھ؟“

”نہیں جاؤ گے کیا؟“ وہ مسکرا دی۔ ”میں نے می کو کہلوا بھیجا ہے کہ سر لا کے بھیا آئے ہیں اور میرے ساتھ ہی آرہے ہیں، می اور پاپا تم سے مل کر خوش ہوں گے۔“

”پھر تو جانا ہو گا مجھے۔“

”جلدی سے کپڑے بدل لو۔“ وہ دروازے کی طرف مڑی تھی کہ پھر رکی اور زیر لب مسکراتی

بولی۔ ”کوئی اچھا سا سوٹ پہننا۔“

”سوٹ کیوں؟“

”ارے پاپا آدھے انگریز ہیں۔ انگریزی لباس پسند کرتے ہیں، سوٹ کے بغیر ملو گے تو لفٹ ہی نہیں کرائیں گے۔“

”مگر میں تو کوئی سوٹ ساتھ نہیں لایا۔“ اور اپنے اٹیچی کیس سے وہ اچکن نکال کر دکھائی جو سندرمی لائی تھی میرے لئے۔ ”کیا اس سے کام نہیں چلے گا۔“

”میں نے بتایا نا۔ سوٹ پاپا کی کمزوری ہے۔“

”پھر میں تمہارے ساتھ نہیں جاتا۔“

”جاؤ گے کیسے نہیں، پاپا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ پھر ایک پل سوچ کر کہنے لگی۔ ”چلو یہی اچکن پہن لو۔“

ہم تینوں بگھی میں سوار ہو کر ”مورتی ہاؤس“ سے نکلے اور بازار سے گزر رہے تھے ایک ٹیلرنگ شاپ کے سامنے انیلا نے بگھی رکوائی اور مجھے ساتھ لے کر دکان میں گھس گئی، اس نے ٹیلر ماسٹر سے کچھ کہا، وہ میرے قد کاٹھ کو دیکھتا ہوا چار پانچ نئے سلے ہوئے سوٹ نکال لایا، انیلا نے سوٹ میری طرف بڑھائے۔

مجھے کچھ عجیب سا لگا مگر انیلا کی ضد پر میں نے ڈارک بلیو کالر کا ایک سوٹ پسند کیا اور جب اسے پہن کر نکلا تو یوں لگا جیسے میرا ہی ناپ لے کر سیا گیا ہے۔ انیلا خوش ہو گئی اور ٹیلر ماسٹر سے بولی۔

”کل واپس مل جائے گا تمہیں ان کا ناپ لے کر دو سوٹ اور تیار کرنا ہوں گے۔“

اس نے ٹیلر ماسٹر کو کچھ ایڈوانس دیا، مجھے لے کر بگھی میں آ بیٹھی اور اب بگھی کا رخ نئی آبادی کی طرف موڑ دیا گیا، سر لا نے مجھے سوٹ میں دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ ”بھیا! اس سوٹ میں نرے رو میو لگتے ہو۔“

”مگر جو لیٹ نے تو ساڑھی پہن رکھی ہے۔“

انیلا مورتی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”آج کی تہذیب سوٹ اور ساڑی کی ہے۔“

”سے ہمیشہ پرانی تہذیب کے خلاف ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر ہمارے

پرکھوں کے شریر پرانی تہذیب میں لیٹے رہتے ہیں۔“

کوئی ڈیرھ دو میل چلنے کے بعد فشن نئی آبادی کی ایک کوٹھی میں داخل ہوئی تو دونو کر بھاگے آئے اور ایک نوکرانی اندر بھاگ گئی، ہم بگھی سے اترے تو اندر سے انیلا کی می برآمدے میں نمودار ہوئی۔ نوکرانی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ چالیس بیالیس برس کی ایک سندرمی صحت مند اور باوقار عورت تھی، آتے ہی انیلا سے لپٹ گئی، ماں بیٹی کی شکل و صورت ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی انیلا نے میری طرف اشارہ کیا۔

”مئی! یہ ہیں سرلا کے بھیا کیشپ بابو۔“

اس نے مجھے اشیر واددی اور سرلا کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ”اپنی طرح بھیا بھی بڑا سوشل چنا ہے تو نے۔“

”پاپا کدھر ہیں مئی؟“

”ادھر بیٹھے ہیں ڈرائنگ روم میں۔“

”آؤ پاپا سے مل لو۔“

وہ مجھے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چلی، مئی اور سرلا ہمارے پیچھے تھیں، میں انیلا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو صوفے پر بیٹھے پاپا کو دیکھ کر دروازے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ وہ بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا میں نے اسے اس نے مجھے حیرت و تعجب کی نظروں سے دیکھا۔ وہ محکمہ آثار قدیمہ کا انچارج مسٹر ونود تھا، انیلا نے ہماری حیرت بھانپ لی مگر کچھ نہ سمجھ سکی اور بولی۔ ”پاپا یہ سرلا کے بھیا کیشپ۔۔۔“

مسٹر ونود نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مل چکا ہوں آفس میں۔“

”Give him blessing papa“

وہ انیلا کی بات پر چونک کر میری طرف بڑھا، میں نے اس کے مزاج کے مطابق غصے کی بجائے ”گڈ مارنگ“ کہا اس نے بڑی گرجوشی سے ہاتھ ملایا، مجھے کھینچتا ہوا صوفے کی طرف لے گیا اور ایک آئی سی ایس افسر کے لہجے میں پوچھا۔

”تم نے آفس میں کیوں نہیں بتایا تھا مجھے کہ سرلا کے بھائی ہو۔“

”مجھے معلوم نہ تھا آپ سرلا بہن کو جانتے ہوں گے، ویسے بھی گھر کی بات آفس میں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”اس نے خوشنودی کا اظہار کیا۔“ Good habit

ہم صوفے پر بیٹھ گئے، انیلا، اس کی مئی اور سرلا بھی بیٹھ کر دلچسپی سے ہماری باتیں سننے لگیں، مسٹر ونود انگریزی کے سانچے میں ڈھلا ہوا افسر تھا، مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا وہ ”ونود بابو“ کی بجائے ”مسٹر ونود“ کہانا پسند کرتا ہے، میں نے سوچا، چلو یہی سہی اور کہا۔

”مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ انیلا کے پاپا ہیں۔“

اس ذکر پر وہ جذباتی ہو گیا۔ ”انیلا میری اور مورتی منڈل کی اکلوتی بیٹی ہے، میرا سب کچھ اسی کا ہے، یہ خوش ہو تو دنیا ہنستی مسکراتی نظر آتی ہے، یہ اداس ہو جائے تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

انیلا ”ڈیر پاپا“ کہہ کر اس سے لپٹ گئی، وہ بھی پیار سے اس کے کندھے تھپتھپانے لگا، سوتیلے باپ بیٹی کا یہ اذیت پیار ان کے ہنستے بستے جیون کا عکس تھا جس نے میرا دل گداز کر دیا اور

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جیون کا سب سے بڑا فلسفہ، سب سے بڑا آدرش پریم ہے خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو۔

یہاں آ کر معلوم ہوا کہ انیلا کی مئی کانن بنگال کا ضلع نواکھلی کی رہنے والی ہے جسے سیٹھ لکشمی نرائن نے منہ بولی بہن بنا لیا تھا، پٹنہ کے رئیس مورتی منڈل کا روبار کے سلسلے میں کچھ مدت چٹاگانگ میں رہے اور سیٹھ لکشمی نرائن کے ذریعے کانن اور مورتی منڈل کا بیاہ ہوا۔ بیاہ کے دوسرے برس انیلا نے جنم لیا، ان دنوں کانن اپنے تپتی کے ساتھ چٹاگانگ میں رہتی تھی، انیلا اور سرلا بچپن میں ایک دوسرے کی گہری سہیلیاں بن گئی تھیں۔ انیلا چھ برس کی تھی جب مورتی منڈل اپنی جنم بھومی پٹنہ میں لوٹ آئے اور دو برس بعد سو رگباش ہو گئے۔ سیٹھ لکشمی نرائن کو اپنی بہن کے ودھوا ہونے کا بڑا دکھ تھا، وہ کانن دیوی سے ملنے پٹنہ آتے جاتے تھے اور انہی کے کہنے پر کانن نے مسٹر ونود سے دوسرا بیاہ کر لیا تھا مگر ان کے ہاں کوئی بچہ نہ ہو سکا، بس انیلا مورتی ہی دونوں کے پیار کا گہوارہ تھی۔

اس طرح صرف انیلا اور سرلا ہی نہیں بلکہ دونوں پر یواروں میں بھی گہرا لگاؤ اور پیار تھا، کانن دیوی کا کوئی بھائی نہیں تھا، مگر سیٹھ لکشمی نرائن نے اس کے ساتھ سکے بھائیوں سے بڑھ کر سلوک کیا لہذا اس گھر میں سرلا اور اس کے ناتے میری کم حیثیت نہیں تھی، یہ ساری باتیں مسٹر ونود اور کانن دیوی کی زبانی معلوم ہوئیں، دونوں کو سرلا کے ساتھ میرے آنے کی بھی خوشی ہوئی تھی۔

تپتی چینی بیٹے دنوں کی یادوں میں کھو گئے تھے، اچانک انیلا بولی۔

”پاپا تمہیں ایک نئی بات بتاؤں؟“

”کوئی سی نئی بات؟“

”کیشپ بابو بہت بڑے بودھ اسکالر ہیں۔۔۔۔۔“

وہ ہنس دیا۔ ”یہ نئی بات نہیں میرے لئے۔“

نئی بات یہ ہے پاپا! میں ان کی شاگرد بن گئی ہوں۔“ انیلا بتانے لگی۔ ”اب اپنی کتاب ”پائلٹی پٹر“ بھی پوری کروں گی اور ان کی سہائتا سے بدھا کی پرانی مورتیوں کے فوٹو اسکیج بھی حاصل کر لوں گی۔“

میرا البم کمپلیٹ (Complete) ہو جائے گا۔“

پاپا نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”یہ تو اچھی بات ہے، کیشپ تمہاری ہلپ (Help) کر سکتا ہے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”یہ بدھا کی پرانی مورتیوں کا ریکارڈ اکٹھا کر رہی ہے چاہتی ہے پرانی مورتیوں کا کمپلیٹ البم چھاپ دے، اگر ایسا کوئی البم چھپ جائے تو بہار گورنمنٹ اس پر ایوارڈ دے گی۔“

”میں نے انیلا کا البم دیکھا ہے مگر اس میں بہت سی مورتیوں کے فوٹو اور اسکیچ نہیں۔“
 ”تم ہلپ کرو گے تو البم کمپلیٹ ہو سکتا ہے اور مجھے خوشی ہوگی۔“
 ”مجھے انیلا کی مدد کرنے سے انکار نہیں۔ مگر بودھ ماتھا لوجی اس وقت تک کمپلیٹ نہیں ہو سکتی، اب تک پہلی اور دوسری صدی کی مورتیوں کے بارے میں معلومات پوری نہ ہو جائیں، میں نے یہ معلومات اکٹھی کی ہیں وہ انیلا کو بھیج کر دوں گا مگر بدھ کی ایک خاص مورتی کا کھوج ابھی تک مجھے نہیں مل سکا۔“

”کوئی خاص مورتی ہے کیا؟“

”ہاں تاریخی مورتی ہے۔“ میں نے مسٹر ونود کی مزید توجہ اور دلچسپی کے لئے کہا اگر اس مورتی کا کھوج مل جائے تو میں گارنٹی دیتا ہوں کہ انیلا نہ صرف گورنمنٹ ایوارڈ حاصل کرے گی بلکہ دنیا میں اس کے نام کی دھوم مچ جائے گی۔“
 ”یہ سن کر انیلا چونک اٹھی۔“ اس کے پاپا کی دلچسپی بھی بڑھی۔

”پھر انیلا کے ساتھ مل کر اس مورتی کو ڈھونڈو۔ میں چاہتا ہوں میری بیٹی ایوارڈ حاصل کرے، دنیا میں نام پائے۔“

”اس مورتی کو ڈھونڈنے میں آپ میری اور انیلا کی ہلپ کر سکتے ہیں۔“ میں نے مسٹر ونود کے سامنے ایک نئی چال رکھ دی، وہ حیران سا بولا۔

”بھلا میں کیسے ہلپ کر سکتا ہوں۔“

”آپ کے ڈیپارٹمنٹ میں قدیم آثار کاریکارڈ ہوگا۔“

”ہاں ہے ریکارڈ۔“

اب میں اسے بتانے لگا۔

”میں جس مورتی کا ذکر کرتا ہوں وہ 1815ء میں پٹنہ کے ان پرانے ٹیلوں کی کھدائی سے برآمد ہوئی تھی، جہاں صدیوں پہلے پاٹلی پتر ہوتا تھا، پٹنہ سے وہ مورتی کلکتہ کے فورٹ ولیم میں منتقل کر دی گئی مگر 1848ء میں کمپنی گورنمنٹ کے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے اسے کسی نامعلوم جگہ بھیج دی اور آج تک اس کا کوئی کھوج نہیں مل سکا۔ ہو سکتا ہے وہ مورتی پھر پٹنہ پہنچا دی گئی ہو۔“

”مسٹر ونود اور انیلا میری ان معلومات پر دنگ رہ گئے، میں نے ہر بات آگے بڑھائی۔“

”میں آپ کے ڈیپارٹمنٹ میں 1848ء کا پرانا ریکارڈ دیکھتا چاہتا ہوں۔“

”مگر 1848ء کا ریکارڈ تو مشکل سے ملے گا۔“ مسٹر ونود نے مایوسی کا اظہار کیا۔ ”نہ جانے

ہے بھی یا نہیں کیونکہ 1857ء کے غدر میں بہت کچھ ضائع ہو گیا تھا۔“

”اس پرانے ریکارڈ پر انیلا کی شہرت کا دار و مدار ہے۔“

”انیلا کی دلچسپی بڑھ چکی تھی وہ محل کر بولی۔“

”پرانا ریکارڈ ڈھونڈنا پاپا۔“

”کہاں سے ڈھونڈوں، اگر کمپنی گورنمنٹ کا کوئی ریکارڈ ہوگا تو صرف نئی دہلی یا لاہور میں ہوگا۔“

میں نے خیال ظاہر کیا۔

”پٹنہ میں ہونے والی کھدائی کا ریکارڈ پٹنہ ہی میں ہونا چاہیے۔“

”تم دونوں کل میرے آفس آ جاؤ، میں کاشی رام سے ریکارڈ کی بات کروں گا، وہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا پرانا آدمی ہے۔“

میں نے اپنی ضرورت کا اظہار کیے بغیر مسٹر ونود کو ایک ایسے کام پر راضی کر لیا جس کے لئے پٹنہ آیا تھا، مگر اپنی بجائے انیلا مورتی کو آگے کر دیا، میں کہاں، یہ تو پر سر قدرت تھی، اس نے انیلا کو خود میرا ذریعہ بنایا ہے مجھے وشواس تھا اس کی خاطر ونود پرانا ریکارڈ پاتال سے بھی ڈھونڈ لائے گا۔

اس انکشاف پر کہ مطلوبہ مورتی ڈھونڈ لینے سے نہ صرف گورنمنٹ ایوارڈ مل سکتا ہے بلکہ دنیا بھر میں شہرت بھی ہوگی، انیلا نے سب کے سامنے میرا ہاتھ پکڑا اور بولی۔

”کیشپ بابو! میرا فیوچر (Future) تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”تمہارا فیوچر تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے انیلا! پھر بھی میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب سی مسکراہٹ چاند کی طرح طلوع ہوئی اپنی ممی اور پاپا کے سامنے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے شاید مجھے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہر لڑکی کو اپنے مستقبل کی تلاش ہوتی ہے اور اس کی تلاش میں ہوں لیکن کیا آکاش پر بھی کوئی فیصلہ ہو رہا تھا۔

(36)

تلاش

میں پٹنہ میں اور انیلا مورتی سے جس طرح آنکرایا، وہ اگرچہ ایک انوکھا اور حیرت انگیز واقعہ تھا مگر مجھے اپنے جیون میں ایسے کئی حسین اتفاقات پیش آچکے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے، جیون انہی اتفاقات اور واقعات کا نام ہے جو بالکل ناگہاں اور خلاف توقع پیش آتے رہتے ہیں۔ ماں کے پیٹ سے جنم لینے کے دن سے، شمشان میں جلائے جانے یا کسی قبرستان میں دفن کئے جانے کی گھڑی تک، ہر واقعہ اسی ترتیب کے ساتھ رونما ہوتا ہے، جس ترتیب کے ساتھ وہ آکاش کی کتاب پر پہلے سے لکھ دیا جاتا ہے کہ یوں ہوگا۔۔۔ یوں ہوگا۔۔۔ اور پھر یوں ہوگا مگر کوئی نہیں جانتا کیا ہونے والا ہے، جیسی لوگ بعض واقعات پر حیران سے رہ جاتے ہیں۔ ہمارے مشرق میں اسی کو تقدیر یا قسمت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو ہر آدمی کے ساتھ لگی رہتی ہے، کچھ لوگ اسے مانتے ہیں، کچھ نہیں مانتے مگر ہوتا وہی ہے جو پیغمبروں، اوتاروں، ولیوں، رشیوں، صوفیوں کے بقول پہلے ہی آسمان کی کتاب اسرار میں رقم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی انہی کی نظریں اس نیلی کتاب کی کوئی تحریر، کوئی پیش آنے والا واقعہ پڑھ لیتی ہیں ورنہ عام طور پر مستقبل کی سب باتیں پردہ راز میں رہتی ہیں اور ہر کوئی انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ میرا ہی معاملہ لیجئے، محکمہ آثار قدیمہ کے انچارج مسٹر ونود اور اس کے ہیڈ کلرک کاشی رام کو چھوڑ کر میں گنگا کنارے اس آسامی میں بھٹکتا رہا کہ پیتل کی مورتی جس نے مجھے پاٹلی پتر (پٹنہ) میں بلایا ہے، کہیں سے معجزانہ طور پر نمودار ہوگی اور میری رہنمائی کرے گی مگر اپنی سرلا بہن کے وسیلے سے مل گئی انیلا مورتی، جسے میں نے سرلا کی ایک سندرسہیلی اور ایک ماڈرن لڑکی جانا مگر اس سے اچانک ملاقات کی حکمت کو ذرا دیر سے سمجھ پایا۔

مجھے کیا علم تھا کہ انیلا مورتی سے میری ملاقات آکاش کی نیلی کتاب پر اسی سے لکھ دی گئی تھی جب میں نے چٹا گانگ میں سیٹھ لکشمی نرائن کی حسین سہری سرلا لکشمی کو اپنی منہ بولی بہن بنایا تھا پھر اس بات کا تو سان گمان بھی نہیں تھا کہ ساڈ گاری میں دیکھے ہوئے سپنے کی تعبیر انیلا مورتی ہوگی۔ اتفاق بھی حیران کن تھا کہ انیلا مورتی مسٹر ونود کی سوتیلی بیٹی تھی گویا پر اسرار تقدیر مجھے محکمہ آثار قدیمہ ہی کے ارد گرد لیے پھرتی تھی۔

ان ساری باتوں کا گیان حاصل کرنے اور یہ جان لینے کے بعد مجھے اصل میں انیلا مورتی

ن کے پاس بھیجا گیا ہے اور یہ بھی قدرت کی مہربانی یا بھگوان کی کرپاتھی کہ اس نے میرے راج کے مطابق میری تعبیر کو بہت سندر بنایا ہے، اس کے شگوفوں کی طرح سرخ ہونٹوں کو ایسی یادوگر مسکراہٹ بخشی کہ میں آپ سے آپ اس کی طرف کھینچتا چلا گیا اور اس مسکراہٹ کے دلکش تڑوں کا شکار ہو گیا۔

میں پہلے بھی بتا چکا اور اب مزید اعتراف کرتا ہوں کہ انیلا مورتی قدرت کا ایک حسین شاہکار تھی، سندر، سرو قد، ماڈرن۔ سندرمتی کی طرح اس کا شریہ بھی اجنتا اور ایلوا کی بے مثال مورتیوں کی طرح سانچے میں ڈھل کر نکلا تھا جسے آدمی دیکھتا ہی رہ جائے۔ اگر سندرمتی میں کسی دیوی کا سا وقار تھا تو انیلا مورتی میں ایک ماڈرن ناری کا بانگین جس کے بھرے بھرے بدن کو دیکھ کر نئے سنسار کے آئیڈیل اور اسٹیجیو یاد آ جاتے تھے اس پر منتر پھونکتی مسکراہٹ، سچ مچ انیلا مورتی جادو کی ایک پتلی تھی جو کسی جنتر منتر ہی کی طرح اچانک میرے جیون میں داخل ہوئی۔

یہ بھی بتاتا چلوں کہ انیلا مورتی میں سندرتا، جو بن اور جادوگر مسکراہٹ کے ساتھ ایک اور گن بھی تھا جو سندرمتی میں، جل پنا میں، منجوری میں دوسری ناریوں میں نہیں تھا جن سے میں ملا اور وہ گن بودھ مائیکھا لوجی کی ریسرچ کا شوق تھا، اس کے علاوہ بودھ اتھاس کے حوالے سے پاٹلی پتر کے پرانے حالات بھی لکھ رہی تھی کیونکہ ہسٹری سے گہرا لگاؤ رکھتی تھی، گویا سپنوں کی اشاراتی بھاشا میں وہ خود ایک ”پاٹلی پتر“ تھی جس کے حلقے میں کہیں نہ کہیں وہ ”مقدس مورتی“ چھپی بیٹھی تھی جسے کھوجنے میں یہاں آیا تھا۔

میرے پڑھنے والے خود اندازہ کر سکتے ہیں، اس انکشاف یا ادراک کے بعد میرے من میں انیلا مورتی کے لئے جو پریم بھاؤ پیدا ہوا، وہ قدرتی تھا مگر جب اس نے اپنے پاپا، مٹی اور سرلا لکشمی کے سامنے میرا ہاتھ تھام کر مجھے ”اپنا مستقبل“ قرار دیا تو میں قدرت کے اس بھید کو بھی نہیں سمجھ پایا۔ میرے گورو صوفی عبد الجبار نے کہا تھا کہ میرے ہاتھ پر تین ہی ریکھائیں ہیں اور اس کے مطابق تین ہی لڑکیاں مجھ سے وابستہ ہو چکی تھیں پھر یہ چوتھی لڑکی، چوتھی ریکھا کہاں سے آگئی؟

”کیا پر اسرار قدرت میرے ہاتھ پر چوتھی لکیر بھی کھینچ رہی ہے۔“

شام کا بھوجن کرنے کے بعد جب میں، سرلا بہن اور انیلا مورتی، مسٹر ونود اور کانن دیوی سے رخصت ہوئے اور کبھی ایک بار پھر ”مورتی ہاؤس“ کی طرف ہوئی تو میرے ذہن میں ”چوتھی لکیر“ کا خیال انگڑائیاں لے رہا تھا کیونکہ میں کبھی میں سامنے والی سیٹ پر بیٹھا تھا، انیلا مورتی سرلا کے ساتھ میرے سامنے بیٹھی تھی اور کبھی کبھی ہماری چور نظریں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں جس کے ساتھ ہی اس کے سندر ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر جاتی اور میرے من میں عجیب

سی باڑھ اٹھتی تھی۔

اچانک میں نے کوچوان سے کہا۔ وہ پہلے ”گپتا ہوٹل“ چلے، میں معلوم کرنا چاہتا تھا، کایا موسا اور وشال رائے کا کوئی پتر آیا یا نہیں۔

اپنے قارئین کی معلومات کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ ”گپتا ہوٹل“ ایک سرائے تھی جسے ”ہوٹل“ تکلفاً ہی کہا جاسکتا ہے۔ دراصل یا تری مندروں اور آشرموں میں ٹھہرتے یا سستی سراؤں میں قیام کرتے تھے، ہوٹلوں کا رواج نہیں تھا، بہر حال مالک نے سرائے کا نام ”گپتا ہوٹل“ ہی رکھا تھا، کریم اپنے کمرے میں موجود تھا، مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا مگر کایا پلٹھا اور وشال رائے کا کوئی پتر نہیں آیا تھا، میں نے کریم کو ”مورتی ہاؤس“ کا پتہ دیا اور کہا کہ جب گیا کے یا تری لوٹ آئیں یا ان کا کوئی خط پتر آئے وہ مجھے فوراً اطلاع دے۔

کریم کو سندیس دے کر پھر بگھی میں سوار ہوا تو اس بار انیلا مورتی نے اپنی سیٹ پر جگہ بنائی اور مجھے اشارہ کیا کہ اس کے پاس بیٹھوں بگھی چلی تو وہ بالکل میرے ساتھ لگ گئی ”کیا ہوٹل میں کوئی چیز بھول گئے تھے جو لے کر آئے ہو؟“

”اپنے آپ کو لینے گیا تھا۔“

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میرے لئے نا؟“

یہ کہہ کر مسکرائی، ناری کی مسکراہٹ ایک پردہ ہوتا ہے جس میں وہ اپنے کئی بھید چھپا لیتی ہے، کئی بھید کھول دیتی ہے اور مسکراہٹ انیلا مورتی کی ہو تو جادو پھونکتی ہے اس نے مسکرا کر ایک پانسہ پھینکا اور جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھا میں حیران تھا کیا جواب دوں کیا فیصلہ کروں آدمی کے اپنے ہی فیصلے اسے خوش بختی یا بد بختی کی طرف دھکیل دیتے ہیں میں انیلا مورتی کو اپنے آدرش کی علامت سمجھ رہا تھا اس لئے میرا جواب یہ تھا۔

”ہاں، تمہارے لئے۔“

اس نے میرے ہاتھ پر اپنی گرم، گداز گرفت مضبوط کر دی اور سرالہ نے سرگوشی کی۔

”اری انیلا! تو نے بھیا کو یوں پکڑ لیا ہے جیسے یہ بگھی سے اتر کے بھاگ جائیں گے۔“

”اب بھاگنے تھوڑی دوں گی۔“ پھر اس نے میری جانب پہلو بدلا۔ ”کیوں کیشپ! مجھے

چھوڑ کے بھاگ تو نہیں جاؤ گے؟“

اس کی مسکراہٹ میرے دل میں بھنور پیدا کرنے لگی میں نے کہا۔

”تمہاری مسکراہٹ نے بھاگنے کے سب راستے بند کر دیئے ہیں۔“

سرالہ نے پھر چٹکی لی۔ ”بھیا! لگتا ہے، میری گویاں نے تمہیں بندی بنالیا اپنا“

”میں نے تو تمہارے کہنے پر اسے شش بنایا تھا یہ مجھے جو چاہے بنا لے۔“

انیلا مورتی کے گالوں پر گلابیاں سی چھلک گئیں، اب سرالہ کو ایک نیا سوال سوچا۔ ”بھیا! تم نے پٹنہ میں آنے کا کارن نو بتایا ہی نہیں۔“

”مورتی ڈھونڈنے آیا ہوں۔“

انیلا مورتی اس ذومعنی جواب پر چونک گئی۔

”بھیا! مورتی تو مل گئی تمہیں۔“

”مل نہیں گئی مل جائے گی، ابھی تو بات ہی چلی ہے۔“

سرالہ کے ذہن میں انیلا مورتی تھی، میرا دھیان ”مقدس مورتی“ میں تھا اور انیلا مورتی کے پیارے میں نہ جانے کتنی مورتیاں کھڑی تھیں۔ بگھی ”مورتی ہاؤس“ میں داخل ہوئی تو رات کے دس بج رہے تھے۔

میں نے اپنے کمرے میں آ کر کرائے کا سوٹ اتارا اور پاجامہ کرتا پہن کے بیٹھا ہی تھا کہ انیلا مورتی شب خوابی کے لباس میں داخل ہوئی اور یوں لگا۔ آکاش سے اندر کی کوئی اپسرا اتر آئی ہے۔ اس نے کولہوں تک سفید گرتی اور ایڑیوں تک سفید ہی لہنگا پہن رکھا تھا، میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بالکل مورتی لگ رہی ہو، اس پہناوے میں۔“

”مورتی کا کوئی پہناوا نہیں ہوتا وہ اپنا پہناوا آپ ہوتی ہے۔“

”بہت خوبصورت بات کہی ہے تم نے۔۔۔ بیٹھو نا۔“

وہ بیٹھی نہیں، کھڑی کھڑی مجھے دیکھتی رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

”کیا مورتی پوجا کرتے ہو؟“

میں ایک پل کے چکرا کے رہ گیا۔ ”پہلے نہیں کرتا تھا، شاید اب کرنے لگوں۔“

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ”تمہارا مطلب ہے اب میری پوجا کرو گے۔“

”تم بھی مورتی ہونا۔“

”ہاں“ دوسروں کے لیے انیلا مگر تمہارے لیے مورتی ہوں، تم صرف مورتی کہا کرو، مجھے کہو

گے نا؟“

”ہاں مورتی! کہوں گا۔“

”پوجا بھی کرو گے؟“

”مورتی پوجا ایک دھرم ہے اور میں ادھرمی نہیں۔“

”پھر کرو مورتی پوجا۔“

اس کے شگوفہ ہونٹوں پر جادوگر مسکراہٹ کھیلنے لگی، میں نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں

لے لیا شاید وہ خود بھی یہی چاہتی تھی، میں اس کی دعوت مسترد نہیں کر سکتا تھا، وہ میرے سینے کی تعبیر تھی اور پراسرار قدرت چاہتی تھی، میں اسے اپنالوں، دوسرے پل وہ کسمسا کر پیچھے ہٹی پھر ہولے سے بولی۔ ”تم نے پہلی پوجا کی ہے۔“

”مورتی پوجا میں نے پوجا کے ساتھ مورتی کا اضافہ ضروری سمجھا۔“

اس نے یک لخت بات بدل دی۔ ”تم نے پاپا سے بدھا کی جس خاص مورتی کا ذکر کیا تھا کیا اسی کو ڈھونڈنے آئے ہو یہاں؟“

”ہاں“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”مگر تمہارا ملنا میرے لیکھ میں تھا۔“

”وہ کیسے؟“

میں اسے بتانے لگا۔ آسام کے اونچے پر بتوں پر دور ایک عمارت ہے ساؤ گاری میں نے وہاں ایک عجیب سپنا دیکھا جس میں مجھے پائلی پتر جانے اور گنگا کنارے مورتی سے ملنے کا اشارہ دیا گیا تم مجھے گنگا کنارے ایک مندر میں اچانک مل گئیں تمہارا نام بھی مورتی ہے۔ ”یہ مورتی ہاؤس“ بھی تمہارا ہے جہاں تم مجھے لے آئیں، بدھا کی مورتیوں پر تمہارا الہم بھی دیکھا ہے اور پائلی پتر پر کتاب بھی لکھ رہی ہو، اب سوچتا ہوں مجھے تمہارے ہی پاس بھیجا گیا ہے۔

وہ یہ سب کچھ بڑی حیرت اور دلچسپی سے سنتی رہی پھر بولی ”کیا سپنوں پر دوشواں رکھتے ہو؟“

”اب بھی نہیں رکھوں گا کیا تم میرے سینے کی تعبیر ہی تو ہو۔“

”بڑا سپنا دیکھا تم نے۔“

”مگر تعبیر سینے سے زیادہ سندر ہے۔“

”سینے میں مورتی سے ملنے کا گیان ہوا تھا جی مجھے مورتی کہنا اچھا لگتا ہے تمہیں۔“

”تم نے بھی تو آگیا دے دی ہے تمہیں صرف مورتی کہوں۔“

”اب ایک اور آگیا دیتی ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”مورتی کے ساتھ ایک شبد اور کہہ لیا کرو۔۔۔ میری“

میں تڑپ سا گیا۔ ”میری مورتی“

مگر ”میری“ کا شبد صرف تنہائی میں کہنے کے لئے ہے دوسروں کے سامنے نہیں کہنا۔“

”سرا کے سامنے بھی نہیں۔“

”سرا دوسری نہیں، میں اور وہ ایک ہی ہیں، ہم اپنی کوئی بات ایک دوسری سے چھپا کے نہیں رکھتیں۔“

”اسے یہ بھی بتا دو گی کہ میں نے تمہاری پوجا کی ہے۔“

”کیوں نہیں بتاؤں گی۔“

میں اس کے منہ کی طرف تکتے لگا۔ ”اس نے ایک اور شکوفہ چھوڑا۔“

”میں تمہارے منہ سے اپنے لئے ”تو“ کا شبد سننا پسند کروں گی۔“

ارے یہ تو دوسری سندر متی ہے، میں بری طرح چونکا سندر متی نے بھی ملتے ہی میرے لئے ”آپ“ اپنے لئے ”تو“ کی بحث نکالی اور دلیل یہ دی تھی کہ میری جیت اور اپنی ہار چاہتی ہے، سوچا دیکھوں تو سہی۔ مورتی اس ”تو“ کی کیا حجت نکالتی ہے۔

”پہلے ”آپ“ سے ”تم“ ہوئی اب ”تم“ سے ”تو“ کیوں؟“

اس نے مسکرا کے جواب دیا ”میں شش ہوں، تم گورو ہوں، شش اور گورو میں ”تو“ اور ”تم“ کا فاصلہ تو ہونا چاہیے۔“

دلیل ٹھیک ہی تھی، میں نے پوچھا ”کیا ”تو“ بھی تنہائی کا شبد ہے؟“

”نہیں، سب کے سامنے کہو، پاپا اور می کے سامنے بھی۔“

میں سمجھ گیا کہ پاپا اور می کا ذکر کیوں کرتی ہے، انہیں بتانا چاہتی تھی کہ ہم دو ہی دن میں نیچرل ہو گئے ہیں، کوئی بیگانگی نہیں رہی۔

”کوئی اور حکم بھی ہے؟“ میں نے مسکرا کے پوچھا۔

”ہاں“ وہ انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ”کل ٹھیک دس بجے جیورام تمہیں ٹیلر ماسٹر کے پاس لے جائے گا وہاں صرف اپنا ناپ دینا ہے۔“

جیورام کبھی کے کوچوان کا نام تھا جو چوکیدار کے ساتھ ہی سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا، میں پریشان سا بولا۔

”تو میرے پہناوے کی اتنی چٹنا کیوں کرتی ہے۔“

”پاپا کو نہیں سمجھتے تم؟“

”سمجھ گیا ہوں مگر سوٹ میں خود.....“

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”نہیں، سوٹ وہی پہنو گے جو میں سلواؤں گی تمہیں صرف ناپ دے کر لوٹ آنا ہے، بارہ ایک بجے ہم پاپا کے آفس جائیں گے اس لئے کرائے کا سوٹ ابھی واپس نہیں کرنا۔“

اس نے بالکل آئی سی ایس افسر کی بیٹی کے لہجے میں احکام نافذ کیے۔ انتظامی معاملات میں اپنی رائے اٹل سمجھتی تھی، آگے چل کر اس کی یہ طبیعت میرے لئے کتنی سودمند ثابت ہوئی؟ آئندہ صفحات میں پڑھنے والوں کو اس کا اندازہ ہو جائے گا، میں نے کوئی حجت مناسب نہ سمجھی، اب مجھے بھی مسٹر ونود کو ”پاپا“ ہی کہنا اور اس کے مزاج کا دھیان رکھنا تھا۔

اتار دی، مورتی بھی میرے ساتھ ہی دروازے پر آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کے بولی۔

”آؤ ذرا باہر لان میں گھومیں۔“

میں نے گھنٹی کی طرف اشارہ کیا جو میرے سر ہانے پڑی تھی، اس نے لپک کر گھنٹی اٹھائی اور مسکرا کے کہنے لگی۔ ”گھوڑے کے گلے سے اتار کر لائی گھی۔“

”میرے گلے میں باندھنے کے لئے؟“

وہ بے اختیار ہنس دی۔ ”کیا پوجا کی گھنٹی نہیں بجانی تھی؟“

ہم ہنستے مسکراتے باہر لان میں آگئے، اچانک میں نے پوچھا

”کیا سرلا ابھی نہیں جاگی۔“

”سورہی ہے، آؤ اسے چل کے جگائیں۔“

پھر مجھے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی۔ ڈبل بیڈ پر سرلا لکشمی ایک طرف پہلو کے بل جوانی کی میٹھی نیند سو رہی تھی، بکھرے بکھرے بال، بے ترتیب لباس اور سونے کی بے پروائی دیکھ کر سرلا بہن پر اس راجکماری کا گمان ہوا جو سپنے میں کسی راجکمار کے اڑن کھٹولے کو دیکھ رہی ہو اور ایسے سندر سپنے عموماً سویرے ہی آیا کرتے ہیں، جب شریر نیند کی لذت میں چور اور گرم ہوتا ہے، میں ابھی اسی خیال میں مگن تھا کہ انیلا مورتی نے اس کے کان کے پاس زور سے گھنٹی بجائی، سرلا نے کروٹ بدلی۔ ”کچھ“ ”اوں..... آں“ کی پھر ہڑ بڑا کے اٹھی، گھبرا کے اچھلی اور چھلک سی گئی مگر مجھے اور مورتی کو دیکھا تو کچھ سمجھی، کچھ حیران ہوئی، مورتی نے ایک بار پھر گھنٹی بجائی اور کہا۔ ”سرلا! اٹھ پوجا کا سہ ہے۔“

”کیوں گھنٹی بجا رہی ہے؟“ پھر اس نے میری طرف دیکھا ”اور بھیا! تم سویرے ہی

جاگ گئے ہو آج۔“

”تمہاری گویاں کہتی ہے، سویرے سویرے پوجا کرنی چاہیے۔“

سرلا نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا اور چہچہتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تم کر آئے مورتی

پوجا بھیا؟“

کبھی کبھی کچھ نہ کہنا کچھ کہنے سے بہتر ہوتا ہے، اس لئے چپ رہا مگر مورتی نے پٹاخ سے

جواب دیا۔

”تیرے بھیا نے تو پوجا کر لی، بس تو رہ گئی ہے۔“ پھر کلائی سے پکڑ کر اسے پٹنگ سے نیچے

اتار لیا۔ ”چل ذرا لان کی سیر کریں گے۔“

”بھیا کو پوجا کرائی ہے تو سیر بھی کرا، مجھے کیوں گھسیٹتی ہے؟“

مگر زرب مسکراتی ہمارے ساتھ بولی، ہم لان میں آئے تو گھاس پر اوس کے موتی

انیلا مورتی چند لمحے کھڑی دیکھتی رہی غالباً جانچ رہی تھی اس کے احکام مجھے ناگوار تو نہیں لگے اور مجھے نارمل دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرا دی۔

”اچھا گورو جی! اب سویرے ملیں گے۔ گڈ نائٹ!“

”ایک بار مورتی پوچھا تو کر لینے دے۔“

”اب مورتی پوچھا سویرے ہوگی۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور بڑے دھیرے۔۔۔ دھیرے چلی کہ میں اسے بڑھ کر روکتا ہوں یا نہیں دروازے پر ایک پل کور کی اور مڑ کے دیکھا مگر میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلاتا پھر یہ سوچ کر شاید میں اس کی آواز کو نہیں سمجھا، وہ باہر نکل گئی اور میں کھڑا سوچنے لگا کہ آج جو کچھ ہوا ہے کیا یہ بھی آکاش کی کتاب اسرار پر پہلے سے لکھا جا چکا تھا؟

سویرے ابھی بستر پر تھا کہ کان میں ہلکی ہلکی گھنٹی کی آواز پڑی، آواز بالکل قریب ہی تھی۔ میں جاگ گیا اور آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ انیلا مورتی اپنے ہاتھ میں کانسی کی ایک چھوٹی سی گھنٹی پکڑے میرے کان کے پاس بجا رہی ہے، میں حیران سا اسے دیکھنے لگا، وہ گھنٹی ہلا کر بولی ”گورو دیو! مورتی پوچھا نہیں کرو گے؟“

میں بستر پر اٹھ کے بیٹھ گیا، سوچا کیا رات دروازے کی چٹنی لگانا بھول گیا تھا مگر دروازہ بند تھا، چٹنی بھی لگی ہوئی تھی۔ مورتی نے میری پریشانی بھانپ کر کھلی کھڑی کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ”میں دروازے سے نہیں کھڑکی سے آئی ہوں۔“

باہر پو پھٹ رہی تھی اور کھڑکی سے آنے والی صبح کی روشنی میں انیلا شب خوابی کے سفید لباس میں سچ سچ مورتی لگ رہی تھی، میرے اندر کا آدمی بولا۔ ”تھارو کیشپ! رات تم نے پوجا کے لئے کہا مگر مورتی چل دی پھر اس نے سوچا تمہاری بات ٹھکرائی نہیں جانی چاہیے تھی اور دھیرے دھیرے چلنے لگی کہ آگے بڑھ کے روک او، تم اپنی جگہ سے نہیں ہلے، وہ چلی گئی شاید رات بھر کروٹیں بدلتی رہی اور سویرے ہی اٹھ کر تمہارے پاس آگئی کہ مورتی پوجا کر لو۔ آئی بھی کھڑکی کھانڈ کر اور گھنٹی بجا کر تمہیں جگایا، کچھ سمجھے اس کا مطلب؟“

یہ کوئی سمجھ میں نہ آنے والی پہیلی نہ تھی، سیدھا سادا پریم کا کھیل تھا اور میری لیے کوئی نیا کھیل بھی نہیں تھا میں نے مورتی کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے پہلو میں لے لیا وہ میری ہانہوں میں گری اور تیز سانسوں کے دریاں بولی ”بڑے بے سدھ سوتے ہو۔ گھنٹی کی آواز پر اٹھے۔“

”گھنٹی پوجا کے لیے بجائی تھی نا تو نے؟“

”مورتی پوجا کے لئے۔“ اب کے اس نے پوجا کے ساتھ مورتی کا لفظ بڑھایا۔ شاید رات والی بھول یا ادا کا ازالہ کرنا چاہتی تھی، باہر دور کہیں سنگھ بجا میں فوراً اٹھا اور جا کر دروازے کی چٹنی

دو حصوں میں بٹ کر رہ گیا تھا اچانک انیلا مورتی اپنے پاپا سے مخاطب ہوئی۔

”کیا اب ہمیں کلکتہ جانا ہوگا۔“

”اگر تم اپنا الیم کمپلیٹ کرنا چاہتی ہو تو اس مورتی کو ڈھونڈنے کلکتہ چلی جاؤ۔“

مسٹر ونود کو اپنی سوتیلی بیٹی کے الیم کی بڑی فکر تھی، ہونی بھی چاہیے، انیلا مورتی نے الیم پر کافی محنت کی تھی، وہ بولی۔ ”پاپا! تم بھی کلکتہ چلو نا۔“

”میں آفس چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں، تم اور کیشپ چلے جاؤ، کلکتہ میوزیم کا انچارج میرا دوست ہے، میں اسے ٹیلی گرام دے دوں گا، وہ تمہاری پوری ہیلپ کرے گا۔“

”ہم کل صبح کی ٹرین سے چلے جائیں پاپا؟“

”اپنی می سے پوچھ کر چلی جاؤ۔“

انیلا مورتی نے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھا، وہ کلکتہ کے سفر میں اس لئے بھی دلچسپی رکھتی تھی کہ پاپا کو میرے اور اس کے اٹھنے سفر پر کوئی اعتراض نہ تھا، بولی۔ ”اب تو کلکتہ جانا ہوگا۔“

اس کا خیال تھا، میں انکار نہیں کروں کہ یہ نیک پریمی تو ایسے سفر کے بہانے ہوتے ہیں مگر اچانک مجھے ایک کیاں یا الہام سا ہوا اور میں نے جواب دیا۔

”اگر مورتی کلکتے میں ہوتی تو تو مجھے پٹنہ میں نہ دیکھتی۔“

اور یہ گیان شاید اس لئے ہوا تھا کہ مورتی کو کھوجنے کے لئے سپنے میں مجھے پاٹلی پتر یعنی پٹنہ ہی جانے کی ہدایت کی گئی تھی اور اس ہدایت کے مطابق میں پٹنہ آ گیا تھا، میں نے یہ بات اس لئے بڑے وشواس کے ساتھ کہی تھی کہ چکرورتی چاچا نے باسو بابو کے ذریعے کلکتہ میں پوری چھان بین کی مگر اصل مورتی کا وہاں کوئی کھوج نہیں مل سکا تھا، میرے گیان اور عرفان کے مطابق اسے پٹنہ ہی میں کہیں ہونا چاہیے تھا، انیلا مورتی نے چونک کر میری طرف دیکھا، مسٹر ونود، کاشی رام اور لوہیا بھی دنگ رہ گئے، میں نے مزید وضاحت کی۔ ”ہم کلکتہ نہیں جائیں گے، مورتی پٹنہ میں ملے گی۔“

اس دنیا میں کبھی کبھی دو آدمی بھی ایک خیال پر متفق نہیں ہوتے مسٹر ونود جیسے ”انگریز“ کو ہم خیال بنانا یا قائل کرنا تو یوں بھی مشکل تھا مگر میں نے زور دے کر کہا۔ ”وہ مورتی پٹنہ میں ہے پاپا! اور یہیں ملے گی۔“

مسٹر ونود میری زبان سے پہلی بار ”پاپا“ کا لفظ سن کر بڑا خوش ہوا، ایک بار اس نے انیلا کو دیکھا پھر اپنی تحسین آمیز نظریں میری طرف اٹھائیں۔

”تم لوں کہتے ہو جیسے تمہیں گمان ہوا ہے۔“

بکھرے تھے، پورب کی افقی لکیر پر لالی پھیل گئی تھی اور سورج کا سرخ گولا اس لکیر سے ہو لے ہو لے ابھرنے لگا تھا، اس طرح پٹنہ میں میرا ایک نیا دن نئے انداز سے شروع ہوا اور وہ دن یادگار اور آشاؤں سے بھرا ہوا تھا۔

اسی دن پروگرام کے مطابق جیورام دس بجے مجھے بگھی میں بٹھا کر ٹیلنگ شاپ پر لے گیا اور دوپہر کا بھوجن کرنے کے بعد میں اور مورتی اسی بگھی پر محکمہ آثار قدیمہ کی طرف روانہ ہوئے۔

مسٹر ونود اپنے دفتر میں ہمارا انتظار کر رہا تھا، ہیڈ کلرک کاشی رام کے علاوہ ریکارڈ کپر لوہیا بھی پہلے سے موجود تھا اور ایک دو سالخورہ رجسٹر بھی میز پر کھلے تھے، کاشی رام نے بڑی گرم جوشی سے میرا سواگت کیا۔ مورتی کے تو پیروں میں بچھا جا رہا تھا، ہمارے بیٹھتے ہی مسٹر ونود نے بتایا۔

”آج میں نے دفتر کا پرانا ریکارڈ نکلوایا تو پتہ چلا کہ 1817ء میں پٹنہ کی کھدائی سے جن عجائبات کی ریکوری (Recovery) ہوئی ان میں بدھا کی ایک پرانی مورتی بھی تھی جسے کمپنی گورنمنٹ کے ہیڈ کوارٹر کلکتہ بھیج دیا گیا تھا مسٹر لوہیا کی رپورٹ صرف یہی بتاتی ہے مگر تم کہتے ہو گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے 1848ء میں بدھا کی وہ مورتی بہار گورنمنٹ کو واپس کر دی تھی۔

کاشی رام اور لوہیا آج سارا دن اس بات کا کھوج لگاتے رہے ہیں، انہوں نے سارا پرانا ریکارڈ ٹول سکا، الٹ پلٹ دیا مگر مورتی کی واپسی کا کوئی پتہ نہیں چل سکا اگر مورتی پٹنہ کو واپس کی جاتی سرکاری ریکارڈ پر درج ہوتی آئی ایم ساری، ہمارے ریکارڈ کے مطابق بدھا کی وہ مورتی بارہ پٹنہ نہیں آئی۔“

یہ رپورٹ بڑی نراش کر دینے والی تھی، کاشی رام اور لوہیا دونوں نے نہ صرف مسٹر ونود کی سید کی بلکہ بتایا کہ بدھا کی بہت سی مورتیاں ان کے ریکارڈ پر ہیں مگر جس مورتی کا میں ذکر کرتا ہوں، وہ کلکتہ سے پھر پٹنہ نہیں بھیجی گئی، انیلا مورتی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”پھر وہ مورتی کہاں گئی پاپا!“

”ہو سکتا ہے، لارڈ ڈلہوزی نے اسے لکھنؤ یا نئی دہلی کے کسی میوزیم میں بھیج دیا ہو۔“

”نہیں“ میں نے مسٹر ونود کو بتایا ”1848ء میں برائے نام سہی لکھنؤ اور دہلی میں دیہی تیس قائم تھیں، اودھ کا کمپنی گورنمنٹ سے باقاعدہ الحاق سات آٹھ برس بعد ہوا۔ 1857ء دہلی کی مغل گورنمنٹ نے کمپنی کے خلاف جنگ لڑی، ان پولیٹیکل خرابیوں کے کارن لارڈ ڈلہوزی ایک نایاب مورتی لکھنؤ یا دہلی ہرگز نہیں بھیج سکتا تھا۔“

مسٹر ونود نے میری بات بڑے دھیان سے سنی اور سوچ کر کہا۔ ”پھر مورتی کلکتہ میں ہوگی۔“

دفتری رپورٹ نے مجھے پریشان کر دیا تھا کہ مورتی دوبارہ پٹنہ بھیجی ہی نہیں گئی، خیال آیا، ہے نقلی مورتی کی طرح اصل مورتی بھی فورٹ ولیم کے کسی تہہ خانے میں مڑی ہو، ذہن

میں اپنے سنے اور حقیقت کو ایک کر رہا تھا، دو اندھیروں یا دو روشنیوں کے کنارے باہم ملا رہا تھا، اسی کشمکش میں بولا۔ ”سمجھو پاپا! گیان ہی ہوا ہے مجھے۔“

”مگر سرکاری ریکارڈ گیان کو نہیں مانتا۔“

اچانک میں نے ریکارڈ کیپر لوہیا سے پوچھا۔ ”یہاں کب سے کام کر رہے ہو؟“

”اس محکمے کا سب سے پرانا آدمی ہوں۔“ لوہیا نے جواب دیا۔ ”تیس برس ہو گئے کام کرتے۔“

”تیس برس جیون کا آدھا حصہ ہوتے ہیں اور تم نے ان تیس برسوں میں محکمے کی ہر چیز کو دیکھا بھالا ہوگا، پرانے نوادرات کے ریکارڈ تیار کئے ہوں گے، ان کے بارے میں معلومات حاصل کی ہوں گی۔“

”بے شک یہ سب کچھ کیا ہے میں نے، مگر بدھا کی جس مورتی کا آپ پوچھ رہے ہیں، اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔“

دفتری رپورٹ کی طرح لوہیا کی باتیں بھی مایوس کن تھیں، اچانک ایک نیا خیال آیا۔ ”تم سے پہلے کون آدمی ریکارڈ کیپر تھا؟“

”ایک مسلمان تھے، مصطفیٰ بہاری، مظفر پور کے رہنے والے تھے۔“

”کیا زندہ ہیں یا.....“

”زندہ ہیں مگر بہت بوڑھے ہو گئے۔“

”مظفر پور میں رہتے ہیں کیا؟“

”نہیں، یہیں پٹنہ میں۔“

”ان کا ایڈریس کیا ہے؟“

”مجھے ان کا ایڈریس یاد نہیں۔“

انیلا مورتی جو چپ چاپ ہماری باتیں سن رہی تھی، ہیڈ کلرک کاشی رام سے مخاطب ہوئی۔

”کاشی رام! اپنے دفتر کے آدمیوں سے پتہ کرو، مصطفیٰ بہاری کہاں رہتے ہیں؟ یہ کام ایک گھنٹے کے اندر ہو جانا چاہیے۔“

افسر کی بیٹی نے بالکل افسر کی طرح حکم جاری کیا اور کاشی رام اسی وقت کمرے سے نکل گیا، اس کی عدم موجودگی میں مسٹر ونود نے ایک بار پھر مجھے توجہ دلائی کہ میں انیلا کے ساتھ کلکتہ چلا جاؤں، ہو سکتا ہے وہاں سے مورتی کا کوئی سراغ مل جائے، کم سے کم یہی پتہ چل جائے کہ اگر وہ کلکتہ سے باہر بھی گئی تو کہاں، مگر انیلا نے اس کی بات کاٹ دی۔

”پاپا! جب کیشپ کا گیان کہتا ہے کہ مورتی یہیں ہے تو یہیں ہوگی۔“

”گیان میں مسئلہ Mistake بھی ہو سکتی ہے۔“

”انسان میں مسئلہ ہوتی ہے پاپا! گیان میں نہیں ہوتی۔“

ونود بیٹی کا جواب سن کر چپ ہو گیا، صرف دس منٹ کے اندر کاشی رام لوٹ آیا۔ مصطفیٰ بہاری کا ایڈریس اس کے ہاتھ میں تھا، وہ بزرگ بڑے بازار میں رہتے تھے، میں نے لوہیا سے کہا کہ وہ ایڈریس لے لے اور ہمارے ساتھ چلے، انیلا مورتی میرے ساتھ ہی اٹھی اور ایک افسر کی سی شان سے بولی۔ ”پاپا تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

مسٹر ونود کو انکار کی جرات نہ ہو سکی، ہمارے ساتھ ہی کمرے سے نکلا، وہ اپنے دفتر میں ایک مضبوط، ڈسپلن کا پابند اور سخت گیر آدمی تھا مگر بیٹی کے سامنے کمزور نظر آیا اور یہ کمزوری انیلا مورتی سے بے پناہ پیار کا نتیجہ تھی کچھ اور نہیں تھا۔

ہم بھی میں بیٹھے اور پندرہ بیس منٹ میں مصطفیٰ بہاری کے مکان پر پہنچ گئے، نوے برس کے بوڑھے بہاری نے مسٹر ونود کی آمد کا سنا تو حیرت بھی ظاہر کی، پرتپاک سواگت بھی کیا اور بیٹھک میں بٹھایا، مصطفیٰ بہاری بوڑھے ضرور تھے مگر اس عمر میں بھی اپنے سارے کام خود کرتے تھے۔ اپنے پوتے کو بازار دوڑا دیا کہ مٹھائی لے کر آئے اور تاکید کی کہ گنیت حلوائی کی دکان پر جائے، ہم سب ان کے حسن اخلاق سے خوش ہوئے۔ وہ سراپہ ایثار بن گئے تھے، انہوں نے انیلا مورتی کی پیشانی پر بوسہ دیا کہ بڑے افسر کی بیٹی ہو کر خود ملنے آئی اور اپنے پاپا کو بھی ساتھ لائی ہے، مسٹر ونود بولے۔ ”آپ سے کچھ کام ہے۔“

”اگر میں آپ کی کوئی خدمت کر سکا تو بڑی خوشی ہوگی، مجھے فرمائیے کیا کام ہے۔“

”کچھ پوچھنا ہے آپ سے۔“

”پوچھیے۔ میں حاضر ہوں۔“

مسٹر ونود نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے پوچھا۔

”آپ کتنی مدت محکمے میں ریکارڈ کیپر رہے؟“

”میاں! پورے چالیس برس سرکار انگلشیہ کی نوکری کی 1900ء میں ریٹائر ہوا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ نے 1860ء میں نوکری کی تھی؟“

”ہاں میاں! یہی سن تھا۔“

بجائے اس کے کہ میں ان سے بدھا کی مورتی کے بارے میں کچھ پوچھتا، ناگہاں ذہن میں ایک عجیب سی لہر سرسرائی اور میں نے غیر اختیاری طور پر سوال کیا۔ ”آپ کی ملازمت کے دنوں میں کبھی چوری تو نہیں ہوئی محکمے میں؟“

اس عجیب و غریب سوال نے بوڑھے مصطفیٰ بہاری کے ساتھ مسٹر ونود، انیلا مورتی اور لوہیا

کو بھی حیران کر دیا، وہ بولے۔

”اللہ کا نام لومیاں! ان دنوں سرکار کے محکموں میں چوری کہاں ہوتی تھی۔“

معلوم نہیں میرے ذہن میں چوری کہاں سے آگئی تھی، میں نے اصرار کیا۔ ”میرا مطلب ہے محکمے سے کوئی نادر شے چرائی یا غائب کر دی گئی ہو بعض لوگ عجائب گھروں یا آثار قدیمہ کے دفاتروں سے قدیم نوادہ چرائیتے اور پرانی اشیاء جمع کر نیوالے شائقین کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں۔“

”نہیں، میرے ہوتے تو محکمے میں کبھی چوری نہیں ہوتی۔“

میں مصطفیٰ بہاری کے جواب سے بھی مایوس ہوا اور ذہن بوجھل سا ہو گیا، کوئی بات بنتی نظر نہیں آرہی تھی، میں سوچنے لگا، ذہن میں چوری کا خیال یونہی نہیں آیا، اس کے پیچھے ضرور کوئی بات چھپی ہے مگر بوڑھے مصطفیٰ بہاری نے کہا تھا کہ ان دنوں سرکاری محکموں میں چوری نہیں ہوتی، ہر زمانے کا آدمی اپنے ہی سے کو آنے والے سے بہتر قرار دیتا اور کہتا ہے کہ اگلے وقتوں میں یوں نہیں، یوں ہوتا تھا، حالانکہ اس دنیا میں کوئی بات نئی نہیں جو کچھ پہلے ہوتا رہا، وہی اب ہو رہا ہے اور آئندہ ہوتا رہے گا جس طرح زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اسی طرح سب کچھ گھوم کے پھر لوٹ آتا ہے، سورج، چاند، ستارے، دن، رات، رتیں اور موسم سب کچھ گردش میں ہے۔ اس سنسار میں سب کچھ وہی ہے جو پہلے تھا اور عقل کہہ رہی تھی۔

”چوری تو سدا سے ہوتی رہی ہے گھروں میں، دکانوں میں، گوداموں میں، سرکاری محکموں میں، پھر مصطفیٰ بہاری کے دنوں میں کیوں نہیں ہوئی؟“

اس اثناء میں بوڑھے کا پوتا اکبر، گپت حلوائی کی دکان سے مٹھائی لے آیا تھا۔ جو ہمارے سامنے رکھ دی گئی اور ہم منہ میٹھا کرنے لگے مگر میرے ذہن میں ایک کڑوی بات گھل رہی تھی۔

”عقل پر بھروسہ نہ کر، قرعہ ڈال کر دیکھ، قدرت کا پراسرار ہاتھ کیا اشارہ کرتا ہے۔“

میں نے جیب سے چاندی کا روپیہ نکالا جس پر ملکہ دکنوریہ کی مورت تھی اور کچھ بتائے بغیر انیلا مورتی سے کہا کہ وہ روپے کی چین یا مورت چن لے۔

مورتی نے کہا ”مورت“

میں نے روپیہ پھینکا تو مورت ہی آئی، مورتی بھی حیران تھی، دوسرے لوگ بھی حیران تھے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ قرعہ میرے حق میں پڑا تھا، فال مورت کی نکلی تھی، میں نے مصطفیٰ بہاری سے کہا ”چوری نہ سہی اپنے دنوں کا کوئی عجیب واقعہ ہی سنائیے جو آپ کے محکمے میں ہوا ہو۔“

”کوئی عجیب واقعہ ہوا ہی نہیں جو قابل ذکر ہو۔“

”آپ سے پہلے کون آدمی کام کرتا تھا؟“

”رام سورتی۔۔۔ اسے مرے بہت عرصہ ہو گیا اور۔۔۔“

مصطفیٰ بہاری کچھ کہتے کہتے رک گئے، دو تین بار شہادت کی انگلی اپنے ماتھے پر ماری اور بولے ”میاں! رام سورتی کے ذکر پر ایک عجیب بات یاد آئی اور وہ بات چوری کی تھی اور نہیں بھی۔“

میں چونکا۔ ”چوری تھی اور نہیں بھی، پھر تو کوئی عجیب بات ہوگی۔“

”عرض کرتا ہوں۔“ اور وہ اپنے بوڑھے حافظ پر زور دے کر کہنے لگے۔ ”جب رام سورتی

ریٹائر ہوا اس نے مجھے چارج دیا تھا، ان دنوں محکمے کی یہ سورت نہیں تھی جو آج ہے، دودو، تین تین محکمے اکٹھے ہوتے تھے، خیر تمہیں ان باتوں سے کیا لینا ہے، رام سورتی کمپنی سرکار کے زمانے میں نوکر ہوا اور اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت اس نے ایک عجیب واقعہ سنایا جو بیان کرتا ہوں۔

اس نے بتایا تھا کہ 1857ء کے سال جب ہندوستان میں غدر مچ رہا تھا، کمپنی سرکار کے خلاف دھاوے ہو رہے تھے، دہلی، لکھنؤ اور جھانسی سے مار دھاڑ کی خبریں آرہی تھیں تو کمپنی کے ملک محروسہ بنگال، بہار میں بھی بڑی بے چینی پھیل گئی، بنگال اور بہار پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے پہلے قبضہ کیا تھا اور یہاں اس کے پاؤں بڑے مضبوط تھے مگر ان دنوں کمپنی سرکار سے اکثر آدمیوں کی وفاداریاں مشکوک ہو گئی تھیں اور لوگ انگریز کو ہندوستان سے نکالنے پر تل گئے تھے۔ کمپنی کی انگریزی اور دیسی فوجیں جگہ جگہ باغیوں سے لڑ رہی تھیں اور سرکار اپنے دیسی ملازموں کا نہ صرف بہت خیال رکھتی بلکہ ان کی بعض وفاداریوں پر انعام بھی دیتی تھی۔

رام سورتی انگریزی سرکار کا ملازم اور اس کا خیر خواہ تھا، ان دنوں اس نے کمپنی سرکار کی کوئی ایسی خدمت کی جس کے عوض اسے ایک سو روپے کا نقد انعام ملا، انعام اسے دفتر ہی میں پیش کیا گیا، ان دنوں سو روپے کی رقم بہت بڑی سمجھی جاتی تھی مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ دفتر سے نکلا اور روپوں کی تھیلی اپنی میز کی کھلی دراز میں بھول گیا، گھر پہنچا تو تھیلی یاد آئی مگر دفتر بند ہو چکا تھا، بیوی نے کہا صبح چڑا اسی دفتر کھولے گا اور بھنگی جھاڑو دینے آئے گا تو ہو سکتا ہے کوئی تھیلی اڑا کر لے جائے، رام سورتی کو بھی پریشانی لاحق ہوئی اگرچہ سویرے وہ دفتر کھلنے سے پہلے ہی وہاں جاسکتا اور اپنی نگرانی میں دروازہ کھلوا سکتا تھا مگر اس کی پریشانی نئے نئے دھموں میں ڈھلتی گئی اور سوچا کیوں نہ رات کو چپکے سے دفتر جا کر اپنے کمرے سے تھیلی نکال لائے۔ یہ خیال اس لئے آیا کہ کمرے کی ایک چابی رام سورتی کے پاس بھی رہتی تھی اور عام طور پر وہ کمرے کو تالا خود ہی لگایا کرتا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ رات کو چوکیدار گشت کرتا رہتا تھا اور یہ گشت بارہ سے ایک بجے تک اس وقت بند ہوتا تھا جب نیا چوکیدار آ کر ڈیوٹی سنبھالتا تھا، رام سورتی نے چپ چاپ دفتر میں گھسنے اور اپنے روپے اڑالانے کے لیے یہی وقت مناسب سمجھا۔

وہ رات کو ٹھیک بارہ بجے دفتر کے وسیع احاطے کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا اور اندھیرے

میں دبے پاؤں اپنے پاؤں کمرے کی طرف چلا کہ ناگہاں پرانے اسٹور کی عمارت کے برآمدے میں ایک سیاہ پرچھائیں کو بھاگتے دیکھ کر انہی قدموں پر ٹھٹھک گیا، سیاہ پرچھائیں برآمدے سے نکل کر اسی جانب آئی جہاں رام سورتی دبکا ہوا تھا، وہ کوئی چھوٹے قد کا آدمی تھا جس کا سراسرے سے منڈا ہوا اور بدن پر میلا سا چولا تھا، رام سورتی نے دیکھا، اس نے بغل میں ایک چھوٹا سا لمبوترانگر بوسیدہ چوبی بکس دبا رکھا ہے اور اندھیرے کے باوجود پہچان لیا کہ وہ انہی بکسوں میں سے ایک ہے جو قدیم نوادر کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے یقیناً کوئی چور محکمے کی نادر شے چرا کر لیے جا رہا تھا۔ قدیم آثار کی دیکھ بھال اور نگرانی رام سورتی کے فرائض میں شامل تھی اور یہ سوچ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اگر محکمے سے کوئی نایاب شے چوری ہو گئی تو اس کی نیک نامی پر حرف آئے گا جبکہ ابھی وفا داری کے عوض کمپنی نے اسے سو روپے کا گرانقدر انعام دیا ہے۔

رام سورتی اپنے روپوں کی تھیلی بھول کر چور کی طرف لپکا جو اسے دیکھ کر احاطے کی دیوار کی طرف بھاگا۔ رام سورتی نے اسے لکارا اور تعاقب کیا اس اثناء میں چوکیدار بھی دوڑا آیا اور اس نے رام سورتی کو پکڑ لیا مگر جب دیکھا کہ وہ اسی محکمے کا ایک افسر ہے تو بے حد پریشان ہوا کہ آدھی رات کو یہاں کیا چرانے آیا ہے؟ مگر رام سورتی نے اپنی نازک حالت کی وضاحت کرنے کی بجائے بھاگتے چور کی طرف اشارہ کیا اور چوکیدار کو ساتھ لے کر اس کے پیچھے بھاگا، اس عرصے میں چور دیوار پھاند چکا تھا مگر دونوں نے محسوس کیا کہ وہ اناڑی ہے اور دیوار کی دوسری جانب گر گیا ہے، چوکیدار اور رام سورتی بھی دیوار پھاند کر دوسری طرف پہنچے، چور کچھ فاصلے پر لنگڑاتا بھاگا جا رہا تھا، چوکیدار اس کے پیچھے لپکا، چور ادھر ادھر چکائیاں دیتا ایک موڑ پر چوکیدار کی زد میں آیا، لاٹھی کی ضرب سر پر پڑی مگر اس سے پہلے چور خنجر پھینک چکا تھا جو نشانہ چوک جانے سے چوکیدار کے کندھے میں لگا اور لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔

لاٹھی کی ضرب سے چور بھی زخمی ہو مگر وہ لڑکھڑاتا، سنبھلتا دریا کے رخ بھاگتا چلا گیا۔ چوکیدار کے علاوہ خود رام سورتی نے بھی دیکھا کہ جب چور کے سر پر لاٹھی کی ضرب پڑی کوئی چوبی بکس اس کے پاس نہیں تھا اور چوٹ کھانے کے بعد وہ خالی ہاتھ ہی بھاگا تھا، جب تک رام سورتی چوکیدار کو سنبھالتا چور نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

چوکیدار کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا، رام سورتی نے اس پر پٹی باندھ دی اور بتایا وہ اپنے روپوں کی تھیلی کمرے میں بھول گیا اور رات کو چپکے سے وہی تھیلی لینے آیا تھا کہ غیر متوقع طور پر چور سے ٹڈ بھینز ہو گئی پھر دونوں انہی راستوں سے واپس ہوئے جن پر چور چکائیاں دیتا بھاگا تھا اور محکمے کے اس چوبی بکس کو تلاش کرتے رہے جسے وہ یقیناً کہیں ادھر ادھر پھینک یا چھپا گیا تھا کہ

پھر آکر لے جائے گا مگر تلاش کے باوجود انہیں بکس نہ مل سکا اور اس خیال سے کہ کل دن کی روشنی میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے دفتر کی طرف لوٹ آئے، رام سورتی چوکیدار کے ساتھ اپنے کمرے میں گیا میز کی دراز سے روپوں کی تھیلی اٹھائی اور یہ تاکید کر کے گھر آ گیا کہ رات کو دفتر میں اس کی آمد اور چوری کے واقعے کا ذکر کسی نہ کرے، کل وہ خود آ کر تحقیق کرے گا کہ کوئی چیز غائب ہوئی ہے۔

دوسرا دن ایک نئی سنسنی کے ساتھ طلوع ہوا کیونکہ اس خبر نے ان دونوں کو پریشان کر دیا کہ عین قلعے کے سامنے گنگا کے گھاٹ پر ایک سرمندے یا تری کی لاش ملی ہے جس کی کھوپڑی بری طرح پچک گئی ہے، نہ تو لاش سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد ہوئی نہ اس کی شناخت ہو سکی، مگر شکل و صورت سے تبت کا بھکشو معلوم ہوتا ہے۔ پولیس کا خیال تھا اس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور قاتل کو تلاش کیا جا رہا ہے۔

معاملہ چونکہ سنگین شکل اختیار کر گیا تھا، اس لیے چوکیدار نے بھی چپ سادھ لی حتیٰ کہ چوری کا تو کیا کسی سے اپنے کندھے کے زخم کا بھی ذکر نہ کیا اور یا تری کا خنجر گڑھا کھود کر دبا دیا، ادھر رام سورتی نے چپکے چپکے پرانے اسٹور کی چھان بین کی، تنہا اسٹور روم میں آیا جس کا تالا چابی سے کھولا گیا تھا اندر ایک بڑی چوبی الماری کا تالا بھی کھلا پڑا تھا جسے وہ دیکھ کر گھبرا گیا مگر الماری کھولی تو معلوم نہ کر سکا کہ کوئی شے غائب ہے، یہ الماری بعض ٹوٹے پھوٹے بیکار یا کم اہمیت کے نوادرات کے لیے مخصوص تھی جسے مدتوں سے کھولا ہی نہیں گیا تھا کیونکہ کبھی اسے کھولنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی پھر بھی اس نے پرانے ریکارڈ کے مطابق تمام اشیاء کو ایک ایک کر کے چیک کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جن چیزوں کا رجسٹرڈ پر اندراج تھا ان میں سے کوئی کم یا کم نہیں ہوئی تھی رام سورتی کو بڑا اندیشہ یہی تھا محکمے کی کوئی نادر شے چوری ہو گئی تو اس کی نیک نامی پر حرف آئے گا مگر اول تو اس الماری میں جس کا تالا توڑا گیا، قیمتی نوادرات ہی نہیں تھے، دوسرے رجسٹر پر لکھے بیکار اور ٹوٹے پھوٹے آثار سب کے سب موجود تھے۔

رام سورتی مطمئن ہو گیا لیکن حیران تھا، چور نے بیکار نوادرات کی الماری کا تالا کیوں توڑا؟ کیا وہ ایک خالی اور بوسیدہ بکس لیکر بھاگا تھا؟ کیونکہ اسی الماری میں چند خالی بکس بھی پڑے تھے۔

تیسرے دن بھکشو کی لاش لاوارث سمجھ کر نذر آتش کر دی گئی کیونکہ پٹنہ میں کوئی بھی اسے شناخت نہیں کر سکا تھا۔ ان دنوں کسی لاش کی زیادہ چھان بین بھی نہیں کی جاتی تھی کیونکہ غدر اور مار دھاڑ کے دن تھے، لوگ انگریز کے خلاف لڑائیوں، بلوؤں، دھاوؤں میں مرتے تھے، فرنگیوں کی بندوقیں ہندوستانیوں کے سینے تلاش کر رہی تھیں، ہر طرف خون ہی خون تھا، لاشیں

ہی لاشیں تھیں اور ان بے گور و کفن لاشوں کی ضیافت اڑاتے ہوئے پرندے تھے موت ہندوستان میں برہنہ ہو کر رقص کر رہی تھی اور خون پانی سے زیادہ سستا ہو گیا تھا، ان دنوں ہوا بھی سرسراتی تو اس سے خون کی بو آتی تھی اور شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو رہے تھے۔

ایسے دنوں میں ایک بھکشو کی لاش کیا اہمیت رکھتی تھی، اسے جلا دیا گیا اور رام سورتی اور چوکیدار نے اپنی زبانیں سی لیں۔ تو میاں! یہ ایک عجیب و غریب واردات تھی جو مجھے یاد آگئی اور تمہیں سنا دی۔ رام سورتی کے بقول چوری ہوئی بھی تھی اور نہیں بھی ہوئی تھی کیونکہ اس کا ریکارڈ پورا تھا اور کوئی شے گم نہ تھی۔

یہ کہہ کر بوڑھے مصطفیٰ بہاری خاموش ہو گئے، مسٹر ونود، انیلا مورتی اور لوہیا اس عجیب و غریب واردات پر حیران تھے کہ چوری بھی ہوئی اور ریکارڈ بھی مکمل تھا مگر میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا، میں نے پوچھا۔

’کیا رام سورتی یا چوکیدار نے دوسرے دن وہ بکس ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی جسے بھکشو کہیں پھینک گیا یا چھپا گیا تھا؟‘

بوڑھے بہاری بولے۔ ’’رام سورتی تو ریکارڈ دیکھ کر بے فکر ہو گیا تھا مگر چوکیدار نے تیسرے دن اسے اطلاع دی کہ بھکشو جن راستوں پر انہیں چکائیاں دیتا رہا ادھر لکھوری اینٹوں کا ایک پرانا ویران کنواں ہے، ہو سکتا ہے وہ بکس اسی کنوئیں میں پھینک گیا ہو مگر اوپر سے کچھ نظر نہیں آتا، کنواں بہت گہرا، تاریک اور کئی سال سے بیکار پڑا تھا، ایک بار گائے کا پچھڑا اگر کے مر گیا۔ اسے نکالنے کے لئے دو بھنگی کنوئیں میں اترے مگر پچھڑے کی لاش کے ساتھ انہیں بھی بڑی مشکل سے کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ ایک بھنگی کنوئیں کی زہریلی گیس میں دم گھٹنے سے مر گیا تھا دوسرے کی حالت بھی خراب تھی مگر فوری علاج سے وہ بچ گیا اس واقع کے بعد کوئی آدمی کنوئیں میں اترنے تو کیا جھانکنے کی بھی ہمت نہیں کرتا تھا۔

یہ بات بھی یقینی نہیں تھی کہ بھکشو چوہی بکس جس میں نہ جانے کچھ تھا بھی یا نہیں، اسی کنوئیں میں پھینک گیا ہو۔ رام سورتی نے یہ سوچ کر تلاش کا ارادہ ترک کر دیا کہ ریکارڈ کے مطابق اس کی ہر شے پوری ہے، چوکیدار کو بھی خاموش رہنے کی تاکید کر دی، بھکشو کی موت کے ساتھ ہی معاملے کی صورت بدل گئی تھی، اگر اس نے کنوئیں میں کوئی چیز پھینکی بھی تھی تو وہیں پڑی رہی ہوگی۔

’میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔‘ کیا پھر کبھی اس کنوئیں کی صفائی نہیں کرائی گئی؟‘

’کنواں شملات میں تھا میاں، لوگوں میں بات چلی کہ وہاں بھوت پریت کا بسیرا ہے اسے خطرناک سمجھ کر 1860ء میں پر کر دیا گیا، اب اس کا نام و نشان بھی نہیں۔‘

مجھے یاد آیا مصطفیٰ بہاری نے 1860ء میں نوکری کی تھی۔

’آپ کو تو معلوم ہوگا کنواں کس جگہ تھا؟‘

’میرے دیکھتے ہی دیکھتے شہر کا نقشہ بدل گیا، آج کل محکمہ آثار قدیمہ کے گرد کوئی دیوار نہیں مگر ان دنوں تھی کئی نئی سڑکیں، نئی عمارتیں بن گئیں، کچھ ٹھیک سے یاد نہیں لیکن ادھر ہندوؤں کی آبادی تھی اور چند سال بعد وہاں درگا دیوی کا ایک مندر تعمیر ہوا تھا، میرا خیال ہے کنواں وہیں کہیں تھا۔‘

یہ تھیں وہ معلومات جو محکمے کے پرانے ریکارڈ کیپر مصطفیٰ بہاری سے حاصل ہو سکیں، گویا کچھ بھی حاصل نہ ہوا اور میرے ذہن میں چوری کا جو غیر اختیاری سوال ابھرا تھا، بوڑھے مصطفیٰ بہاری کی باتوں کے بلے میں دب کے رہ گیا، آخر ان کا شکر یہ ادا کر کے ہم نے رخصت لی۔

میں اور مورتی شام کے چھٹپے میں ’’مورتی ہاؤس‘‘ پہنچے تو سیرا بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی، اس کا خیال تھا، شاید پاپا کے دفتر سے جسے وہ ماما کہتی تھی، مورتی کا کوئی سراغ مل گیا ہے جو ہمیں دیر ہوگئی مگر جب پتہ چلا کہ اس کے ماما کی مایوس کن رپورٹ اور مصطفیٰ بہاری کی الجھی ہوئی کہانی کے سوا کچھ بھی ہمارے پلے نہیں پڑا تو انیلا مورتی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ’’بھیا! بدھا کی گمشدہ مورتی کھوجتے کھوجتے کہیں اس جیتی جاگتی مورتی کو بھی کھونہ دینا۔‘‘ یہ کہہ کر اپنی گویاں کے ساتھ ہنستی مسکراتی اندر چلی گئی۔

رات کو بستر پر لیٹا تو دن بھر کی بھاگ دوڑ کا تجزیہ کرنے لگا، ونود پاپا کی رپورٹ کہتی تھی مورتی کلکتہ سے پھر پٹنہ نہیں لوٹی۔ بوڑھے مصطفیٰ نے رام سورتی کی جو کہانی سنائی وہ میرے ذہن پر ریت کی طرح بکھر گئی تھی۔

نہ جانے بھکشو کون تھا؟ کیا چرانے آیا تھا؟ اور کیا چرا کر لے گیا؟ اگر وہ کوئی ایسی ہی نادر شے ہوتی جو اس کے ہاتھ لگی تو دفتر کے ریکارڈ میں اس کا اندراج ضروری تھا۔ کم از کم جس ’’گوہر نایاب‘‘ کی تلاش میں بھٹک رہا تھا، اسے کسی دفتر میں یوں لاوارث مال کی طرح نہیں رکھا جاسکتا تھا، یہ بھی سوچا بھکشو نے گرفتاری کے ذرے بھاگتے کوئی چوہی بکس اگر کنوئیں میں پھینکا بھی تھا تو ہمیشہ کے لئے پیوند زمین ہو چکا کیونکہ کنواں ستر برس پہلے بند کر دیا گیا تھا تو اس وقت تک جو کچھ ہوا سب بیکار، لا حاصل، بے نتیجہ تھا۔

ارے۔۔۔ میرے اندر کی وہ پراسرار شکتی کہاں چلی گئی جو دروازوں، دیواروں، پہاڑیوں کے اس پار جھانک لیا کرتی تھی جس نے سسے سے پہلے ہی مجھے کئی ایسے نظارے دکھائے تھے جو بعد کو ہو بہو اسی طرح پیش آئے جس طرح میں نے تصور یا گیان کی آنکھ سے دیکھے تھے، وہ پراسرار شکتی آج کیوں میری رہنمائی نہیں کرتی؟

میں نے اپنے ذہن کے اندھیروں میں جھانکنے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ نہیں تھا، اپنے من کے سنسان ویرانے میں کھڑے ہو کر آواز دی اور وہ آواز مخفی خلاؤں میں گھوم کر لوٹ آئی، بس وہی ونود پایا کی رپورٹ تھی۔ وہی رام سورتی کی الجھی الجھی کہانی تھی جو مصطفیٰ بہاری نے سنائی اور جو ریت کی مانند میری سوچوں پر بکھر گئی تھی، وہ ریت پھراڑنے اور میرے ذہن کے صحرا میں ایک باؤوروں کی شکل اختیار کرنے لگی۔ ناگہاں مخفی خلاؤں سے نکل کر ایک صدا بے بازگشت میرے من کے دوارے ٹکرائی کہ ایک تپتی بھکشو کو پٹنہ کے سرکاری دفتر میں گھس کر کچھ چرانے کی کیا ضرورت تھی؟

رام سورتی کی کہانی کے مطابق پولیس رپورٹ میں گنگا کنارے جس یا تری کی لاش ملی وہ چہرے مہرے سے تبت کا باشندہ بیان کیا گیا تھا اور ایک دم مجھے یاد آیا کہ لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں بعض برمی اور تبتی بھکشو بھگوان بدھ کی وہی مورتی چرانے کے الزام میں پکڑے گئے تھے جسے میں کھوجتا پھر رہا ہوں، کیا رام سورتی کی کہانی کا تبتی بھکشو بھی وہی مورتی چرانے آیا تھا؟

مگر رام سورتی کا بیان تھا کہ پرانے اسٹور میں جس کی الماری کا تالا توڑا گیا، ٹوٹے پھوٹے، بیکار اور غیر اہم آثار رکھے تھے جن کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی، ظاہر ہے بھگوان بدھ کی ایک انتہائی نادر اور تاریخی مورتی گھوڑ کباڑ میں ڈالنے والی نہیں تھی جس کا سرکاری ریکارڈ میں کہیں ذکر تک نہ کیا جاتا، اچانک ذہن میں اڑتے باؤوروں نے بھگوان کی اس مورتی کا روپ دھار لیا اور دل کے نہاں خانے سے آواز آئی۔

”مقدس مورتی کو کلکتہ سے اس لئے غائب کر دیا گیا تھا کہ بودھ اسے حاصل نہ کر سکیں، اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا دیا گیا پھر کسی سرکاری ریکارڈ پر اس کا اندراج کیوں ڈھونڈتے ہو؟“ دل کی آواز کے ساتھ ہی ذہن نے بھی اس امر کی تصدیق کر دی کہ مورتی کو کسی اہم مقام پر رکھنے کی بجائے کسی غیر اہم جگہ ہی ڈال دینا مناسب تھا تا کہ اس کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہ ہو سکے اور ٹوٹے پھوٹے، بیکار اور غیر اہم آثار کی الماری ہی اس کی حفاظت کی بہترین جگہ تھی۔

سوچ کی یہ لہر کہہ رہی تھی، وہ یا تری بھکشو جو چوکیدار کی لاٹھی کا شکار ہوا پرانے اسٹور سے بھگوان بدھ کی مورتی ہی لیکر بھاگا تھا اور گرفتاری کے ڈر سے مورتی کا چوٹی بکس ویران کنوئیں میں پھینک گیا کہ بچ کر نکل گیا تو پھر کسی سے نکال کر لے جائے گا، یقیناً وہ یہ بھی جانتا ہو گا کہ بھوت پریت کا مسکن ہونے کے خوف سے لوگ اس اندھے، تاریک کنوئیں سے دور ہی رہتے ہیں اور مورتی کا چوٹی بکس وہاں محفوظ رہے گا۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ لارڈ ڈلہوزی نے 1848ء میں مقدس مورتی کو کلکتہ سے کسی

خفیہ مقام پر بھیج دی۔ وہ خود 1856ء تک ہندوستان کا گورنر جنرل رہا اور اسی سال اودھ کی مملکت کا مہینی سرکار سے زبردستی الحاق کر کے انگلستان چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی 1857ء میں آزادی کی جنگ لڑی گئی۔ جسے انگریز کی اصطلاح میں ”عذر“ کا نام دیا گیا اور 1857ء کے اسی ”عذر“ میں پٹنہ کے سرکاری دفتر ایک پراسرار چوری کی واردات ہوئی جو چوری تھی بھی، اور نہیں بھی، کیونکہ سرکاری ریکارڈ کے مطابق کوئی چیز کم یا گم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اندھا کنواں جس کی ویران تہ میں پیدا ہونے والی زہریلی گیس نے بھوت پریت کے تصور کو جنم دیا۔ 1860ء میں بند کر دیا گیا اور بعد ازاں اسی کنوئیں پر یا اس کے آس پاس درگادیوی کا مندر بنا۔

یہ سارا تجزیہ بتا رہا تھا کہ وہ مقدس مورتی جس کی تلاش میں قدرت نے مجھے ”پٹنہ“ پہنچنے کا اشارہ کیا تھا، ایک گہرے کنوئیں کی تہ میں کہیں زیر زمین دفن ہے اور وہ پراسرار شکتی ہی ہے جسے میں من کے سنسان ویرانے میں کھڑا پکار رہا تھا کہ میری رہنمائی کرے، مجھے واقعات کی اس پگڈنڈی پر ڈال گئی تھی۔ حالات کے اس ادراک یا انکشاف نے میرے جسم میں سنسنی کی ایک زبردست لہر دوڑائی اور میں بستر سے اچھل کر فرش پر آ گیا اور ننگے پاؤں ہی انیلا مورتی کے کمرے کی طرف بھاگ۔ میرا خیال تھا، وہ سوئی نہ ہوگی، ابھی رات کے گیارہ ہی بجے تھے۔

میں نے مورتی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا تو دونوں جوان، سندر سہیلیاں ذبل بیڈ کے درمیان پہلو کے بل باہم لپٹی چمٹی اور ایک دوسرے کی کمر میں بانہیں ڈالے دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھیں، مجھے دیکھتے ہی ان کی بانہوں کے حلقے کھلے اور دونوں ایک دم اچھل کر بستر پر بیٹھ گئیں، سر لا مسکرا کے بولی۔

”بھیا! یہ تو مورتی پو جا کا۔ سے نہیں، کیا میری گویاں کو چھیننے آئے ہو مجھ سے؟“ میں نے کھڑے کھڑے ان کے بکھرے بالوں، ہنستی ہنستی آنکھوں کو دیکھا اور کہا۔ ”مورتی کا کھونچ مل گیا۔“

دونوں سنبھل کے بیٹھ گئیں، انیلا مورتی نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھ کے بتاؤ۔ کیا کھونچ مل گیا ہے۔“

میں اس کے قریب ہی بیٹھ کر وہ سب باتیں بتانے لگا جو میرے من سے اٹھی اور ذہن سے گزر رہی تھیں اور جب سب کچھ کہہ چکا تو بتایا۔ ”اب ہمیں صرف کنوئیں کا کھونچ لگانا اور اس کی کھدائی کا بندوبست کرنا ہے۔“

یہ سن کر انیلا مورتی دنگ رہ گئی۔ ”تمہیں یاد ہے مصطفیٰ بہاری کہتے تھے، آج کل وہاں درگا دیوی کا مندر ہے۔“

”ہاں۔۔۔ یاد ہے۔“

”پھر یہ کام مجھے خود کرنا ہوگا۔“

یہ کہہ کر میں اٹھا اور اسی لمحے سر لا بہن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”بھیا! تم جو کچھ بھی کرو گے میری گولیاں اور میں تمہارا ساتھ دیں گی۔“

میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر لیٹا سوچنے لگا، مندر میں کھدائی کی کوئی ترکیب نکالی جائے کہ دھرم کے ابھان کا جھگڑا کھڑا نہ ہو مگر ایک بار پھر میرا ذہن ویران اور سنسان نظر آیا، جہاں کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی سندیس نہ تھا۔ میرے خیال کی ہر لہر بند کواڑوں سے ٹکرا کے لوٹ آئی۔

○○○

”تو کیا مندر میں کھدائی کرو گے؟“

”مورتی کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔“

”مندر کے مہنت پجاری کچھ نہ کرنے دیں گے، جھگڑا فساد ہوگا، دھرم رکھشا کی بات اٹھے گی۔ ہندو جاتی تمہیں اپرا دھی اور ناسٹک قرار دے گی۔“

”میں مندر گرانے کی تو نہیں سوچتا۔“

”تم سوچو یا نہ سوچو۔ درگا کے پردہت پجاری اور مہنت یہی سوچیں گے کہ مندر گرانے آئے ہو، انہیں بدھا کی کسی مورتی سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ”کیا پاپا کوئی مدد نہیں کر سکتے؟“

”پاپا کو دھرم سے کوئی لگاؤ ہے نہ مندروں سے۔ ان کا بس چلے تو مندر، شوالے، مسجدیں، گردوارے، گرجے سب گرا دیں مگر وہ ڈرتے ہیں صرف ان تلک دھاری پروہتوں، مہنتوں سے جو بات کا بتنگڑ بنا کر دھرم کے جھگڑے کترے کر دیتے ہیں، درگا مندر کے بارے میں وہ تمہاری کوئی ہیلپ نہیں کر سکیں گے۔“

میری پریشانی بڑھ گئی۔ اب میں بھگوان کی مورتی کے ساتھ اپنے سمبندھ واضح کرنے پر مجبور ہو گیا اور بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ تیرے الہم میں اس مورتی کا فوٹو لگ جانے سے تجھے سرکاری ایوارڈ مل سکتا ہے اور تیرے نام کا چرچا ہوگا مگر اس مورتی کی تلاش میرا آدرش ہے اور میں صرف اسی کو ڈھونڈنے یہاں آیا ہوں اس کے لئے اپنی جان پر بھی کھیل سکتا ہوں۔“

اب انیلا مورتی اور سر لا نکشمی پر مقدس مورتی کی اہمیت کچھ اور واضح ہو گئی اور مورتی مجھے حیرت پاش نظروں سے دیکھتی بولی۔

”اس مورتی کی تلاش تمہارا آدرش ہے اس کے لئے اپنی جان پر بھی کھیل سکتے ہو مگر کیوں؟“

”ہر سوال کے جواب کا ایک سے ہوتا ہے۔ مورتی مل گئی تو تیرے سوال کا جواب بھی مل جائے گا، اب تو صرف یہ سوچنا ہے کہ اسے پانے کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں، تو کیا ہیلپ دے سکتی ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ میری بات نے انیلا مورتی کے من میں ایک بلچل سی پیدا کر دی ہے وہ پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

”اگر وہ مورتی تمہارے لیے اتنی اہم ہے تو اپنی سر لا گولیاں کے سامنے وچن دیتی ہوں کہ اسے پانے کے لئے میں بھی اپنے آپ پر کھیل جاؤں گی۔ بولو کیا کرنا ہے؟“

”پاپا کو منا کر درگا دیوی کے مندر میں کھدائی کی آگیا لے دیں۔“

”بات کروں گی مگر وہ اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔“

(37)

ہارجیت

رات بہت دیر تک جاگتا اور سوچتا رہا تھا، اس لئے سویرے بہت دیر سے جاگا، گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے، تکیے کے پاس گلاب کے دو پھول بھی نظر آئے۔ سمجھ گیا کہ مورتی آج بھی پوجا کے لئے آئی ہوگی اور مجھے گہری نیند سوتا دیکھ کر لوٹ گئی۔ کمرے سے نکلا تو نوکرانی سے پتہ چلا کہ سرلا کے ساتھ بگھی پر کہیں گئی ہے۔ اس نے ناشتہ میرے کمرے ہی میں لگا دیا۔

ناشتے سے فارغ ہوا تھا کہ دونوں سہیلیاں لوٹ آئیں، مورتی نے بتایا۔
 ”پاپا سے بات کرنے گئی تھی مگر ان کا جواب وہی ہے جو تمہیں پہلے بتا چکی ہوں، کہتے ہیں یہ پروہت بچاری لوگ میرے بس کے نہیں، درگا مندر میں کھدائی مشکل ہوگی۔“
 مورتی چپ ہوئی تو سرلا کہنے لگی۔ ”ماما سے مل کر ہم درگا دیوی کا مندر دیکھنے چلی گئی تھیں، بھیا! بہت بڑا مندر ہے، اس کے مہنت شہسواری کے بارے میں سنا ہے کہ درگا دیوی کا خاص پانڈا (پجاری) ہے اور بڑا شکتی مان ہے۔ دیوی کے ساتھ لوگ اسے بھی مانتے ہیں۔ پتہ چلا ہے شہسواری نے پورے تین مہینے گنگا میں بیٹھ کر درگا ماتا کی تپسیا کی۔ تب اس کی مہانتا کا چرچا ہوا، سادھن لگاتا ہے تو پجاریوں اور ناریوں کے من مٹھی میں لے لیتا ہے سبھاؤ کا سخت، ہٹ کا پکا اور جو بات کرتا ہے اسے پتھر پر لکیر سمجھتا ہے۔“

میں حیران ہوا کہ دونوں سہیلیاں میرے سوئے سوئے اتنی معلومات بھی حاصل کر آئی ہیں۔ اچانک انیلا مورتی نے پوچھا۔ ”تمہیں دشواں ہے کہ کھدائی سے بدھا کی مورتی مل جائیگی؟“
 ”جس بات کا مجھے گیان ہو، کبھی غلط نہیں ہوتی۔“

”پھر درگا مندر کے مہنت کو کوئی لالچ دے کر دیکھو شاید کھدائی کے لیے مان جائے۔“

میں رات بھر خیال کے گھوڑے دوڑاتا اور سوچتا رہا تھا لیکن ذہن کے کواڑ ہی بند تھے۔ کوئی اشارہ نہ مل سکا تھا، اب مورتی نے ”لالچ“ کا شبد کہا تو ایک دم عجیب سی ترکیب سوچھی اور میں کہنے لگا۔ ”کیوں نہ بدھا کی مورتی کا ذکر کیے بغیر اسے کسی پرانے خزانے کی کھدائی کا لالچ دیا جائے اور دشواں دلایا جائے کہ خزانہ مل گیا تو اس سے درگا دیوی کا بڑا عظیم مندر تعمیر کیا جائے گا اور مندر میں دیوی کی سونے کی مورتی رکھی جائے گی۔“

سرلا نے فوراً تائید کی۔ ”بہت اچھی ترکیب ہے بھیا! شہسواری اگر درگا کا سچا پانڈا ہے تو

کھدائی پر راضی ہو جائے گا۔“

انیلا مورتی نے اصل خطرے کا اظہار کیا۔ ”کھدائی سے خزانہ تو نکلے گا نہیں پھر سواری کو کیسے ہینڈل کرو گے؟“

”یہ بعد کی بات ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مورتی مل گئی تو اسے ہزار بارہ سو روپے دے دیے جائیں گے کہ خزانہ نہیں مل سکا تو یہی روپے مندر پر لگا دے۔“
 ”اگر وہ نہ مانا؟“

”مانے گا کیسے نہیں۔“ سرلا نے اپنی گویاں کی کمر میں چٹکی بھری۔ ”تو اس پر تھوڑی سی مسکراہٹ کا منتر پھونک دے گی تو مان جائے گا، یہ پانڈے پروہت ناریوں کو دیویاں سمجھتے ہیں۔“

میں نے سرلا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”شہسواری سے بات کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“

”کیا خزانے کا لالچ دو گے؟“

”اسے کھدائی پر راضی کرنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی ترکیب نہیں۔“

اسی لمحے چوکیدار ایک تار لے کر آیا اور بولا۔ ”ڈاکیہ باہر کھڑا اور اس کاغذ پر دستخط مانگتا ہے۔“
 تارا سرلا لکشمی کے نام تھا۔ اس نے سائن Sign کر کے کاغذ لوٹا دیا اور تار کھولا، سیٹھ لکشمی خزانے نے سرلا کو فوراً چٹا گنگ بلایا اور تاکید کی تھی کہ تار دیکھتے ہی چل دے کیونکہ اس کی ماں کی حالت اچانک خراب ہو گئی ہے، مجھے پر نام لکھا تھا۔

تار پڑھتے ہی سرلا واپسی کے لیے تیار ہو گئی اور بولی ”بھیا! تمہیں اپنی گویاں کے حوالے کرتی ہوں، پتہ نہیں ماں کی حالت کیسی ہے؟“

سرلا کی اچانک واپسی کا بلاوا ہی ایسا تھا کہ وہ رک سکتی تھی نہ اسے روکنا مناسب تھا۔ اس نے ذرا سامان باندھ لیا، ہم ایک بجے سرلا کے ساتھ بگھی میں بیٹھ کر کانن دیوی سے ملنے گئے، وہ تار کا سن کر پریشان ہو گئی۔ سرلا کو گلے لگا کر رخصت کیا، بہت کچھ دیا پھر وہ دو بجے کی ٹرین میں سوار ہو گئی، میں اور انیلا مورتی پٹنہ ریلوے اسٹیشن پر ہاتھ ہلا ہلا کر اسے رخصت کر رہے تھے۔

ریلوے اسٹیشن سے نکلے تو میں سرلا بہن کی کمی محسوس کر کے کچھ اداس ہو گیا۔ مورتی نے دیکھا، میرے ساتھ بگھی میں بیٹھی اور بولی۔ ”کیا تھوڑی سی سیر کرو گے؟ من بھل جائے گا۔“

”تو ساتھ ہو تو من ویسے ہی بھل جاتا ہے۔“

”مگر میں اب تمہارے ساتھ ”مورتی ہاؤس“ میں نہیں رہ سکتی، آج ہی پاپا اور مئی کے پاس

سرلا کی واپسی کے بعد اس کا ”مورتی ہاؤس“ میں قیام ختم ہو گیا تھا، مجھے ایک دھچکا سا لگا۔
”اور میری“ مورتی پوجا“ کا کیا ہوگا؟“

اس نے مسکراہٹ کا منتر پھونکا۔ ”پوجا کے لئے آجایا کروں گی کبھی کبھی۔“
اچانک مجھے درگا مندر میں کھدائی کا خیال پریشان کرنے لگا۔ میں نے پوچھا ”شعبو سوامی
سے آج ہی کیوں نہ مل لیں؟“

پھر اس نے کوچوان کو آواز دی۔ ”جیورام! پہلے درگا دیوی کے مندر چلو جہاں سویرے گئے
تھے۔“ اور جیورام نے کبھی کا رخ درگا مندر کی طرف موڑ لیا۔

درگا مندر پہنچے تو ایک پجاری سے شعبو سوامی کے بارے میں پوچھا اور بتایا کہ ہم ملنے آئے
ہیں، پجاری نے ہم دونوں کو دیکھا اور آگیا لینے کے لیے اندر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد لوٹ کے آیا
تو بولا۔ ”سوامی جی نے آگیا دے دی ہے آئیے۔“

اور آگے آگے چل دیا، صحن پار کر کے ایک برآمدے میں مورتی نے اپنی سینڈل، میں نے
اپنے بوٹ اتارے اور ہم ننگے پاؤں بڑے کمرے میں داخل ہوئے جہاں پوجا ہوتی تھی۔
پجاری وہیں سے واپس چلا گیا، مندر کا مہنت درگا دیوی کی مورتی کے سامنے فرش پر تنہا بیٹھا تھا،
گندی رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، رعب دار چہرہ، مضبوط اور صحت مند جسم، ماتھے پر تلک، گلے
سے کمر تک جینیو، بدن پر صرف گہروی دھوتی جس کا پلو کندھے پر ڈال رکھا تھا، بازوؤں کی
مچھلیوں پر ایک ایک مالا بندھی ہوئی۔ یہ تھا شعبو سوامی جس کی عمر چالیس بیالیس برس کے لگ
بھگ ہوگی۔ ہم دونوں نے ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا، سوامی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور اپنے پاس
بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہم بیٹھ چکے تو پوچھا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

میں نے اسے اپنے اعتماد میں لینے کے لئے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور بتایا۔
”پوربی بنگال کے شہر رنگامتی سے، کیشپ نام ہے، پٹنہ میں آثار قدیمہ کے افسر ونود جی کا
مہمان ہوں، یہ ان کی سوتیلی بیٹی اینلا مورتی ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس جان پہچان کا اچھا اثر ہوا ہے۔ وہ بولا ”کوئی سمیا ہے کیا؟“

”ہاں سوامی جی! بہت بڑی سمیا ہے۔“

”بولو، کیا ہے؟“

میں نے اپنے ذہن میں کچھ سوچ لیا تھا، اسی کے مطابق کہا۔

”آپ درگا کے بڑے پانڈے، بڑے مہنت ہیں اور میں بھی آپ کے پاس ایک بڑا بھید
لے کر آیا ہوں پر بھید کھولنے اور آپ کو اس میں پتی دار بنانے سے پہلے یہ دشواس چاہتا ہوں کہ

مہاراج دیوی کے سچے مہنت اور شردھا لو ہیں۔“

میں نے بات بڑی چبھتی ہوئی کہہ دی تھی، سوامی نے موٹی موٹی آنکھوں سے یوں گھورا
جیسے اس کا بڑا اپمان کر دیا ہو۔ مورتی بھی پریشان ہو گئی کہ خواہ مخواہ سوامی کو بھڑکار رہا ہوں، وہ
کسی قدر غصے سے بولا۔

”تمہیں یہ ادھیکار نہیں پرنتو! کہ درگا ماتا کے مہنت کی شکتی کو پرکھو۔ یہاں آنے سے پہلے
تمہیں لوگوں سے پوچھ لینا چاہیے تھا وہ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں۔“
”میں سنی سنائی پر نہیں آنکھوں دیکھی بات پر دشواس رکھتا ہوں۔“

”کوئی چٹکار دیکھنا چاہتے ہو کیا؟“
میں جانتا تھا۔ وہ کوئی چٹکار نہیں دکھا سکے گا اور اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے ڈھب
پر لے آؤں گا۔ ”ہاں سوامی جی! کوئی چٹکار کوئی اشارہ، کوئی شکون۔ کیا پانسہ ہے آپ کے پاس؟
وہ مجھے فکر کر دیکھنے لگا۔ ”ہاں ہے۔“

”تولا ئیے! پانسہ ہی پھینک کر دیکھ لیتے ہیں کہ درگا دیوی آپ کو سویرا کرتی ہے۔“
وہ ہکا بکا بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باہر گیا، دو منٹ میں پانسہ لے آیا اور میرے ہاتھ پر رکھ کے بولا۔
”پھینکو پانسہ۔“

میں نے پانسہ پھینکا اور وہ سوامی کے حق میں پڑا۔ اس کے چہرے پر جلال آ گیا۔
”درگا ماتا نے میرا مان رکھا، میری مہنتائی کو سویرا کیا۔ کیا ڈھارس ہوئی تمہاری؟“
”ہاں۔۔ اب مجھے دشواس ہے کہ آپ درگا کے سچے مہنت ہیں۔“

”پھر بولو، کیا بھید لے کر آئے ہو میرے پاس۔“ وہ بھید جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔
”بھید درگا مندر کے بارے میں ہے مگر آپ کو پتی دار بنانے سے پہلے یہ بھی چاہتا ہوں کہ
جو کچھ کہوں گا، آپ وہی کریں گے۔“

”یہ ادھیکار تو مجھے ہونا چاہیے۔“

”چلیے۔ اس کا نیاؤ بھی پانسے سے کر لیتے ہیں۔“

سوامی میرے بھید کی بازی میں الجھ گیا تھا، اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں نے پانسہ
پھینکا، اس بار وہ سوامی کے خلاف اور میرے حق میں پڑا۔ بولا۔

”ٹھیک ہے پرنتو! تمہاری اچھیا پوری ہوگی۔“

میں نے یہ سارا کھیل جان بوجھ کر اس لئے کھیلا تھا کہ اسے نفسیاتی طور پر اپنے کام کے
لیے تیار کر لوں وہ آہستہ آہستہ میرے ڈھب پر آ گیا تو کہا۔ ”سوامی جی! کسی زمانے میں درگا
مندر کی جگہ ایک پرانا کنواں ہوتا تھا۔“

وہ چونکا۔ ”ہاں، ہوتا تھا۔“

”میں نے اس کنوئیں کے بارے میں ایک بھید کی بات معلوم کی اور بھگوان سے اشارہ بھی لیا ہے کہ اس کی گہری تھاہ میں ایک خزانہ دفن ہے۔“

یہ سنتے ہی شبھوسوامی اچھل کر کھڑا ہو گیا، ہم دونوں بھی اٹھے۔ اس نے میری طرف اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے مجھے تول رہا ہو۔ ”کیا تمہیں دشواں ہے کہ کنوئیں کی تھاہ میں خزانہ ہوگا۔“

”پورا دشواں ہے۔“ میرے نزدیک بھگوان بدھ کی مقدس مورتی سے بڑا خزانہ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ”میں اسی دشواں کے ساتھ آپ کے پاس آیا اور آپ کو پتی دار بنا کر مندر میں کھدائی کرنا چاہتا ہوں، خزانہ مل گیا تو ہم چار حصوں میں بانٹ لیں گے ایک حصہ آپ کا دوسرا درگا دیوی کا اور درگا کا حصہ مندر پر صرف ہوگا، باقی دو حصے ہم دونوں کے۔“ میں نے ایلا مورتی کی طرف اشارہ کیا۔

اب اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہ تھی کہ خزانے کے اچانک انکشاف نے شبھوسوامی کے من میں مایا کالو بھ پیدا کر دیا اور اس کی آنکھوں میں ایک نئی جوت جلادی تھی میں نے اس کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ دیکھی۔ بولا۔

پرنٹو! کیا اسی لئے میری مہنتائی کو پرکھ رہے تھے؟

”سوامی جی! کسی کو پتی دار بنانے سے پہلے پرکھ لینا برا تو نہیں۔؟“

”مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی۔ پرکھنے کے لیے اشارہ لیتے ہو، پانسہ پھینکتے ہو، تم نے جو بخرے کیے میں نے مان لیے۔“

”پھر ہم کل یا پرسوں کھدائی شروع کر دیں گے مگر پہلے یہ کھوج لگانا ہے کہ کنواں تھا کہاں۔“

”وہ میں بتاؤں گا، آؤ میرے ساتھ۔“

مگر چلتے چلتے انہی پیروں رک گیا اور فکر مند لہجے میں پوچھنے لگا۔

”اگر خزانہ نہ ملا؟“

اس کا یہ اندیشہ طبعی تھا جو اس قسم کے معاملات میں اکثر پیدا ہوتا ہے، ہم پہلے ہی جانتے تھے وہ یہ سوال ضرور پوچھے گا، میں نے بے دھڑک جواب دیا۔

”پھر ہم آپ کا ہر جانہ بھر دیں گے۔“

سوامی سوچنے لگا، ”تب ہر جانے کا چناؤ میں کروں گا۔“

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ نہ جانے لاپچی مہنت کتنی بڑی رقم مانگ لے مگر اسے کچھ نہ کچھ تو ادا کرنا ہی تھا کیونکہ جس خزانے کی وہ سوچ رہا تھا اس کا کوئی وجود نہ تھا، مجھے خاموش دیکھ کر اس

نے تجویز پیش کی۔

”پرنٹو! اشارے کو مانتے ہو۔ پانسہ پھینک کر دیکھ لو، ہر جانے کا مول تمہارا ہو گا یا میرا؟“

اس بار پانسہ سوامی کے حق میں پڑا اور وہ ایلا مورتی سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھا دیوی! ہر جانے کا مول میرا ہی ہوگا۔“

”آپ کی اچھیا پوری ہوگی سوامی جی!“ مورتی نے اس پر مسکراہٹ کا پہلا منتر پھونکا۔ پھر سوامی ہمیں اپنے ساتھ لے کر مندر کے پچھواڑے آیا جہاں آٹھ دس مرلے کا ایک باغیچہ اور غنچی دیوار میں ایک دروازہ تھا، وہ دروازے سے پورے دس قدم پورب کی طرف چل کر رک گیا۔

”یہاں تھا کنواں جہاں میں کھڑا ہوں۔“

میں نے اس جگہ کو اچھی طرح بھانپ لیا اور یہ وضاحت بھی کر دی۔

”کھدائی دن رات ہوگی یہیں تنبو لگے گا، مزدور بھی یہیں سویا کریں گے۔“

”کتنے دن میں کام پورا کر لو گے؟“

”پانچ چھ دن میں۔“

سوامی کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک دکھائی دی، پھر ہم نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا۔ اس نے مسکرا کے ہمیں رخصت کی آگیا دی اور کبھی پھر ”مورتی ہاؤس“ کی طرف ہوئی ایلا مورتی مجھے اپنے مہمان گھر میں چھوڑنے جا رہی تھی کہنے لگی۔ ”تمہاری باتوں سے میں ڈر گئی تھی کہ کہیں سوامی ہتھے سے اکھڑ نہ جائے۔“

”اے اپنے ہتھے ہی تو چڑھا رہا تھا، اگر میں یہ ٹانگ نہ کرتا تو وہ کھدائی پر کبھی تیار نہ ہوتا۔“

”مگر ہر جانے کا مول وہی لگائے گا۔“

کسی طرح اس کے کان میں ہزار روپے تک کی بات ڈال دینا۔ بات ڈیڑھ دو ہزار میں نمٹ جائے گی۔“

”کوشش کروں گی۔ سوامی زیادہ مول نہ بڑھائے۔“

”مورتی ہاؤس“ پہنچے تو شام کا جھپٹنا لگ رہا تھا، اور اسی سے مندروں میں سکھ پھونکے جاتے ہیں، گھنٹیاں بجتی ہیں، پوجا ہوتی ہے آج کا سورج میری پہلی کامیابی کی خبر کے ساتھ غروب ہوا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر میں نے جی بھر کے ”مورتی پوجا“ کی پھر ایلا مورتی کبھی میں بیٹھ کر پایا اور مٹی کے ہاں چلی گئی اور میں سوچنے لگا کہ سویرے ہی ”گیتا ہوٹل“ جا کر کریم سے کہوں گا کہ کنوئیں کی کھدائی کے لیے کچھ مزدور بھرتی کر لے۔

○

سویرے ابھی بستر ہی میں تھا کہ مورتی ہاؤس کے چوکیدار نے آکر کسی ملنے والے کی

اطلاع دی، میں خود باہر نکلا تو گیٹ پر کریم کے ساتھ کایا پٹھا اور وشال کو دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ اب میں اپنے ساتھیوں کی ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا، انہیں لے کر کمرے میں آیا۔ چان اور کالی ناتھ ”کیتا ہوٹل“ ہی میں رہ گئے تھے۔

میں نے ان سے گیا کی یا ترا کے بارے میں پوچھا، ہر بودھ کے لیے اس مقدس شہر کی یا ترا آتما کی تسکین کا ذریعہ بھی جاتی ہے مگر وشال رائے نے جواب دیا۔ ”کیشپ بابو! جب ہم ساؤ گاری سے چلے تو سروپ جی نے ہمارے کو بولا تھا گنجال بودھ گیا میں ہوگا، جیسی ہم گیا کے ایک ایک مندر، ایک ایک آشرم میں گئے اور پروہت گنجال کو ڈھونڈا مگر ہمارے کو اس کا کہیں کھوج نہیں ملا اور اسی کارن دیری ہوگئی۔ سوچا تمہارے کو بڑی چھتا ہوگی تو ہم لوٹ آئے۔“

”میں پہلے ہی جانتا تھا وہ گیا میں نہیں ملے گا۔“

”پھر ہمارے کو بول کیوں نہیں دیا تھا؟“

”اس لیے نہیں بولا تھا کہ گنجال کو ڈھونڈنے کے ساتھ تم لوگ گیا کی یا ترا بھی کر آؤ۔“

”وہ تو کر لی۔ اب تمہارے کو یہ بھی بول دوں، میں بودھ گیا سے سو گند کھا کے نکلا ہوں کہ گنجال سے روپ تارا کا بدلہ نہیں لیا تو گھر لوٹ کے نہیں جاؤں گا۔“

”وشال جی! گنجال تمہارا ہی نہیں میرا کایا موسا کا بھی دوستی ہے اور تم جانتے ہو جس طرح پہاڑی خانقاہ میں تھا پابہادر کانیاے ہوا تھا، اسی طرح پروہت گنجال کانیاے بھی ضرور ہو گا مگر میں نہیں جانتا کہ کہاں ہوگا۔“

جس طرح میرے الفاظ اپنی معنوی حکمت کے ساتھ پہلے اثر انداز ہوتے رہے تھے، اس بار بھی ہوئے اور وشال رائے ان کی تیز دھار محسوس کر کے کہنے لگا۔ ”کیشپ بابو! ہمارے کو وشال ہے تم جو بولتے ہو وہی ہوگا مگر یہ بولو پٹنہ میں تمہارے کو کچھ مورتی کا پتہ چلا، کب تک ٹھہرو گے یہاں؟“

میں نے بتایا کہ پٹنہ میں ایک پرانے کنوئیں کا کھوج ملا ہے جو 1860ء میں بند کر دیا گیا تھا، کچھ معلومات اور کچھ میرے گیان کے مطابق بھگوان بدھ کی وہ مورتی جس کی مجھے تلاش ہے، اسی کنوئیں میں دفن ہے جہاں آج کل درگادیوی کا مندر کھڑا ہے، کل سے ہم اس مندر میں کھدائی کریں گے پھر میں نے سرالاکشی کے ذریعے انیلا مورتی اور ونود پاپا کی ملاقات سے لے کر درگامندر کے مہنت شمشو سوامی سے مل کر کھدائی کی آگیا لینے تک تمام واقعات سنائے اور آخر میں کہا ”میرا من کہتا ہے مورتی مل جائے گی اور اس کے ساتھ نہ صرف ساؤ گاری کے اسرار کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ ہم پروہت گنجال کو بھی ڈھونڈ لیں گے، یوں لگتا ہے بڑھے ساگر ساؤ جی کے ساتھ گنجال کی موت بھی اسی مورتی میں بند ہے۔“

میرے آخری الفاظ سن کر وشال رائے، کایا موسا، کریم سب چونک گئے، ٹھیک اسی لمحے بیرونی گیٹ کھلنے اور کچھ کے داخل ہونے کی آواز آئی۔ انیلا مورتی جیورام کو لے کر آگئی تھی اور اس نے آنے میں جلدی شاید اس لیے کی تھی کہ کہیں پوجا کا سہ بیت نہ جائے، میں خود اس کے سواگت کو اٹھا۔ اسے کارڈور میں ملا اور بتایا کہ میرے ساتھی گیا سے لوٹ آئے اور اس وقت کمرے میں بیٹھے ہیں۔

”ادھر آؤ۔“ وہ مجھے کھینچتی اپنے کمرے میں لے گئی اور میرے سامنے پریم کی مورتی بن کے کھڑی ہوگئی۔ میں نے پوجا کی تو کہنے لگی۔ ”اب اپنے ساتھیوں سے ملاؤ۔“

میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا اور سب سے چان پہچان کر آئی، میرے ساتھی مورتی سے مل کر بہت خوش ہوئے اور وہ اس بات پر مطمئن تھی کہ میں پٹنہ میں تنہا نہیں تھا، جہاں مندروں، تیرتھوں، آشرموں، سراؤں، یا تریوں، پانڈوں، پروہتوں، سادھوؤں کی بھیڑ ہے، پٹنہ میں اگرچہ مزدور چار پانچ آنے یومیہ پر مل جاتے تھے مگر اب کھدائی کے لیے مجھے کرائے کے مزدوروں کی ضرورت نہیں تھی، میرے ساتھیوں نے فیصلہ کیا تھا، وہ کھدائی خود کریں گے، مورتی کچھ دیر بیٹھ کے چلی گئی۔

وہ سارا دن کھدائی کی تیاری کرنے اور ضروری سامان خریدنے میں گزر گیا شام کو ایک بار پھر شمشو سوامی سے ملنے درگامندر گیا اور بتایا کل مزدور اپنا کام شروع کر دیں گے۔ سوامی نے کہا۔ ”کل مندر کے پچھواڑے کا پھانک کھول دیا جائے گا، مزدور ادھر سے آئیں، ادھر سے جائیں۔“ دوسرے دن سچ مچ پچھلا دروازہ کھل گیا اور میرے ساتھی کدالیں، بسولے، ٹوکریاں، رے چرنی وغیرہ لے کر اسی رستے مندر کے عقبی باغیچے میں داخل ہوئے سب سے پہلے رہائشی چھولداری اور مندر کی طرف ایک اونچی اور لمبی قنات نصب کی گئی جس سے مندر اور باغیچے کے درمیان پار چاتی دیوار کھڑی ہوگئی، کام اسی دن شروع کر دیا گیا اور سہ پہر تک پرانے کنوئیں کی لکھوری اینٹوں کا گھیر نکل آیا جس سے یہ اطمینان ہو گیا کہ سوامی نے کنوئیں کی نشاندہی بالکل ٹھیک کی تھی۔

شام سے کچھ دیر پہلے انیلا مورتی شمشو سوامی کے ساتھ مندر کی طرف سے قنات کی دیوار گزر کر باغیچے میں آئی، اسے علم نہیں تھا کہ پچھواڑے کا دروازہ کھل چکا ہے، میں نے آگے بڑھ کر دونوں کا سواگت کیا اور انہیں لکھوری اینٹوں کا وہ گھیر دکھایا جو کھدائی سے برآمد ہوا تھا، مورتی نے گھیر دیکھا حیران ہوئی پھر مسکرا کے سوامی کی طرف دیکھا یہ گویا سوامی کے تعاون اور کنوئیں کی صحیح نشاندہی کرنے کا ”شکریہ“ تھا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے پرس سے پندرہ روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے اور بولی۔

”مہاراج! یہ میری طرف سے درگا کے پرشاد کے لیے ہیں۔“

سوامی نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ ”دیوی! درگا کے نام پر شاد کسی دن آپ بنا کے لانا اور مندر کے پانڈوں میں بانٹ دینا۔“

بات معقول تھی کیونکہ سوامی نے پانڈوں، پجاریوں سے یہی کہا تھا کہ ونود جی کی بیٹی پرانا کنواں کھدوار ہی ہے جسے جا کھن ڈلوا کر پھر چالو کر دیا جائے گا، مورتی نے روپے پرس میں رکھ لیے۔

”ٹھیک ہے سوامی جی! میں پرسوں درگا کا پرشاد لے کر آؤں گی اور آپ ہی بانٹوں گی۔“

پھر وہ سوامی کے ساتھ اسی رستے لوٹ گئی، میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلا، سوامی پوجا کے کمرے کی طرف مڑا تو مورتی نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا اور بیرونی دروازے کی طرف ہولی۔ باہر جیورام بھی لیے کھڑا تھا، جب وہ سوار ہونے لگی، میں نے بتایا۔

مندر کا پچھلا دروازہ کھل گیا ہے، آئندہ ادھر سے آیا کرو۔“

”نہیں کیشپ! اسی دروازے سے آنا جانا ٹھیک ہوگا، لوگ یہی سمجھیں گے میں درگاہ کی پوجا کرنے آتی ہوں۔“

”اور میری مورتی پوجا کا کیا ہوگا؟“

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا جادو بکھر گیا۔ ”کچھ دن اپنی آنکھوں کو بھی پوجا کر لینے دو۔“ وہ بکھی میں بیٹھ کر چلی گئی، میں مندر کے پچھواڑے لوٹ آیا، اس وقت تک ہر کام میری ذوق کے مطابق ہوا۔ خزانے کے لوبھ میں سوامی ہم سے تعاون کر رہا تھا، میرے ساتھی بھی مورتی پانے کے لیے جلد سے جلد کنوئیں کی تھاہ تک پہنچ جانا چاہتے تھے، اس لیے کام کی رفتار نیز ہو گئی۔ تیسرے دن شام کی پوجا پر انیلا مورتی درگا کا پرشاد لے کر آئی، پوجا کے لیے آنے والے مردوں، ناریوں اور مندر کے پانڈوں، پجاریوں میں پرشاد اس نے اپنے ہاتھ سے بانٹا، مندر کے پچھواڑے کنوئیں پر بھی آئی اور میرے ساتھیوں میں پرشاد تقسیم کیا۔ پھر مجھے ایک طرف لے گئی اور سرگوشی میں بتانے لگی۔

”سوامی نے ابھی ابھی مجھے اپنے آشرم کی کٹی میں ملنے کو کہا ہے۔“

”کیوں؟ میں چونکا۔“

”مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”سن لے، کیا کہتا ہے۔“

وہ پرشاد بانٹ کر پھر مندر میں چلی گئی اور سوامی کو آشرم کی کٹی میں ملی۔

میں پچھلے دروازے سے نکل کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں جیورام بکھی لیے کھڑا تھا اور بکھی میں

بیٹھ کر مورتی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا جوں جوں دیر ہو رہی تھی، میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، اٹھارہ بیس منٹ کے بعد وہ مندر سے نکل آئی اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی پھر جیورام کو بکھی بڑھا کر ہولے ہولے چلنے کو کہا اور مجھ سے بولی۔ ”سوامی کو شک ہو گیا ہے کہ خزانے والی بات غلط ہے۔“

”شک کیسے ہو گیا اسے؟“

”یہ میں نہیں جانتی مگر اس کی کٹی میں پہنچی تو کہنے لگا۔“ دیوی! تو ونود جی کی بیٹی ہے جی میں نے تجھ پر وشواس کیا تھا۔“

”آپ کے ساتھ وشواس گھات نہیں ہوگا، سوامی جی!“ میں نے جواب دیا۔

”وہ تو ہو گیا دیوی! سوچتا ہوں، جب کوئی لا بھ نہیں تو کھدائی کیسی، تجھے اس لیے بلایا ہے کہ یہ نائک بند کرنے کو کہوں۔“

میں اس کی بات سن کر پریشان ہو گئی۔ ”یہ نائک نہیں مہاراج! کھدائی خزانے کے لیے ہو رہی ہے۔“

”پر میرا دچار ہے، کنویں کے اندر کوئی خزانہ نہیں۔“

”آپ کھدائی بند نہ کرائیں، خزانہ نہ ملا پھر بھی آپ کو بھینٹ تو ملے گی، ہر جانہ دیا جائیگا۔“

”یہ کچھ اچھا نہیں لگتا، دیوی! میں کوئی جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا۔“

”جب ہر جانے کا مول آپ کا ہوگا پھر جھگڑا کیسا؟“

بہت اکھڑا اکھڑا تھا، میں نے رام کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ ”کھدائی ہونے دیں، سوامی جی! آپ کا مول مل جائے گا اور اسے پرنام کر کے آگئی۔“

میں انیلا مورتی کی زبانی یہ روداد سن کر پریشان ہو گیا کیونکہ اس موقع پر جب کھدائی کو ابھی تیسرا دن تھا، شہسوامی کا شک میں بڑ جانا کوئی اچھی علامت نہ تھی، سوچا اگر اس نے کھدائی رکوا دی تو بات بگڑ جائے گی، مورتی کہنے لگی۔

”میں بات بگڑنے نہیں دوں گی، تم کھدائی ذرا تیز کر دو۔“

”سوامی کے کان میں ہزار بارہ سو کی بات ڈال دے۔“

”اب وہ مول بڑھائے گا مگر موقع دیکھ کر بات کروں گی۔“

میں نے بکھی رکوائی اور اتر کے مندر کی طرف ہولیا، نہ جانے شہسوامی کو یہ شک کیسے ہو گیا کہ کنویں میں خزانہ نہیں اور اب کھدائی رکوانے کی سوچ رہا تھا، ونود پاپا کی سرکاری حیثیت اچھی طرح جانتا تھا، سوچا اس کی بیٹی کا کہا آسانی سے نہیں ٹال سکے گا پھر بھی دل کو ایک عجیب سا دھڑکا تھا اور یوں لگتا تھا، جیسے کوئی گڑ بڑ ہونے والی ہے، واپس آ کر وشال رائے سے بات کی اور بتایا۔

”سوامی ڈانواں ڈول ہو گیا ہے، اس نے انیلا مورتی سے کھدائی بند کرانے کی بات کی ہے۔“
 ”تمہارے کو اتنی چٹا کیوں ہے۔“ وشال نے جواب دیا۔ ”وہ ایک افسر کی بیٹی ہے، کھدائی بند نہیں ہونے دے گی۔“

”مگر مورتی نے کام تیز کرنے کو کہا ہے۔“

”یہ تو میں بھی بولتا ہوں کہ اپنے کو ذرا پھرتی کرنی چاہیے۔“

ہم نے رات کے اوقات کار میں دو گھنٹے اور بڑھادیئے مگر کنواں جوں جوں گہرا ہو رہا تھا کھدائی کا کام مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ چرنی کے ذریعے مٹی اوپر کھینچنے میں دیر ہو جاتی تھی مورتی کبھی سویرے بھی شام کو آتی۔ سمبھو سوامی کنوئیں پر آتا ہی نہیں تھا، خزانے کی لگن ختم ہو چکی تھی، اب تو صرف ہر جانے اور اس کے مول کا مضمون رہ گیا تھا مگر اس نے کھدائی بند نہیں کرائی جس سے میں یہی سمجھا کہ مورتی نے اسے ہینڈل کر لیا ہے پانچویں دن شام کو جانے لگی تو پوچھا۔ ”کیا تو نے سوامی سے مول کی بات کر لی؟“

”آج کروں گی، اس نے آج پھر مجھے آشرم کی کئی میں بلایا ہے مگر تم کنوئیں کی تھاہ میں کب پہنچو گے؟“

”کل رات کے آٹھ بجے تک ہمارا کام ختم ہو جائے گا۔“

”پھر مورتی سوامی کے آشرم میں چلی گئی اور میں پچھلے دروازے سے نکل کر پھر بگھی میں آ بیٹھا جو مندر کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی، دس بارہ منٹ کے اندر مورتی آ گئی۔ میں نے مول کے بارے میں پوچھا تو بولی۔

”کل بتائے گا۔“

میں کچھ حیران سا ہوا۔ اس نے پیار سے میری طرف دیکھا۔ ”تم کہتے تھے، بدھ کی وہ مورتی تمہاری جان کے مول بھی سستی ہے۔“

”اب بھی یہی کہتا ہوں۔“

”کل مورتی تمہیں مل جائے گی۔“

بعض عورتیں صرف پریم کرنے کے لیے جنم لیتی ہیں۔ انیلا مورتی انہی میں سے ایک تھی، میرا ہاتھ تھام کے دھیرے سے بولی۔ ”بدھا کی مورتی کے پریم بھاؤ میں ”مورتی پوجا“ بالکل ہی بھول گئے ہو۔“

میں نے شام کے اندھیرے میں بگھی کے اندر ہی تھوڑی سے ”پوجا“ کی اور نیچے اتر پھر جیورام نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور بگھی دوڑنے لگی۔

اگلے دن اور یہ کھدائی کا چھٹا اور آخری دن تھا، مورتی دس بجے ہی پہنچ گئی، میں کریم کے

ساتھ چرنی پر تھا، ہم دونوں مل کر رسہ کھینچتے اور مٹی نکال کر پھینکتے تھے، میں چرنی کو کریم کے سپرد کر کے چھو لداری کے پاس آ گیا، جہاں وہ میرا انتظار کر رہی تھی، پہلا سوال یہی تھا۔ ”کیا سوامی سے مل آئی؟“

”نہیں اس کے پاس کچھ اجنبی لوگ بیٹھے ہیں، تھوڑی دیر کو جاؤں گی، تم کام کے بارے میں بتاؤ۔“

ہم کنوئیں کی تھاہ میں پہنچے ہی والے تھے اور مجھے دشواں تھا، میرا سپنا ضرور پورا ہو گا پھر بھی میری آواز کپکپا رہی تھی، میں نے جذبات انگیز لہجے میں کہا۔ ”مورتی! آج رات کے آٹھ بجے تک معلوم ہو جائے گا کہ قسمت میرا ساتھ دیتی ہے یا نہیں؟“

اس نے اپنی مسکراہٹ کا منتر پھونکا۔

”تمہاری قسمت تمہارے سامنے کھڑی ہے، ساتھ کیوں نہیں دے گی۔“

مسکراہٹ کے ساتھ اس کے الفاظ بھی میرے من میں اتر گئے، ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر وہ کہنے لگی۔ ”آج مندر میں اجنبی لوگ بہت ہیں۔ ذرا ہوشیار رہنا اور آٹھ بجے تک مدعا مل جائے تو اسے لے کر سیدھے ”مورتی ہاؤس“ پہنچنا۔ میں تم سے وہیں آ کر ملوں گی۔“

پھر مجھ سے آگیا لی اور مندر کی جانب ہولی تاکہ سوامی سے بات کر لے۔ وہ قنات کی دیوار کے پیچھے مندر کی غلام گردش میں غائب ہوئی تو میں بھی چند لمحوں کا وقفہ دے کر پیچھے ہولیا کہ معلوم کروں کیا بات ہوتی ہے۔ قنات کی دیوار سے گزر کر ابھی میں غلام گردش میں پہنچا تھا کہ مورتی اور سمبھو سوامی دونوں ساتھ ساتھ مندر کے دروازے کی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ میں انہی پیروں رک گیا کیونکہ مندر کے اندر اجنبی لوگوں کی آوازیں سن رہا تھا، مورتی غالباً واپس جا رہی تھی اور سوامی اسے دروازے تک چھوڑنے گیا تھا، جب مورتی نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا اور جانے کی آگیا لی تو سوامی نے دائیں ہاتھ کا پنجہ بنا کر کوئی اشارہ کیا۔ جواب میں وہ اپنے روایتی انداز سے مسکرائی پھر اس نے بھی پانچوں انگلیاں کھول کر اپنا گورا گورا سندھ ہاتھ لہرایا اور بگھی کی طرف چلنے لگی۔ سوامی وہیں سے پلٹ آیا اور میں تیزی سے واپس مڑا۔

میرا خیال تھا، سوامی نے پانچ ہزار کی مانگ کی ہے اور مورتی نے اسے یہ مول ادا کرنے کا دشواں دلایا ہے مگر پانچ ہزار کی رقم بہت بڑی تھی اور جب میں قنات کی دیوار پار کر کے کنوئیں کی طرف چل رہا تھا، یہ خیال مجھے بار بار پریشان کرنے لگا کہ انیلا مورتی مجھے رقم کے بارے میں بتائے بغیر کیوں چلی گئی؟ کیا وہ خود ہی اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنے کا سوچ رہی ہے مگر میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سوامی نے کیا کہا تھا، مورتی نے کیا جواب دیا تھا، سوچا، شاید شام کو آ کر بتائے گی۔

مندر کے پچھواڑے دن بھر کام ہوتا رہا، چرخی گھومتی رہی۔ چار، ساڑھے چار بجے کے درمیان میں ذرا ستانے کے لیے چھولداری میں آکر لیٹ گیا کیونکہ چرخی پر رسہ کھینچنے کے علاوہ کنوئیں میں اتر کر کھدائی بھی کرتا رہا اور کافی تھک گیا تھا مگر جونہی دری پر لینا ذہن میں انجانے اندیشوں کے کواڑ کھل گئے اور کوئی شے من کو ذہن لگی اور جس طرح ملاح آکاش کو ہمیشہ خطرے کی نظر سے دیکھتا ہے کہ نہ جانے کب بادل اُڈ آئیں اور کب طوفان جہاز کو گھیر لے۔ اسی طرح میں بھی بھگوان بدھ کی نایاب اور انتہائی مقدس مورتی کو پالنے کی کوشش میں بدک بدک جاتا تھا کیونکہ جو واقعات میں اپنی سرگزشت میں بیان کر آیا ہوں۔ ان سے میرے پڑھنے والوں نے بھی جان لیا ہو گا کہ اس مورتی کے سلسلے میں کیسی کیسی وارداتیں ہو چکی تھیں، انہیں سامنے رکھتے ہوئے میرے نا دیدہ اندیشے بے جا نہیں تھے۔ شمسوامی کی پراسرار خاموشی بھی ایک معمائی ہوئی تھی اور آج مندر میں اجنبی لوگوں کی آمد میرے انہی اندیشوں کی تائید کر رہی تھی جن سے انیلا مورتی نے بھی ہوشیار رہنے کی توجہ دلائی تھی۔

ادھر شمسوامی کا پنچہ ابھی تک میرے ذہن میں گڑا ہوا تھا، لیٹے لیٹے میں نے اسی طرح اپنا پنچہ لہرایا تو اسی لمحے کلائی کی گھڑی پر نظر پڑی جس پر ٹھیک پانچ بجے تھے، میں بری طرح چونکا، میرے ہاتھ کی انگلیاں بھی پانچ بج رہی تھیں اور اب خیال آیا، کہیں سوامی نے مورتی سے بات چیت کرنے کے لئے پانچ بجے کا وقت تو نہیں ٹھہرایا تھا؟ یہ خیال آتے ہی ایک لخت اٹھ کر بیٹھ گیا اور معاملے کی صورت پر غور کرنے لگا جو اچانک ہی سامنے آئی تھی۔

پانچ سات منٹ تک سوچتا رہا اور دماغ نے فیصلہ دیا کہ پنچے کا مطلب پانچ بجے کا بلاوا ہی ہو سکتا ہے پھر پچھلے دروازے سے باہر نکلا اور ہولے ہولے مندر کے بڑے دروازے کی طرف چلنے لگا کہ دیکھوں مورتی آئی ہے یا نہیں؟ مگر آس پاس کبھی کہیں دکھائی نہ دی گویا وہ نہیں آئی تھی، میں اسی دروازے سے مندر میں داخل ہوا اور سیدھا سوامی کے آشرم کی طرف گیا۔ کئی میں جھانکا وہ خالی تھی، ایک پانڈے نے مجھے دیکھ لیا اور لپک کر آیا میں نے پوچھا۔ ”سوامی جی کہاں ہیں؟“

”وہ شرادھ پر گئے ہیں۔“ پانڈے نے جواب دیا۔ ”دیر سے آئیں گے مجھ سے بولو۔“ کیا بات ہے؟“

”صرف انہی سے ملنا تھا۔“

میں مندر کی غلام گردش سے ہوتا کنوئیں پر آ گیا، دو تین پانڈوں کے سوا کوئی اجنبی آدمی بھی دکھائی نہیں دیا تھا، سوچا پنچے کے اشارے کا مطلب پانچ بجے کی ملاقات کی بجائے کچھ اور ہی ہو گا جسے میں سمجھ نہیں سکا اور چرخی پر کھڑا ہو گیا۔

چھ بجے شام کا بھوجن کر کے ذرا باغیچے میں ٹہل رہا تھا کہ کریم پچھلے دروازے سے اندر آیا اور کہنے لگا۔

”میں نے کچھ مشکوک لوگوں کو مندر کے ارد گرد منڈلاتے دیکھا ہے۔“ ”اڈوں“ کے آدمی لگتے ہیں، شاید ہماری نگرانی ہو رہی ہے۔“

ایک دم ذہن میں ریگتے وسوسوں اور اندیشوں نے سر ابھارا اور میں کئی دن سے جس گڑبڑ کی آہٹ سن رہا تھا، اس نے ایک نیا روپ دھار لیا۔ تو سوامی کوئی دام بچھا رہا ہے مگر جب باہر جانے کا مول ادا کرنے کی بات ہو چکی ہے پھر اس نگرانی کا کارن کیا ہے؟ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟

چند لمحے ٹھہر کر میں کریم کے ساتھ باہر نکلا تو دور کھلے میدان میں تین چار آدمی نظر آئے جو ہمیں دیکھ کر ایک طرف کاوا کاٹ گئے، شام کے اندھیرے میں چار پانچ ایسے ہی آدمی مندر کے سامنے بھی پھرتے دیکھے۔

”ہاں دیکھ بھال تو ہو رہی ہے۔“

پھر میں کریم کے ساتھ کنوئیں پر لوٹ آیا۔ وشال رائے اور کایا موسا چھولداری کے باہر ہی کھڑے تھے، میں نے ان سے بات کی۔ وشال رائے بولا۔ ”کاہے کی چتا کرتے ہو کیشپ بابو! ان چڑی کے غلاموں کو تو کریم اور کالی ناتھ ہی سنبھال لیں گے پھر اپنے پاس گولی سکے بھی ہے۔“

”مگر میں کوئی جھگڑا نہیں چاہتا۔“

”ہمارے کو بھی جھگڑے سے کیا لینا ہے؟ وہ تو تب ہو گا جب کوئی مائی کا جنا ہاتھ کھولے گا۔“

کایا موسا نے کہا۔ ”ہمیں اپنے کام کی طرف دھیان دینا چاہیے۔“

میں خود گیس لیمپ لے کر کایا موسا اور چان کے ساتھ کنوئیں میں اتر گیا۔ وشال اور کالی ناتھ چرخی پر کھڑے ہو گئے، کریم کو پہلی بار پچھواڑے کی نگرانی کا کام سونپا گیا۔ رات کو کام کرنے کے لیے ہمارے پاس چار پانچ گیس لیمپ تھے مگر صرف دو ہی روشن کیے جاتے، ایک کنوئیں کے اندر، ایک باہر، کھدائی آخری مرحلے میں تھی، میں اور کایا موسا کدالیں چلاتے اور چان مٹی ٹوکریوں میں بھر بھر کے اوپر پہنچاتا رہا، ٹھیک سات بجے تھے، جب میری کدال کی نوک کسی لکڑی سے ٹکرائی اور میں بڑی احتیاط سے اس جگہ کو کھودنے لگا۔

سات کا ہندسہ میرے لیے ہمیشہ بڑا مبارک اور بھاگوان رہا ہے اور آج ایک بار پھر رات کے سات بجے میری خوش قسمتی کا ستارا کنوئیں کی گہری تھاہ میں چمکا تھا کیونکہ مٹی ہٹائی تو نیچے ایک لمبوتر اچوبی بکس دکھائی دیا جو ٹوٹ پھوٹ کر خستہ حال اور بھر بھرا سا ہو رہا تھا، میں نے کدال رکھ کر

لرزتے ہاتھوں سے اس خستہ حال بکس کو اٹھایا تو ٹکڑے ٹکڑے ہو کے بکھر گیا اور اس کے اندر کپڑے میں لپیٹی پٹائی مورتی میرے ہاتھ میں آگئی، کپڑا بھی بوسیدہ ہو چکا تھا خود ہی گر گیا اور میں نے پیتل کی مورتی دیکھی جس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا مگر کوئی شخص میری خوشیوں کا اندازہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے بھگوان بدھ کی اس مقدس مورتی کو ڈھونڈ لیا تھا جسے غالباً دو ہزار چار سو تیرہ برس پہلے کوشی نگر کے ایک کاریگر نے بنایا تھا۔ مورتی کا رنگ سیاہ پڑ جانے کے باوجود اس پر ”جیون بھید چارانا“ کے شبد اور ”تھا گت، شاکیہ منی، امی تابھ، آتماروپ“ کے پوتر نام بھی پڑھ لیے جو قدیم پالی زبان میں کندہ تھے۔ نقلی مورتی پر کندہ شبدوں اور ناموں کے کارن میں پالی بھاشا کی اتنی لکھت کو سمجھنے لگا تھا، کئی دن رات کی کٹھن محنت کا صلہ میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ تاریخی مورتی جس کا اشوک کے زمانے میں چرچا ہوا جو پاٹلی پتر کی تباہی کے ساتھ ہی پیوند زمین ہو گئی، جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں انگلستان کے ماہرین آثار نے 1815ء میں پٹنہ کی کھدائی سے برآمد کیا اور 1848ء میں گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے کلکتہ کے فورٹ ولیم سے غائب کر دیا تھا، ہاں یہ وہی نایاب اور پوتر مورتی تھی جسے کئی بودھ حکومتوں نے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جس کی تلاش میں نہ جانے کتنے بودھ گمانی اور بھکشو کہاں کہاں بھٹکتے رہے تھے مگر کوئی اسے ڈھونڈ نہ سکا کیونکہ آسمان کی کتاب اسرار پر اس کی تلاش تھارو کیشپ کے نام لکھ دی گئی تھی اور پر اسرار قدرت میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے درگا کے اس مندر تک لے آئی تھی جس کے پچھواڑے زیر زمین یہ مورتی 1857ء سے میرے ہی لیے محفوظ کر دی گئی تھی۔

میرے من میں اس انادی اور انت ایشور کے پریم بھاؤ کی ایک زبردست لہر جوار کی طرح اٹھی جس نے سدا مجھ پر دیا اور کرم کا سایہ رکھا تھا اور کنوئیں کی تھاہ میں اس کے حضور اپنا ماتھا ٹیک دیا پھر بدھا کی مورتی کو چوما جس میں جیون کے نہ جانے کون سے اسرار بند تھے۔

کایا موسا اور چان بھی اس گوہر مقصود کے مل جانے پر بے حد خوش تھے اور سچ مچ یہ بڑی خوشی کی بات تھی کہ انہوں نے اور وشال رائے اور کالی ناتھ اور کریم نے بھی 483 قبل مسیح کی بودھ تاریخ کو کھوجنے میں میرا ساتھ دیا اور اس مورتی کو ڈھونڈنے اور پالنے میں سب سے بڑا ہاتھ انیلا مورتی کا تھا جو پٹنہ میں میرے سپنے کی تعبیر اور میری تلاش کا ذریعہ بنی تھی۔

میں مقدس مورتی کو ہاتھ میں لے کر رسہ پر بیٹھا اور رسہ کھینچنے کا اشارہ کر دیا۔ وشال رائے اور کالی ناتھ نے مل کر مجھے اوپر کھینچ لیا اور دیکھا کہ میں کنوئیں سے با مراد نکلا ہوں تو خوشی سے جھوم اٹھے پھر کایا پتھا اور چان کو باری باری اوپر کھینچ لیا گیا اور سب نے چھو لداری میں اکٹھے ہو کر بھگوان کے مورتی کے درشن کیے۔

میں مورتی کو لے کر نکل جانا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے باہر کی صورتحال کا پتہ کرنا ضروری

تھا، کریم نے آکر بتایا کہ اڈوں کے وہ لوگ جو پانچ چھ بجے کے درمیان مندر کے آس پاس منڈلاتے رہے تھے، اب کہیں نظر نہیں آتے۔ صرف سامنے والے میدان میں درخت کے نیچے ایک پر چھائیں دکھائی دے رہی ہے میں نے کالی ناتھ کو بھیجا کہ وہ کوئی رکشہ یا ٹم لے آئے۔ آٹھ بج چکے تھے کالی ناتھ ایک دستی رکشہ لے آیا، اپنے ساتھیوں کو یہ ہدایت دے کر سویرے وہ کرائے کا سامان لوٹا کر ”گیتا ہوٹل“ چلے جائیں میں مورتی لے کر نکلا اور رکشہ میں بیٹھ گیا۔ وشال رائے میری حفاظت کے خیال سے ساتھ ہی جانا چاہتا تھا مگر میں نے کہا۔ ”اگر اس مورتی کو چھو لینے سے روگی اچھے ہو جاتے ہیں تو یہ میرا بچاؤ بھی کر سکتی ہے اور اس وشواس کے ساتھ میں اکیلا ہی وہاں سے روانہ ہوا پھر بھی وشال، کایا، کالی ناتھ، چان اور کریم دور تک میرے پیچھے آئے مگر اندھیرے سے کوئی سایہ، کوئی خطرہ میری طرف نہیں لپکا اور یہ ایک حیرت انگیز بات ہوئی تھی۔

مورتی ہاؤس میں ایک بار پھر چوکیدار نے میرے کمرے کا دروازہ کھول دیا، میں بھگوان کی مورتی اٹیچی کیس میں سنبھالنے لگا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس پر نئے سلعے ہوئے دو قیمتی سوٹ رکھے تھے اور یہ وہی سوٹ تھے جن کا ناپ دینے کے لیے انیلا مورتی نے آٹھ دن پہلے مجھے ٹیلر ماسٹر کے ہاں بھیجا تھا، وہ کتنی جلدی میرے جیون میں آئی اور کتنی لگن کے ساتھ میری ہر ضرورت کا خیال رکھنے لگی تھی، میں نے سوچا۔ ”کیا سچ مجھ میرے ہاتھ پر چوتھی ریکھا بن رہی ہے؟“

میں نے اس خیال سے ایک عجیب لذت محسوس کی اور انیلا مورتی کا نام میرے من کی جھیل میں نئی تھر تھراہٹ پیدا کرتا ہوا گزرنے لگا۔ میں اسے پسند کرتا تھا کیونکہ وہ ایک اچھوتا شاہکار تھی، اس کا شریر ایلورا کی مورتیوں سے زیادہ سندر اور سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ خود سے پاؤں تک ایک مورتی تھی، جس کی پوجا کرنے کو جی چاہتا تھا، اس کی مسکراہٹ کے منتروں کے ساتھ دماغ کو بھی مسحور کر دیتے تھے، اور میں بتا چکا ہوں کہ اس کے مسکرانے کی ادا کسی دوسری ناری کو نصیب نہ ہو سکی۔ پھر میری طرح بودھ مائیتھا لوجی کی اسکا لربھی تھی اور کبھی کبھی میں سوچتا تھا اس کا جنم صرف میرے لیے ہوا ہے کیونکہ پر اسرار قدرت نے انیلا مورتی کو آپ میرے سپنے کی تعبیر بنایا تھا، مگر میں ابھی تک یہ نہیں جان سکا تھا کہ دوسری ناریوں پر بھی میرا ادھیکار مانتی ہے یا نہیں اور جب سندرستی اور جل پنا اور منجوری کے بارے میں سنے گی تو کیا کہے گی۔

میں تھکا ہوا تھا، سوچا مورتی کے وچار معلوم کرنے کو ابھی بڑا سہ پہلے نہا دھو کر کپڑے بدل لوں، بھگوان کی مورتی کو اٹیچی کیس میں بند کیا اور غسل خانے میں گھس گیا، ابھی کپڑے بدل کے بیٹھا ہی تھا کہ گیٹ کھلنے اور کبھی کے اندر آنے کا کھٹکاسن کر چونکا، انیلا مورتی

آگئی تھی۔

وہ بھی سے اتر کر سیدھی میرے کمرے میں آئی، میں اس کی حالت دیکھ کر حیران ہوا، بکھرے بکھرے پریشان بال ہونٹوں کی سرخی اتری ہوئی، چہرے پر پڑمردگی سی۔ خیال آیا شاید بستر سے اٹھ کر آئی ہے اور جلدی میں کنگھا بھی نہیں کر سکی، اس نے آتے ہی پوچھا۔
”کیا مورتی مل گئی؟“

”ہاں“ پھر اٹیچی کیس سے مورتی نکال کر دکھائی تو اس کے چہرے پر چھائی مردنی ایک دم بشاشت میں بدل گئی اور ہونٹوں پر وہی جادو مسکراہٹ تیر گئی جو میرے من میں جوار بھاٹا پیدا کر دیتی تھی، مورتی کو دوبارہ اٹیچی میں رکھ کر کہا۔ ”تو نے آج مجھے ہوشیار رہنے کا سنگٹل دے کر ڈرا ہی دیا تھا۔“

”کیا کسی نے تمہیں روکا ٹوکا نہیں؟“

”آج مندر میں کچھ اجنبی لوگ ضرور تھے۔ شاید ”اڈوں“ سے بلائے گئے تھے۔ شام کو پانچ اور چھ بجے کے درمیان مندر کے آس پاس پھر کر ہماری نگرانی بھی کرتے رہے مگر آٹھ بجے جب میں مورتی لے کر نکلا ایک آدمی کے سوا کسی کی پرچھائیں بھی نظر نہ آئی اور میں رکشہ میں بیٹھ کر بے روک ٹوک ”مورتی ہاؤس“ پہنچ گیا۔

اس نے اطمینان کی سانس لی۔ ”میں ذرتی تھی کہیں وہ لوگ تمہیں روکنے کی کوشش نہ کریں۔“

”تو آج شام کو مندر نہیں گئی تھی کیا؟“

وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔ ”گئی تھی۔“

”کس سے؟“

”پورے پانچ بجے۔“

اس کا جواب سنتے ہی شہسواری کا پنجہ میرے ذہن میں ابھر آیا اور میں حیران سا ہو کر بتانے لگا۔

”آج سوا پانچ بجے کے قریب میں مندر میں گیا مگر سوامی کی کٹی خالی پڑی تھی۔ ایک پانڈے نے بتایا۔ سوامی شراذھ پر گئے ہیں، دیر سے لوٹیں گے۔“

”سوامی بھی وہیں تھا، میں بھی وہیں تھی مگر کٹی میں نہیں، مندر کے پچھلے کمرے میں۔“ وہ بتانے لگی۔ ”سوامی نے ملنے کے لیے پانچ بجے کا سہ ٹھہرایا تھا، میں پانچ بجے پہنچی تو مندر کے پچھلے کمرے میں لے گیا کہ نچنت ہو کر بات چیت کریں گے وہاں ایک لائین چل رہی تھی فرشی درمی بچھی تھی۔ ہم اس پر بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے، کھدائی کے تیسرے دن جب سوامی نے

مجھے اپنے آشرم میں بلایا اور کھدائی رکوانے کی بات کی تو یہ بھی جانتا تھا ہم درگامندر میں خزانہ تلاش کرنے نہیں بلکہ بدھا کی ایک پرانی مورتی ڈھونڈنے آئے ہیں مگر میں نے یہ بات تم سے چھپائی تھی۔“

مجھ پر حیرت کا دورہ پڑا۔ ”اسے مورتی کے بارے میں کس نے بتایا؟“

”پاپا کے ہیڈ کلرک کاشی رام نے۔“ وہ ایک پل رکی پھر بولی۔ ”سوامی نے خود جا کر کاشی رام سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم بدھا کی ایک پرانی مورتی کھوجتے پھر رہے ہو نو دپاپا کے عزیز ہو۔ سوامی سمجھ گیا کہ ہم نے خزانے کا نائٹک کھیلا ہے، کھدائی کا مقصد مورتی ڈھونڈنا ہے مگر میں نے ہر جانے کا مول ادا کرنے کا وچن دیا اور کہا کھدائی نہ رکوائے وہ اپنی ہٹ کا پکا ہے مگر میں نے ذرا ہینڈل کیا تو کچھ رام ہو گیا اور بولا۔ ”مورتی دیوی! تیری چیت اور اچھیا کے لیے میں کھدائی نہیں رکواؤں گا۔“

کل جب اس نے دوبارہ مجھے اپنی کٹی میں بلایا تو پوچھا کہ کام کب ختم ہوگا؟ میں نے بتایا کل رات آٹھ بجے تک تو کہنے لگا۔ ”پھر مول کا فیصلہ بھی کل ہی کریں گے۔“ میں آج دس بجے مندر گئی مگر اس نے پانچ بجے شام کو بلا لیا اور مندر کے پچھلے کمرے میں لے جا کر اپنا مول بتایا۔ مول سن کر میری جو حالت ہوئی تمہیں بتا نہیں سکتی ادائیگی بھی آٹھ بجے سے پہلے چاہتا تھا۔

”کیا مول لگایا اس نے؟“

”مورتی کے بدلے مورتی“

”کیا مطلب؟“

”اس کا مول میں تھی۔ بولا۔ ”مورتی دیوی! تو نے مجھے میری مرضی کا مول ادا کرنے کا وچن دیا تھا۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے یہ انکشاف کر کے مجھ پر بجلی گرا دی کہ اس سے پندرہ سولہ آدمی مندر کو گھیرے ہوئے ہیں اور اگر آٹھ بجے سے پہلے میرا مول ادا نہ ہوا تو بدھا کی مورتی کے ساتھ کیٹپ کا بھی پتہ نہیں چل سکے گا۔“ میں ہکا بکا سی بیٹھی تھی کہنے لگا۔ ”پہلے دن بھی جب پانسہ پھینکا گیا یہی بات طے ہوئی تھی کہ مول میں لگاؤں گا، آج پھر پانسہ پھینک لیتے ہیں۔“ اس نے پانسہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور بولا۔ ”مورتی دیوی! تو ہی پانسہ پھینک۔“

میرے من میں ہلکی سی آس پیدا ہوئی اور یہ شرط لگائی کہ پانسہ تین بار پھینکا جائے گا تینوں بار میرے حق میں پڑا تو سوامی کو کسی قسم کے سول کا ادھیکار نہیں ہوگا، دوبار میرے حق میں پڑا تو میں اپنی مرضی کی رقم ادا کروں گی، صرف ایک بار میرے حق میں پڑا تو رقم اس کی مرضی کی ہوگی، اور تینوں بار میرے خلاف پڑا تو اپنے آپ کو اس کے سامنے بار دوں گی، میری شرط سن کر سوامی

کچھ دیر چپ بیٹھا رہا، پھر اچانک بول پڑا۔

”مورنی دیوی! تیری شرط مانتا ہوں، پھینک پانسہ۔“

میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے پانسہ پھینکا، ایک بار، دو بار، تین بار اور تینوں بار پانسہ میرے خلاف پڑا۔ وہ جیت گیا، میں ہار گئی اور آٹھ بجے سے پہلے وہ سب کچھ ہو گیا جو سوامی چاہتا تھا۔“

مجھ پر بجلی گری اور اس کے کڑا کے سے ذہن لرز اٹھا مگر وہ کہہ رہی تھی۔ ”اگر میں سوامی کا مول نہ چکاتی تو تم مورنی لے کر مندر سے نہیں نکل سکتے تھے، اس نے قول دیا تھا کہ میں مول چکا دوں گی تو تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ آٹھ بجے جب تم مورنی لے کر نکل گئے اس نے مجھے جانے کی آگیا دے دی تم نے کہا تھا نہ بدھا کی مورنی کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل سکتے ہو مگر میں تمہارے لیے اپنے آپ پر کھیل کر آرہی ہوں اور اب تمہاری پوجا کے قابل نہیں رہی۔“

یہ کہتے کہتے انیلا مورنی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میرے اندر جوالا بھڑک اٹھی، وہ بستر پر اوندھے منہ گر کر سسکیاں بھرتی رہی اور میں یوں اچھل کے کھڑا ہو گیا جسے جوالا مکھی کے دھانے نے مجھے اچھال دیا ہو۔ نس نس میں شعلے تیر رہے تھے، بدن بھٹی کی طرح دھک اٹھا تھا، کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں سکتا تھا، یوں لگ رہا تھا میں کنوئیں سے مورنی لے کر نہیں ایک عورت کی ارٹھی لے کر نکلا ہوں، وہ عورت جو میری جیت کے لئے خود کو ہار آئی اب اب میرے سامنے پکھل رہی تھی، سسک رہی تھی، اس کے اندر کوئی چیز کم یا کم ہو گئی یا اس نے بیدار کر دی تھی، اس طرح میرا سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا اور وہ بہت آگے نکل گئی تھی مگر ایک غم کی آگ تھی جس نے ہم دونوں کو اپنی جلتی، سلکتی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔

ہر آدمی کے اندر بھگوان ہوتا ہے یا شیطان اور سمجھو سوامی کے اندر شیطان تھا جس نے برہما (آدم) کی ایک امانت لوٹ لی تھی، اچانک میرا ہاتھ مورنی کے کندھے پر پڑا، اس نے گردن اٹھا کر روتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور میں نے کہا۔ ”اس بات کو بھول جا کہ تو نے کیا کہا، میں نے کیا سنا مگر ایک بات ابھی ہونا باقی ہے جو ہوگی۔“

وہ تڑپ کے اٹھی اور کپکپاتی آواز میں بولی۔ ”تم کل ہی مورنی لے کر پٹنہ چلے جاؤ، میں یہی کہنے آئی تھی۔“

پھر خود بھی جانے کے لیے تیار ہو گئی میں نہیں جانتا تھا اسے روکوں یا جانے دوں، وہ بھیگی بھیگی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بے اختیار قدموں میں جھکی، میرے دھلے ہوئے پاؤں چومے اور ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ”کل دوپہر کی ٹرین سے ضرور چلے جانا۔“

یہ کہہ کر آندھی کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی، میں سکتے کی سی حالت میں کھڑا

دیکھتا ہی رہ گیا اور اس وقت چونکا جب کبھی ”مورنی ہاؤس“ سے نکل رہی تھی۔

یہ ایک ایسا لرزہ خیز سانحہ تھا جس نے میری نیند لوٹ لی، میری کامیابی پر غم کا کالا سایہ ڈال دیا، میں ساری رات ایک پل کے لیے نہ سوکا، رات جاگتے سوتے، اٹھتے بیٹھتے گھومتے پھرتے بیت گئی اور نیا دن چڑھنے سے پہلے میں ایک فیصلہ کر چکا تھا، پھر اپنا اٹیچی کیس لے کر ”مورنی ہاؤس“ سے نکلا اور ”گیتا ہوٹل پہنچ گیا، میرے ساتھی کرائے کا سب سامان مالکوں کو لوٹا کر فارغ ہو چکے تھے میں نے انہیں جاتے ہی بتایا۔

”ہم آج پٹنہ سے روانہ ہو جائیں گے۔“

”کوئی ٹرین ہے؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ مورنی نے تاکید کی تھی کہ آج دوپہر کی ٹرین سے چلا جاؤں، میرا فیصلہ کچھ اور تھا اچانک وصال رائے بولا۔

”کیشپ بابو! ہمارے کو لمبا سفر کرنا ہے، رات کی ٹرین پکڑو، بارہ بجے چلتی ہے۔“

”تو اسی ٹرین سے چلیں گے۔“

رات کی ٹرین سے واپسی کا فیصلہ ہو گیا، میں جانے سے پہلے ایک بار مورنی سے ملنا، کچھ کہنا، کچھ بتانا چاہتا تھا اس کی پوجا کے پھول چننے کی سوچ رہا تھا، اسے سو بیکار کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے مجھے کچھ اور بھی کرنا تھا جو دوسروں کا نیاؤ کرنے، انصاف بانٹنے نکلا تھا، انیلا مورنی کا نیاؤ نہ کرتا۔

میں جانتا تھا، دو تین بجے کے درمیان درگا مندر سنسان ہو جاتا پانڈے پجاری دوپہر کا بھوجن کر کے سو جاتے یا باہر نکل جاتے ہیں، سمجھو سوامی بھی اپنے آشرم کی کٹی میں آرام کرتا ہے، میں نے اس سے ملنے کے لیے یہی سے چنا اور صرف کریم کو اپنے ساتھ لے کر نکلا۔

ہم دونوں ایک بات سوچ کر چلے تھے اور اس کے مطابق پچھواڑے کی دیوار پھاند کر مندر کے باغیچے میں کودے کیونکہ پچھلا دروازہ پھر بند کر دیا گیا تھا، کریم کو کنوئیں کے پاس چھوڑ کر میں غلام گردش سے ہوتا سوامی کی کٹی کی طرف ہولیا۔ وہ اپنی کٹی میں موجود تھا، مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”کیسے آئے ہو پرنتو!“

چہرے پر کسی حیرانی، کسی پچھتاوے کے آثار نہیں تھے۔ الٹا میں اس کی بے فکری دیکھ کے حیران رہ گیا۔ ”ہر جانے کا مول چکانے“ میں نے جواب دیا۔

”وہ تو میں نے چھوڑ دیا پرنتو! کنواں پھر سے چالو ہو جائے تو درگا مندر کے لیے یہی تمہارا

ایک دان ہوگا، جا کھن کب ڈالواؤ گے؟“

”اسی کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں، ذرا میرے ساتھ کنوئیں تک چلیں۔“

وہ بے دھڑک میرے ساتھ ہولیا، ہم غلام گردش سے گزر کر مندر کے پچھواڑے کنوئیں پر آ گئے، کریم وہیں کھڑا تھا، سوامی نے ایک نظر اسے دیکھا اور مجھ سے پوچھا۔
”جاکھن کے بارے میں کیا بتانا چاہتے ہو۔“

مگر اب ہر سوال کا جواب مجھے نہیں سمجھو سوامی کو دینا تھا اور میرا پہلا سوال یہ تھا۔ ”سمجھو سوامی تم درگا مندر کے مہنت ہو، وید شاستر تو پڑھے ہوں گے۔“

وہ میرے لہجے کی تبدیلی اور سوال پر چونکا۔ ”تم یہ پوچھنے والے کون ہو؟“

”سوال نہیں کرو سمجھو سوامی، صرف جواب دو اور بتاؤ۔ ویدوں میں، شاستروں میں دھرم میں کسی ناری کی لاج پت لوٹ لینے کی سزا کیا ہے؟“

وہ میرے سوال پر، سوال کرنے کے انداز پر بھونچکا رہ گیا اور بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں، مگر حیرت کے مارے کچھ بول نہ سکا، زبان کنگ ہو گئی اور ٹکڑ ٹکڑ مجھے دیکھنے لگا میں نے کہا۔ ”تمہیں میرے سوال کا جواب دینا ہوگا بولنا ہوگا۔“

اور سمجھو سوامی بولا۔ ”میں جان گیا ہوں تم کیا پوچھنے آئے ہو مگر میں نے کوئی انیائے نہیں کیا یہ تو پانے کا کھیل تھا، تم نے پانسہ پھینکا کنواں کھود لیا میں نے پانسہ پھینکا مورتی دیوی کو جیت لیا۔ ایک بازی میں ہارا ایک تم۔ یدھشٹر در یودھن کے ساتھ جوئے میں درو پدیری کو ہارا تھا۔“

میں سوامی کی بات پر حیران ہوا اس کے نزدیک جو کچھ ہوا وہ ایک کھیل تھا جو اتنا اور جوئے میں کسی ناری کو ہارنا، جیتنا کوئی پاپ نہیں مگر میں اس کی یہ بھول دور کرنا چاہتا تھا۔
”تم جوئے میں ناری کی ہار جیت کو پاپ نہیں سمجھتے نہ سمجھو مگر ناری کی لاج پت اتار لینا پاپ ہے، در یودھن سے درو پدیری کا اپمان کرنا چاہا تو کرشن جی بیچ میں آ گئے مگر تم انیلا مورتی کا اپمان کر چکے ہو اور میں دیر سے آیا ہوں۔“

”تو اب کیا لینے آئے ہو۔“ اس نے ذرا جرأت دکھائی۔

”اب تمہارے پاپ کا نیائے کرنے آیا ہوں اور وہ نیائے ایشور کے قانون کے انوسا رہوگا اور ایشور کا قانون یہ ہے کہ جو مرد ناری سے پاپ کرتا ہے اس کی پت لوٹا ہے وہ جان سے مارا جائے۔“

اس اثناء میں کریم نے جو سوامی کے پیچھے کھڑا تھا اپنی کلباڑی اٹھالی جسے یہاں آتے ہی ایک جھاڑی کی اوٹ میں ڈال دیا تھا، درگا مندر کے مہنت کو ایشور کا قانون سنا دیا گیا جسے سن کر وہ ہل سا گیا اور خوف اور حیرت کی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا وہ مبہوت سا کھڑا تھا میں ایک دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”سمجھو سوامی! مجھے سنساں میں نیائے کرنے اور ایشور کا قانون سنانے کا ادھیکار دیا گیا ہے تم

نے وہ قانون سن لیا۔ اب دھرتی اور آکاش دونوں دیکھیں گے کہ اس قانون کے انوسار لوہا ایک پاپی مہنت کے جسم کو کیسے کاٹتا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے کریم کو اشارہ کیا جسے غالباً سوامی بھول گیا تھا میرے اشارے کے ساتھ ہی اس نے گھبرا کر، پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے کریم کی کلباڑی اٹھ چکی تھی، سوامی کے مڑتے ہی اس کا تیز پھل گردن میں اتر گیا اور درگا مندر کا منت چنچے چلائے بغیر ڈھیر ہو گیا اس کی آنکھیں حیرت اور خوف کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کریم نے اس کا مردہ گھسیٹ کر کنوئیں کی گہری تھاہ میں لڑھکا دیا اور ہم دونوں نے بہت سی مٹی گرا کے کنوئیں کی تھاہ میں ایک نئی پرت جمادی۔ اس پرت کے اندر سمجھو سوامی اپنے پاپ کے ساتھ دفن ہو گیا، پھر کریم نے کلباڑی کا پھل صاف کر کے لکڑی سے اتارا اور صدری میں چھپا لیا، اپنے، میرے اور سوامی کے پیروں کے نشانات مٹا دیے اور ہم پچھواڑے کی دیوار پھانڈ کر باہر آ گئے کسی نے بھی ہمیں مندر میں جاتے یا مندر سے نکلتے نہیں دیکھا تھا اور میرے اندر کا آدمی کہہ رہا تھا سمجھو سوامی کی لاش کبھی نہ مل سکے گی اور کنوئیں کی گہری تھاہ میں دفن رہے گی کیونکہ اب اس میں جاکھن نہیں ڈالا جائے گا کنواں دوبارہ پر کر دیا جائے گا جس طرح ایک بار پہلے کر دیا گیا تھا۔

اس نیاؤ کے بعد جو میرا نہیں بلکہ میرے بھگوان کا نیاؤ تھا، میں چار بجے ونود پاپا کی کوٹھی پہنچا تو وہاں ایک کہرام مچا رہا تھا نوکر نے بتایا۔

”ونود جی کی بیٹی نے آج دو بجے زہر کھا کر جیوتھیا کر لی ہے؟“

یہ خبر سن کر میں کہہ سکتے ہیں آگیا، ذہن میں ایک ساتھ کئی بجلیوں کا کڑا کا ہوا، دل کو زبردست دھچکا لگا اگر کریم مجھے جلدی سے سنبھال نہ لیتا تو دروازے میں گر گیا ہوتا۔ ونود پاپا روتا چلاتا میری طرف لپکا اور سمجھا شاید انیلا مورتی کی اچانک موت کا سن کر مجھے ہارٹ اٹیک ہوا ہے اس کا اپنا حال برا تھا کیونکہ انیلا سے بے پناہ پیار کرتا تھا، پھر بھی مجھے سہارا دے کر اس کمرے میں لایا جہاں مورتی کی لاش پڑی تھی میں نے اس کے درشن کیے، مرتے سے بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اسے دیکھ کر کلیجا کٹ گیا، میرے سینے کی تعبیر مجھے روشنی دے کر خود موت کے اندھیروں میں گم ہو گئی تھی، کریم کی آنکھوں سے بھی ٹھم ٹھم آنسو گرنے لگے۔ ادھر کانن دیوی کو غش پر غش آ رہے تھے اور دو تین عورتیں اسے سنبھال رہی تھیں۔

ونود پاپا نے روتے روتے جیب سے ایک چٹھی نکالی اور میری طرف بڑھائی۔

”اسے تم بھی پڑھ لو کیشپ!“

وہ انیلا مورتی کی آخری چٹھی آخری تحریر تھی۔ لکھا تھا۔

”ڈیر پاپا!“

شہسوامی نے مجھے ایسا دھبہ لگا دیا جو صرف موت کے امرت سے دھل سکتا ہے، میں نے ایک بازی ہار دی مگر ایک بازی جیت رہی ہوں، کیشپ جی آج دوپہر کی ٹرین سے چلے گئے ہوں گے پاپا! اگر وہ پھر بھی آئیں تم سے ملیں اور میرا پوچھیں تو ان سے کہنا مجھے شام کر دیں میں ان کے لائق نہ تھی مگر دوسرے جنم میں ان سے ضرور ملوں گی۔ پاپا! تم بھی مجھے شام کر دینا، تمہاری پیاری بیٹی۔“

(انیلا مورتی)

اس چٹھی کو پڑھ کر میری جو حالت ہوئی بیان نہیں کر سکتا، میرا من رو رہا تھا، آنکھیں رو رہی تھیں، میں اس کی پوچھا کرنا چاہتا تھا مگر مورتی روٹھ گئی تھی، میں تورا کر کرسی پر گرا تو ونود پاپا گلوگیر آواز میں کہنے لگے۔

”میں نے ڈی آئی جی کو بلایا ہے، شہسوامی کا کیس پولیس میں دے رہا ہوں، اس پاپی مہنت کو جیتا جی نہیں چھوڑوں گا جس نے مجھ سے میری بیٹی چھین لی۔“

پھر ونود پاپا دھاڑیں مار مار کے رونے لگا، تھوڑی دیر میں ڈی آئی جی ایک پولیس انسپکٹر ایک سب انسپکٹر اور چند سپاہیوں کے ساتھ آ گیا۔ شہسوامی کے خلاف رپورٹ لکھ لی گئی اور پولیس اس کی گرفتاری کے لئے درگاہ مندر پہنچی مگر پولیس رپورٹ کے مطابق وہ روپوش ہو چکا یا فرار ہو گیا تھا۔ ڈی آئی جی نے حکم دیا۔

”وہ چھپ گیا ہے تو ڈھونڈ نکالو، بھاگ گیا ہے تو پکڑ کے لاؤ۔“ پولیس ان ٹھکانوں پر چھاپے مارنے لگی، جہاں شہسوامی کے چھپنے کا امکان تھا مگر اس کے خلاف جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا اور وہ درگاہ مندر کے پچھواڑے کنوئیں کی گہری تھاہ میں کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند سو رہا تھا۔

ڈاکٹری معائنے کے بعد انیلا مورتی کی ارتھی اٹھی میں نے اسے کاندھا دیا، میرے ساتھی کریا کرم میں شریک ہوئے اور رات کے آٹھ بجے انیلا مورتی کی ارتھی جلا دی گئی، پٹنہ میں میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ مندروں اور تیرتھوں کے اس شہر میں سب کچھ وہی تھا، وہی بازار تھے، وہی رونق تھی، وہی بہتی گزرتھی مگر انیلا مورتی نہیں تھی، میں نے اس شہر میں ایک مورتی پائی، ایک مورتی کھودی اور اسی رات اپنے ساتھیوں سمیت 12 بجے کی ٹرین سے آسام کی طرف روانہ ہو گیا۔

○○○

(38)

انکشاف

پٹنہ سے روانگی اس طرح ایک ایسی ہوئی تھی جیسے میں سب کچھ ہار کے جا رہا ہوں حالانکہ انیلا مورتی نے خود کو ہار کر مجھے دے دی تھی اور اب میں بھاگتی ٹرین کے اندر بیٹھا سوچ رہا تھا کیا قدرت کے اس حسین شاہکار کا جس نے انیلا مورتی کے روپ میں جنم لیا، اس بھرے پرے سنسار میں صرف یہی رول تھا کہ وہ چند دن کے لیے میرے جیون میں آئے، میرے سپنے کی تعبیر بنے اور میرے لیے قربان ہو جائے۔

پہلے میں نے سوچا تھا، وہ ان ناریوں میں سے ہے جو صرف پریم کرنے کے لئے جنم لیتی اور مسکراہٹ کے منتر پھونکتی ہیں، اب یہ انکشاف ہوا تھا کہ اس میں مسکرانے کی انوکھی اور جادوگر ادا کے ساتھ اپنے پریمی کے لیے بلیدان دینے اور اس کے لئے اپنے آپ پر کھیل جانے کا گن بھی تھا، اگر وہ شہسوامی کا لگایا ہوا مول نہ چکاتی تو شاید میں بھگوان کی مورتی حاصل نہ کر سکتا۔ ”اڈوں“ سے بلائے گئے غنڈے مجھ پر حملہ کرتے شاید وہی مارے بھی جاتے مگر دنگ فساد ہوتا اور اس ہنگامے میں مورتی چھن جاتی یا ضائع کر دی جاتی یا غلط ہاتھوں میں پڑ جاتی۔ انیلا مورتی نے یہ سب کچھ سوچا ہوگا، معاملے کی سنگین صورت دیکھی ہوگی، تبھی اس نے خود کو گرا دیا، سوامی کی مانگ پوری کر دی کہ میں مورتی لے کر بحفاظت نکل جاؤں اور یہ سب کچھ صرف وہی ناری کر سکتی ہے جو اپنے آپ پر کھیلنا قربان ہونا جانتی ہو تو اتنی مہمان اور اتنی وفا شعار تھی انیلا مورتی۔

میں نے محسوس کیا، وہ چلتی ٹرین میں بھی میرے ساتھ ہے اور کہہ رہی ہے۔

”میں تمہاری قسمت ہوں، تمہارے ساتھ سفر کروں گی، تمہارے ساتھ رہوں گی۔“

میں تو انیلا مورتی کو پٹنہ چھوڑ آیا، شمشان میں جلا آیا تھا مگر نہیں اسے دل میں بٹھا کر لے آیا تھا اور اب میں جدھر بھی جاؤں گا، جہاں بھی جاؤں گا وہ میرے ساتھ رہے گی، وفا کی خوشبو بن کر۔ یہ کیسا عجیب خیال تھا اور اسی محویت میں اپنی نشست پر لڑھک گیا کیونکہ بہت تھک گیا تھا، اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا، وشال رائے نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور کہا۔

”کیشپ بابو! اپنے کو پتہ ہے، تم بہت دکھی ہو، میرے کو بھی انیلا مورتی کا بڑا دکھ ہے مگر یہ تو بھگوان کی لیلیا ہے، کبھی دوستاروں کے راس ملتے ہیں، کبھی نہیں ملتے۔“

”ہاں وشال جی! انیلا مورتی کا راس مجھ سے نہیں ملتا تھا، مگر اس نے لکھا ہے کہ اگلے جنم میں مجھے ضرور ملے گی۔“

”اگلا جنم کس نے دیکھا ہے کیشپ بابو۔“

اور میں یک لخت چونک اٹھا کہ کیسی باتیں کر رہا ہوں کیونکہ میں تو پنر جنم کو مانتا ہی نہیں اور جو کچھ ہوتا تھا اسی جنم میں ہو چکا ہے، وشال رائے کہنے لگا۔

”تم نے بولا تھا۔ مورتی مل گئی تو پروہت گنجال بھی مل جائے گا۔“

”وشال جی، یہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو آکاش کی کتاب پر پہلے سے لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کتاب پر پروہت گنجال کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ میں نہیں جانتا، مگر میرا اس کا آمتنا سا منہ ہوگا ضرور۔“

اس کے ساتھ ہی ایک دھچکا لگنے سے پھر گرتے گرتے بچا۔ اس بار وشال رائے بھی بمشکل سنبھلا کیونکہ گاڑی اسٹیشن پر رکی تھی معلوم ہوا ہم بھاگل پور پہنچ گئے ہیں، ٹرین وہاں سے چلی تو اب مجھے پروہت گنجال کا خیال پریشان کر رہا تھا کیونکہ اب وہی تو رہ گیا تھا جس کا مجھے نیا کرنا تھا۔

مگر گنجال تھا کہاں؟ وہ ساؤ گاری سے بھاگا اور بدھ گیا میں بھی نہیں ملا۔ بڑھا سا گر ساؤ جی اسے ساؤ گاری میں واپس لانا چاہتا تھا مگر کیوں؟ اور اب ایک بار پھر ساؤ گاری کے اسرار میری سوچوں کا مرکز بن گئے۔

ساتھا گیا میں، پٹنہ میں پاٹلی پتر کی پرانی پالی بھاشا جاننے والے کچھ بودھ گیانی رہتے ہیں اور سوچا تھا، مورتی مل گئی تو سارگلیان کی تحریر کسی سے پڑھو اوں گا جو مقدس مورتی کی کلید اسرار تھی کیونکہ بڑھے سا گر ساؤ نے کہا تھا اگر مورتی کھوجنے سے پہلے ہی اس کی تحریر کا بھید جان گیا تو اس کی طرح سروپ جی کی طرح خود بھی دکھوں کا شکار ہو جاؤں گا، اسی ڈر سے اب تک سارگلیان کی تحریر نہیں پڑھوائی مگر مورتی پالینے کے بعد پٹنہ میں ٹھہرنے کا، انیلا مورتی نے تاکید کی تھی کہ فوراً چلا جلاؤں اور اس کے دیہانت کے بعد پٹنہ میں رہ بھی گیا تھا میرے ہاتھ کی چوٹھی رکھنا بنتے بنتے بگڑ گئی تھی کیونکہ قدرت جو بات نہیں چاہتی وہ نہیں ہو پاتی اور اس طرح میں سارگلیان کی تحریر پڑھوائے بغیر اس شہر کو چھوڑ آیا تھا۔

رونگیا سے ہم نے تیز پور جانے والی گاڑی بدلی، یہ میٹر گج کی لائن ہے اور بتاتا چلوں کہ بنگال اور آسام میں زیادہ تر میٹر گج کی ریلوے لائنیں ہیں براڈ گج کی لائن کم ہے اور میٹر گج پر میرے خیالات کی رفتار بھی کچھ سست پڑ گئی تھی۔

دوسرے دن ہم بائی پارہ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے اور اسٹیشن سے نکلتے ہی میرے قدم آپ سے آپ ساؤ پر یوار کی پرانی حویلی کی طرف اٹھنے لگے حالانکہ میں سندرمی کو ساؤ گاری میں چھوڑ آیا اور وہ پیٹ سے بھی اس لیے اب دادا اس کو وہاں سے نکلتے کی آگیا نہیں دے سکتا تھا وہ خود اس کا بڑا ادھیان رکھتا اور تارا سے اس کے گربھ کی دیکھ بھال کرتا تھا، سروپ جی بھی یہی چاہتے

تھے کہ سندرمی اپنے پہلے بچے کو ساؤ گاری میں جنم دے، اس لیے وہ وہیں دادا اور تارا کی خاص نگرانی میں ہوگی میں حویلی کی طرف کیوں چلا جا رہا تھا اور یہ جانتے ہوئے کہ سندرمی وہاں نہیں ملے گی، میرے پیر اسی جانب کو کیوں اٹھ رہے تھے؟ وشال رائے حیران تھا، کہنے لگا۔ ”کیشپ بابو! ادھر کا ہے کو جاتے ہو، وہاں سندرمی تمہارے کو نہیں ملے گی۔“

”وشال جی! یہ میں بھی نہیں جانتا کہ ادھر کیوں چل پڑا ہوں، مگر کچھ دیر حویلی میں سناں گے، بھوجن کریں گے اور سوچیں گے اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”اپنے کو تو صرف گنجال کی چنتا ہے۔“

”اسی کے بارے میں سوچیں گے، کوئی پروگرام بنائیں گے۔“

ہم حویلی کے پھانک پر پہنچے تو آسام کے بوڑھے قبائلی چوکیدار نے بڑھ کر سواگت کیا اور میرے ہاتھ سے اپنی پکڑنے لگا جسے میں اب میں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتا تھا کیونکہ مقدس مورتی اسی میں بندھی، میں نے پوچھا۔

”ساؤ گاری سے تو کوئی نہیں آیا؟“

”نہیں مالک!“ چوکیدار نے جواب دیا۔ کل مہنت جی آئے تھے پروہ ساؤ گاری سے نہیں تیز پور سے آئے تھے۔“

میں حیران ہوا ”کون مہنت جی؟“

”ساؤ گاری کے مہنت گنجال“

اور چوکیدار کی زبان سے گنجال کا نام سن کر ہم سارے ایک دم چونک اٹھے۔

”گنجال کیا لینے آیا تھا؟“

”میں نہیں جانتا، کل شام کی گاڑی سے آئے رات حویلی میں رہے اور آج چلے گئے۔“

”کدھر؟“ میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔

”یہ بھی نہیں جانتا۔“

”اسے حویلی سے نکلے کتنی دیر ہوئی؟“

”بس یہی کوئی آدھ گھنٹہ۔“

یہ سنتے ہی میں فوراً پلٹا اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

”اسٹیشن سے تو ہم آ رہے ہیں وہ ضرور لاری اڈے گیا ہوگا۔“

گنجال کے نکلنے کی خبر سن کر حویلی میں رکنے اور ٹھہرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ہم جس حالت میں آئے تھے اسی حالت میں مڑے چوکیدار حیران سا بولا۔

”کیا بھوجن نہیں کرو گے مالک۔“

”پھر بھی آئیں گے تو بھوجن بھی کریں گے۔“

چوکیدار کو حیران و ششدر چھوڑ کر ہم لاری اڈے کی طرف ہو لیے اور بھاگ بھاگ وہاں پہنچے تو یہ سن کر سر پکڑ لیا کہ رپا کو جانے والی ایک لاری صرف پانچ منٹ پہلے نکل گئی ہے پروہت گنجال اڈے پر نہیں تھا۔ وہ یقیناً اسی لاری سے رپا چلا گیا تھا اور اگر رپا گیا ہے تو اس کی اگلی منزل ساؤ گاری ہوگی۔ سورج ڈوبنے میں اڑھائی گھنٹے باقی تھے وہ رات رپا کی بودھ سرائے میں گزارے گا اور دوسرے دن ساؤ گاری جائے گا مگر یہ دشواری نہیں تھا کہ رپا سے ضرور ساؤ گاری ہی جائے گا ہو سکتا ہے اس نے ٹھکانہ بدل دیا ہو اور کیا معلوم بودھ سرائے میں ٹھہرے یا نہ ٹھہرے۔ یہ سوچتے ہی میں پریشان ہو گیا اور ایک ڈرائیور سے پوچھا۔ ”دوسری لاری کب جائے گی رپا؟“

”اب کوئی لاری نہیں جائے گی۔“

”کیوں نہیں جائے گی؟“

”راستے میں رات ہو جائے گی ہم رات کو پہاڑی سفر نہیں کرتے۔“

یہ ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی تھی گویا گنجال ایک بار پھر ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا میں نے کہا ”ابھی تو سورج ڈوبنے میں اڑھائی گھنٹے پڑے ہیں اگر کوئی پوری لاری کا بھاڑا چکا دے تو بھی نہیں جاؤ گے؟“

اس نے شوق سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا پوری لاری کا بھاڑا چکا دو گے بابو!“

”کیوں نہیں چکاؤں گا، بولو کیا بھاڑا ہے سالم لاری کا؟“

وہ ایک کیبن میں گیا منیجر سے بات کی پھر مجھے اندر بلایا، منیجر نے بھاڑا بتایا اور میں نے اسی وقت رقم چکا دی۔ پانچ سات منٹ بعد ہم لاری میں بیٹھے رپا کی طرف جا رہے تھے، ہماری لاری اور اس لاری میں جس میں گنجال سوار ہوا زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا اور ایک بار پھر ویسی صورت بن گئی تھی جیسی کوہیما سے امپھال کی طرف شکر کا پیچھا کرتے بنی تھی، میری آپ بیتی پڑھنے والوں کو یاد ہو گا میں نے کایا پنتھا کے ساتھ کوہیما سے شکر کا پیچھا کیا اور ڈرائیور کو کچھ روپے دیئے تھے کہ وہ لاری تیز چلائے اس بار بھی میں نے چاندی کے دس روپے نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس نے حیرانی سے میری جانب دیکھا اور میں نے کہا۔

”اگر رپا پہنچنے تک اگلی لاری کو پکڑ لو تو یہ دس روپے تمہارے ہو گئے۔“

ڈرائیور نے روپے جیب میں ڈالے، رفتار بڑھادی اور شام کے جھٹپٹے میں رپا پہنچا دیا جب اگلی لاری صرف دو تین منٹ پہلے وہاں پہنچی تھی ہم نے لاری سے اترنے میں ذرا احتیاط کی کیونکہ پہلی لاری کے مسافر ابھی ادھر ادھر بکھر رہے تھے ہماری خوش قسمتی کہ گنجال بھی نظر پڑا جو بڑی تیزی سے پور بی سمت ہولیا، یہ راستہ بودھ سرائے کو نہیں جاتا تھا اس کی منزل کوئی اور ہی تھی اور یہ اچھا ہوا تھا کہ ہم سالم لاری کے لئے اس کے پیچھے بھاگے تھے، ورنہ سانپ کی طرح گنجال کا بھی کھوج نہ

ملتا۔ وصال رائے نے لاری ہی میں اپنی بندوق نکال لی تھی وہ گنجال کے پیچھے چلا تو میں نے روکنے کی کوشش کی کیونکہ رپا بہر حال شمال مشرقی سرحدی ایجنسی کا شہر تھا اور یہاں کوئی خلاف قانون حرکت ہم سب کے لیے پریشانی اور خطرے کا باعث بن سکتی تھی مگر وہ نہیں رکا اور کالی ناتھ کو لے کر نکل گیا، میں اٹیچی کیس سمیت اس کے پیچھے لپکا کریم میرے قدم بہ قدم آیا، کایا پنتھا اور اس کا بری کسان چان ہمارے پیچھے پیچھے تھے، یہ تعاقب کوئی آٹھ دس منٹ جاری رہا، گنجال ایک مڑے مڑے پہاڑی راستے ایک عام آبادی کو چھوڑ کر آگے بڑھ رہا تھا، وصال رائے اور کالی ناتھ سے اس کا فاصلہ ڈیڑھ دو سو قدم سے زیادہ نہیں تھا جسے وصال رائے تیز تیز قدموں سے کم کرتا جا رہا تھا جونہی وہ شام کے پہاڑی اندھیرے میں ایک گھماؤ پر پہنچا وصال نے تقریباً بھاگتے ہوئے ایک جگہ شست باندھی اور صرف ساٹھ ستر قدم کے فاصلے سے فار کرنا چاہا مگر گنجال نے بھاگتے قدموں کی آواز سن لی تھی۔ اس نے رک کر، پلٹ کر دیکھا تو آنکھیں کسی بلی کی طرح چمکنے لگیں پھر ہاتھ لہرا کر کھڑا ہو گیا اور نہ جانے کیا کہا کیونکہ دوری کی وجہ سے میں اس کی آواز نہ سن سکا مگر یہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے انہی پیروں پر رک گیا کہ گنجال کے مخصوص اشارے کے ساتھ ہی بندوق وصال کے ہاتھ سے اور کلہاڑی کالی ناتھ کی گرفت سے چھوٹ کر گری، کسی پر اسرار جھٹکے سے وصال گھٹنوں کے بل نیچے آ رہا اور کالی ناتھ ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا میں اور کریم بھاگے اس اثناء میں گنجال گھماؤ کاٹ کر غائب ہو گیا تھا۔

میں نے وصال رائے کو اور کریم نے ڈھلان اتر کر کالی ناتھ کو سنبھالا، اسے کافی چوٹیں آ گئیں تھیں مگر وصال کا صرف سر چکرایا تھا، بندوق ہاتھ سے چھوٹی تھی، سر کو جھٹک کے بولا۔

”یہ میرے کو کیا ہو گیا کیشپ بابو! اپنا ہاتھ ہی نہیں چلنا۔“

”وصال جی! میں نے تمہیں روکا تھا کہ گنجال کے پیچھے بھاگو نہیں۔“

”میں تو اس کی ٹانگ پر گولی مارنے والا تھا کہ وہ بھاگے نہیں۔ مگر میرے کو کیا معلوم تھا پلٹ کے منتر پھونک دے گا۔“ شام کے اندھیرے میں ساٹھ ستر قدم کے فاصلے سے گنجال نے اپنی پر اسرار شکلی کا جو مظاہرہ کیا، وہ بلاشبہ بڑا حیرت انگیز تھا۔ اور اب یہ بات بالکل کھل گئی تھی کہ کوئی عام آدمی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ مسمریزم اور پناٹزم کا ماسٹر تھا جس کی طاقت اس نے کبھی میں لگا تار پسپا کر کے بہت بڑھالی تھی اسی کو دھرم کا یا اور گیان کی شکلی قرار دیتا تھا۔

اس اثناء میں کایا پنتھا اور چان بھی پہنچ گئے اور دونوں اس بات پر حیران و پریشان تھے کہ گنجال ایک بار پھر اپنا ”اندراجال“ بچھا کے نکل گیا۔ گنجال بے شک نکل گیا تھا مگر سانپ کا سراغ پا کر اسے چھوڑ دینا عقلمندی نہ تھی، مجھے چکرورتی چاچا کی وہ باتیں جو انہوں نے رنگامتی میں ایک رات میرے سپنے میں آ کر کی تھیں اور اپنے روحانی گورو صوفی عبد الجبار کی ہدایتیں یاد آئیں کہ آدمی کو اپنی ذات پر وشواس ہو جسے صوفیا کی زبان میں ”خود آگہی“ یعنی اپنی پہچان کہتے ہیں اور

میں بودھ سرائے کے منتظم کے علاوہ کسی اور کو جانتا ہی نہیں تھا اور بودھ سرائے بستی کے اتر میں تھی جب کہ ہم پورب کو جا رہے تھے اچانک اندھیرے میں ایک نام شرارے کی طرح ذہن پر لپکا۔ ”میگھازمیندار کے گھر۔“

شاستر دے سنا تھا کہ میگھازمیندار کا گھر جس کی سولہ برس کی کنواری بیٹی چندرا سے سروپ جی اپنے 140 سالہ اجل بدوش دادا کے ناتے کی بات کرنے آئے تھے، رُپا کے پورب ہی میں کہیں ہے، میگھا کا نام سنتے ہی اس نے اپنے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

”زمیندار کا گھر اس موڑ پر ہے، وہاں سے بائیں ہاتھ مڑو گے تو پہلا گھر انہی کا ہے۔“
یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے، کیا گنجال، ادھر میگھا کے پاس تو نہیں آیا؟

اب معاملہ کچھ اور دلچسپ ہو گیا، اور اندھیرے میں ایک کرن نظر آئی تھی، میں کریم کو لے کر موڑ کی طرف بڑھا اور بائیں ہاتھ گھوم کر پہلے پھانک پر رکھا، بونے شاستر دے کے بیان کیے ہوئے نقشے کے مطابق یہ گھر میگھازمیندار ہی کا تھا، پھانک بند تھا، صحن کے آگے بیٹھک میں روشنی ہو رہی تھی، میں نے بھگوان کو یاد کر کے اور اپنی قوت ارادی پر پورے دوشواں کے ساتھ پھانک پر دستک دی، تھوڑی دیر کے بعد بیٹھک کا دروازہ کھلنے اور صحن میں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی پھر پھانک کھلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پروہت گنجال ہی سامنے کھڑا ہے وہ مجھے دیکھ کر بری طرح چونکا اور حیران سا بولا۔ ”کیٹھپ جی! میرا یہ ٹھکانہ بھی ڈھونڈ لیا آپ نے کہیں مجھے جین بھی لینے دیں گے یا نہیں؟ میں نے اپنے اندر کی پوری شکتی کے ساتھ جواب دیا۔

”پروہت گنجال! میں نے ایک دن کہا تھا تم زمین کے آخری کنارے تک بھاگو گے میں زمین کے آخری کنارے تک تمہارا پیچھا کروں گا یہ رپا زمین کا آخری کنارہ تو نہیں مگر آسام کی دھرتی کا آخری کنارہ ضرور ہے کیونکہ یہاں ایسٹ ناردرن برٹش ایجنسی کی حد ختم ہو جاتی ہے آگے ننگے پہاڑوں کی دنیا میں قانون کی حکمرانی نہیں۔“

”آپ نے ٹھیک کہا، ان پہاڑوں سے آگے انگریز کا قانون نہیں چلتا کسی اور کا قانون چلتا ہے۔“ ساتھ ہی اس نے اپنی آنکھوں کی طاقت سے جواہر میرے میں چراغ دشت کی طرح چمکنے لگی تھیں، گھور کے دیکھائیوں لگا کہ ان آنکھوں کی پراسرار شکتی سے مجھے پسپا کر دینا چاہتا ہے مگر دو تین منٹ کے اندر ہی جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹا اور خود پسپا ہو گیا چہرے پر مردنی، چھاگئی ہونٹ تھر تھرائے۔ ”بڑے شکتی مان ہیں آپ۔“
”یہی شکتی تمہارا پیچھا کر رہی ہے۔“

اس کا برتاؤ یک لخت بدل گیا اور اپنائیت کے لہجے میں بولا۔ ”آپ کا پیچھا کرنا کوئی اور بات ہے یہ تو گیان سے گیان کا ٹکراؤ ہو گا، میں آپ کا سواگت کروں گا، آپ میری بات سنیں گے مگر یہ

قوت ارادی پر بھروسہ ہو تو کوئی سفلی طاقت اسے مغلوب نہیں کر سکتی۔ اسی قوت ارادی کے سہارے میں نے خود گنجال کے پیچھے جانے کی ٹھان لی، اپنے اٹیچی کیس سے بھگوان کی مورتی نکال کر ایک تھیلے میں ڈالی اور تھیلا کندھے پر لٹکا لیا کیونکہ اس مقدس اور نایاب مورتی کی حفاظت بھی میں ہی کر سکتا تھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”تم لوگ بودھ سرائے میں جاؤ اور وہاں میری واپسی کا انتظار کرو، میں خود گنجال کو دیکھوں گا۔“

وہ سب میرے فیصلے پر ششدر رہ گئے مگر اس کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ خود سانپ کے بل میں اتروں، گنجال پر وار کرنے کا دوسرا تجربہ بڑا مہنگا پڑا اور اب وشال رائے بھی اس کی پراسرار طاقت سے خوفزدہ معلوم ہوتا تھا، انہیں سامان سمیت بودھ سرائے کی طرف بھیج کر میں نے صرف کریم کو ساتھ لیا اور اندھیرے میں اس پہاڑی گھاؤ پر ہولیا جدھر گنجال غائب ہوا تھا۔

رپا میں اس نے کوئی نیا ٹھکانہ ڈھونڈا تھا، یہ بھی ممکن تھا کہ رپا میں کہیں ر کے یا ٹھہرے ہی نہیں اور کسی قریبی بستی یا ر بڑ کے جنگلوں میں غائب ہو جائے۔ اب تو ہمارے تعاقب کا ”خوف“ بھی دامن گیر ہو گا مگر اس کے لیے ”خوف“ کا لفظ غالباً درست نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ میرے ساتھیوں کی کلہاڑی اور بند قوتوں سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھا، البتہ اس کی حالت ایک ایسے سانپ کی سی تھی جو اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر کوئی نیا بل ڈھونڈ رہا ہو۔ میں کریم کے ساتھ اندھیرے میں ہولے ہولے اس ڈھلان کی طرف اترنے لگا، جہاں چھتری دار درختوں کے درمیان پہاڑی طرز کے مخصوص مکانات نظر آ رہے تھے، اندھیرا بڑھ گیا تھا اور ان مکانات کے اندر ٹھماتی ایک ادھر روشنی ہی ہماری رہنمائی کر رہی تھی شبی راستے پر چلنا ذرا مشکل ہوتا ہے پھر اندھیرا، ہم دونوں سنبھل سنبھل کے چلتے رہے، یہ راستہ جہاں تک جاتا تھا ہمیں اسی پر چلنا اور یہ دیکھنا تھا کہ کہاں ختم ہوتا یا کدھر کو نکلتا ہے، گنجال اسی راستے پر گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے رپا سے کسی ڈیرے یا جنگل کا رخ کیا ہو اور یہ راستہ ہمیں بھی اسی طرف لے جائے، اچانک اندھیرے میں ایک آدمی لائیں لیے اوپر آتا دکھائی دیا اسے اسے روک کر پوچھا۔

”یہ راستہ کدھر کو جاتا ہے؟“

وہ حیران سا ہوا ”تم کدھر جاؤ گے؟“

اسے کیا بتاتا ہمیں کدھر جانا ہے کوئی منزل، کوئی ٹھکانہ تو تھا نہیں، لائیں کی روشنی میں ہمارے چہرے دیکھ کر خود ہی کہنے لگا۔

”پردیسی لگتے ہو۔“

”ہاں باہر سے آئے ہیں۔“

”کس کے گھر؟“

یہ دوسرا سوال زیادہ پریشان کر دینے والا تھا، میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ کس کا نام بتاؤں، رپا

”بھگوان کی مورتی کا بھید ہے نا؟“

”ہاں یہ لکھت اسی جیون بھید کی کنجی ہے۔“

”تو یہ کنجی پکڑو اور مورتی کے بھید کا تالا کھول دو، میں یہ بھید جاننا چاہتا ہوں۔“

گنجال کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”میں سمجھتا ہوں، سندرمی کے ناتے سروپ جی کے بعد آپ ہی ساؤ گاری کے وارث ہوں گے مگر بنتی کرتا ہوں مورتی کا بھید جاننے کی ضد نہ کریں کیونکہ یہ بھید آپ کے سامنے صرف موت کے بستر پر کھولا جائے گا جب سروپ جی پران تیاگ رہے ہوں گے۔“

گنجال ساؤ پر یوار کے بھیدوں میں شریک تھا، اس نے وہی کہا جو سروپ جی کہہ چکے تھے پھر ایک پل ٹھہر کے وہ بات کہی جو ساگر ساؤ جی نے کہی تھی۔

”مورتی کھوجے بغیر یہ بھید جاننا اچھا نہیں ہوگا۔“

میں نے سارگلین کی چرمی تحریر اس کی طرف اچھال دی۔ ”پروہت گنجال! میرے لیے یہ لکھت پڑھو کیونکہ میں نے بھگوان کی مورتی کھوج لی ہے۔“

یہ سنتے ہی گنجال کرسی سے اچھلا، نہ صرف اچھلا بلکہ کھڑا ہو گیا اور حیرت پاش نظروں سے مجھے دیکھنے لگا، مورتی کے مل جانے کی خبر اس کے لیے اچنبھے سے کم نہ تھی میں نے تھیلے سے ساؤ پر یوار کی وہ تقدیر نکال کر دکھائی تو گنجال نے مقدس مورتی کی خاص علامات کو چشم تحیر سے دیکھا، پھر ایک دم میرے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

میں حیران تھا وہی گنجال جو چند گھنٹیاں پہلے اپنی آنکھوں کی پراسرار شکتی سے مجھے پسپا کرنا چاہتا تھا، مورتی دیکھتے ہی کس طرح میرے چرنوں میں گر پڑا ہے، وہ پل دوپل اسی طرح پڑا رہا، پھر اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہنے لگا۔ ”کیشپ جی اپنی تنسیا کے دنوں میں صرف اتنا سمجھ پایا تھا کہ اس مورتی کو جسے ساؤ پر یوار کے لوگ پیڑھی در پیڑھی ڈھونڈتے ہوئے مر گئے صرف وہی مہاپرش ڈھونڈ سکے گا جو دیوتا سمان ہوگا، بھگوان کا روپ ہوگا، میں نے آپ کا ایک روپ ساؤ گاری میں دیکھا جب سروپ جی انت کال سے لوٹ آئے۔ دوسرا روپ اس سے دیکھا، جب آپ میری گکھا میں پہنچ گئے اور تیسرا روپ آج دیکھ رہا ہوں، جب آپ بھگوان کی مورتی ڈھونڈ لائے ہیں، آپ سچ مچ بھگوان کا روپ ہیں۔ دیوتا ہیں اور میں آپ کی شرن (پناہ) چاہتا ہوں۔“

اس کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا۔ ”گر میرا تمہارا جھگڑا ہے اور جب تک اس جھگڑا کا نیاؤ نہیں ہوتا، میں تمہیں اپنی شرن میں نہیں لے سکتا۔“

وہ گڑ گڑایا۔ ”اب میرا آپ کا جھگڑا نہیں پر بھوا!“

”مجھے پر بھو نہیں وہی کیشپ جی کہو جو پہلے کہتے تھے اور اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ، میں تم سے کچھ

بتا دوں آپ نے جن لوگوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”میں جانتا ہوں، وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔“

”پھر انہیں کیوں بیچ میں لے آئے جھگڑا تو میرا اور آپ کا ہے۔“

”تم ان کے دوشی ہو۔“

”اس بات کا نیاؤ نہیں ہو سکتا کہ کون کس کا دوشی ہے۔“

”پروہت گنجال! میں یہی نیاؤ کرنے نکلا ہوں اور ساؤ گاری اس سے تک تک نہیں لوٹوں گا جب تک یہ نیاؤ نہیں ہو جائے گا۔“

میری آواز کی چمک نے اسے کچھ اور پریشان کر دیا، گھبرا کے بولا۔ ”کیسے ہوگا۔“

”کیا یہ ساری باتیں یہاں کھڑے کھڑے پوچھو گے۔“ میں نے اس کی طرف ہاتھ لہرایا۔

”تمہی نے کہا ہے تم سواگت کرو گے میں تمہاری باتیں سنوں گا۔“

میں خود گنجال سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا، اس کے چہرے پر حیرت سی چھا گئی۔

”کیا آپ جانتے ہیں یہ کس کا گھر ہے؟“

”یہ میگھا زمیندار کا گھر ہے اور اسی پر یوار کی لڑکی سنوری.....“

یہ سن کر گنجال نے میری بات کاٹ دی۔ ”اگر آپ یہ سب کچھ جانتے ہیں تو میں آج آپ کا سواگت کرتا ہوں، اندر آئیے اور پھاٹک بند کر کے وہ ہمارے آگے آگے چلا، میں اس سے اور وہ مجھ سے خوفزدہ نہیں تھا۔“

بیٹھک میں بیٹھتے ہی اس نے بتایا کہ میگھا گھر میں نہیں ہے، آنے والا ہے جب پھاٹک پر دستک ہوئی تو یہی سمجھا میگھا آ گیا ہے جہی خود دروازہ کھولنے آیا مگر مجھے دیکھ کر دنگ رہ گیا، میں اس سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا۔

”پروہت گنجال! کیا تم پچھلے دنوں پٹنہ یا گیا نہیں گئے؟“

”تھوڑے دنوں کو جاؤں گا؟“

”پرانی پالی بھاشا پڑھ سکتے ہو؟“

وہ ٹکڑ ٹکڑ مجھے دیکھنے لگا۔ پڑھ سکتا ہوں، ساگر ساؤ جی نے سکھائی تھی پالی بھاشا۔“

میں نے مہاپرش سارگلین کی چرمی تحریر جو سونے کی ڈبیا سے برآمد ہوئی تھی اپنے بازو سے کھول کر اس کی طرف بڑھائی پھر سارگلین کی یہ لکھت بھی تمہیں پڑھو گے جس کو پانے کے لئے تم نے کایا پنتھا کو پانچ برس تمہے خانے کی کال کوٹھڑی میں بند رکھا۔“

وہ بھونچا سا رہ گیا، میرے ہاتھ سے چرمی تحریر بھی پکڑی جیسے اس سے ڈرتا ہو۔“

”کیشپ جی میں اس لکھت کو پڑھنے کے لیے نہیں جلا دینے کے لیے کھوج رہا تھا کیونکہ اس

میں جو بھید لکھا ہے وہ سنسار میں کسی کو نہیں جاننا چاہیے۔“

باتیں پوچھنا چاہتا ہوں مگر ہر بات کا جواب ٹھیک ہونا چاہیے۔

”ٹھیک ہوگا کیشپ جی!“ اور اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا، وہ میرے ہر حکم کی تعمیل کر رہا تھا جس پر کریم بھی حیران رہ گیا اور میں جان گیا کہ یہ سب مقدس مورتی کا اعجاز ہے جسے میں نے پھر تھیلے میں رکھ لیا اور پوچھا۔

”پروہت گنجال تم نے اس سے جھگڑا کیا تھا جب جل پنا مجھ سے پریم کرنے لگی تھی۔“

”اسی لیے تو جھگڑا کیا تھا کہ جل پنا کو پریم نہیں کرنا چاہیے وہ بھگوان کی نرتکی تھی اور ساؤ گاری کی ضرورت کے لیے اسے کنواری رہنا چاہیے تھا۔“

گنجال خود ہی اس موضوع پر آگیا جس پر میں اسے لانا چاہتا تھا، کنواری اور گرہن زدہ نرتکی کے چکر ہی نے مجھے اکثر پریشان رکھا اور اب اسی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ”صرف کنواری اور گرہن زدہ نرتکی ہی ساؤ گاری کی ضرورت کیوں تھی۔“

”یہ سب کچھ بڑھے کے لیے ہو رہا تھا کیشپ جی! جسے موت پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی تھی۔“

میں بری طرح چونکا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

گنجال نے بتایا۔ ”بڑھے نے پڑھا تھا اگر وہ کسی گرہن زات سے لے کر اس رات تک جب چاند پوری طرح گھٹ جائے اور وہ چاند کی اٹھائیسویں یا انیسویں رات ہوگی کسی گرہن زدہ نرتکی کے بستر پر جائے تو سوم دیوتا اسے لڑکی کے بستر سے چھین کر لے جائے گا اور وہ چاند گھٹنے کی رات طبعی موت مرے گا۔“

یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا جس نے مجھے پریشان کر دیا۔ ”کیا تم بھی اس بات پر وشواس رکھتے ہو۔“

”لکھی ہوئی بات ہے کیشپ جی۔“

”کہاں لکھی ہے یہ بات؟“

”ایک پریم گرنہ سے بہت پرانا جو آج بھی بڑھے کے کمرے میں رکھا ہے میں نے پڑھا ہے، آپ کو بھی دکھاؤں گا مگر وہ ایک ہندو گرنہ ہے۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ ”کئی ہنایان بودھ پرانے ہندو گرنہوں، شاستروں اور پورانوں کو مانتے ہیں، کئی نہیں مانتے یہ اپنے اپنے اعتقاد اور وشواس کی بات ہے مگر بڑھا پریم گرنہ پر پورا وشواس رکھتا ہے۔“

”کیا وہ گرنہ وشواس کے لائق ہے؟“

”کیوں نہیں؟“ گنجال کہنے لگا۔ ”پریم گرنہ کی بات دو پرانے گرنہوں سے لی گئی ہے مسیح سے 57 برس پہلے اجین کے بڑے راجہ وکر مادیٹہ کے بھائی بھرتی ہری نے تین شکلوں کا ایک گرنہ لکھا تھا۔ پہلا شرن کارشٹک“ جو مردناری کے پریم پر ہے۔ دوسرا ”نیتی شٹک“ جو ملنساری کے

بارے میں ہے۔ تیسرا ”ویراگ شٹک“ جس میں بھگتی اور یوگ کی رچنا ہے۔ ہر شٹک کے سو اشلوک ہیں، اگر ہر اشلوک کے پہلے پھر (حرف) کو الگ کر لیا جائے تو ایک عجیب لکھت بنتی ہے، بھرتی ہری کے چار سو برس بعد سدگل دیپ کے راجہ بدھ داس نے اپنے ویدک گرنہ ”سارتیہ سنگر“ میں نہ مرنے والے بڑھوں کے بارے میں ویدک ویدیا سے ہٹ کر جیو آتما چھوڑنے کا ایک اور گرنہ بھی لکھا ہے اور پریم گرنہ میں انہی دو گرنہوں سے نکال کر وہ بات لکھی ہے جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“

”یعنی بڑھا چاند گرہن کے بعد کی راتیں کسی گرہن زدہ کنواری نرتکی کے ساتھ بسر کرے تو چاند کی اٹھائیسویں یا انیسویں رات کو جب چاند نہیں نکلے گا آپ سے آپ مر جائے گا۔“

”ہاں یہی لکھا ہے۔“

میں ایک عجیب و غریب بات سن رہا تھا، ”مگر کنواری نرتکی ایک اجل بدوش بڑھے کے ساتھ یہ سمبندھ خواہ کچھ راتوں کا سہی کیسے مان سکتی ہے؟“

”بڑھے کا شریر تو مر چکا پر شریر کی بھوک نہیں مری۔“ گنجال نے ایک اور انکشاف کیا۔ ”پھر وہ کنواری بھی چاند کی اٹھائیسویں یا انیسویں رات کو آکاش پر پہنچ جائے گی، سوم دیوتا بڑھے کو پرلوک میں اندر دیوتا نرتکی کو اپنے سؤرگ میں لے جائے گا اور وہ اپسرا بن کے اس سؤرگ میں اندر کے ساتھ سدا اند منگل منائے گی۔ اس بات میں کسی بھی نرتکی کے لیے اتنا رچاؤ اور کھنچاؤ ہے کہ وہ گنتی کی کچھ راتوں کے بدلے اندر کی اپسرا بننا اور اس کے ساتھ سؤرگ میں سدا اند منگل منانا مان لے گی۔“

گنجال کی ہر بات حیران کر دینے والی تھی، میں نے پوچھا۔

”دھرتی کی کوئی لڑکی اندر دیوتا کی اپسرا کیسے بن سکتی ہے؟“

”بن سکتی ہے۔“ پروہت گنجال نے شاستروں اور پورانوں کا ایک نیاباب کھول دیا اور بولا۔ ”پریم لوچا اندر کی ایک سندرا اپسرا بھی جو رشی کنڈو کی تپسیا بھنگ کرنے آکاش سے دھرتی پر آئی۔ رشی کنڈو اس پر رتیجھ گیا اور وہ پیٹ سے ہوگی، جب رشی کو اصل بات کا پتہ چلا اسے نکال دیا۔ وہاں سے نکلتے سے پریم پوجا کے پیٹ سے کچھ بوندیں گریں جو اس نے درخت کے پتوں پر گرا دیں۔ ان بوندوں سے مارشانا کی اپسرا کا جنم ہوا پھر پورانوں میں ایک سندرا اپسرا رشی کی پریم کتھا بھی لکھی ہے جو دھرتی پر راجہ پرورد کی جو رشی اور انت کو اندر دیوتا نے اسے آکاش کے سؤرگ میں بلا لیا۔ اردشی اور پرورد کے پریم پر تو کوئی کالی داس نے ایک نائک بھی لکھا تھا اور اپسرا کے پیٹ سے پرورد کا ایک بچہ بھی ہوا، تو کیشپ جی، جب اندر دیوتا کی اپسرا نہیں دھرتی پر آ سکتی ہیں تو دھرتی کی کوئی سندر لڑکی اندر کے سؤرگ کی اپسرا کیوں نہیں بن سکتی؟“

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ میں نہ دیوتاؤں کو مانتا ہوں نہ ہندو

پورانوں اور شاستروں کی خلاف عقل کہانیوں کو درست سمجھتا ہوں مگر بڑھا سا گر ساؤ جی اور پروہت گنجال اور شاید سروپ جی بھی ان باتوں کو مانتے تھے۔ ہندوؤں کی طرح بہت سے ہنایان بلکہ کئی مہایان بودھ بھی دیوتاؤں اور اپسراؤں پر اعتقاد اور دشواس رکھتے ہیں اور میں کسی کے مذہبی اعتقاد یا دھارمک دشواس پر بحث نہیں کرتا یا دخل نہیں دینا چاہتا۔ سو ساؤ گاری میں گرہن زدہ کنواری نرتکیوں کا نائٹک اس لیے کھیلا جاتا تھا کہ بڑھا کسی طرح پران تیاگ دے، مجھے حیرت زدہ دیکھ کر گنجال کہنے لگا۔ ”اب تو بڑھے کو پران تیاگنے کے لیے کسی کنواری نرتکی کی ضرورت نہیں کیونکہ مورتی کو پالینے کے بعد وہ آپ ہی مر جائے گا۔“

یہ بات میں بڑھے سا گر ساؤ جی کی زبان سے بھی سن چکا تھا کہ اس کی موت مورتی میں بند ہے، مگر حیران تھا، مورتی مل جانے سے وہ مر کیسے جائے گا؟ یہی سوال میں نے گنجال سے کیا؟ وہ بولا ”کیشپ جی! اب میں آپ کو سارگلیان کی لکھت پڑھ کے سناؤں گا اور مورتی کا جیون بھید کھل جائے گا مگر سب سے بڑا بھید تو بڑھا آپ ہے۔“

میں مورتی کا بھید جاننے کے ساتھ ساؤ گاری کے گہرے اسرار سے بھی پردہ اٹھانا چاہتا تھا، پروہت گنجال رک رک کے پالی بھاشا پڑھنے اور ساتھ ساتھ اس کا ترجمہ بھی کرنے لگا جو کچھ اس نے پڑھا جو کچھ میں نے سنا وہ حیران کر دینے والا تھا، اسے اپنی زبان میں یہاں تحریر کرتا ہوں، یوں بھی سارگلیان کی لکھت۔

”میں سنگھ کا داس اور شاکیہ منی گوتم بدھ کا پریمی سارگلیان ان کی مورتی کے بارے میں ایک بھید کی بات بتاتا ہوں۔ اس مورتی کے اندر ایک جیون بھید بند ہے جو تھاگت نے ولی شالی کی امب پالی کے لیے چھوڑا تھا کیونکہ وہ اپنی عمر بڑھا کے اور دیر تک جی کر یہ دیکھنا چاہتی تھی، کیا پنڈت جو اسے ویشیا کہتے اور آپ دھرم ماتما بنتے ہیں، مرنے کے بعد کسی رشی منی کی جون پاتے ہیں یا اپنے برے کرموں کا پھل بھوگنے کے لیے پشو اور سانپ بچھو بن جاتے ہیں۔ آئندہ جیون بھید لے کر امب پالی کے باغ میں آیا مگر اس سے نہ مل سکا کیونکہ امب پالی کو سانپ نے ڈس لیا تھا، اس طرح وہ جیون بھید جوں کا توں مورتی میں بند رہ گیا، مرنے سے پہلے آئندہ مورتی سنگھ کے بڑے ارہت کے سپرد کر دی اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کے اندر بھگوان بدھ کے سر کی پوتر راکھ محفوظ ہے جو کوئی یہ دورانی راکھ نمک کے ساتھ کھائے گا معجزانہ طور پر جیے گا اور اس سے تک نہیں مر سکے گا جب تک یہی دورانی راکھ شہد کے ساتھ نہیں کھائے گا، مقدس راکھ دوسری بار کھا کر ہی جیون کی قید سے چھٹکارا پاسکے گا یہی اس کی راکھ کا اعجاز اور یہی جیون بھید ہے۔“

میں نے مہاراجہ (اشوک) سے کہہ مورتی مرگ داؤ کے بڑے مٹھ میں رکھوا دی ہے تاکہ اس کی کچھ بھال ہو سکے اور وہ کسی غلط ہاتھ میں نہ پڑ جائے اس راکھ میں قانون قدرت سے ہٹ کر ایک

انوکھی بات ہے جسے ایشور کے مہان اوتار شاکیہ منی بدھ کا روحانی چیتکار سمجھنا چاہیے، اس لیے کوئی آدمی اس کا غلط استعمال نہ کرے یہ پوتر اور معجزانہ راکھ کسی بڑے آدرش کے لیے کھائی جاسکتی ہے جو کوئی یہ راکھ استعمال کرے گا ایک غیر طبعی جیون پائے گا اگر اس غیر طبعی جیون میں وہ غیر طبعی مورت مر گیا یعنی اس نے جیو ہتھیا کر لی یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے مارا گیا اور کسی ہتھیار سے قتل کر دیا گیا تو سیدھا نرگ میں جائے گا اور سدا دکھ اور عذاب بھوگے گا۔

اس ہدایت اور اپدیش کے ساتھ بن کسی بڑے آدرش کے یہ پوتر راکھ استعمال نہ کی جائے اس جیون بھید کا انت کرتا ہوں۔ (سارگلیان۔ پالی پتر)

جوں جوں پروہت گنجال تحریر پڑھتا جاتا تھا جسم میں ایک عجیب سی سنسنیٹ دوڑتی جاتی تھی، بڑھے سا گر ساؤ جی کا غیر طبعی بڑھا یا ایک عجیب سی شکل میں ڈھل کر میرے خیالات میں تڑپنے لگا تھا اور میں اپنے تصور سے اس کی سس سس..... فف فف..... سن رہا تھا کہ مجھے میری موت لا دو اور وہ غیر طبعی موت اس لیے نہ مرنے چاہتا تھا کہ مقدس راکھ کھا کر غیر طبعی جیون گزار رہا تھا۔ اب مجھ پر پرانکشاف ہوا کہ بڑھا مرنا کیوں نہیں اور کس لیے جینے کا عذاب بھوگ رہا ہے۔

جب گنجال نے سارگلیان کی تحریر ختم کی تو ناگیاں مجھ پر اس سے بھی بڑا لرزہ خیز انکشاف ہوا کہ ساؤ پر یواری تین صدیوں سے نسل در نسل مورتی کو ڈھونڈ رہا ہے کیونکہ تین صدیاں پہلے اس خاندانی کے بانی گوچی ساؤ نے تبت کے بودھ لا مانا تھا بندہ سے جیون بھید کے ساتھ مورتی بھی حاصل کی تھی جسے وہ اس سے برہم پترندی میں کھو بیٹھا تھا جب سیلاب کے زور سے ناؤ الٹ گئی تھی اور سروپ جی نے بتایا تھا گوچی ساؤ جیون بھر گم شدہ مورتی کھوجتا رہا اور مرنے سے پہلے وصیت کر گیا کہ ساؤ پر یواری کی نجات اور مکتی اور نروان مورتی کھوج لینے میں ہے، اسے نسل در نسل تلاش کیا جائے اور ساؤ گاری کو آباد رکھا جائے لیکن گوچی ساؤ دراصل مرانہ تھا بلکہ تین صدیوں سے آج بھی سا گر ساؤ جی کے نام سے جی رہا اور غیر طبعی جیون کا عذاب بھگت رہا تھا۔

اس لرزہ خیز سنسنی خیز انکشاف کے ساتھ ہی میں مارے حیرت کے اچھل کر کھڑا ہو گیا کیونکہ یہی وہ انسان تھا جو اپنے جنم پروا دلا کرتا اور کہتا تھا، کاش! میں اپنی ماں کے گربھ میں مر گیا ہوتا یا میری ماں مانجھ ہوتی اور مجھے جنم نہ دیتی اور اپنی چھاتیوں کا دودھ نہ پلاتی تاکہ میں جیون کا یہ دردناک اور لعنتی عذاب بھوگنے کے لیے بڑا نہ ہوتا۔

اب میں تصور کی آنکھوں سے سا گر ساؤ جی کو شناخت کر رہا تھا کیونکہ وہی گوچی ساؤ تھا، جو دوسری بار مقدس راکھ کھائے بغیر مرنہ سکتا تھا اور مجھے مقدس مورتی کھوجنے کا کام اس لیے سونپا گیا تھا کہ میں گوچی ساؤ کو جیون کی قید سے چھڑا سکوں جو تین صدیوں سے جی رہا تھا جس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے، پوتے، پڑپوتے، نگر پوتے نسل در نسل مرتے رہے، ان کی ارتھیاں ساؤ گاری کے شمشان میں جلتی رہیں مگر گوچی ساؤ مرنہ سکا، اس کی ارتھی نہ چلی۔

یہ جیون کا کتنا ہولناک، کتنا لرزہ خیز عذاب تھا، کسی باپ کی کتنی بڑی سزا تھی کہ ساؤ پر یوار کی نسلیں اور پیڑھیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتی چلی گئیں مگر خود وہ جیون کا عذاب بھوگتا اور تڑپتا رہا اور گوچی ساؤ کا باپ بھی اتنا ہی بڑا تھا جتنی بڑی اسے سزا دی گئی تین صدیاں پہلے ایک مظلوم کنواری کنیا سنوری جس کے شریر پر چاند گرہن کا نشان تھا اس کی جنسی وحشت کا شکار ہوتے ہوتے مر گئی اور مرتے سے اس نے شراب دیا تھا کہ اس کی آتما گوچی ساؤ کا پیچھا کرتی رہے گی میں لرز سا گیا۔

میرے اٹھتے ہی پروہت گنجال بھی کھڑا ہو گیا میں اپنے جسم کے اندر ایک زلزلہ لیے آگے بڑھا، اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور اسے جھنجھوڑ کے پوچھا۔
”کیا بڈھا ہی گوچی ساؤ ہے؟“

مجھے اس سوال جواب مل چکا تھا پھر بھی میں گنجال کی زبان سے سننا چاہتا تھا اور اس نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ ”ہاں مگر ساؤ پر یوار کے ہر نئے وارث کو یہ بھید صرف موت کے بستر پر بتایا جاتا اور تاکید کی جاتی ہے کہ بڈھے کی دیکھ بھال کرے اور اسے جیون کے عذاب سے چھڑانے کے لیے مورتی کی تلاش جاری رکھے۔“

اب یہ معما بھی سمجھ میں آ گیا کہ مہذب دنیا سے کوسوں دور ایک پہاڑی ویرانے میں ساؤ گاری کی عمارت کو پشت در پشت آباد رکھنے میں کیا حکمت ہے۔ گوچی ساؤ کے غیر طبعی جیون کی دیکھ بھال ایک ویرانے ہی میں ہو سکتی تھی۔

پھر میں کرسی پر گر سا گیا، ساؤ گاری کے تمام اسرار مجھ پر کھل گئے اور اب وہ عجیب و غریب واقعات جو ساؤ پر یوار پر تین صدیوں تک عذاب بن کے ٹوتے رہے اور جنہوں نے گوچی ساؤ کو جیون کی سلاخوں میں جکڑ دیا تھا، نرگ کے کسی عفریت کی طرح میرے ذہن میں ناچنے لگے۔

مگر میں نے اپنے سر کو جھٹک کر ان کے دہشت ناک تصور سے چھٹکارا حاصل کیا اور کہا۔
”پروہت گنجال! ساؤ پر یوار کے دکھوں کا انت ہونے والا ہے اور پراسرار قدرت نے مجھے اسی لیے ساؤ گاری کی طرف دھکیل دیا تھا کہ میں اسے نروان عطا کروں، نکل میں ساؤ گاری کو مکتی دینے جا رہا ہوں اور تم میرے ساتھ چلو گے۔“

یہ کہہ کر میں اٹھا، گنجال اور کریم بھی اٹھے اور جب میں پھانک پر گنجال سے رخصت ہونے لگا، اس نے جھک کر میرے چرن چھو لیے اور میں نے کہا۔ ”سویرے بودھ سرائے پہنچ جانا اور اگر مناسب سمجھو تو میگھا کو سب کچھ بتا دینا، مناسب سمجھو تو نہ بتانا۔“

”کیٹپ جی! سویرے آپ مجھے بودھ سرائے کے پھانک پر دیکھیں گے۔“
میں کریم کے ساتھ رخصت ہوا تو پروہت گنجال دیر تک کھڑا ہمیں دیکھتا رہا، مجھے وشواس تھا کہ وہ سویرے ضرور آئے گا۔



دوسرے دن سورج نکلنے ہی میں باہر آیا تو پروہت گنجال بودھ سرائے کے پھانک پر موجود تھا مگر اس کے ساتھ اکاون باون برس کا ایک خوش پوش اور خوش شکل آسامی بھی دیکھا جس نے گنجال کے ساتھ ہی مجھے پر نام کیا۔ جان پہچان ہوئی تو اس سے مل کر حیرت انگیز خوشی ہوئی۔

وہ میگھا زمیندار تھا جو سب حالات سن چکا اور میرے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا، میں سمجھا مجھے ملنے آیا ہے کیونکہ رات میں اس کے آنے سے پہلے ہی لوٹ آیا تھا مگر پتہ چلا پروہت گنجال نے اسے بھی اپنے ساتھ ساؤ گاری چلنے پر راضی کر لیا ہے اور یہ بڑی مبارک بات تھی، دراصل تین صدیوں سے جینے والے گوچی ساؤ کو دیکھنے کی خواہش اسے رتنا گری کے ویرانے کی طرف کھینچ رہی تھی کہ آخر وہ کیسا آدمی ہو گا جسے سنوری کا شراب اس طرح لگا کہ تین سو برسوں سے جینے کا عذاب بھوگ رہا ہے، گنجال نے اسے بھی سفر پر تیار کر کے بڑی سمجھداری اور دانائی کا کام کیا تھا کیونکہ اب ساؤ خاندان اور میگھا پر یوار کی دشمنی بھائی چارے میں بدلنے کی گھڑی آ گئی تھی۔

بودھ سرائے کے منتظم نے میرے کہنے پر رات ہی گھوڑوں اور خچروں کا انتظام کر دیا تھا اور سا کس نہیں لے کر پہنچ گئے تھے۔ میگھا کے لیے فوری طور پر ایک اور گھوڑے کا بندوبست بھی ہو گیا۔ کاپا پتھا اور وشال رائے، جان، کالی ناتھ، کریم کے ہمراہ سامان اٹھائے باہر نکلے تو انہوں نے حیرت، خوف اور غصے کی ملی جلی نظروں سے پروہت گنجال کی طرف دیکھا مگر اس نے کسی پردھیان بھی نہ دیا، جیسے وہ کاٹھ کے پتلے تھے۔ تاش کی دکیاں تکیاں تھیں، میں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ سفر کے دوران وہ گنجال سے کوئی بات نہیں کریں گے، گنجال ان کا دوشی تھا اور یہ میں ہی جانتا تھا کہ اسے کس بات نے ہمارے ساتھ سفر پر مجبور کر دیا تھا۔

ہم سوار ہو کر رپا سے نکلے تو سفر کی رفتار تیز کر دی۔ گھوڑوں کے ساتھ صرف دو سائیں آئے اور وہ بھی خچروں پر تھے، اس لیے ساؤ گاری کا یہ سفر پہلے سفر کی نسبت سے بڑا تیز تھا، میگھا سفر میں مجھ سے گھل مل گیا ہم نے گیارہ بجے ہی پانی کی وہ لکیر پار کر لی جو رپا اور ساؤ گاری کے درمیان واقع تھی، دو پہر کا بھوجن آگے جا کر کیا کیونکہ دن کے اجالے میں اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ درے کا موڑ عبور کر کے رتنا گری کی وادی میں داخل ہوئے تو سورج پچھم کے پر بتوں پر جھک رہا تھا۔

ہم دن کے اجالے میں آئے اور درے کے موڑ سے نکلے تو ساؤ گاری کے باسیوں نے ہمارا قافلہ دیکھ لیا، اس لیے جب ساؤ گاری کے واحد پھانک پر پہنچے، سروپ جی، گونا مکھیا پیگو، شاستر اور چھ گونگے بھکشو ہمارے سواگت کے لیے کھڑے تھے، سروپ جی نے پروہت گنجال کے ساتھ میگھا زمیندار کو بھی میرے ہمراہ دیکھا تو دنگ رہ گئے مگر انہوں نے میگھا کا پر تپاک

سواگت کیا۔ گنجال کی واپسی پر خوش ہوئے کیونکہ ہمارے جانے کے بعد بھی بڑھا اس کے بارے میں بار بار پوچھتا رہا تھا۔

میکھا پہلی بار ساؤ گاری آیا تھا، وہ اس عجوبہ اور قلعہ نما عمارت کو چشم حیرت سے دیکھتا رہا جہاں اس کے حریف خاندان نے تین صدیاں گزار دی تھیں وسیع و عریض صحن یا پارک سے گزر کر ہم رہائشی حصے میں داخل ہوئے مگر پروہت گنجال وہیں سے مندر کی طرف چلا گیا گونگے بھکشو بھی لوٹ گئے، کایا، وشال اور ان کے ساتھی لائبریری والی راہداری کے کمروں میں پہنچ گئے جہاں وہ پہلے ٹھہرے تھے، سردپ جی نے میکھا کے لیے اپنا کمرہ کھول دیا تھا پیگو اور شاستر دونوں ان کے ساتھ تھے۔

سب لوگوں کو اپنے کام میں مصروف چھوڑ کر میں نے اٹیچی کیس اٹھایا اور چپکے سے آگے بڑھ گیا۔ ”نی“ نما راہداری میں گوچی ساؤ کے مجھے پر نظر ڈالتا رہنے پر ہولیا اور بالگونی سے ملنے والی راہداری عبور کر کے صحن میں داخل ہوا تو سندرمستی کو دیکھا جس نے میرے پیروں کی آہٹ پہچان لی اور سراپا انتظار بنی کھڑی تھی، ادھر میں نے صحن میں قدم رکھا ادھر اس نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھو لیے میرے ہاتھ سے اٹیچی کیس پکڑ لیا اور مجھے اپنے کمرے میں لے گئی، جہاں اس نے بھرپور پیار کیا، میں سترہ اٹھارہ دن کے بعد لوٹا تھا، بڑی بے چین رہی تھی، ملاپ کے لیے۔ میں نے پوچھا۔ ”تیرا من کیسا ہے؟“

”صرف آپ کے لیے بے چین تھا۔“

وہ۔۔۔ مجھے مدبھری نظروں سے دیکھتی اور آنکھوں میں جھانکتی رہی۔

”کیا اپنی آنکھوں میں تصویر بسا رہی ہے میری؟“

”آپ کی تصویر تو میرے انگ انگ میں بس چکی ہے کیشی! اپنے گربھ میں جو بیٹا پال رہی ہوں وہ بھی آپ کا ہم شکل ہوگا۔“

میں ہنس دیا، شاید وہ آنکھوں پہ اپنے گربھ میں پلنے والے بیٹے ہی کے دھیان میں مگن رہتی تھی، اسی لمحے باہر سے تارا کی آواز سنائی دی، سندرمستی نے مجھے بتایا وہ دادا کو آپ لوگوں کے آنے کی اطلاع دینے گئی تھی، وہیں سے آرہی ہے پھر دروازے کا پٹ کھولتی بولی۔ ”تارا دیکھ تیرے صاحب آگئے۔“

تارا لپکتی، چھلکتی اندر آئی اور آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی، جیسے کوئی بچہ برسوں کے بعد اپنے پریمی کو ملی ہو۔ میں سندرمستی کو دیکھ کے گھبرار ہا تھا اور سندرمستی تارا کو لپٹتے دیکھ کر ہنس رہی تھی، تارا بے حد خوش نظر آتی تھی میں نے کہا۔ ”ارے اب چھوڑ دو گی یا نہیں۔“

اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور اپنا میرے کانوں کے پاس لا کر دھیرے سے بولی ”اب مجھے بھی متلی آتی ہے صاحب۔“

یہ کہہ کر پرے ہٹ گئی اور میں نے سوالیہ نظروں سے سندرمستی کی طرف دیکھا وہ بتانے لگی۔ ”ہاں کیشی! بھگوان نے آپ کی پرارتھنا سونیکار کی، میری طرح تارا کو بھی ابکائی لگی ہے اور پیگو تو ابھی سے اسے کام کاج سے روکتا ہے۔“

”یہ بہت اچھی خبر سنی میں نے۔“

اسی اثناء میں سیڑھیوں کا دروازہ کھلنے کا کھٹکا ہوا پھر راہداری میں پیروں کی آہٹیں ابھریں ہم صحن میں نکل آئے اور دیکھا کہ سردپ جی میکھا زمیندار کو لیے آرہے ہیں پیگو ان کے پیچھے تھا، سندرمستی اجنبی کو دیکھ کر حیران ہوئی اور سردپ جی بولے۔ ”میکھا کو پرنام کر سندرمستی۔“ وہ میکھا کا نام سن کر چونکی، حیران ہوئی پھر دونوں ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا، میکھا نے آگے بڑھ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اشیر باد دی۔

”جگ جگ جیو بیٹی! تمہارے پتی دیوتا سلامت رہیں جن کے کارن آج دو پر یوار مل رہے ہیں۔“

پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے پیروں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی اور میں تڑپ کے پیچھے ہٹا۔ ”میکھا جی! آپ میرے پتا سان ہیں۔“

اس نے مجھے بانہوں میں لے کر میرا ہاتھ چوم لیا پھر سردپ جی میکھا کو بڑھے سے ملانے کے لیے کٹیا کو مہر نما کمرے کی طرف چلے گئے اور پیگو نے میرے پیروں پر لپٹ لیے۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کے اٹھایا گلے سے لگایا اور تارا کو ابکائی لگنے کی بدھائی دی پیگو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے، کپکپاتی آواز میں بولا۔ ”آپ سب کے پر بھو ہیں، سب کے بھگوان ہیں۔“

میں نے اسے تارا کے پاس چھوڑا اور سندرمستی کو لے کر پھر کمرے میں آ گیا اس کے ساتھ کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔

سردپ جی کو آتے ہی کہہ دیا تھا کہ آج شام کو ساؤ گاری میں پھر سنگت ہوگی، ویسی ہی سنگت جیسی میرے بیاہ اور سندرمستی کے گربھ جشن پر ہوئی تھی اور اس کا انتظام ہو گیا۔ گونا مکھیا کے آدمیوں نے گونگے بھکشوؤں کے ساتھ مل کر ساؤ گاری کے صحن میں پنڈال تیار کر دیا۔ مسند بچھ گئی گیس لیمپ روشن ہو گئے۔ شام ہوتے ہی ساؤ گاری کے سارے باسی، سب عورتیں، سب مرد اکٹھے ہوئے۔ گونگے بھکشو بڑھے کی پاکی اتار کر لے آئے اور میں تنہا مسند پر بیٹھا، مسند کی ایک طرف بڑھا تھا، پروہت گنجال تھا، سردپ جی تھے، سندرمستی تھی، تارا تھی، پیگو تھا، شاستر تھا، دوسری جانب میکھا زمیندار تھا۔ کایا پنٹھا تھا، وشال رائے تھا، چان تھا، کالی ناتھ تھا، کریم تھا اور سامنے گونگے بھکشو تھے، سادھو تھے، گونا مکھیا کا پورا پر یوار تھا۔

میں اس بھیڑ کے درمیان کھڑا ہوا تو سب چپ ہو گئے، میں نے بھگوان بدھ کی معجز نما مورتی سے بات چلائی، جیون بھید کا ذکر کیا، گوچی ساؤ اور سنوری کا واقعہ سنایا اور اس واقعے کو سب جانتے

تھے کیونکہ اس کے بعد ہی گوچی ساؤ نے بودھ دھرم اختیار کیا تھا۔ رتناگری کی وادی میں انا تھ بندو سے ملاقات کرنے، جیون بھید جاننے مورتی لینے اور اسے برہم پتر میں کھودینے کے واقعات سنائے۔ 1815ء کی کھدائی سے برآمد ہونے والی آئند بھکشو کی مورتی کا بتایا۔ ویشال رائے کی بہن روپ تارا اور کایا پنتھا کی بیٹی جل پنا کی کہانیاں بیان کیں کہ وہ کس طرح ساؤ گاری میں آئیں۔ رام گارتھ کے جنگل میں منگل ساؤ پر ویشال کے حملے اور پہاڑی خانقاہ کی زیر زمین کال کوٹھڑی میں کایا پنتھا کی ہولناک، اسیری کا حال سنایا اور بتایا کہ یہ سارے واقعات اس لیے پیش آئے کہ گوچی ساؤ مرا نہیں تھا کیونکہ اس نے اپنا جیون بڑھانے کے لیے مقدس راکھ استعمال کر لی، مگر مورتی کھودی جس میں راکھ بندھی اور وہ اس راکھ کو دوبارہ کھائے بغیر مرنہ سکتا تھا، اسی لیے ساؤ پر یوارسل درسل مورتی کو ڈھونڈتا کھو جتا رہا، پروہن مل سکی اور گوچی ساؤ جیون کے عذاب میں مبتلا ہو گیا جس نے ڈیڑھ صدی گزر جانے کے بعد اپنا نام ساگر ساؤ جی رکھ لیا اور باقی ڈیڑھ صدی اسی نام کے ساتھ گزار دی۔

جس طرح بجلی کڑ کئے، چمکنے سے اندھیرے میں شگاف پڑ جاتے ہیں، اسی طرح میرے اس انکشاف سے ساؤ گاری کے باسیوں کے دلوں میں حیرت کی دراڑیں پڑ گئیں، یہ لرزہ خیز انکشاف بجلی کا کڑا کا ہی تو تھا کہ گوجی ساؤ تین صدیوں سے جی رہا ہے سندرمتی کے منہ سے مارے حیرت کے چیخ نکل گئی۔ ہونٹوں پر تحیر و تعجب کی آوازیں تڑپیں، سسکیں کیونکہ پروہت گنجال اور سروپ جی کے علاوہ کوئی بھی ساگر ساؤ جی کی اصلیت سے واقف نہ تھا، یہ راز تو ساؤ گاری کے وارثوں کو صرف موت کے بستر پر منتقل کیا جاتا تھا۔

سب لوگوں کی نظریں دوڑ کر پاکی پر لگ گئیں جہاں بڑھاگوچی ساؤ کانوں میں آلہ سماعت لگائے میری باتیں سن رہا تھا۔ دیکھنے والی آنکھوں میں اتنی حیرت، اتنی پریشانی تھی جیسے انہوں نے کسی بھوت پریت کو دیکھ لیا ہو، میں نے اسی حالت میں بات آگے بڑھائی اور کہا۔

”گوچی ساؤ تین صدیوں سے جینے کا عذاب اس لیے بھوگ رہا ہے کہ سنوری نے مرتے سے اسے شراب دیا تھا، وہ سنوری کا شراب ہی تھا جو اس کے من میں جیون کی ہوس بن کر جاگھسا اور جب اس نے مقدس راہ استعمال کر لی، قدرت کے زبردست ہاتھ نے اس سے مورتی چھین لی۔ اس طرح گوچی ساؤ کے ساتھ اس کے پر یوار نے بھی بہت لمبی سزا کاٹی ہے مگر اب قدرت چاہتی ہے یہ سزا ختم ہو، اس نے مجھے اشارہ کیا، راستہ دکھایا اور میں وہ مورتی ڈھونڈ لایا ہوں جس کے اندر جیون بھید بند ہے اب ساؤ گاری کا دادا موت کے بستر پر سو جائے گا۔“

میں نے مورتی دکھائی، لوگوں میں اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ سرپ جی کے جسم میں سرسراہٹ سی ہوئی، بڑھے کی آنکھوں میں موت کی جوت جل اٹھی اور میں کہنے لگا۔ ”جو کچھ ہوا وہ آکاش کی کتاب پر پہلے سے لکھ دیا گیا تھا، پھر بھی کچھ باتیں سنسا اور بھگوان کے خلاف ہوئیں اور آج اس

کھلی کچہری میں ان کا نیاؤ ہوگا کیونکہ بھگوان نے مجھے نیاے کرنے کا ادھیکار دیا ہے اور اب میں ساؤ گاری کے پروہت گنجال پر دوش لگاتا ہوں کہ اس نے روپ تارا کیلئے زہر کا پیالہ بھرا، کا یا پنتھا کو پانچ برس تک بندی گھر میں رکھا اور مدایا بھکشو کو سانپ سے ڈسوا یا، اگر گنجال کہے جیسا کہ وہ ایک بار کہہ چکا ہے کہ اس نے سب کچھ دادا کے کہنے پر کیا ہے تو بھگوان کا اور سنسار کا قانون یہ عذر نہیں مانتا اسے یہ جاننا چاہیے تھا کہ ہر آدمی اپنے برے کرموں کی رسیوں میں جکڑا جاتا ہے اور ہر بھیا نک دوش کا کوڑا موت کی کوٹھڑی میں کھلتا ہے اب میں پروہت گنجال کو موقع دیتا ہوں کہ اگر وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے تو سب کے سامنے کہے۔“

پوری سنگت میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ کایا پنتھا اور وشال رائے نے پہلو بد لے اور سب نے گنجال کو کھڑے ہوتے دیکھا مگر اس نے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا اور بولا۔ ”بھگوان کی مورتی دیکھ لینے کے بعد مجھے کچھ نہیں کہنا کیونکہ جس طرح میرا جیون ساؤ گاری کے لیے تھا، اسی طرح میرا انت بھی گویا ساؤ کے ساتھ ہوگا، میں تو صرف نیاؤ سننے کے لیے ساؤ گاری آیا ہوں۔“

میں نے اپنا ہاتھ اونچا کیا۔ ”تو پھر یہ میرا نیاؤ کہ جس طرح تم نے روپ تارا کے لیے زہر کا پیالہ تیار کیا تھا، ایک پیالہ اپنے لیے بھی تیار کر لو۔“

یہ سن کر گنجال نے کالے آکاش کی طرف دیکھا اور بڑھے کی پاکی کے پاس بیٹھ گیا، اس نے نیاؤ مان لیا تھا، اس کے ساتھ ہی یہ کچہری، یہ سنگت ختم ہوئی اور ساؤ گاری کے باسی گوچی ساؤ کو دیکھنے کے لیے اس کی پاکی کے گرد اڈ آئے۔ میں اور سندرمتی پاکی کے پاس کھڑے ہو گئے اور سب نے باری باری اسے دیکھا اور گوچی ساؤ ان سے رخصت ہوا پھر پاکی مندر میں پہنچا دی گئی جہاں صرف میں، پروہت گنجال، سروپ جی، سندرمتی، کاپنٹھا، وشال رائے، گونا کھیا اور میگھا زمیندار تھے گوچی ساؤ نے مجھے بلا کر میرا ہاتھ چوما پھر میگھا کو بلایا اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور فف فف..... سس سس..... کرتا کہنے لگا۔

”میگھا! آج میرے جیون کی آخری رات ہے میں میں کال روپی ساگر میں جانے سے پہلے ایک چیز مانگتا ہوں تم سے انکار نہ کرنا۔“

”میں اپنے بیٹے تھارو کیشپ کے لیے تم سے چند اکابر مانگتا ہوں اور براس لیے مانگتا ہوں کہ ساؤ پر یوار اور میگھا پر یوار ایک ہو جائیں اور پرلوک میں میری آتما شانت رہے۔“

سب نے بڑھے کی اس بات کو حیرت سے سنا اور ان کی نظریں میگھا کی طرف تھیں، اس نے مسکرا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور یہ ایک عجیب نیا ایک عجیب فیصلہ تھا، پھر سب کے سامنے بھگوان کی مورتی سے مقدس راکھ نکالی گئی اور شہد میں گھول کر گوجی ساؤ کو دے دی تھوڑی دیر کے بعد اسے پالکی سے اتار کر فرش پر ڈال دیا گیا کیونکہ انت کال (سکرات موت) کی گھڑی آگئی تھی، مرنے

ہکا سی یہ سب کچھ دیکھتی رہی پھر آنسو پونچھے انہیں ساتھ لگایا۔ ماں کی بغل سے نکل کر سندرمی جل پنا سے اور جل پنا سندرمی سے لپٹ گئی، سر لا بہن چندا کو لیے پھرتی تھی، میں ان سب کو چھوڑ کر اپنے گور و صوفی عبد الجبار کی طرف بھاگا اور ان کے پاؤں چھونے لگا تو انہوں نے پیر پیچھے ہٹا لیے اور مجھے پکڑ کے گلے سے لگالیا، میں نے انہیں ”چوٹی ریکھا“ کے بارے میں بتایا تو بولے۔

”انسان کا علم ناقص ہوتا ہے کیشپ بیٹے! غیب کی باتیں وہ عالم الغیب ہی جانتا ہے۔“

دوسرے دن و شمال، منجوری اور مادھو موسیٰ کو بھی رنگامتی لے آیا اور میرے ہاتھ کی چاروں ریکھائیں میری ماں کے قدموں میں جمع ہو گئیں جس نے مجھے پال پوس کر جوان کیا اور میرے لیے راتوں کو اٹھ اٹھ کر پرارتھنا کیا کرتی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ بھگوان اس کے جیون کی محرومیوں کا ایسا صلہ دے گا پھر رنگامتی میں ایک بڑا جشن منایا گیا اور سارے شہر میں چرچا ہو گیا کہ تھارو کیشپ چار بہنیں لے آیا ہے۔

میری آپ بیتی پڑھنے والوں کے من کو یہ چٹا لگی ہوگی کہ گوچی ساؤ نے مرنے سے پہلے جو تہہ کیا ہوا کاغذ میرے سپرد کیا اس میں کیا لکھا تھا تو بتاتا ہوں کہ اس چٹھی یا وصیت میں اس نے مجھے ایک خزانے کی اطلاع دی تھی جو ساؤ گاڑی کی باؤلی میں دفن تھا اور جسے میں وہاں سے نکال لایا تھا وہ قیمتی بیروں اور سونے چاندی کی صورت میں اتنی دولت تھی کہ میری سات پیشیں بھی اسے ختم نہیں کر سکتیں۔ یہ خزانہ گوچی ساؤ کا وہ صلہ تھا جو اس نے اپنی موت کے عوض مجھے دیا اور جس کی طرف وہ کبھی کبھی اشارہ کیا کرتا تھا۔

اپنی آخری وصیت میں اس نے ایک اور بات بھی لکھی تھی کہ بھگوان کی مورتی کو تو سنہال کے رکھوں مگر تنہا گت بدھ کی معجز نما راکھ کو ضائع کر دوں کیونکہ آدمی کا اصل جیون وہی ہے جو بھگوان کی طرف سے ملتا ہے آکاش پر ٹھہرائی ہوئی موت کو ٹالنا ایک نادانی ہے اور اگر کوئی آدمی غیر طبعی جیون کی خواہش کرے گا تو اسے ان گنت دکھوں سے بھی گزرنا ہوگا، یہی وہ جیون مہید یا زندگی کا فلسفہ تھا جو تنہا گت شاکیہ منی وی شال کی امب پالی کو سمجھانا چاہتے تھے کہ جیون بھی ایک عذاب ہوتا ہے اور کوئی منش جیون بڑھا کر من کی شانتی حاصل نہیں کر سکتا، قدرت نے آدمی کے لئے جو کچھ مقرر کر دیا وہی بہتر ہے۔

میں نے گوچی ساؤ کی اس وصیت یا نصیحت پر عمل کیا اور مقدس مورتی کی راکھ کرنا فلی ندی میں بہا دی، اب صرف یہ بتانا باقی رہ گیا ہے کہ ساؤ گاڑی سے ہمارے نکلنے کے چند روز بعد رتناگری کی وادی میں لگا تار کئی شدید بھونچال آئے اور ان بھونچالوں میں ساؤ گاڑی کی بوڑھی عمارت پیوند زمین ہو گئی۔ اب وہاں بلے کے ڈھیر اور پتھروں کے سوا کچھ نہیں۔

(ختم شدہ)

سے پہلے اس نے مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا اور تہہ کیا ہوا ایک کاغذ میرے ہاتھوں میں دے دیا پھر چند ہی گھنٹیوں میں بڑھے کو موت کی ہچکی لگی اور اس کی آتما بوڑھا شریر چھوڑ کر پرلوک کی طرف پرواز کر گئی اور سروپ ساؤ جی نے بھگوان کا شکر ادا کیا۔

سورج نکلنے تک گوچی ساؤ کا مردہ شریر مندر ہی میں پڑا رہا، صرف پروہت گنجال اس کے پاس تھا، سویرے ہم مندر میں گئے تو وہاں ایک نہیں دو مردے تھے۔ گنجال نے رات زہر کا پیالہ پی لیا اور گوچی ساؤ کے ساتھ ہی دنیا سے چلا گیا تھا۔

دونوں کا کریا کرم اور انتم سنسکار بڑی دھوم دھام سے کیا گیا اور جب آگے پیچھے ان کی ارتھیاں انھیں تو ساؤ گاڑی کے باسی بھجن گاتے پیچھے پیچھے چلے، گوچی ساؤ کی ارتھی میں نے سروپ جی نے، گونا کھیا اور میگھانے اٹھا رکھی تھی اور گنجال کی ارتھی چار گونگے بھکشوؤں کے کندھوں پر تھی، ہم شمشان پہنچے تو وہاں ایک اور اچنچا ہمارا منتظر تھا، انا تھ بن کا بوڑھا شیش ناگ بھی مرا پڑا تھا۔ شاید وہ رات اس سے مرا تھا جب گنجال نے زہر کا پیالہ پیا شمشان میں ایک تیسری چٹا بنائی گئی اور گوچی ساؤ اور گنجال کے ساتھ سانپ کو بھی جلا دیا گیا۔

ہم ساؤ گاڑی میں لوٹے تو اس کے سارے اسرار کا خاتمہ ہو چکا تھا، دوسرے دن اس عمارت کو خالی کر دیا گیا۔ گونا کھیا اور اس کے پر یوار کو بائی پارہ میں کچھ زمین دے دی گئی پیگو اور تارانے سروپ جی کے ساتھ حویلی میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا جب میں لوگوں کی بھیڑ کے ساتھ ساؤ گاڑی سے نکل کر جا رہا تھا ایک جگہ رک کر میں نے اس قلعہ نما عمارت کی طرف دیکھا اور کہا۔

”الوداع اے ساؤ گاڑی! میں نے تیرے دکھ مٹا دیئے اور تجھے نروان عطا کیا۔“

سروپ جی اور سندرمی نے بھی اس بوڑھی عمارت کو الوداعی نظروں سے دیکھا اور ہمارا قافلہ رپا کی طرف چل پڑا جہاں ہم میگھاز میندار کے گھر ٹھہرے اور اس کی بیٹی چندا کے ساتھ میرا چوتھا لگن ہوا میں نے چندا کو دیکھا تو بھونچکا رہ گیا کایا پنتھا، و شمال رائے چان، کالی ناتھ اور کریم بھی انگشت بدنداں تھے کہ اس کی صورت ہو بہو انیلا مورتی سے ملتی جلتی تھی جو میرے ہاتھ کی چوٹی ریکھا تھی، یہ ایک عجیب و غریب بات ہوئی تھی کہ انیلا مورتی مجھے چندا کے روپ میں مل گئی۔ رپا میں ایک دن قیام کرنے کے بعد ہم بائی پارہ پہنچے، چندا کے ساتھ لگن رات ساؤ پر یوار کی پرانی حویلی میں ہوئی۔

تیسرے دن سندرمی اور چندا کو لے کر پوربی بنگال کی طرف روانہ ہوا، سروپ جی اور شاسترو بھی ساتھ تھے۔ شاسترو کو میں مستقل طور پر اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا خوابوں کے سبز شہر چٹا گانگ سے سیٹھ لکشمی نرائن اور سر لا بہن کو بھی ساتھ لیا اور اس طرح رنگامتی پہنچا۔ ماں نے مجھے اس دھوم دھام سے آتے دیکھا تو خوشی کے مارے رونے لگی۔ سروپ جی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے دھبہ دیکھا اور سندرمی کو ماں کے چرونوں میں ڈال دیا چندا نے بھی اس کے پیر چھوئے اور ماں